

اسلام پر اعتراضات و شبہات پر عقلی و نقلی جامع اور  
دلچسپ جوابات علماء و عوام کے لیے یکساں مفید

# آشرف الجواب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محمد امجد اللہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی



مکتبہ عرفان و وقوف

شارف فصیح آباد، کراچی

کفار، شرکین، شیعہ، بدعتی، غیر متقدمین، مغرب زدہ مسلمان اور جاہل طبقے  
کے اسلام پر اعتراضات و شبہات پر عقلی و نقلی، جامع اور دلچسپ جواب

# اشرف الجواب

افادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرتہ

مولانا الشاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ

اسلام پر اعتراضات و شبہات پر عقلی و نقلی جامع اور  
دلچسپ جوابات علماء و عوام کے لیے یکساں مفید

مکتبہ عمر فاروق  
شاہ فیصل کالونی کراچی

## جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب .....	اشرف الجواب
مؤلف .....	حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
اشاعت اول .....	
ضخامت .....	608
قیمت .....	
ناشر .....	فیاض احمد 021-4594144-8352169
موبائل .....	0334-3432345
.....	مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی نمبر ۴، کراچی نمبر ۲۵

## قارئین کی خدمت میں

کتاب ہذا کی تیاری میں تصحیح کتابت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، تاہم اگر پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو التماس ہے کہ ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کا تدارک کیا جاسکے۔

۔ جزاء کم اللہ تعالیٰ جزاءً جمیلاً جزیلاً۔

## فہرست عنوانات حصہ اول

- ۳۳..... فہرست مضامین اشرف الجواب ایک نظر میں  
 ۳۳..... اسلام پر کیے گئے شبہات و اعتراضات کے مدلل و مکمل جوابات عقل و نقل کی روشنی میں  
 ۳۶..... حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ.....

۳۸	۱	پہلا اعتراض..... کیا اسلام بزرگ شمشیر پھیلا؟
۳۸	۲	جواب:
۳۸	۳	حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کا واقعہ
۳۹	۴	قاضی کا فیصلہ
۴۰	۵	قاضی کے فیصلہ پر مسرت
۴۰	۶	یہودی کا قبول اسلام
۴۰	۷	اہل یورپ کا خیال اور اس کی تردید
۴۱	۸	قانون اسلام
۴۱	۹	ہرمزان کا واقعہ
۴۲	۱۰	ہندوستان کی مثال:
۴۲	۱۱	مدینہ میں اسلام
۴۳	۱۲	حبشہ میں اسلام
۴۳	۱۳	جہاد کا منشا
۴۴	۱۴	دوسرا اعتراض..... کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے؟
۴۴	۱۵	جواب:
۴۶	۱۶	تیسرا اعتراض..... اللہ تعالیٰ بغیر زبان کے کیسے کلام فرماتا ہے؟
۴۶	۱۷	چوتھا اعتراض..... شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟
۴۷	۱۸	ایک مثال
۴۸	۱۹	پانچواں اعتراض..... کیا مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟
۴۸	۲۰	جواب:

۲۸	کعبہ کی طرف منہ کرنے کا راز	۲۱
۲۹	کعبہ کی خصوصیت	۲۲
۲۹	کعبہ پر تجلیات الہیہ	۲۳
۵۰	چھٹا اعتراض..... حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ!	۲۴
۵۰	جواب:	۲۵
۵۱	حجر اسود کو بوسہ دینے کا راز	۲۶
۵۲	ساتواں اعتراض..... غلامی کا مسئلہ کیا اسلام میں قابل اعتراض ہے؟	۲۷
۵۲	جواب:	۲۸
۵۲	مسئلہ غلامی کی اصل	۲۹
۵۳	جیل میں رکھ کر راحت پہنچانا	۳۰
۵۳	مجموعہ غزنوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ	۳۱
۵۴	غلامی کا کرشمہ	۳۲
۵۵	آٹھواں اعتراض..... اسلامی تعزیرات پر اعتراض اور اس کا جواب	۳۳
۵۵	شریعت کی قدر و قیمت	۳۴
۵۶	نواں اعتراض..... کیا جنت و دوزخ کوئی چیز ہے؟	۳۵
۵۸	دسواں اعتراض..... مسلمان کیا رسول ﷺ کو خدا تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں؟	۳۶
۵۸	جواب:	۳۷
۵۹	گیارہواں اعتراض..... رسول اللہ ﷺ کا اشاعت اسلام سے مقصود کیا اپنی تعظیم ہے؟	۳۸
۵۹	جواب:	۳۹
۵۹	محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حال	۴۰
۶۰	محبت کا اثر	۴۱
۶۱	صحابہ رضی اللہ عنہم کا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم	۴۲
۶۱	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کار	۴۳
۶۲	بارہواں اعتراض..... نجات کے لئے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ہے؟	۴۴
۶۲	جواب:	۴۵
۶۳	ایک واقعہ	۴۶

۲۴	۴۷	ایک فلسفی کا قصہ
۲۵	۴۸	تیرہواں اعتراض..... تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی!
۲۸	۴۹	چودھواں اعتراض..... تمہارے نبی تارک لذات!
۲۸	۵۰	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ
۲۹	۵۱	ترک لذات زہد نہیں
۲۹	۵۲	آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و ضبط
۳۰	۵۳	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کرنے کی حکمتیں
۳۰	۵۴	حکمت اول:
۳۰	۵۵	امت کو بتانا تھا کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہئے؟
۳۰	۵۶	حکمت دوم:
۳۱	۵۷	حکمت سوم:
۳۲	۵۸	دل کے میلان پر تقابول نہیں ہوتا
۳۲	۵۹	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی
۳۳	۶۰	حیثیوں کا کھیل
۳۳	۶۱	بیوی کی رعایت
۳۳	۶۲	وقار کا بھوت
۳۳	۶۳	حکمت چہارم
۳۵	۶۴	پندرہواں اعتراض..... نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج فرمانا
۳۵	۶۵	مزاج کی دوسری حکمت
۳۶	۶۶	مزاج سے رعب کب کم ہوتا ہے؟
۳۷	۶۷	سولہواں اعتراض..... مرتد کا درجہ کا فرائض سے کیوں بڑھا ہوا ہے؟
۳۷	۶۸	جواب:
۳۷	۶۹	ارتداد کا انجام
۳۸	۷۰	سترہواں اعتراض: مسلمان کا اقدام علی الکبائر اور اس کی وجہ!
۳۸	۷۱	ایک مسلمان کا واقعہ
۳۹	۷۲	دیانت داری کا دوسرا واقعہ

۸۰	عقیدہ کا اثر	۷۳
۸۰	عقلمندی جو اب ۲	۷۴
۸۱	مراحم خسرو سے فریب نہیں کھانا چاہئے	۷۵
۸۱	گنہگاروں کی مغفرت	۷۶
۸۲	ایک شبہ کا ازالہ	۷۷
۸۳	اللہ تعالیٰ کا بے انتہا غفور و کرم	۷۸
۸۳	کفر سے پہلے والے گناہ	۷۹
۸۴	اٹھارواں اعتراض..... مسلمانوں کا جانوروں کو ذبح کرنا عقل و نقل کی روشنی میں!	۸۰
۸۵	ایک حکایت	۸۱
۸۶	مسلمانوں کی رحم دلی	۸۲
۸۶	انیسواں اعتراض..... ذبح کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب!	۸۳
۸۷	بیسواں اعتراض..... مردہ کو ذبح کرنا بہتر ہے یا جلا دینا؟	۸۴

## حصہ دوم روافض کے اعتراضات کے جوابات

۸۹	پہلا اعتراض..... وصال حضور ﷺ کا دوات مانگنا اور حضرت عمرؓ کا یہ کہنا کہ کیا ضرورت ہے؟	۸۵
۸۹	الزامی جواب:	۸۶
۹۰	دوسرا اعتراض: اس شبہ کا جواب کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ اول کیوں نہیں بنایا	۸۷
۹۰	جواب اول:	۸۸
۹۱	ایک واقعہ	۸۹
۹۱	تین تین رضی اللہ عنہما کے احسانات	۹۰
۹۲	کیا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ طالب دنیا تھے؟	۹۱
۹۳	گمراہ فرقہ کا غلط دعویٰ	۹۲
۹۴	تیسرا اعتراض..... ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن بھی اہل بیت میں داخل ہیں	۹۳
۹۵	چودھواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ بعض علوم سینہ بہ سینہ ہیں!	۹۴
۹۵	سینہ بہ سینہ علم کا موجد	۹۵

۹۶	صوفیہ پر انزام	۹۶
۹۷	ایک حکایت	۹۷
۹۷	ایک مشہور قصے	۹۸
۹۸	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان	۹۹
۹۸	امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا واقعہ	۱۰۰
۹۹	اہل بدعت کے شہادت کے جوابات	۱۰۱
۹۹	پانچواں اعتراض..... بدعت کی ایک پہچان اور اس کی صحیح حقیقت!	۱۰۲
۱۰۰	ایصال ثواب کے لئے تاریخ مخصوص کرنا	۱۰۳
۱۰۰	نیت کی اصلاح	۱۰۴
۱۰۱	بدعت کی مثال:	۱۰۵
۱۰۱	حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا واقعہ	۱۰۶
۱۰۲	بدعات کی قباحت	۱۰۷
۱۰۲	خیر القرون کے بعد کی چیزیں	۱۰۸
۱۰۳	کتابوں کی تصنیف اور مدارس و خانقاہوں کی تعمیر	۱۰۹
۱۰۳	بدعات میں کیا چیزیں داخل ہیں	۱۱۰
۱۰۴	چھٹا اعتراض..... اہل حق کو وہابی کہنا بہتان ہے!	۱۱۱
۱۰۴	ساتواں اعتراض..... شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی گیارہویں منانے والوں کی غلطیاں	۱۱۲
۱۰۵	عقائد کی خرابیاں	۱۱۳
۱۰۵	آٹھواں اعتراض..... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے متعلق ایک بے بنیاد حکایت!	۱۱۴
۱۰۶	نواں اعتراض..... بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا ہونے کی حدیثیں گھڑ لی ہیں	۱۱۵
۱۰۷	جاہلوں کے خرافات	۱۱۶
۱۰۸	دسواں اعتراض..... جانوروں وغیرہ کو منحوس سمجھنا وہابیات ہے!	۱۱۷
۱۰۸	گیارہواں اعتراض..... اصطلاح صوفیہ میں کافر سے مراد فانی ہے!	۱۱۸
۱۰۹	مزاح حدیث میں	۱۱۹
۱۰۹	ایک واقعہ	۱۲۰
۱۱۰	حق تعالیٰ کا مزاح	۱۲۱



۱۱۱	بارہواں اعتراض.....خطیبہ الوداع محض بدعت ہے	۱۲۲
۱۱۱	تیرہواں اعتراض.....عوام کا اہل طور سے مدد مانگنا شرک سے خالی نہیں!	۱۲۳
۱۱۲	شرک کی ایک مثال	۱۲۴
۱۱۳	قبروں سے مدد چاہنا	۱۲۵
۱۱۳	ایک حکایت	۱۲۶
۱۱۴	خاف ادب کام	۱۲۷
۱۱۴	چودہواں اعتراض.....حضور ﷺ کے یوم ولادت پر جلوس نکالنا!	۱۲۸
۱۱۵	ایک بزرگ کی حکایت	۱۲۹
۱۱۵	دنیا داروں کا سامعہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ	۱۳۰
۱۱۵	یوم ولادت پر خوشی منانے کی کوئی دلیل ہے	۱۳۱
۱۱۶	پندرہواں اعتراض: عرس کے حقیقی معنی اور بزرگوں کے ہر مہجہ عرسوں کا خلاف شروع ہونا!	۱۳۲
۱۱۷	مرنے پر خوشی	۱۳۳
۱۱۸	ابن الفارض کا واقعہ	۱۳۴
۱۱۹	بزرگوں کی موت یوم مسرت ہے	۱۳۵
۱۱۹	سولہواں اعتراض.....شادی اور نفی کی رسوم خلاف شرع اور واجب التکرار ہیں!	۱۳۶
۱۲۰	تکبر کی حمایت	۱۳۷
۱۲۰	شادی میں انسان کا حال	۱۳۸
۱۲۱	نیوت کی رسم	۱۳۹
۱۲۲	نیوت کی خرابیاں	۱۴۰
۱۲۳	دوسری رسمیں	۱۴۱
۱۲۳	نمونوں کی رسمیں	۱۴۲
۱۲۴	دلائل عقلیہ	۱۴۳
۱۲۴	ایصال ثواب کے غلط طریقہ	۱۴۴
۱۲۵	ایک حکایت	۱۴۵
۱۲۶	دین چھوڑنے کا انجام	۱۴۶
۱۲۷	عفت و عصمت کی حفاظت	۱۴۷

۱۲۷	دلہن کی حفاظت	۱۲۸
۱۲۸	ستر ہواں اعتراض..... شوہر کے مرنے کے بعد شوہر والوں کا موت کے نکاح میں اپنا حق بھجھنا غلط ہے!	۱۲۹
۱۲۹	زبردستی نکاح	۱۳۰
۱۲۹	انٹھارہواں اعتراض..... مائیں بٹھانے کی رسم ناجائز ہے!	۱۳۰
۱۳۰	انیسواں اعتراض..... چالیسویں وغیرہ کا کھانا محض برادری کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا!	۱۳۱
۱۳۰	ایک حکایت	۱۳۱
۱۳۱	ایک گوجر کا واقعہ	۱۳۱
۱۳۱	ایک رئیس زادے کی حکایت	۱۳۲
۱۳۲	حاصل کلام	۱۳۲
۱۳۲	بیسواں اعتراض..... تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت	۱۳۳
۱۳۳	موئے مبارک	۱۳۳
۱۳۳	تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں احادیث	۱۳۴
۱۳۴	چہ مبارک کا تذکرہ	۱۳۴
۱۳۴	موئے مبارک سے متعلق حدیث	۱۳۵
۱۳۵	لباس مبارک	۱۳۶
۱۳۶	تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غلو	۱۳۶
۱۳۶	تبرکات کا نام نہیں آتے	۱۳۷
۱۳۷	اکیسواں اعتراض..... رمضان شریف کے لئے نیک کاموں کا روک رکھنا؟	۱۳۷
۱۳۷	نیکی کی تائید کرنا چاہئے	۱۳۸
۱۳۸	بائیسواں اعتراض..... عید میلاد النبی ﷺ کی دلائل اربعہ سے تردید!	۱۳۸
۱۳۸	میلاد کی تردید قرآن میں	۱۳۹
۱۳۹	میلاد کی تردید حدیث میں	۱۴۰
۱۴۰	فضائل یوم ولادت کی صراحت نہیں	۱۴۰
۱۴۰	روضہ مبارک کی زیارت	۱۴۱
۱۴۱	چوتھی حدیث سے استدلال	۱۴۲
۱۴۲	عدم جواز پراجماع سے ثبوت	۱۴۲

۱۰	
۱۲۲	۱۷۴ ایک شبہ کا جواب
۱۲۲	۱۷۵ عید میلاد کا عدم جواز قیاس سے
۱۲۳	۱۷۶ موجودین کے دلائل اور ان کا جواب
۱۲۳	۱۷۷ پہلا استدلال اور اس کا جواب
۱۲۴	۱۷۸ دوسرا استدلال اور اس کا جواب
۱۲۴	۱۷۹ تیسرے استدلال کا جواب
۱۳۵	۱۸۰ چوتھا استدلال اور اس کا جواب
۱۳۶	۱۸۱ پانچواں استدلال اور اس کا جواب
۱۳۷	۱۸۲ عقلمانی دلائل کا جواب
۱۳۸	۱۸۳ ایک قصہ
۱۳۹	۱۸۴ تین سوواں اعتراض..... پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے مذاق کے خلاف ہے
۱۵۰	۱۸۵ زیارت قبور کا منشاء
۱۵۰	۱۸۶ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا غسل
۱۵۱	۱۸۷ کچی قبریں
۱۵۱	۱۸۸ پختہ قبر ممنون
۱۵۲	۱۸۹ قبروں پر فیض کا سوال
۱۵۲	۱۹۰ چوبیسواں اعتراض..... ربیع الاول کی مخصوص تاریخ میں میاں کی ممانعت!
۱۵۳	۱۹۱ صوفیہ اور علماء کے ذوق کا فرق
۱۵۳	۱۹۲ صوفیہ اور علماء کی رائے کا فرق ایک مثال سے
۱۵۴	۱۹۳ حسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ
۱۵۵	۱۹۴ واقعہ خواجہ باقی باللہ
۱۵۶	۱۹۵ بیسیسواں اعتراض..... نماز پنجگانہ یا فجر و عصر کے بعد مل کر بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے!
۱۵۶	۱۹۶ علماء کی مثال
۱۵۶	۱۹۷ مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا حال
۱۵۷	۱۹۸ شیخ الہند رحمہ اللہ کا واقعہ
۱۵۷	۱۹۹ چھبیسواں اعتراض..... سجادہ نشینی محل میراث نہیں، بلکہ محض رسم ہے!

۱۵۸	حکیم الامت رحمہ اللہ کا ایک واقعہ	۲۰۰
۱۵۸	گدی نشینی	۲۰۱
۱۵۸	حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ	۲۰۲
۱۵۹	ایک حکایت	۲۰۳
۱۶۰	ستائیسواں اعتراض..... عید گاہ میں بچوں کے لانے کی ممانعت	۲۰۴
۱۶۱	اٹھائیسواں اعتراض..... حضور ﷺ کی تعریف میں ایسا مبالغہ کہ	۲۰۵
۱۶۱	غلط کتابیں	۲۰۶
۱۶۲	انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی	۲۰۷
۱۶۲	حسن کی دو قسمیں	۲۰۸
۱۶۲	نبی کی ایسی تعریف جس سے دوسرے کی تنقیص ہو	۲۰۹
۱۶۳	ہر خوبی کا ہر وقت ظہور لازم نہیں	۲۱۰
۱۶۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ	۲۱۱
۱۶۳	انداز بیان میں احتیاط	۲۱۲
۱۶۵	صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جان نثاری	۲۱۳
۱۶۶	حضرت موسیٰ علیہ السلام	۲۱۴
۱۶۷	انیسواں اعتراض..... حضور ﷺ کو خدا تعالیٰ کا معشوق قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے!	۲۱۵
۱۶۸	تیسواں اعتراض..... مردہ کی روح دنیا میں واپس نہیں آتی!	۲۱۶
۱۶۸	اکیسواں اعتراض..... غیر مقلدین کے اعتراضات کا حل اور اس کا جواب!	۲۱۷
۱۶۹	تیسواں اعتراض..... انقطاع اجتہاد پر شبہ کا جواب!	۲۱۸
۱۷۰	تینیسواں اعتراض..... آج کل دین کی حفاظت کے لیے تقلید شخصی نہایت ضروری ہے!	۲۱۹
۱۷۰	خود غرضی کا ایک واقعہ	۲۲۰
۱۷۱	ایک حکایت	۲۲۱
۱۷۱	تقلید شخصی کی ضرورت	۲۲۲
۱۷۲	چوبیسواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ مقلدین حدیث چھوڑ کر اقوال ائمہ پر عمل کرتے ہیں!	۲۲۳
۱۷۳	ایک اعتراض اور اس کا جواب	۲۲۴
۱۷۴	مسائل اجتہاد	۲۲۵

۲۲۶	پینتیسواں اعتراض..... اس شب کا جواب کہ توسل میں بزرگی کی بزرگی کو حجت میں کیا مثل ہے!	۱۷۵
۲۲۷	چھتیسواں اعتراض..... اس شبہ کا حل کہ لا الہ الا اللہ کے سوا تمام اذکار بدعت ہیں!	۱۷۵
۲۲۸	سینتیسواں اعتراض..... خفی کہلانے پر اعتراض کا جواب!	۱۷۶
۲۲۹	مقصد اتباع الہی ہے	۱۷۷
۲۳۰	ائمہ اربعہ کی طرف نسبت	۱۷۸
۲۳۱	اڑتیسواں اعتراض..... روضہ نبوی ﷺ کی زیارت کے لیے سفر	۱۷۹
۲۳۲	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق	۱۸۰
۲۳۳	کانپور کا ایک واقعہ	۱۸۰
۲۳۴	امام مالک رحمہ اللہ کا جملہ اور اس کا جواب	۱۸۱
۲۳۵	سید احمد رفاعی رحمہ اللہ کا واقعہ	۱۸۱
۲۳۶	انتالیسواں اعتراض..... تراویح میں رکعت سنت ہیں!	۱۸۲
۲۳۷	ایک واقعہ	۱۸۲
۲۳۸	مقصد سہولت ہے	۱۸۳
۲۳۹	ایک مشہور حکایت	۱۸۳
۲۴۰	عہد عمر رضی اللہ عنہ میں تراویح کو وتر	۱۸۳
۲۴۱	چالیسواں اعتراض..... حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ روایت میں سب ائمہ میں بڑھے ہوئے ہیں!	۱۸۵
۲۴۲	عالم بالحدیث کا قصہ	۱۸۶
۲۴۳	عوام کے شبہات کا حل!	۱۸۶
۲۴۴	اکتالیسواں اعتراض..... حضور ﷺ کا اپنے صاحبزادے ابراہیم ؑ کی وفات پر رونا	۱۸۶
۲۴۵	بیالیسواں اعتراض..... لڑکا لڑکی کی عمر بوقت شادی برابر ہی ہونی چاہیے!	۱۸۷
۲۴۶	ہمم عمر کا خیال	۱۸۷
۲۴۷	عورت کا کم عمر ہونا مناسب ہے	۱۸۸
۲۴۸	ترالیسواں اعتراض..... علم دین حاصل کرنے کا سہل اور آسان طریقہ!	۱۸۸
۲۴۹	چوالیسواں اعتراض..... قرآن شریف ایک مثنیٰ ہے، فقہ اور حدیث اس کی شرح ہے!	۱۸۹
۲۵۰	پینتالیسواں اعتراض..... آج کل مستحبات کی پروا نہیں کی جاتی نہ ہی ان کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے!	۱۹۰
۲۵۱	اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق	۱۹۱

۱۹۲	۲۵۲	تعلقات میں درجہ کمال
۱۹۳	۲۵۳	کمزور تعلق پر انسوس نہیں
۱۹۴	۲۵۴	ہمارا فرض کیا ہے؟
۱۹۵	۲۵۵	کسی مصلحت سے ترک مستحبات
۱۹۵	۲۵۶	مستحبات بھی ضروری ہیں
۱۹۶	۲۵۷	چھیالیسواں اعتراض..... عوام کے لیے ترجمہ قرآن شریف دیکھنا معسر ہے!
۱۹۶	۲۵۸	ایک بڑے میاں کا واقعہ
۱۹۸	۲۵۹	سینتالیسواں اعتراض..... قبولیت دعا پر شبہ کا جواب!
۱۹۸	۲۶۰	دعا کی قبولیت کی شکلیں
۱۹۹	۲۶۱	اجابت دعا کا معنی
۲۰۰	۲۶۲	اڑتالیسواں اعتراض..... عمل کے بغیر کوئی دینی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا!
۲۰۱	۲۶۳	انچاسواں اعتراض..... مجاہدہ کو ضروری نہ سمجھنا غلطی ہے!
۲۰۲	۲۶۴	چھاسواں اعتراض..... انبیاء علیہم السلام پر تکالیف آنے کی وجہ!
۲۰۳	۲۶۵	فرق حشوئیہ کی حماقت
۲۰۵	۲۶۶	اکیادواں اعتراض..... جہلاء کی اس غلطی کا جواب کہ خیرات کی ہوئی چیز بعینہ مردہ کو پہنچتی ہے!
۲۰۵	۲۶۷	خیرات ہونے والی چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے
۲۰۶	۲۶۸	خیرات کی جانے والی چیزیں مردہ کو نہیں پہنچتی ہیں
۲۰۶	۲۶۹	حوریں اور ان کے دوپٹے
۲۰۷	۲۷۰	حوض کوثر کا پانی
۲۰۷	۲۷۱	باونواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ مشائخ بعض مرتبہ نا اہل کو خلیفہ کر دیتے ہیں!
۲۰۸	۲۷۲	ترچواں اعتراض..... اس اعتقاد کی تردید کہ نجات آخرت ہمارے اختیار سے باہر ہے!
۲۰۸	۲۷۳	فصل اختیار کے دو معنی ہیں
۲۰۹	۲۷۴	جنت میں جانا اختیاری ہے
۲۰۹	۲۷۵	تقویٰ کا بیان
۲۱۰	۲۷۶	توکل اور اس کی حقیقت
۲۱۱	۲۷۷	آخرت کے لیے سعی کرنا

۲۷۸	چونواں اعتراض..... اختلاف روایت کی صورت میں روزہ کن سی تاریخ کا افضل ہوگا؟
۲۷۹	جس کے یہاں جو تاریخ ثابت ہو وہی برکت ہے
۲۸۰	بچپنواں اعتراض..... عورتوں کے اس عمل کی تردید کدھر میں.....
۲۸۱	چھپنواں اعتراض..... مردوں کی کوتاہی کہ عورتوں کے دینی امور اپنے ذمہ نہیں سمجھتے!
۲۸۲	ستاونواں اعتراض..... زمانہ اسکول کا قیام عورتوں کے لیے زہر قاتل ہے!
۲۸۳	موجودہ زمانہ میں اسکول کا حال
۲۸۴	لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ
۲۸۵	خصوصی مسائل
۲۸۶	لکھنا بھی سکھایا جائے
۲۸۷	انٹھاونواں اعتراض..... ماں باپ کے حق پیر سے زیادہ ہے!
۲۸۸	بیروں کا حال
۲۸۹	آج کل کے پیرومریدوں کو غلام سمجھتے ہیں
۲۹۰	حضرت جبرئیل صوفی کا واقعہ
۲۹۱	شریعت کا حسن و جمال
۲۹۲	عبادت کا اثر
۲۹۳	انٹھواں اعتراض..... چھوٹے بچے کو روزہ پر مجبور کرنا درست نہیں!
۲۹۴	ساتھواں اعتراض..... فرشتے کو بیغیر بنا کر کیوں نہ بھیجا گیا؟.....
۲۹۵	ادکام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی موافقت ضروری ہے
۲۹۶	فرشتے رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجے گئے؟
۲۹۷	سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب
۲۹۸	آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان
۲۹۹	اسٹھواں اعتراض..... بعض جدید تعلیم یافتوں کا حال، ان سے مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا!
۳۰۰	باستھواں اعتراض..... حضور ﷺ کے زمانے میں پیدا ہونے کی تمنا!
۳۰۱	تریسٹھواں اعتراض..... لوگوں نے غفور رحیم کے معنی غلط سمجھے!
۳۰۲	طوطے کی مثال
۳۰۳	غفور رحیم کا حاصل

۲۲۹	خدا کی مخالفت	۳۰۳
۲۳۰	خطا معاف کر کے مقرب بنانا	۳۰۵
۲۳۰	چونٹھواں اعتراض..... جاہل و اعظموں کے وعظ کی خرابیاں!	۳۰۶
۲۳۱	جاہل و اعظموں کی خرابیاں	۳۰۷
۲۳۱	ضعف ایمان اور ضعف طبیعت	۳۰۸
۲۳۲	سونا چاندی خریدنے کا مسئلہ	۳۰۹
۲۳۳	طلاق کا مسئلہ	۳۱۰
۲۳۳	مطلق و مقید کا فرق	۳۱۱
۲۳۴	پینسٹھواں اعتراض..... عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش کرنا بڑی غلطی ہے!	۳۱۲
۲۳۵	چھیستھواں اعتراض..... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں.....	۳۱۳
۲۳۶	سرسٹھواں اعتراض..... حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت اسماعیل.....	۳۱۴
۲۳۷	اڑسٹھواں اعتراض..... مفتداء بنانے کے لیے عوام کا غلط معیار!	۳۱۵
۲۳۸	بزرگی کیا ہے؟	۳۱۶
۲۳۸	بی بی تیز کا وضو	۳۱۷
۲۳۹	بزرگی کیا ختم نہیں ہوتی ہے؟	۳۱۸
۲۳۹	انہتر واں اعتراض..... پیشوا بنانے کا صحیح معیار!	۳۱۹
۲۴۰	ستر واں اعتراض..... بعض لوگ حج کے بعد بد عمل کیوں ہو جاتے ہیں؟	۳۲۰
۲۴۱	اکہتر واں اعتراض..... جب بری باتوں سے بچانا نماز کا.....	۳۲۱
۲۴۱	ہماری نمازیں	۳۲۲
۲۴۲	صورت نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں	۳۲۳
۲۴۲	اعتراض کا جواب	۳۲۴
۲۴۳	بہتر واں اعتراض..... معراج میں دیدار باری تعالیٰ!	۳۲۵
۲۴۴	دیدار الہی	۳۲۶
۲۴۵	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الہی معراج میں ہوئی ہے	۳۲۷
۲۴۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ	۳۲۸
۲۴۶	دنیا و آخرت میں فرق!	۳۲۹



۲۴۷	تہتر واں اعتراض..... درود پڑھ کر حضور ﷺ پر کوئی احسان سمجھنا غلط ہے!
۲۴۸	درود شریف کا فائدہ
۲۴۹	چوتھواں اعتراض..... مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے!
۲۵۰	مجالس اسلامی کی شان
۲۵۱	اہل حق کا کام
۲۵۲	چوتھواں اعتراض..... حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام کی حیات برزخیہ کا اثبات!
۲۵۲	حیات برزخیہ کے مراتب
۲۵۳	شہید کی حیات
۲۵۳	انبیاء علیہم السلام کی حیات
۲۵۴	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات
۲۵۴	سلطان مدینہ کا خواب
۲۵۵	سرنگ ٹھونڈنے والے پکڑے گئے
۲۵۶	چوتھواں اعتراض..... علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک نہیں!
۲۵۶	تجوید کی کیا فرض ہے
۲۵۷	ستتر واں اعتراض..... علماء کا باہمی اختلاف اور ہمارا فرض!
۲۵۷	ضروری سمجھنے کے بعد!
۲۵۹	علماء کی نا اتفاقی
۲۵۹	اختلاف کی بنیادی وجہ
۲۶۰	فاتحہ مر بیچ کا نقصان
۲۶۱	اختلاف نسل شکایت نہیں!
۲۶۲	مولویوں کی صحبت میں رہ کر دیکھیں!
۲۶۲	آختر ہوا اعتراض..... بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں اس کی تردید!
۲۶۳	اس سوال کا جواب..... اس شہد کا جواب کہ تبلیغِ عذر سے ساقط ہوتی ہے یا نہیں؟
۲۶۴	انبیاء اس اعتراض..... تبلیغِ اسلام کا علم طرِ ایقہ!
۲۶۵	اعتراض سے پہلے رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثال
۲۶۶	اس سوال کا جواب..... مجتہدین کے اختلاف کا راز!

۲۶۷	۳۵۶	آمین میں اختلاف
۲۶۷	۳۵۷	بیاسیواں اعتراض..... دور و ابراہیمی کے افضل ہونے کا شبہ اور اس کا جواب!
۲۶۸	۳۵۸	ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۶۸	۳۵۹	تراسیواں اعتراض..... واہس بحق ہونے پر شبہ!
۲۷۰	۳۶۰	چوداسیواں اعتراض..... بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہو جانے کی تمنا کرنا غلط ہے!
۲۷۱	۳۶۱	پچاسیواں اعتراض..... بزرگوں کے طریقہ اصلاح پر شبہ کا جواب!
۲۷۲	۳۶۲	چھیاسیواں اعتراض..... طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے!
۲۷۳	۳۶۳	ستاسیواں اعتراض..... منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمر.....
۲۷۴	۳۶۴	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان!
۲۷۵	۳۶۵	اٹھاسیواں اعتراض..... تکبیل نماز کا طریقہ
۲۷۶	۳۶۶	سجدہ و رکوع میں سوچ
۲۷۶	۳۶۷	جلسہ تشہد میں سوچے
۲۷۶	۳۶۸	خیر نماز میں تصور
۲۷۷	۳۶۹	نواسیواں چندہ وصول کرنے کے مفاسد!
۲۷۷	۳۷۰	بیوی کے مال میں طیب نفس کی قید
۲۷۸	۳۷۱	چندہ و ہدیہ کے آداب
۲۷۸	۳۷۲	ایک انجمن کا واقعہ
۲۷۹	۳۷۳	حب جاہ
۲۷۹	۳۷۴	نوے واں اعتراض حق تعالیٰ بدون اتلاہ و امتحان کے جنت کیوں عطا نہیں فرماتے؟
۲۸۰	۳۷۵	امتحان و اتلاہ کی حکمت
۲۸۱	۳۷۶	عبادت میں لذت کے باوجود ثواب
۲۸۲	۳۷۷	اکانوے واں اعتراض اختلاف روایت تفرکی صورت میں لیا۔ اللہ.....
۲۸۳	۳۷۸	بانوے واں اعتراض..... محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہو سکتی!
۲۸۳	۳۷۹	حضرت کا اپنا واقعہ
۲۸۴	۳۸۰	ترانوے واں..... نفع متعدی کا علی الاطلاق نفع لازمی سے افضل ہونا درست نہیں
۲۸۵	۳۸۱	اپنی اصلاح مقدم ہے

۳۸۶	۳۸۲	اجازت کی قید کی وجہ
۳۸۶	۳۸۳	چرانوے والی اعتراض..... جبرائیل علیہ السلام کا فرعون کے.....
۳۸۷	۳۸۴	فرعون کا ایمان لانا
۳۸۷	۳۸۵	فرعون کی لعش کا محفوظ رہنا
۳۸۸	۳۸۶	بچانوے والی اعتراض خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی امر کے متعلق.....
۳۹۰	۳۸۷	چھیانوے والی اعتراض..... خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہ.....
۳۹۰	۳۸۸	ایک غلط فہمی کا ازالہ
۳۹۱	۳۸۹	ستانوے والی اعتراض..... کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا؟
۳۹۲	۳۹۰	نئے مسائل کے جوابات
۳۹۲	۳۹۱	اجتہاد فی الاصول کی بندش
۳۹۳	۳۹۲	اجتہاد فی الفروع باقی ہے
۳۹۴	۳۹۳	ٹھانوے والی علم الاعتبار نکات و لطائف کے درجہ میں ہے!
۳۹۵	۳۹۴	ہمارا طریقہ کار
۳۹۶	۳۹۵	ٹھانوے والی اعتراض..... کوسیاسی اغراض کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں!
۳۹۶	۳۹۶	لوگوں کا حال
۳۹۷	۳۹۷	امر بالمعروف کے آداب
۳۹۸	۳۹۸	سودا والی اعتراض..... حضرت منصور رحمہ اللہ کے "انالحن" کہنے کا راز!
۳۹۸	۳۹۹	ایک بزرگ کا واقعہ

## حصہ سوم

۳۰۰	۳۰۰	پہلا اعتراض..... آسمان کے وجود پر دلیل!
۳۰۰	۳۰۱	فلاسفہ کے دلائل مندرج ہیں
۳۰۱	۳۰۲	شریعت سے سائنس متصادم نہیں
۳۰۱	۳۰۳	دوسرا اعتراض..... جدید تعلیم یا نئے کاموں کا اسباب علم کو منہ حقیقی سمجھنا صحیح نہیں
۳۰۱	۳۰۴	جواب
۳۰۱	۳۰۵	ایک مثال
۳۰۲	۳۰۶	منہ حقیقی تعالیٰ ہے

۳۰۲	پاگل کا دعویٰ	۳۰۷
۳۰۳	خدا کا منکر بھی پاگل ہے	۳۰۸
۳۰۳	مسلمانوں کی حالت	۳۰۹
۳۰۴	تیسرا اعتراض ..... کثرت رائے کلیہً حق ہونے کی دلیل نہیں!	۳۱۰
۳۰۴	جواب نمبر ایک:	۳۱۱
۳۰۴	جواب نمبر دو:	۳۱۲
۳۰۵	جواب نمبر تین صرف کثرت رائے کی کوئی حقیقت نہیں	۳۱۳
۳۰۵	صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عزیمت	۳۱۴
۳۰۶	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کو جواب دیا	۳۱۵
۳۰۶	چوتھا اعتراض ..... مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا کیا خلاف عقل ہے؟	۳۱۶
۳۰۷	قربانی کی حقیقت	۳۱۷
۳۰۷	پانچواں اعتراض ..... جماعت علماء کو نکما سمجھنا صحیح نہیں!	۳۱۸
۳۰۸	چھٹا اعتراض ..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے پر شہ کا جواب	۳۱۹
۳۰۹	ساتواں اعتراض ..... کافر کو عذاب دائمی ہونے پر شہ کا جواب!	۳۲۰
۳۰۹	جواب نمبر ایک:	۳۲۱
۳۰۹	جواب نمبر دو:	۳۲۲
۳۱۰	آٹھواں اعتراض ..... احکام شریعت میں علتیں دریافت کرنا اس.....	۳۲۳
۳۱۱	نواں اعتراض ..... احکام شریعت کو مصالح دینی کی بنا پر قرار دینا خطرناک مسلک ہے!	۳۲۴
۳۱۱	وشو کا انکار	۳۲۵
۳۱۲	قربانی پر اعتراض	۳۲۶
۳۱۲	قانون عقل پر حاکم ہے	۳۲۷
۳۱۳	قربانی کا مقصد	۳۲۸
۳۱۴	دسواں اعتراض ..... کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال کے لیے.....	۳۲۹
۳۱۵	گیارواں اعتراض ..... جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا.....	۳۳۰
۳۱۵	خدا کے یہاں پرہیز کہاں ہے؟	۳۳۱
۳۱۶	قانون کی پابندی	۳۳۲

## اشرف الجواب

۳۱۶	پارلیمنٹ کی حیثیت	۴۳۳
۳۱۷	ایک زمانہ میں دو تہی	۴۳۴
۳۱۸	قصہ ساسری	۴۳۵
۳۱۸	تالیخ اور متبوع	۴۳۶
۳۱۹	شخصی حکومت	۴۳۷
۳۲۰	سر سید اور مولانا محمد حسین میں مکالمہ	۴۳۸
۳۲۰	کثرت رائے	۴۳۹
۳۲۱	شخصی سلطنت	۴۴۰
۳۲۱	حضرت بربرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ	۴۴۱
۳۲۲	مشور کا درجہ	۴۴۲
۳۲۲	مشورہ پر عمل ضروری نہیں!	۴۴۳
۳۲۳	بارہواں اعتراض..... اسن عام مکالمہ طور پر دین پر قائم ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے!	۴۴۴
۳۲۴	عقائد	۴۴۵
۳۲۵	ذہبی طاقت کی مثال	۴۴۶
۳۲۵	خوف خدا کا اثر	۴۴۷
۳۲۶	اعمال کا فضل	۴۴۸
۳۲۶	خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ	۴۴۹
۳۲۶	اعمال دین کے اثرات	۴۵۰
۳۲۸	عقائد و اعمال کی خاصیت	۴۵۱
۳۲۹	تیرہواں اعتراض..... دین میں تشنگی اور دشواری نہیں ہے!	۴۵۲
۳۲۹	ایک حکایت	۴۵۳
۳۳۰	دشواریوں کی قسمیں	۴۵۴
۳۳۱	ایک مثال	۴۵۵
۳۳۲	ایک اشکال اور اس کا جواب	۴۵۶
۳۳۳	ہندگی سے قوت آتی ہے	۴۵۷
۳۳۴	چاندنی کا مسئلہ	۴۵۸

۳۳۵	۳۵۹ علماء ہند
۳۳۶	۳۶۰ ایک واقعہ
۳۳۶	۳۶۱ ایک رئیس کا واقعہ
۳۳۷	۳۶۲ انسانی کوشش
۳۳۸	۳۶۳ چودہواں اعتراض..... ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا غلطی ہے!
۳۳۸	۳۶۴ ایک عام غلطی
۳۳۸	۳۶۵ ایک مثال
۳۳۹	۳۶۶ شریعت کے دلائل
۳۳۹	۳۶۷ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم
۳۴۰	۳۶۸ اجماع امت
۳۴۰	۳۶۹ قیاس
۳۴۰	۳۷۰ صحیح دلیل
۳۴۱	۳۷۱ پندرہواں اعتراض..... آزادی کے معنی
۳۴۲	۳۷۲ سولہواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا!
۳۴۲	۳۷۳ ساوگی
۳۴۳	۳۷۴ ساوگی کے ساتھ صفائی
۳۴۳	۳۷۵ اردو زبان کی خصوصیات
۳۴۳	۳۷۶ اصل اردو
۳۴۵	۳۷۷ سترہواں اعتراض..... ہم لوگ تمہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج نہیں ہیں!
۳۴۵	۳۷۸ اٹھارہواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم امر یکا تشریف نہیں.....
۳۴۶	۳۷۹ انیسواں اعتراض..... جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا کہ وہ.....
۳۴۷	۳۸۰ بیسواں اعتراض..... اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت چین برکفار کو گس لیے دی؟
۳۴۷	۳۸۱ اکیسواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ سو، کے بند کرینے سے ہماری قوم پر تباہی آگئی!
۳۴۸	۳۸۲ ترقی خوش معاملگی میں ہے
۳۴۸	۳۸۳ بد معاملگی کا انجام
۳۴۹	۳۸۴ پانچسواں اعتراض..... کیا تمام علوم قرآن شریف میں ہیں؟

۳۵۹	۳۸۵	ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں درست نہیں
۳۵۰	۳۸۶	تیسوواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے سے مال کم ہوتا ہے، بڑھتا کہاں؟
۳۵۱	۳۸۷	چوبیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ: پیدا لوگ مصائب میں زیادہ مبتلا رہتے ہیں!
۳۵۱	۳۸۸	اہل اللہ کا حال
۳۵۲	۳۸۹	پچیسواں اعتراض..... ناول بینی کی مسخرتیں!
۳۵۲	۳۹۰	ناول دیکھنا نقصان دہ ہے
۳۵۳	۳۹۱	چھبیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ قرآن مجید میں تکرار مضامین کیوں ہے؟
۳۵۳	۳۹۲	تکرار مضامین کی وجہ
۳۵۳	۳۹۳	انسان محتاج محض ہے
۳۵۳	۳۹۴	محتاج کی وجہ
۳۵۳	۳۹۵	اللہ تعالیٰ محتاج نہیں
۳۵۵	۳۹۶	شاہزادہ ایران کا واقعہ
۳۵۵	۳۹۷	اس حکایت کا خلاصہ
۳۵۶	۳۹۸	ستائیسواں اعتراض..... پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب!
۳۵۶	۳۹۹	جواب!:
۳۵۶	۵۰۰	عورت کا پردہ
۳۵۷	۵۰۱	پردہ تعلیم کے لیے مسخر نہیں
۳۵۷	۵۰۲	پردہ کی وجہ
۳۵۸	۵۰۳	جواب نمبر دو پردہ کی اہمیت
۳۵۹	۵۰۴	خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل
۳۵۹	۵۰۵	حضرت یوسف علیہ السلام کا قول
۳۵۹	۵۰۶	نفس کی پاکی کا دعویٰ
۳۶۰	۵۰۷	ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا پردہ
۳۶۰	۵۰۸	اٹھائیسواں اعتراض..... علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں!
۳۶۰	۵۰۹	جواب!:
۳۶۱	۵۱۰	ترقی مموہ مطلوب ہے

۴۶۲	۵۱۱	جواب دو پر غلط الزام
۴۶۲	۵۱۲	ریل کا ایک واقعہ
۴۶۳	۵۱۳	علماء بتانے والے ہیں
۴۶۳	۵۱۴	انسان کا مقصد
۴۶۴	۵۱۵	عزت و مال مطلوب ہیں
۴۶۵	۵۱۶	حکایت وزیر بھوپال
۴۶۵	۵۱۷	دین سے بے رغبتی
۴۶۶	۵۱۸	انبیواں اعتراف ..... اس تکلیف کلام اور مشہور اعتراف کا جواب کہ.....
۴۶۷	۵۱۹	انسان کی پیدائش
۴۶۷	۵۲۰	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۴۶۸	۵۲۱	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۴۶۹	۵۲۲	لوگوں کا موجودہ فرق
۴۶۹	۵۲۳	دینی امور کی دلیل
۴۷۰	۵۲۴	پل صراط پر چلنا
۴۷۰	۵۲۵	کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں
۴۷۱	۵۲۶	پل صراط کیا ہے؟
۴۷۱	۵۲۷	دنیا میں اختلاف حالات
۴۷۲	۵۲۸	ایک حدیث کی تشریح
۴۷۴	۵۲۹	شریعت پر عمل
۴۷۵	۵۳۰	عقل کی مثال
۴۷۵	۵۳۱	قانون سلطنت کیوں مانتے ہیں؟
۴۷۶	۵۳۲	کہیں عقل کو چھوڑنا بھی چاہیے
۴۷۷	۵۳۳	رسول ماننے کا ما حاصل
۴۷۷	۵۳۴	عقل کو چھوڑنا پڑتا ہے
۴۷۸	۵۳۵	محض عقل کافی نہیں
۴۷۹	۵۳۶	افراط عقل کی نتیجہ



۳۷۹	۵۳۷	قوت شہوانیہ
۳۷۹	۵۳۸	قوت غضبیہ
۳۸۰	۵۳۹	اخلاق پسندیدہ
۳۸۰	۵۴۰	شریعت کی نزاکت
۳۸۱	۵۴۱	تیسواں اعتراض..... اس رائے کا جواب کہ مولوی سب باہم
۳۸۲	۵۴۲	اختلاف کی وجہ
۳۸۳	۵۴۳	اکیسواں اعتراض..... مرد و عورت میں مساوات اور اس کا فیصلہ
۳۸۴	۵۴۴	مرد و عورت کی خلقت میں فرق
۳۸۴	۵۴۵	تعلیم یافتوں کا حال
۳۸۵	۵۴۶	انتظام کا تقاضا
۳۸۵	۵۴۷	عورتوں کو حاکم بنانا
۳۸۷	۵۴۸	تیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب ہو تو ناجی کیوں نہیں؟
۳۸۷	۵۴۹	غیر مسلم کے ناجی نہ ہونے کی وجہ

## حصہ چہارم

۳۸۹	۵۵۰	پہلا اعتراض..... ڈارون کے اس کہنے کی تردید کہ اصل انسان بندر ہے!
۳۸۹	۵۵۱	یہ مشاہدہ نہیں ہے
۳۹۰	۵۵۲	زمین کی حرکت کا مسئلہ
۳۹۰	۵۵۳	آفتاب کا طلوع و غروب ہونا
۳۹۱	۵۵۴	دوسرا اعتراض..... آدمی علم دین پڑھ کر کم عقل نہیں ہوتا ہے!
۳۹۲	۵۵۵	تیسرا اعتراض..... قرآن پڑھنے سے فائدہ ہے اگرچہ معنی نہ سمجھتا ہو!
۳۹۳	۵۵۶	ایک شبہ کا جواب
۳۹۴	۵۵۷	عام مسلمان بہتر ہے
۳۹۵	۵۵۸	قرآن کا سمجھنا
۳۹۷	۵۵۹	قرآن کا تجزیہ
۳۹۸	۵۶۰	قرآن یاد کرنے کو بے کار کہنے والے

۳۹۹	اللہ کا نور مٹ نہیں سکتا ہے	۵۶۱
۳۹۹	قرآن کی حفاظت	۵۶۲
۴۰۰	اسباب محبت	۵۶۳
۴۰۰	الفاظ قرآن کی حفاظت کا اہتمام	۵۶۴
۴۰۱	قرآن کے رسم خط کے حفاظت	۵۶۵
۴۰۲	خلیفہ اللہ کا خطاب	۵۶۶
۴۰۲	ارشاد خداوندی	۵۶۷
۴۰۲	بیدار ہو جاؤ!	۵۶۸
۴۰۳	قرآن بعد حفظ ہوتا ہے	۵۶۹
۴۰۴	تلاوت قرآن کی برکت	۵۷۰
۴۰۴	عارفین کا حال	۵۷۱
۴۰۵	قوت و اعضاء انسانی کا اقرار	۵۷۲
۴۰۵	ایک واقعہ	۵۷۳
۴۰۶	بے معنی سمجھے قرآن کا فائدہ	۵۷۴
۴۰۷	ایک دوسرا عالم بھی ہے	۵۷۵
۴۰۷	تلاوت قرآن کا ذریعہ	۵۷۶
۴۰۸	اللہ تعالیٰ کی محبت	۵۷۷
۴۰۸	ایک واقعہ	۵۷۸
۴۱۰	قرآن میں مزہ	۵۷۹
۴۱۰	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ	۵۸۰
۴۱۱	کلام اللہ پڑھنا	۵۸۱
۴۱۲	الفاظ بھی مقصود ہیں	۵۸۲
۴۱۳	دریا کی سیر	۵۸۳
۴۱۳	الفاظ قرآن	۵۸۴
۴۱۴	سیرت کے ساتھ صورت پر نظر	۵۸۵
۴۱۵	صورت کی اہمیت	۵۸۶

۲۱۵	۵۸۷	حروف مقطعات کے نکات
۲۱۶	۵۸۸	قرآن سے معنی کے ساتھ الفاظ تھی مقصود ہیں
۲۱۶	۵۸۹	چوتھا اعتراض..... فرشتوں سے سوال کہ: "میرے بندے کیا کر رہے ہیں؟"
۲۱۷	۵۹۰	پانچواں اعتراض..... لوح محفوظ کی وسعت پر شیعہ کا جواب!
۲۱۷	۵۹۱	چھٹا اعتراض..... مرجانے کے بعد عذاب قبر روح پر ہوتا ہے یا جسم پر!
۲۱۸	۵۹۲	ساتواں اعتراض..... بارہ بروج کا ثبوت قرآن مجید سے دینا صحیح نہیں!
۲۱۹	۵۹۳	آٹھواں اعتراض..... آیات کی تفسیر قواعد ہیئت پر ہے!
۲۲۰	۵۹۴	نواں اعتراض..... قرآن وحدیث کا جو مطلب علماء بیان کرتے ہیں وہی درست ہے!
۲۲۱	۵۹۵	مجتہدین کی شان
۲۲۲	۵۹۶	علماء کی پیروی
۲۲۲	۵۹۷	دسواں اعتراض..... طاعون میں اعمال کی خرابی!
۲۲۳	۵۹۸	ایک حکایت
۲۲۵	۵۹۹	گیارہواں اعتراض..... مصیبت اگر گناہوں کی وجہ سے آتی ہے تو کفار پر آنی چاہیے
۲۲۶	۶۰۰	حضرت انبیا علیہم السلام پر عذاب
۲۲۷	۶۰۱	درجات کی بلندی
۲۲۸	۶۰۲	نوشحالی و بدحالی
۲۲۹	۶۰۳	ایک واقعہ
۲۲۹	۶۰۴	عقل کا تبادلوں دولت ہے
۲۲۹	۶۰۵	امام نزاری رحمہ اللہ کا قول
۲۳۰	۶۰۶	مصیبت کیوں آتی ہے؟
۲۳۰	۶۰۷	ایک مثال
۲۳۱	۶۰۸	انبیا علیہم السلام پر مصائب
۲۳۳	۶۰۹	طاعون سے بھاگنے والا
۲۳۴	۶۱۰	نوشی بوقت موت
۲۳۵	۶۱۱	بعد موت کا حال
۲۳۵	۶۱۲	جدی نبی کا اثر

۲۳۶	مالداری کا مشاہدہ	۶۱۳
۲۳۷	صورت و حقیقت	۶۱۴
۲۳۷	مصیبت کی قسمیں	۶۱۵
۲۳۸	بچے کے ختمہ کی مثال	۶۱۶
۲۳۸	بارہواں اعتراض..... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی!	۶۱۷
۲۳۹	ادکام شریعیہ کی حکمت	۶۱۸
۲۳۹	تیرہواں اعتراض..... ترقی مطلوب کی شریعت نے تعلیم نہیں فرمائی!	۶۱۹
۲۴۰	چودہواں اعتراض..... محمد شین رحمہ اللہ پر اعتراض کا جواب!	۶۲۰
۲۴۰	پندرہواں اعتراض..... محتاج اصلاح دوسروں کی اصلاح کیا کریں گے؟	۶۲۱
۲۴۱	آج کل جیلے	۶۲۲
۲۴۱	سولہواں اعتراض..... علماء کا استیصال اسلام کا استیصال ہے!	۶۲۳
۲۴۲	حجرہ نشینوں کا جواب	۶۲۴
۲۴۲	سترہواں اعتراض..... لیڈران قوم کے طریقے شریعت کی نظر میں!	۶۲۵
۲۴۸	اٹھارہواں اعتراض..... غیر قوموں کی ترقی کارا ز کیا ہے؟	۶۲۶
۲۵۰	مسلمانوں کی حالت	۶۲۷
۲۵۰	مجلس کے آداب	۶۲۸
۲۵۱	آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور	۶۲۹
۲۵۳	کفار کا قول	۶۳۰
۲۵۳	نظافت کا قول	۶۳۱
۲۵۳	انیسواں اعتراض..... ہندو مسلم اتحاد کی خرابی!	۶۳۲
۲۵۵	غیروں کی تعریف	۶۳۳
۲۵۶	قومیت کی حفاظت	۶۳۴
۲۵۷	غیر مسلموں کی حمایت	۶۳۵
۲۵۷	فقال کی اجازت	۶۳۶
۲۵۸	اخلاق کا رسوخ	۶۳۷
۲۵۸	انصار مدینہ	۶۳۸

۲۵۹	واقعہ ہجرت سے امتحان	۶۳۹
۲۶۰	مسائل سے اجتناب	۶۴۰
۲۶۰	ایک فتویٰ	۶۴۱
۲۶۱	اسلام میں قناعت	۶۴۲
۲۶۱	تبلیغ دین کی ممانعت	۶۴۳
۲۶۲	بیسواں اعتراض..... مقصود بالذات رضائے حق ہے نہ کہ سلطنت!	۶۴۴
۲۶۳	علماء لیڈروں کے ساتھ	۶۴۵
۲۶۴	رضائے حق	۶۴۶
۲۶۵	اکیسواں اعتراض..... تجرہ بالکفار مذہبی کاموں میں حرام ہے!	۶۴۷
۲۶۶	مشتبہ صورت	۶۴۸
۲۶۷	اسلام کی تعلیم	۶۴۹
۲۶۷	بے پردگی	۶۵۰
۲۶۸	بائیسواں اعتراض..... آج کل کے مسلمانوں کا حال!	۶۵۱
۲۷۰	تیسسواں اعتراض..... جدید تعلیم یافتہ کا غلط استعمال!	۶۵۲
۲۷۱	چوبیسواں اعتراض..... ہر اتفاق نہ محمود ہے اور نہ ہر اختلاف مذموم ہے!	۶۵۳
۲۷۲	حق کا ساتھ دینا چاہیے	۶۵۴
۲۷۲	افتراق کی مثال	۶۵۵
۲۷۳	پچیسواں اعتراض..... حقیقت شریعت اعتدال کا نام ہے!	۶۵۶
۲۷۵	چھبیسواں اعتراض..... شریعت سے ناگواری کی وجہ!	۶۵۷
۲۷۶	قانون میں حکمت	۶۵۸
۲۷۸	ایک مثال	۶۵۹
۲۷۹	غیر ملکی کی ایک حکایت	۶۶۰
۲۸۰	شریعت کا اتباع	۶۶۱
۲۸۱	اتباع شریعت	۶۶۲
۲۸۲	آفتاب کی مثال	۶۶۳
۲۸۳	اتباع شریعت کا فائدہ	۶۶۴

۳۸۳	راستہ طے کرنے والوں کی ضرورت	۲۶۵
۳۸۵	ستائیسواں اعتراض..... عذاب قبر پر اعتراض کا جواب!	۲۶۶
۳۸۵	اٹھائیسواں اعتراض..... اسلام و درحقیقت اللہ کا راستہ ہے!	۲۶۷
۳۸۷	حق تعالیٰ کی امداد	۲۶۸
۳۸۷	انیسواں اعتراض..... بعض عامی کی مغفرت بدون عذاب کے بھی ہوگی!	۲۶۹
۳۸۸	تیسواں اعتراض..... مرتد بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا ہوا ہے!	۲۷۰
۳۸۹	تیسواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب کا حال!	۲۷۱
۳۹۱	تیسواں اعتراض..... جنت میں شہداء کی ارواح کی سبز پرندوں کا ہونا!	۲۷۲
۳۹۲	تیسواں اعتراض..... اہل دنیا کے آخرت کا نفع دنیا کے نفع سے بڑھا ہوا ہے!	۲۷۳
۳۹۳	دنیا کی وجہ سے آخرت چھوڑنا	۲۷۴
۳۹۳	آخرت کا نفع یقینی ہے	۲۷۵
۳۹۳	چونتیسواں اعتراض..... حسن یوسف علیہ السلام و جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق	۲۷۶
۳۹۶	پینتیسواں اعتراض..... علماء کرام میں غیر خدا سے طبعی خوف کی وجہ!	۲۷۷
۳۹۸	چھتیسواں اعتراض..... جنسٹل مینوں کا انگریزی کو علم میں شمار کرنا غلطی ہے!	۲۷۸
۵۰۱	سینتیسواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے طلب کرنا محبت الہی کا نتیجہ ہے!	۲۷۹
۵۰۳	اڑتیسواں اعتراض..... انبیاء علیہم السلام پر نزع کی کیفیت کیوں ہوتی ہے؟	۲۸۰
۵۰۵	انتالیسواں اعتراض..... تفاضل تفسیلی بیان الانبیاء بمسئوع ہے!	۲۸۱
۵۰۶	حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کی وجہ	۲۸۲
۵۰۷	حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض	۲۸۳
۵۰۸	چالیسواں اعتراض..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال بیان کرنے میں اعتدال!	۲۸۴
۵۰۹	عربی گھوڑے	۲۸۵
۵۱۰	اہل عرب کا حال	۲۸۶
۵۱۰	اکتالیسواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج فرمانے کی حکمت!	۲۸۷
۵۱۱	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ	۲۸۸
۵۱۳	حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا دبدبہ	۲۸۹
۵۱۳	بیاہیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح بدل سکتی ہے؟	۲۹۰

۵۱۵	تراہیوں اور اعتراض ..... فلسفہ اور تعلیم حضرت انبیاء علیہم السلام میں فرق!	۶۹۱
۵۱۵	علم معقول	۶۹۲
۵۱۶	تعلیم انبیاء کرام	۶۹۳
۵۱۷	چوالیسواں اعتراض ..... تو تعلیم یافتہ کو ظاہر اصلاح کے ساتھ باطن کی صفائی بھی ضروری ہے!	۶۹۴
۵۱۸	دین کے اجزاء	۶۹۵
۴۱۹	باطن کی اصلاح	۶۹۶
۵۲۱	تاویل کی خرابی	۶۹۷
۵۲۲	بائسنی بیماری کا علاج	۶۹۸
۵۲۳	پینتالیسواں اعتراض ..... ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ضروری ہے!	۶۹۹
۵۲۴	دین سے بے رغبتی	۷۰۰
۵۲۵	دین کی اہمیت	۷۰۱
۵۲۶	امراء کا حال	۷۰۲
۵۲۸	ایک لطیفہ	۷۰۳
۵۲۸	بے غیرتی کی انتہا	۷۰۴
۵۲۹	ایک صاحب کا حال	۷۰۵
۵۲۹	بعض لیڈروں کی حالت	۷۰۶
۵۳۰	نماز پر اعتراض	۷۰۷
۵۳۱	ایک بڑھیا اور شاہی باز	۷۰۸
۵۳۳	ظاہر و باطن	۷۰۹
۵۳۴	عمل کی ضرورت	۷۱۰
۵۳۵	چھیالیسواں اعتراض ..... طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا اسرار حماقت ہے!	۷۱۱
۵۳۶	صرف عقل پر اعتقاد کا انجام	۷۱۲
۵۳۷	خدا کے منکر	۷۱۳
۵۳۸	سائنسدانوں کا حال	۷۱۴
۵۴۰	ایک صاحب علم کا قصہ	۷۱۵
۵۴۱	موجد کا حال	۷۱۶

۵۴۲	سینٹا لیسواں اعتراض..... مولوی لوگوں کو کافر بتاتے ہیں!	۷۱۷
۵۴۳	اڑتالیسواں اعتراض..... عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے، جتنی شریعت خیر خواہ ہے!	۷۱۸
۵۴۳	انچاسواں اعتراض..... کفار کا مال و مالینا حلال نہیں ہے!	۷۱۹
۵۴۶	پچاسواں اعتراض..... تقدیر پر اعتقاد رکھنے سے دنیا میں راحت.....	۷۲۰
۵۴۷	ایک بزرگ کی حکایت	۷۲۱
۵۴۸	مجتون کا حال	۷۲۲
۵۴۹	اکاونواں اعتراض..... روح کو موت نہیں آتی جسم عنصری کو آتی ہے!	۷۲۳
۵۵۱	باونواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت آخرت میں کفار کے لیے!	۷۲۴
۵۵۳	کفار کے حق میں سفارش کی نوعیت	۸۲۵
۵۵۴	ترہنواں اعتراض..... مطیع اور غیر مطیع پر مصائب آنے میں فرق ہے!	۷۲۶
۵۵۶	چونواں اعتراض..... قرآن کریم میں ہر پہلو کی رعایت ہے!	۷۲۷
۵۵۷	قیامت کا حال	۷۲۹
۵۵۹	پچھنواں اعتراض..... قرآن پاک کی آیتوں میں باہم ربط ہے اور مفسرین کا بیان درست ہے!	۷۳۰
۵۵۹	چھپنواں اعتراض..... تفسیر بالرائے تحریف معنوی ہے!	۷۳۱
۵۶۱	ستاونواں اعتراض..... قرآن کریم سے متعلق شبہات دور کرنے کا طریق!	۷۳۲
۵۶۳	اٹھاونواں اعتراض..... وجود و صانع کی عقلی دلیل!	۷۳۳
۵۶۴	ایک اعتراض کا جواب	۷۳۴
۵۶۴	انٹھواں اعتراض..... عہد یشاق پر شبہ کا جواب!	۷۳۵
۵۶۶	ساتھواں اعتراض..... مال تدبیر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تقدیر سے حاصل ہوتا ہے!	۷۳۶
۵۶۶	اہل سائنس کی ایجاد	۷۳۸
۵۶۷	اکٹھواں اعتراض..... اسلام نے سادگی سکھلائی ہے!	۷۳۹
۵۶۹	مولانا سنج مراد آبادی رحمہ اللہ	۷۴۰
۵۷۰	بے تکلفی	۷۴۲
۵۷۰	ایک واقعہ	۷۴۳
۵۷۱	باستھواں اعتراض..... علماء پر ایک اعتراض کا جواب!	۷۴۴
۵۷۱	ایک بھٹیاری کا قصہ	۷۴۵



۵۷۴	۷۴۶	تریشٹھواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ شریعت قید محض ہے!
۵۷۴	۷۴۷	چونٹھواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی پر شبہات کا جواب!
۵۷۵	۷۴۸	معراج کا واقعہ
۵۷۸	۷۴۹	پینٹھواں اعتراض..... تبلیغ کے لیے چندہ جمع کرنے کا کام علماء کے سپرد نہیں کرنا چاہیے!
۵۷۹	۷۵۰	چھیٹھواں اعتراض..... نسب نامے نہ تو محض ریکارڈ ہیں اور نہ ہی مدار فخر ہیں!
۵۸۲	۷۵۱	سڑسٹھواں اعتراض..... نماز کی برکتیں اور اس کے نہ پڑھنے پر تریب!
۵۸۳	۷۵۲	نماز میں مساوات
۵۸۴	۷۵۳	جماعت کی اہمیت
۵۸۵	۷۵۴	اڑسٹھواں اعتراض..... اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت!
۵۸۷	۷۵۵	اصلاح کا طریقہ
۵۸۸	۷۵۶	اتحاد کے لیے حدود
۵۸۹	۷۵۷	اصلاح کا عمل
۵۸۹	۷۵۸	دین پر ڈاکہ
۵۹۱	۷۵۹	اتحاد غلط طور پر
۵۹۱	۷۶۰	کفار سے اتحاد
۵۹۳	۷۶۱	اکتبرواں اعتراض..... ترقی متعارف کا رد!
۵۹۳	۷۶۲	آج کل کی ترقی کا حال
۵۹۴	۷۶۳	سنہرواں اعتراض..... توجہ الی اللہ کے معنی!
۵۹۵	۷۶۴	اکتبرواں اعتراض..... پردہ کا عقلی ثبوت!
۵۹۶	۷۶۵	بہتر واں اعتراض..... کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں رغبت نہیں ہوتی؟
۵۹۹	۷۶۶	تہتر واں اعتراض..... عالم مثال اور عذاب و ثواب کا قبر کا اثبات!
۶۰۳	۷۶۷	چوتھواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ عالم آخرت محض خیالی ہی ہے!
۶۰۵	۷۶۸	چھتر واں اعتراض..... حقیقت بل صراط!
۶۰۷	۷۶۹	چھتر واں اعتراض..... عقل کے معنی اور تشریح

## فہرست مضامین اشرف الجواب ایک نظر میں

### حصہ اول

غیر مسلم اقوام کی جانب سے مسلمان و عقائد اسلام مثلاً ذبح حیوانات، مسئلہ غلامی، مسئلہ رسالت، سزائے مرتد، ذنن میت وغیرہ پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، اس حصہ میں ان سب کے جوابات ہیں۔

### حصہ دوم

شیعہ، بدعتی، غیر مقلدین اور عوم جاہل طبقہ کے اعتراضات و شبہات کو علی الترتیب جدا جدا مع جوابات جمع کر دیا ہے۔

### حصہ سوم

نو تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام اور اسلامیات پر جو شبہات ہوتے ہیں، ان کے عقلی و فطری جوابات کا مجموعہ۔

### حصہ چہارم

انسانی تخلیق، وجود صانع، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی، حیات شہداء کرام، عالم مثال، عذاب و ثواب قبر، حقیقت میل صراط پر مکمل بحث۔



## حصہ اول

اسلام پر کیے گئے شبہات و اعتراضات کے مدلل و مکمل جوابات عقل و

### نقل کی روشنی میں

از محمد ظفر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند انگریزی دور حکومت کا سب سے پہلا اسلامی مدرسہ ہے، جو چیت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی تحریک اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمہ اللہ کے مشورہ اور مقامی علماء کے تعاون سے قائم ہوا، اس نے اپنی بے سرو سامانی کے باوجود برصغیر میں جو تعلیمی اور علمی و دینی خدمت انجام دی، وہ ہندوستان کی تاریخ کا نمایاں باب ہے۔ یہاں سے ہزاروں علماء و صلحاء اور اولیاء اللہ پیدا ہوئے، جنہوں نے ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور ان کے فیوض و برکات سے لاکھوں مسلمانوں نے ایمان و ایقان کی لذت پائی اور تعلیمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت و ترویج میں امتیازی رول ادا کیا اور آج بھی دارالعلوم دیوبند اسی پرانی شاہراہ پر گامزن ہے اور کتاب و سنت کی تعلیم میں مشغول ہے۔

ممتاز فرزندگان دارالعلوم دیوبند کے انہی گئے چنے علماء میں حکم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ذات اقدس بھی ہے جو بلاشبہ اپنے دور کے امیر قافلہ تھے اور جنہوں نے ایسے تجزیاتی کارنامے انجام دیے، جن سے ملت اسلامیہ کا مستقبل روشن ہو گیا اور بدعات و خرافات کے بادل چھٹ گئے۔

آپ کی ایک ہزار سے زیادہ تصنیفات و تالیفات اور موعظہ مطبوعہ شکل میں اب بھی موجود ہیں، جن کے نور سے مسلمانوں کے دل منور ہیں اور گم گشتہ راہ لوگ اسلام کی شاہراہ پانے میں کامیاب ہیں۔ حکیم الامت حضرت علی اشرف تھانوی رحمہ اللہ نے انگریزی دور حکومت میں

ان تمام شبہات و اعتراضات پر گہری نظر رکھی جو مخالفین اسلام کی طرف سے پیدا ہو رہے تھے، یا پیش کیے جاتے رہے اور پھر ان تمام کام معقول مدلل و مکمل جواب لکھا اور اپنے مواضع میں بیان فرمایا جس کی برکت سے دشمنان اسلام کے سارے الزامات و شبہات اور اعتراضات ختم ہو گئے اور مسلمانوں کا ذہن و فکر اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں مطمئن اور پرسکون ہو گیا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ”اشرف الجواب“ نامی کتاب ہے جو اہل علم اور عوام و خواص میں کافی مقبول ہے۔ مکتبہ تھانوی دیوبند جو اس وقت دیوبند کا سب سے اہم اور مرکزی کتب خانہ ہے، اس کے مالک عزیز مکرّم و قارئ علی سلمہ کی خواہش ہوئی کہ یہ کتاب جس طرح اپنے مضامین میں ممتاز ہے، کتاب و طباعت میں بھی امتیازی شان سے لوگوں کے سامنے آئے اور اسے آفٹ سے شائع کیا جائے۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس پر میں نظر ثانی چاہتا ہوں اور ضمنی عنوانات کا اضافہ کر دیا جائے، ساتھ ہی ان آیات کا ترجمہ و احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ کر دیا جائے، جن کا ترجمہ نہیں ہو سکا ہے اور جہاں جہاں عربی کے سخت الفاظ آجائیں حاشیہ پر ان کا معنی بھی درج کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کام کو اپنے لیے سعادت سمجھ کر پوری کتاب کا اسی نقطہ نظر سے میں نے مطالعہ کیا اور جو خدمت سیردی گئی تھی، اس کی تکمیل کی سعی کی ہے۔ اب کتاب آپ کے سامنے ہے، خود مطالعہ کر کے اندازہ لگائیں، مجھے توقع ہے کہ اس سے اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ آخر میں خاکسار اپنی کتاب ”مشاہیر علماء دیوبند“ سے حضرت اقدس رحمہ اللہ کی مختصر سوانح نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔

## حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ

ولادت ۱۲۸۰ھ..... فراغت ۱۳۰۱ھ..... وفات ۱۳۶۲ھ

آپ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ یوم چہارم شنبہ کو بوقت صبح صادق اپنے وطن تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے پہلے حفظ قرآن کیا، فارسی مولانا فتح محمد تھانوی رحمہ اللہ سے پڑھی، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، مشکوٰۃ، مختصر المعانی اور ملاحسن وغیرہ سے پڑھنا شروع کیا تھا، ۱۳۰۱ھ میں باضابطہ فراغت حاصل کی، قراءت اور تجوید آپ نے قاری محمد عبداللہ مہاجرکی سے حاصل کی۔ فراغت کے بعد تدریس کے لیے کانپور تشریف لے گئے، پہلے تین چار ماہ مدرسہ فیض عام میں قیام رہا، پھر مستقل طور پر مدرسہ جامع العلوم میں منتقل ہو گئے اور عرصہ تک اس مدرسہ میں رہ کر درس و تدریس، افتاء اور وعظ کی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۳۱۵ھ میں سب کچھ چھوڑ کر کانپور سے تھانہ بھون آ گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرکی سے بیعت تھے اور خلافت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے، چنانچہ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ بیعت وارشاد کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ لاکھوں علماء، صلحاء، مشائخ اور خاص و عوام آپ کے حلقہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ۷۴ مجاز بیعت ہوئے، ۵۹ مجاز صحبت قرار پائے ایک ہزار سے زیادہ تصانیف اور آپ کے مواعظ شائع ہوئے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بعد الحمد والصلوة حقیر، ناچیز سر اپنا تقصیر علی محمد لاہوری مظہر مدعا ہے کہ حضرت اقدس سیدنا و مرشدنا حکیم الامت، مجدد الملت، جامع شریعت و طریقت مولانا مفتدانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے اسلام پر اغیار کے اعتراضات اور خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اعتراضات کے جوابات اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں دیے ہیں، چنانچہ حصہ اول میں جو جناب کے سامنے موجود ہے، کفار کے بیس اہم اعتراضات کے دندان شکن جوابات ہیں، ان سب کو مع حوالہ صفحات و اسماء مواعظ و ملفوظات ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور سہولت کے لیے اور ضرورت کے وقت حوالہ دیکھنے کے لیے ان مواعظ و ملفوظات کی فہرست ذیل میں نقل کرتا ہوں:

روح الحج والعمرة، ملفوظات، مجازلات معدلت ملحقہ دعوات عبدیت حصہ سوم، ازالة الغفلة، شعب الایمان، بحاسن اسلام، الرفع والوضع، تقلیل الکلام، الحمد والقیود، افناء المحبوب۔  
اس کے دوسرے حصہ میں رسومات و بدعات کی تردید اور شبہات کا حل، کثیر الوقوع اغلاط کی تردید اور اس کے تیسرے حصہ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ان شکوک و شبہات و اعتراضات کا جواب ہے جو سائنس جدید کی رو سے پیش آتے ہیں۔



## پہلا اعتراض..... کیا اسلام بزور شمشیر پھیلا؟

جواب:

اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے تو ان کے قلوب (دلوں) پر تلوار کا اثر کیسے ہو جاتا ہے؟ اور دل پر اثر ہو جانے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے بالکل مطابق ہو گئے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کا واقعہ

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ چوری ہو گئی تھی۔ ایک یہودی کے پاس ملی، آپ رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر پہچان لیا اور فرمایا کہ یہ میری زرہ ہے، یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ۔ اللہ اکبر! کس قدر آپ نے اسلامی تعلیم کا نمونہ اپنے کو بنالیا تھا کہ جہاں رعایا کو زبان سے آزاد کیا، عمل سے بھی دکھلایا کہ ایک یہودی رعایا کی یہ جرأت ہے کہ وہ صاحب سلطنت، خلیفۃ المسلمین سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ! حالانکہ یہود خود ایک ذلیل قوم تھی۔ جب سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرکشی کی تھی، اس وقت سے برابر ذلت و خواری ہی کی حالت میں رہے اور اب بھی جہاں میں ذلیل و خواری ہیں۔ سچ کہا ہے:

عزیزے کہ از در گہش سرتافت

بہر در کہ شد بیق عزت نیافت

”جس عزیز نے بھی اس کے آستانے سے منہ موڑا، وہ جس دروازہ پر گیا تمام عزتوں سے منہ موڑا۔“  
پس ایک تو اس کی قومی ذلت اور پھر یہ کہ آپ کی قلمرو (حکومت) کا رہنے والا اگر اس پر بھی یہ جرأت ہے، صاحبو! یہ ہے حقیقی آزادی نہ وہ جو آج کل اختیار کی گئی ہے کہ دین سے نکل گئے، خدا

کو چھوٹا، رسول کو چھوٹا، آزادی یہ ہے کہ کسی صاحب حق کی زبان بند نہ کریں، ظلم نہ کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ ایک یہودی کا کچھ قرش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تھا۔ ایک روز اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ بے باکانہ الفاظ کہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کو دھمکایا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان لصاحب الحق مقالا“۔ ”یعنی صاحب حق کو بولنے کا موقع ہوتا ہے۔“ تو آزادی یہ ہے کہ حکومت میں رعایا کو اتنا آزاد کریں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے اتنا آزاد بنا دیا تھا کہ اس یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ یا ناپاش کرو، چنانچہ حضرت شریح رضی اللہ عنہ کے یہاں جو اس وقت قاضی تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وقت سے اسی عہدہء جلیلہ پر چلے آ رہے تھے، جا کر ناپاش دانزکی، دونوں مدنی اور مدعا علیہ بن کرساوات کے ساتھ عدالت میں گئے۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے موافق قاعدہ شریعت کے پوچھنا شروع کیا، یہ نہیں کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے آنے سے ہلچل پڑ جائے، غرض نہایت اطمینان سے اس یہودی سے پوچھا کہ کیا زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے؟ اس نے انکار کیا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ گواہ لائے۔

### قاضی کا فیصلہ

اللہ اکبر! ذرا آزادی دیکھئے کہ ایک قاضی سلطنت خود امیر المؤمنین سے گواہ طلب کر رہے ہیں اور امیر المؤمنین بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جن پر احتمال دعویٰ خلاف واقعہ کا جو ہی نہیں سکتا تھا، مگر یہ محض ضابطہ کی بدولت تھا، واللہ جن لوگوں نے تمدن سیکھا، اسلام سیکھا اور پھر بھی اسلام کے برابر عمل نہ کر سکے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گواہ لائے، ایک امام حسن رضی اللہ عنہ (جو آپ کے صاحبزادے تھے) ایک اپنا آزاد کردہ غلام جن کا نام قنبر تھا۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ حضرت شریح رضی اللہ عنہ بیٹے کی گواہی کے حق میں جائز نہ سمجھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز تھی، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کر دیا۔

آج اختلاف پر علماء کو برا بھلا کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ اختلاف پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے، مگر آج کل کی طرح علماء کو برا بھلا کہنا نہ تھا۔ ایک دوسرے کی تکفیر و تہلیل نہ کرتے تھے۔ آج کل سب و شتم (گالی گلوچ) کی زیادہ تربیہ علاوہ نفسانیت کے ایک یہ بھی ہے کہ ہر جگہ اصغر کی عملداری ہے، اکابر (بڑے) خود آپس میں ملتے نہیں کہ اصل بات کا پتہ چل سکے جس طرح چھوٹے کہہ دیتے ہیں، اسی



کو صحیح سمجھا جاتا ہے، یہ نہیں کرتے کہ راوی (بیان کرنے والے) کو ڈانٹ دیں۔  
 غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مذہب تھا کہ بیٹے کی گواہی معتبر ہے اور حضرت شریح رضی اللہ  
 عنہ اس کو مانتے نہیں تھے، حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور حضرت امام  
 رضی اللہ عنہ کی گواہی نہیں مانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ غلام چونکہ آزاد ہو چکا ہے، اس  
 کی گواہی تو مقبول ہے، مگر بجائے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی رضی  
 اللہ عنہ نے کہا کہ اور تو گواہ کوئی نہیں ہے، آخر حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ  
 کا دعویٰ خارج کر دیا۔

### قاضی کے فیصلہ پر مسرت

اگر آج کل کے معتقد ہوتے تو حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے لڑتے مرتے، لیکن حضرت شریح  
 رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی طرح مذہب فروش نہ تھے، وہ مذہب کے ہر امر پر  
 جان فدا کرتے تھے، اگر حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ  
 حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے ہیں، لیکن چونکہ ضابطہ شریعت اجازت نہیں دیتا تھا، اس لیے آپ نے  
 اپنے عقیدت پر کارروائی نہیں کی۔

### یہودی کا قبول اسلام

آخر باہر آ کر یہودی نے دیکھا کہ ان پر تو ذرا بھی ناگواری کا اثر ظاہر نہ ہوا ہوا جو بدیہ آپ اسد اللہ ہیں  
 (اللہ کے شیر) برسر حکومت ہیں، تو کس چیز نے ان کو برہم نہیں کیا؟ فوراً کر کے کہا کہ حقیقت میں اب مجھے  
 معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے، یہ اثر ہی کا ہے، لیکن! یہ زورہ آپ ہی کی ہے اور میں مسلمان ہوتا  
 ہوں اور کہتا ہوں کہ "اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبده ورسوله" اس کے بعد آپ  
 نے فرمایا کہ میں نے یہ زورہ تجھی کو دی، غرض وہ یہودی مسلمان ہو گیا اور آپ ہی کے ساتھ رہا، حتیٰ کہ  
 ایک اسلامی لڑائی میں شہید ہو گیا، اب بتائیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کموار سر پر کچھ کر مسلمان ہوا یا اس  
 کو نیام میں رکھیے کر؟  
 (وعظاز الہ الغلیہ ص: ۴)

### اہل یورپ کا خیال اور اس کی تردید

اہل یورپ کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے زور سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور اس  
 کے لیے دہل میں وہ واقعات جنگ پیش کرتے ہیں کہ سلاطین نے کس قدر خونریزیوں کی ہیں،

میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا ہے کہ جنگ مطلقاً تمدن (شائستگی) کے خلاف ہے۔ آج متمدن (اپنے کو مہذب کہنے والی) قومیں بھی ضرورت کے موقع پر جنگ کرتی ہیں، معلوم ہوا کہ بروقت ضروری لڑائی کرنا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جائز ہے، بس اب میں ظالم سلاطین کی تو طرفداری نہیں کرتا، البتہ خلفائے راشدین کی بابت میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انہوں نے بنا، ضعیف (کمزور بنیاد) پر کبھی جنگ نہیں کی، کسی قومی سبب کی بنا پر ہی وہ لڑائی کرتے تھے اور لڑائی کے متعلق اسلامی قانون اگر مخالفین کی نظر سے گزرتا تو کبھی یہ لفظ زبان سے نہ نکالتے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے، تو انین جنگ اسلام نے بہت سے بتلایے ہیں، مگر میں اس وقت ایک مختصر قانون بیان کرتا ہوں۔

### قانون اسلام

اسلام کا مسئلہ ہے اور خلفائے راشدین کا اس پر ہمیشہ عمل در آدرہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقابلے کے وقت تمہارے باپ کو، تمہارے بیٹے کو اور تمہارے بھائی کو، غرض سب متعلقین کو قتل کر ڈالے اور عرصہ تک خور بزی کرتا رہے، پھر کسی وقت قابو آ جاوے اور تم اس سے بدلہ لینا چاہو اور وہ زبان سے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہہ دے تو حکم ہوتا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو، اگر چہ تم کو کامل یقین ہو کہ اس نے جان کے خوف سے، ہی کہا ہے اور دل سے اسلام نہیں لایا ہے، تب بھی فوراً اس سے تلوار اٹھا لو، ورنہ اگر تم نے اس کو مارا تو تم جہنم میں جاؤ گے، اگر چہ یہ بھی خطرہ ہو کہ یہ اس وقت جان بچا کر پھرتے قتل کرے گا، جو کچھ چاہے ہو، اب اس کا قتل کرنا ہرگز جائز نہیں، تو جس مذہب نے اتنی بڑی سیر (ذہال) دوسروں کے ہاتھوں میں دے دی ہے، اب اس کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ بزور شمشیر پھیلا ہے؟ یقین جانئے اس قانون پر ہمارے سلف صالحین پوری طرح عمل کرتے تھے۔

### ہرمزان کا واقعہ

ہرمزان نے مسلمانوں کو بہت سی ایذائیں پہنچائی تھیں، آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گرفتار کر کے لایا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اسلام پیش کیا، مگر اس نے نہ مانا، آپ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا، اس نے ایک چال چلی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا آپ مجھے قتل تو کرتے ہی ہیں، تھوڑا پانی منگا دیں تو آپ نے پانی منگا یا جب پانی منگا یا تو اس نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ پانی نہ پنی سلوں اور جلاد مجھ پر تلوار چلا دے، آپ نے فرمایا نہیں جب

تک تم یہ پانی نہ پی چکو گے اس وقت تک قتل نہ کیے جاؤ گے، یہ سن کر اس نے پانی فوراً زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ اب مجھ کو قتل نہیں کر سکتے کیونکہ اس پانی کا پینا ممکن نہیں اور اس کے پینے تک مجھے کو امن تھا، آپ نے اس کو آزاد کر دیا، ہرمزان کو اپنی ذات پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فرمان پر کہ تم جب تک پانی نہ پی چکو قتل نہ کیے جاؤ گے، ہرگز قتل نہ کریں گے، یہ واقعہ دیکھ کر ہرمزان فوراً اسلام لے آیا کہ واقعی یہ دین برحق ہے، اس میں مخالف کے ساتھ بھی اتنا اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے اور اس پر خلفائے نے اس طرح پابندی کی ہے کہ ان کی نظیر آج تک کوئی دکھانی نہیں سکتا، ہاں پچھلے بادشاہوں کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر انہوں نے ظلم کیا ہے، جھگڑتیں گے، ہمارے اسلاف نے ان کو انین پر پورا عمل کیا اور ان کو ترقی و عروج بھی ایسا نصیب ہوا جو کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا، صحابہ رضی اللہ عنہم کے طرز کا دوسری قوموں پر ایسا اثر تھا کہ بہت سے لوگ جاسوس بن کر آئے مگر ان حضرات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔

(وعظہ شعب الایمان ص: ۱۱۴)

## ہندوستان کی مثال

لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے، واللہ بالکل غلط ہے، اگر مسلمان لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان کیا کرتے تو آج ہندوستان میں جہاں اسلامی حکومت چھ سو برس تک رہی ہے، ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کا جواب اس اعتراض کے متعلق یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، تو یہ بتلاؤ کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے تھے؟ کیونکہ تلوار خود سے تو چل نہیں سکتی تھی جن لوگوں نے سب سے پہلے تلوار چلائی ہے۔ یقیناً وہ تلوار سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، کیونکہ ان سے پہلے تلوار چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں، تو ثابت ہو گیا کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔

## مدینہ میں اسلام

تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاد مدینہ منورہ میں آ کر شروع ہوا اور اہل مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے، آخر ان کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا؟ اور مکہ معظمہ میں جو کئی سو آدمی مسلمان ہوئے اور کفار کے ہاتھوں سے اذیتیں برداشت کرتے رہے، وہ کس تلوار سے مسلمان ہوئے تھے؟

## حبشہ میں اسلام

پھر ہجرت مدینہ منورہ سے پہلے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ہے اور وہاں کفار قریش کے ساتھ مسلمانوں کا مناظرہ ہوا اور نجاشی شاہ حبشہ نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زبان سے قرآن شریف سن کر بے تحاشہ روٹنا شروع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن شریف کی حقانیت کی گواہی دی اور اسلام قبول کیا، اس پر کس کی تلوار چلی تھی؟ اسی طرح صد ہا واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ اسلام کھس اپنی حقانیت سے پھیلا ہے۔

خصوصاً عرب کی قوم جو جنگ جوئی میں شہرہ آفاق ہے، وہ کبھی اور کسی طرح تلوار کے خوف سے اسلام کو قبول نہ کر سکتی تھی، ان کے نزدیک لڑنا مرنا معمولی بات تھی، مگر دُوب کر دین کا بدن سخت عیب ہے، وہ ہرگز تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لا سکتے تھے اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر جہاد کس لیے مشروع ہوا؟ تو خواب کبھی لو کہ جہاد حفاظت اسلام کے لیے مشروع ہوا نہ کہ اشاعت اسلام کے لیے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے، لوگ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔

## جہاد کا منشا

جہاد کی مثال آپریشن جیسی ہے، کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک متعدی اور ایک غیر متعدی جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے، اس کو دواؤں کے ذریعے دیا جاتا ہے، کوئی مرہم لگا دیا یا اس کی مالش کر دی، وہ دب گیا اور متعدی مادہ کے لیے آپریشن کیا جاتا ہے، اس کو چیر کر نکال دیا جاتا ہے، اسی طرح دشمنان اسلام دو طرح کے ہیں، بعض تو جن سے صلح کر لینا مناسب ہوتی ہے، وہ صلح کر کے مسلمانوں کو سنانا چھوڑ دیتے ہیں اور ان سے تو صلح و مصالحت کرنی جاتی ہے، بعض ایسے موذی اور مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، یہ مادہ متعدی ہے، ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے، اسی کا نام جہاد ہے۔ پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

لوگ عالمگیر رحمہ اللہ کو بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا ہے، یہ بالکل غلط ہے، عالمگیر رحمہ اللہ پابند شرع تھے، بارہ ہزار تین احادیث کے حافظ تھے، قرآن شریف لکھ کر ہدیہ کر کے گزارا کرتے تھے، اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے، ان کے سامنے ”لا اکرہ فی الدین“ کا حکم موجود تھا، وہ اس کے خلاف کیونکر کر سکتے تھے؟ یہ تو پہلے کے واقعات

تھے، ان سے قطع نظر کر کے میں پوچھتا ہوں کہ اچھا! اس وقت جو لوگ ہندوستان میں اسلام لاتے ہیں، وہ کیوں مسلمان ہوتے ہیں؟ ان پر کون سی تلوار کا زور ہے؟ یقیناً اس وقت کسی طرح بھی ان پر زور نہیں ہے، بلکہ ہر طرح آزادی ہے، نہ ہم ان کو کسی طرح کی طمع دلا سکتے ہیں، مسلمانوں کے پاس اتنا مال ہی نہیں جو وہ طمع دلا کر کسی کو مسلمان کریں، بلکہ یہ حالت ہے کہ آج کوئی نو مسلم اسلام لایا تو کل کو اس سے بھی دینی کام میں چندہ مانگتے ہیں اور اگر کوئی اسلام لاتے وقت ہم سے روپیہ کی درخواست کرے تو ہم صاف کہتے ہیں کہ تم اپنی نجات کے واسطے اسلام لاتے ہو تو لاؤ، ورنہ ہم کو لاؤ گے ساتھ مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جو دولت ہم تم کو دے رہے ہیں، اس کے مقابلہ میں اگر تم خود ہم کو نذرانہ دو تو بہت بجا ہے، لیکن باوجود اس آزادی اور استغناء کے پھر بھی بہت سے لوگ اسلام لاتے ہیں اور لارے ہیں اور اسلام لاتے ہی ان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا پھڑپھڑا ہوا محبوب ان کو مل گیا، ایک ہندو اسلام لانے کے بعد خدا کی محبت اور اس کی یاد میں اس قدر روتا تھا کہ جس کا بیان نہیں اور کہتا تھا کہ مجھ کو تو اب معلوم ہوا کہ خدا کس کو کہتے ہیں؟ غرض اس کی عجیب حالت تھی۔

(وعظ محاسن اسلام ص: ۸۷)

دوسرا اعتراض..... کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے؟

جواب:

اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں، یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں، گو قادر ضرور ہیں، ورنہ تعذیب کافر پر خدا کا مضطر ہونا لازم آئے گا اور اضطرار منافی وجوب ہے اور بدون ایمان و اسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن شریف میں جا بجا مذکور ہے، چنانچہ ایک آیت تو وہی ہے: "إِنَّ اللَّهَ لَا يُغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ"۔ "بے شک اللہ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشتے گا۔" مگر شاید اس پر کوئی شبہ کرے کہ یہاں تو صرف مشرک کا ذکر ہے، کفر کا ذکر ہی نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں، بلکہ موصد ہیں، مگر اسلام سے اباہ کرتے ہیں، ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے؟ تو اس لیے دوسری جگہ مذکور ہے۔

"إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ"

"بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں

گے یہ لوگ دنیا میں بدترین ہیں۔“

اس میں کافر کو اہل کتاب اور مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لیے خُلُودِ فِسیٰ اَلْجَہَنَّمَ مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہوگی اور یہ شبہ نہیں رہا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے جس کے معنی مکث طویل (یعنی زیادہ دنوں رہنے) کے آتے ہیں اور اس کے لیے دوام لازم نہیں، جواب یہ ہے کہ یہ دوام (بیشکی) خلود کے منافی بھی نہیں، پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے اور یہاں خلود بمعنی دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے، وہ یہ مشرکین کے لیے خلود بمعنی دوام ہے، تو کافر کے لیے بھی دوام ہی ہوگا، ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا اور یہ ممتنع (ناممکن، دشوار) ہے، علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لیے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

”وَالَّذِينَ كَفَرُوا اقْتَضَعَتْ لَهُمْ نِيَابَ مِنْ نَارٍ اِلَى قَوْلِهِ تَعَالَى كَلِمًا اَرَادُوا اَنْ يَنْخَرُجُوا

مِنْهَا مِنْ عَمٍ اَعْبُدُوا فِيهَا“

اور ارشاد فرماتے ہیں: ”وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ لَمْ يَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ“۔

پس کافر کا بھی ہمیشہ کے لیے معذب ہونا صاف طور سے ثابت ہو گیا جس سے اس کی عدم مغفرت بھی ثابت ہوگی اور یہاں سے ایک اشکال کے مندرج ہونے پر تشبیہ کیے دیتا ہوں، وہ یہ کہ خلود کے معنی مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہوگی جو قاتل عمد کے بارے میں وارد ہے۔

”من يقتل مؤمناً متعمداً فجزأه جہنم خالداً فيها“۔

کہ اس سے قاتل عمد کی توبہ کا قبول ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس میں خلود بدون قید و دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو سلتزم نہیں، نہ کوئی قرینہ یہاں ارادۃ دوام کے مرتجح ہے، اس کے لیے مدلول میت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہوگا، مگر کسی وقت نجات ہو جائے گی، گو مدت دراز ہی کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہئے، اس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لیے توبہ نہیں، مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک قبول ہے، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین و تبع تابعین، ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے جب کہ قاعدہ شریعہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجماع متاخر اختلاف مقدم کو رافع ہوتا ہے، لہذا اب مسئلہ اجماعی ہے، مگر کفار مشرکین کے لیے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے، اس لیے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں، کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابودہ سے جس کا کبھی انقطاع نہ ہوگا اور

ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو اس کے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو، دونوں کے لیے سزا ابد الابد جہنم ہے جب ترک اسلام کی یہ سزا ہے، تو اس سے اسلام کی نوعیت و نشانی اور اس کی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا۔ (ایضاً ص: ۱۷)

### تیسرا اعتراض..... اللہ تعالیٰ بغیر زبان کے کیسے کلام فرماتا ہے؟

ایک ہندو جو اپنے گروہ میں عابد کہلاتا ہے، میرے پاس اپنے ایک پنڈت کے ساتھ آیا اور یہ سوال کیا کہ آپ لوگ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہتے ہیں، حالانکہ کلام بے زبان کے نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ کی زبان سے نہیں، پھر اس نے کلام کیسے کیا؟ میں نے جواب دیا کہ ہم کو کلام کے لیے زبان کی ضرورت ہے، لیکن خود زبان کو کلام کرنے کے لیے زبان کی ضرورت نہیں، وہ خود اپنی ذات سے کلام کرتی ہے، اسی طرح ہم کان سے سنتے ہیں، لیکن خود کان اپنی ذات سے سنتا ہے، اس کو کسی اور آلہ کی ضرورت نہیں، ہم کو دیکھنے کے لیے آنکھ کی ضرورت نہیں، وہ اپنی ذات سے دیکھتی ہے، تو جب زبان اس پر قادر رہے کہ بے زبان کلام کرے، تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کو کلام کے لیے کسی آلہ کی ضرورت نہ ہو تو کیا تعجب ہے؟ صفت کلام خود اس کی ذات میں موجود ہے، کلام خود اس کی ذات سے بلا زبان صادر ہوتا ہے۔

وہ ہندو اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اپنے ہمراہی سے کہا کہ دیکھو اس کو علم کہتے ہیں، پھر حضرت والا نے فرمایا کہ اس سے پہلے کبھی میرے ذہن میں یہ جواب نہ تھا، الحمد للہ کہ اسی وقت منجانب اللہ یہ جواب میرے ذہن میں آیا۔ (مجاہدات معدلت لمحققہ و عوات عبدیت حصہ سوم)

### چوتھا اعتراض..... شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا مقدمہ تو مسلم ہے کہ سزا جنایت (جرم) کے مناسب ہونی چاہئے، مگر کیا مناسب کے معنی یہ ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو؟ اگر یہی بات ہے تو چاہئے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو کر آئیں، تو حاکم ڈاکوؤں کو دو گھنٹہ کی سزا دے دے، اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف و رمانیں گے؟ اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے؟ ہرگز نہیں! اس سے معلوم ہوا کہ سزا اور جنایت میں مناسبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب و مساوی (برابر) ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو، اب تم خود فیصلہ کر لو، شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے، وہ

شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں؟ اور یہ جرم شدید و سخت ہے یا نہیں؟ کیا آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے، مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابد الابد جہنم ہو، میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لیے پیدا ہوا کہ آپ نے صرف فعل کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے، حالانکہ سزا و جزا کا مادہ مجتہدین اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے، بلکہ نیت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے۔

## ایک مثال

چنانچہ اگر ایک شخص دھوکے سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا گو صورت گناہ موجود ہے، کیونکہ نیت نہ تھی، اگر ایک شخص شراب پینے کے لیے دوکان پر جائے اور دکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دے دے، جسے یہ شراب سمجھ کر پیئے تو اس کو گناہ ہوگا، کیونکہ نیت تو اس کی شراب پینے ہی کی تھی، اس لیے فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جماعت (صحبت) کر لے، مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے، تو اس کو گناہ ہوگا، اسی طرح جماعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے، یعنی بیوی سے جماعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے جماعت کر رہا ہوں اور اس کی صورت ذہن میں حاضر ہو، اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجائے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہم بستر ہوا کہ یہی میری بیوی ہے، تو اس کا گناہ نہ ہوگا اور یہ بڑی زنا میں شمار نہ ہوگی، بلکہ وہی بالشیہ ہوگی، جس سے ثبوت نسب ہی ہو جاتا ہے اور عدت بھی لازم ہوتی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں گو کفر کا فرقتناہی ہے، مگر اس کی یہ نیت تھی کہ اگر زندہ رہا تو ابد الابد (ہمیشہ ہمیشہ) اسی حالت میں رہے گا، اس لیے اپنی نیت کے موافق اس کو ابد الابد جہنم کا عذاب ہوگا، اسی طرح مسلمان کا اسلام متناہی ہے، مگر اس کی نسبت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں گا تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا، اس لیے ابد الابد تک ثواب جنت میں ملے گا۔

دوسرا ایک دقیق (باریک) جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الہیہ کی تقویت ہے اور حقوق الہیہ غیر متناہی ہیں، تو ان کی تقویت کی سزا بھی غیر متناہی ہونی چاہیے اور اسلام میں حقوق الہیہ کی رعایت ہے اور وہ غیر متناہی ہیں، تو ان کی رعایت کا بدلہ بھی غیر متناہی ہونا چاہئے، الحمد للہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہو گیا۔



## پانچواں اعتراض..... کیا مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟

جواب:

یہ ہے کہ ہم کعبہ کی پرستش نہیں کرتے، بلکہ عبادات خدا کی کرتے ہیں اور صرف منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں اور اس کے لیے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں، ایک یہ کہ ہم خود اس کی معبودیت کی نفی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی عابد اپنے معبود کی معبودیت کی نفی نہیں کیا کرتا، دوسرے یہ نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں کعبہ کا خیال بھی نہ آئے، مگر کعبہ کی طرف منہ رہے تو نماز درست ہے، چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ مسجد میں اگر نماز شروع کر دیتے ہیں اور کعبہ کا خیال تک ان کو کچھ نہیں آتا، پھر بھی ان کی نماز درست ہے، تیسرے یہ کہ اگر کسی وقت کعبہ نہ رہے جب بھی نماز فرض رہے گی اور اس کی طرف منہ کیا جائے گا جہاں کعبہ موجود ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان پتھر اور اینٹ کو نہیں پوجتے، ورنہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہو جاتی، چوتھے یہ کہ اگر کوئی شخص سقف کعبہ پر نماز پڑھے، تو اس کی نماز درست ہے، اگر کعبہ مسلمانوں کا معبود ہوتا ہے اس کے اوپر چڑھ کر نماز صحیح نہ ہوتی، کیونکہ اب اس کے سامنے نہیں ہے، دوسرے معبود (خدا) کے اوپر چڑھنا گستاخی ہے، اس حالت میں کسی طرح نماز درست نہ ہونا چاہیے تھی، مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کعبہ کی چھت پر بھی نماز صحیح ہے، تو کیا معبود کے اوپر چڑھا کرتے ہیں ہاں معترضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہوگا کہ وہ گانے اور تیل کو دیتا اور معبود بھی سمجھتے ہیں، پھر ان کے اوپر سواری بھی کرتے ہیں، مگر اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔

(ایضاً)

## کعبہ کی طرف منہ کرنے کا راز

اب آپ کو بتلاتا ہوں کہ استقبال قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دلجمعی اور یکسوئی ہے، بدوں دلجمعی اور یکسوئی کے عبادت کی صورت ہی صورت ہوتی ہے، روح نہیں پائی جاتی اور یہ ایسی بات ہے جس کو تمام اہل ادیان تسلیم کرتے ہیں، اب سمجھئے کہ اجتماع خواطر میں اجتماع ظاہر کو بہت بڑا دخل ہے، اس لیے نماز میں سکون اعضا، کا امر ہے التفات و عیبت سے ممانعت ہے، صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے، کیونکہ صف کے میزھا کرنے سے قلب پریشان ہوتا ہے، عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا کیونکہ ان کو دلجمعی و یکسوئی بہت کم نصیب ہے، مگر جن کو نماز میں دلجمعی کی دولت

نصیب ہے، ان سے پوچھئے کہ صرف میزھی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے؟ صوفیہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ صف غیر متکلم سے قلب کو بجان و پریشانی ہوتی ہے، اس دل جمعی کے لیے سجدہ گاہ پر نظر جمانے کی تاکید ہے، کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، بس نماز میں اگر ایک خاص جہت مقرر نہ ہوتی تو کوئی کسی طرف منہ کرتا، کوئی کسی طرف منہ کرتا، اس اختلاف جہات و تباہن بیانات سے تفرق قلب ہوتا، لہذا یکسوئی کے لیے ایک خاص جہت مقرر کر دی گئی۔

### کعبہ کی خصوصیت

رہا یہ کہ کعبہ ہی کی جہت کیوں مقرر ہوئی؟ اور جہت کیوں نہیں ہوئی؟ اس سوال کا کسی کو حق نہیں، کیونکہ یہ سوال دوسری جہت کو بھی ہو سکتا ہے کہ یہی کیوں ہوئی، دوسری کیوں نہ ہوئی؟ دیکھئے عدالت وقت مقرر کرتی ہے کہ کچھری کا وقت فلاں وقت تک ہے، تو آپ یہ سوال تو کر سکتے ہیں کہ وقت مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جس کا جواب یہ دیا جائے گا تاکہ کام کرنے والے سب کے سب معاً (ساتھ) حاضر ہو سکیں اور رعایا اہل حاجت کو وقت مقرر ہونے سے اطمینان ہو جائے کہ عدالت کا یہ وقت ہے، تو اس کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے دوسرے کام کر سکیں، اگر وقت مقرر نہ ہو تو ہر شخص کو تمام دن عدالت میں ہی رہنا پڑے کہ نہ معلوم کس وقت حاکم آجائے؟ باقی اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ گورنمنٹ نے دس بجے سے چار بجے ہی تک کا وقت کیوں مقرر کیا؟ کوئی اور وقت مقرر کر دیا ہوتا، کیونکہ وہ کوئی بھی وقت مقرر کرتی یہ سوال تو کبھی ختم نہ ہو سکتا تھا، علیٰ ہذا ہم کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جہت کعبہ ہی کو استقبال کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا؟ ہاں! ہم نے اس کا راز بتلا دیا کہ خاص جہت کے تعین میں کیا مصلحت ہے، یہ جواب تو ضابطہ کا ہے اور طالب کے لیے یہ جواب ہے کہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کی یعنی حق تعالیٰ کی توجہ کس طرف زیادہ ہے، جس طرف ان کی توجہ زیادہ تھی، اسی کو جہت مسلّمہ مقرر فرمایا۔

### کعبہ پر تجلیات الہیہ

رہا یہ کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی توجہ کعبہ کی طرف زیادہ ہے؟ سو جن کے آنسو ہیں، وہ جانتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیات الہیہ بہت زیادہ ہیں اور توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیات روح کعبہ اور حقیقت کعبہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ کعبہ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہو جاتی ہے، کیونکہ اس وقت کو صورت کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقت کعبہ یعنی تجلی الہیہ تو سامنے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اصل تجلی الہی کا استقبال کرتے ہیں، کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے، مگر چوں کہ

تجلی الہی کا احساس ہر شخص کو نہیں ہوتا، اس لیے حق تعالیٰ نے اس خاص بقد کے حد متفرق فرما دیں، جس پر ان کی تجلی دوسرے مکاناتوں سے زیادہ ہے، پس یہ عمارت محض اس تجلی اعظم کی جگہ دریافت کرنے کے لیے ہے، ورنہ خود بالذات نہیں، چنانچہ انہدام عمارت کے بعد نماز کا موقوف نہ ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا اس کی دلیل ہے، فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے، اس لیے وہ فرماتے ہیں ہیں کہ قبلہ رخ وہ ہوا ہے جو کعبہ کی محاذات میں آسمان تک اور اس کے نیچے زمین کے اسفل طبقات تک ہے، لیکن چونکہ عمارت کعبہ اور اس کی جگہ کی تجلی الہی سے تلبیس ہے، اس تلبیس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آگئی۔

(ایضاً ص: ۶۶)

## چھٹا اعتراض..... حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ!

جواب:

یہ ہے کہ تقبیل حجر عظمت سے نہیں، بلکہ محبت سے ہے، جیسے بیوی بچوں کا بوسہ لیا کرتے ہیں، اگر بوسہ دینا عظمت کی دلیل ہے، تو لازم آئے گا کہ ہر شخص اپنی بیوی کی عبادت کرتا ہے اور اس کا لغو ہونا بدیہی ہے، معلوم ہوا کہ تقبیل (بوسہ دینا) عبادت و تعظیم کو مستزیم نہیں، بلکہ کبھی محبت سے بھی تقبیل ہوا کرتا ہے، رہا یہ سوال کہ تم حجر اسود سے محبت کیوں کرتے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میرے گھر کی بات ہے، اس کے متعلق مخالف کو سوال کرنے کا حق نہیں، دیکھئے اگر کوئی شخص عدالت میں یہ مقدمہ دائر کر دے کہ فلاں مکان میری ملکیت میں ہے تو اس سے اس پر ثبوت طلب کیا جائے گا، لیکن جب وہ ثبوت پیش کر دے گا تو خصم (مخالف) کو اس سوال کا حق نہیں کہ اچھا مکان تو تمہارا ہی ہے مگر بتلاؤ اس گھر میں کیا کیا سامان موجود ہے؟ یا کوئی شخص بیوی کا بوسہ لے تو اس سے یہ سوال تو ہو سکتا ہے کہ تم اس کا بوسہ کیوں لیتے ہو؟ لیکن جب وہ بتلا دے کہ میں محبت کی وجہ سے بوسہ لیتا ہوں، تو پھر اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ تم کو بیوی سے محبت کیوں ہے؟ اور تم رات دن میں کتنے اس کے بوسے لیتے ہو؟

اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کی وجہ نہیں بتلا سکتے کہ ہم کو حجر اسود سے محبت کیوں ہے؟ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے اعتراض کا جواب اسی حد تک دینا چاہئے جہاں تک اس کا سوال کا حق ہے اور جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو، اس کا جواب نہ دینا چاہئے بلکہ صاف کہہ دینا چاہئے کہ تم کو اس سوال کا کوئی حق نہیں، مخالفین کا دماغ ہر بات کی حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں اور وہ قیدہ کو ان کے سامنے نہ بیان کرنا چاہئے، بعض لوگ اس پر توجہ کرتے ہیں کہ وہ وجہ کون سی ہے جس کو ہم

نہیں سمجھ سکتے ہیں؟ آخر ہم بھی تو انسان ہیں، اگر بار یک بات ہمارے سامنے بیان کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو نہ سمجھ سکیں، میں کہتا ہوں کہ اگر ایسی بات ہے تو میں ایک راضی دان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقلیدس کی کوئی شکل ایک گھس گھسے کو سمجھا دے جس نے اقلیدس کے مبادی و اصول موضوعہ کو کبھی نہ سنا ہو، یقیناً وہ اقرار کرے گا کہ میں ایسے شخص کو اقلیدس کی اشکال نہیں سمجھا سکتا، آخر کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں؟ مگر بات وہی ہے کہ بعض امور کے لیے مبادی و مقدمات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے، اس لیے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ذہن میں مبادی و مقدمات حاضر ہوں، ہر شخص اس کو نہیں سمجھ سکتا اور یہ بالکل موٹی بات ہے، مگر حیرت ہے کہ آج کل کے عقلاء کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

### حجر اسود کو بوسہ دینے کا راز

میں تبرعاً اس کا راز بھی بتلائے دیتا ہوں، تقبیل حجر اسود کے راز کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ اس کا منشاء عظمت و عبادت نہیں، بلکہ محض محبت اس کا منشاء ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو مجمع عام میں ظاہر کر دیا: ایک بار آپ طواف کر رہے تھے، اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے جب آپ رضی اللہ عنہ نے تقبیل حجر اسود کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا ٹھہرے اور فرمایا: ”انی اعلم انک الحجر..... الخ ص: ۳۰“

”یعنی میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا، کیا خشک معاملہ کیا ہے، حجر کے ساتھ، جھلا اگر مسلمان کا یہ معبود ہوتا تھا تو کیا اس سے بھی خطاب کیا جاتا کہ نہ تو نفع دے سکتا ہے، نہ ضرر پہنچا سکتا ہے، اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اس تقبیل کا منشاء محض محبت کی وجہ سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بوسہ دیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فضلہ بھی کسی جگہ گراہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی، چہ جائیکہ وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا دہن مبارک لگا ہوا!!!“

بامید آنکہ جانا روزے رسیدہ باشند

باخاک آستانش درایم جب سائی

رہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیوں بوسہ دیا؟ اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کی وجہ بتلانا ضروری ہے، ہاں اتنی بات یقینی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عبادت و عظمت کے بوسہ نہیں دیا، ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بے باکی کے ساتھ ”لا تضر و تنفع“ نہ

فرماتے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے جب انہوں نے حجر کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا منشاء عبادت ہرگز نہیں اور تمراً اس کا جواب بھی بتلائے دیتا ہوں کہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر کے اندر تجلیات الہیہ کا یہ نسبت دوسرے حصص بیت کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو، پس منشاء اس تقبیل کا تلبس زائد ہے تجلیات الہیہ سے اور جس چیز کو محبوب کے انوار سے تلبس ہوا اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے۔ امر علی الدیار..... الخ ص: (۳۱)

ساقواں اعتراض..... غلامی کا مسئلہ کیا اسلام میں قابل اعتراض ہے؟

جواب:

معاشرت میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ اپنے غلاموں کی ستر خطائیں روز معاف کیا کرو اس سے زیادہ خطا میں ہوں تو کچھ سزا دو، بھلا غلاموں کے ساتھ یہ برتاؤ کوئی غیر مسلم کر سکتا ہے؟ غلام تو کجا اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا، مگر افسوس! باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی مخالفوں کو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہے، میں کہتا ہوں کہ اسلام نے تو غلاموں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ویسا نہیں کر سکتے تھے۔

مسئلہ غلامی کی اصل

مسئلہ غلامی کی اصل یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی جان بچائی گئی ہے، کیونکہ جب ایک دشمن مسلمانوں کے مقابلے میں فوج کشی کرتا ہو اور اس کے ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوں، تو اب ہمیں کوئی بتلا دے کہ ان قیدیوں کو کیا کرنا چاہئے؟ ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو ہار کر دیا جائے، اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کہ دشمن کے ہزاروں لاکھوں کی تعداد کو پھر اپنے مقابلے کے لیے مستعد کر دیا، ایک صورت یہ ہے کہ سب کو فوراً قتل کر دیا جائے، اگر اسلام میں ایسا کیا جاتا تو مخالفین جتنا شور و غل مسئلہ غلامی پر کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اس وقت کرتے کہ دیکھئے کہ کیا سخت حکم ہے کہ قیدیوں کو فوراً قتل کر دیا گیا؟ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو کسی جیل خانے میں بند کر دیا جائے اور وہاں رکھ کر ان کو روٹی کپڑا دیا جائے، یہ صورت گو کہ آج کل کی بعض متدن سلطنتوں میں پسندیدہ ہے، مگر اس میں چند خرابیاں بھی ہیں، ایک یہ کہ اس سے سلطنت پر بڑا بار عظیم پڑتا ہے اور ان سے کمائی کرنا خود غرضی کی صورت ہے، پھر جیل خانے کی حفاظت کے لیے ایک خاص فوج مقرر کرنا پڑتی ہے، قیدیوں کی ضروریات کے لیے بہت سے آدمی ملازم رکھے

جاتے ہیں۔ یہ سارا عملہ بے کار ہو جاتا ہے، سلطنت کے کسی اور کام میں نہیں آ سکتا قیدیوں ہی کی حفاظت کا ہو کر رہتا ہے۔

### جیل میں رکھ کر راحت پہنچانا

پھر تجربہ شاہد ہے کہ جیل خانے میں رکھ کر آپ چاہے قیدیوں کو کتنی ہی راحت پہنچائیں، ان کی ان کو کچھ قدر نہیں ہوتی، کیونکہ آزادی سلب ہونے کا غیظ ان کو اس قدر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ساری خاطر مدارات کو بے کار سمجھتے ہیں، تو سلطنت کا اتنا خرچ بھی ہوا اور سب بے سود کہ اس سے دشمن کی دشمنی میں کمی نہ آئے، پھر قید خانے میں ہزاروں لاکھوں قیدی ہوتے ہیں، وہ سب کے سب علمی اور تمدنی ترقی سے بالکل محروم رہتے ہیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے، اسلام نے اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ جتنے قیدی گرفتار ہوں، سب لشکر والوں کو تقسیم کر دو، ایک گھر میں ایک غلام کا خرچ معلوم بھی نہ ہوگا اور سلطنت بابر عظیم سے بچ جائے گی، پھر چونکہ ہر شخص کو اپنے قیدی سے خدمت لینے کا حق بھی ہے اس لیے وہ اس کو روٹی کپڑا جو کچھ دے گا، اس پر گراں نہ ہوگا، وہ سمجھے گا کہ میں تنخواہ دے کر نوکر رکھتا جب بھی خرچ ہوتا، اب اس سے خدمت لوں گا اور اسے معاوضہ میں روٹی کپڑا دوں گا، پھر چونکہ غلام کو چلنے پھرنے سیر و تفریح کرنے کی آزادی ہوتی ہے، قید خانے میں بند نہیں ہوتا ہے، اس لیے اس کو اپنے آقا پر غیظ نہیں ہوتا، جو جیل خانہ کے قیدی کو ہوتا ہے اس حالت میں اگر آقا نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا، تو اس کا احسان دل میں گھر کر لیتا ہے اور وہ اس کے گھر کو اپنا گھر، اس کے گھر والوں کو اپنا عزیز سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سب باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں، پھر اس صورت میں غلام علمی اور تمدنی ترقی بھی تو کر سکتا ہے، کیونکہ جب آقا غلام میں اتحاد ہو جاتا ہے تو آقا خود چاہتا ہے کہ میرا غلام مہذب و شائستہ ہو، وہ اس کو تعلیم بھی دلاتا ہے، صنعت و حرفت بھی سکھاتا ہے، چنانچہ اسلام میں صد ہا علماء زہاد عبادا ایسے ہوئے ہیں جو اصل میں موالی (آزاد کردہ غلام) تھے، غلاموں کے طبقہ نے تمام علوم میں ترقی حاصل کی، بلکہ غلاموں کو بعض دفعہ بادشاہت بھی نصیب ہوتی تھی۔

### محمود غزنوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ

سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ کو مخالفین بہت بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے تلوار سے اسلام پھیلایا ہے، مگر تاریخ میں ان کا ایک واقعہ دکھا ہے کہ اس سے ان کی رحم دلی اور شفقت کا اندازہ ہوتا ہے اور

یہ کہ غلاموں کے ساتھ ان کیا برتاؤ تھا، ایک بار سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بہت سے ہندو قید ہوئے، جن کو اپنے ساتھ غزنی لے گئے، ان میں ایک غلام بہت ہونہار اور ہوشیار تھا، اس کو آزاد کر کے سلطان نے ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی، جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کے حکومت کے عہدے دیے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کو ایک بڑے ملک کا صوبیدار بنا دیا، صوبہ دار کی حیثیت اس وقت وہ بھی جو آج کل کے بڑے والی ریاست کی حیثیت ہوتی ہے جس وقت سلطان نے اس کو تخت پر بٹھایا اور تاج سر پر رکھا تو وہ غلام رونے لگا، سلطان نے فرمایا کہ یہ وقت خوشی کا ہے یا غم کا؟ اس نے عرض کیا: ”جہاں پناہ! اس وقت مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ کر پھر اپنی یہ قدر و منزلت دیکھ کر رونا آ گیا۔ حضور میں جس وقت ہندوستان میں بچہ تھا، آپ کے حملے سن کر ہندو کا منہ تھے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو آپ کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں، جیسا ہوا ہے ڈرایا کرتی ہیں، میری ماں بھی مجھے اسی طرح آپ کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں، میں سمجھتا تھا کہ نہ معلوم محمود کیسا ظالم و جاہل ہوگا؟ حتیٰ کہ آپ نے خود ہمارے ملک پر حملہ کیا اور اس فوج سے آپ کا مقابلہ ہوا جس میں یہ غلام موجود تھا، اس وقت تک میں آپ کے نام سے بھی ڈرتا تھا، پھر میں آپ کے ہاتھوں قیدی ہوا، تو میری جان ہی نکل گئی کہ بس اب خیر نہیں، مگر حضور نے دشمنوں کی روایات کے خلاف میرے ساتھ نیک برتاؤ فرمایا کہ آج میرے سر پر تاج سلطنت رکھا جا رہا ہے، تو اس وقت میں خیال کر کے رونے لگا کہ کاش آج میری ماں ہوتی تو میں اس سے کہتا دیکھ یہ وہی محمود ہے جس کو ہوا بتلایا کرتی تھیں۔“

### غلامی کا کرشمہ

ایسے واقعات اسلام میں بکثرت ہیں اور یہ اسی مسئلہ غلامی کا نتیجہ ہے، اگر یہ لوگ قید خانے میں قید کر دیے جاتے تو نہ ان کو مسلمانوں سے انس ہوتا نہ مسلمانوں کو ان سے تعلق ہوتا، غلام بن کر یہ لوگ مسلمانوں میں ملے جلے رہے، علمی ترقی حاصل کرتے رہے، آخر کار اپنی حیثیت کے موافق درجات و مناصب پر فائز ہوتے رہے، کوئی محدث بنا، کوئی فقیہ، کوئی قاری، کوئی مفسر، کوئی نحوی بنا، کوئی ادیب، کوئی قاضی ہوا، کوئی حاکم پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کی نہایت رعایت فرمائی کہ آپ کا حکم ہے: ”جو خود کھلاؤ وہی کھلاؤ، جو پہنوں وہی پہناؤ اور جب وہ کھانا پکا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاؤ، عین وصال کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت یہ تھی:

”الْصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ“

”یعنی نماز کا خیال رکھو اور ان غلاموں کا بھی جو تمہارے ہاتھوں کے نیچے ہیں۔“

اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو سکتی ہے؟ اور الحمد للہ حضرات صحابہ و تابعین اور اکثر سلاطین

اسلام نے غلاموں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا ہے، اگر کسی ایک دو نے اس کے خلاف عمل درآمد کیا تو وہ اپنے فعل کا خود مددگار ہے، اس پر اسلام سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً ص: ۵۷)

## آٹھواں اعتراض..... اسلامی تعزیرات پر اعتراض اور اس کا جواب

آج کل متمدن اقوام نے قصاص بالسيف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے، یہ بھی سخت موذی ہے، کیونکہ اس میں روح نکلنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور قتل میں جان نکلنے کا راستہ ہو جاتا ہے، پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھتے ہی ایک سیکنڈ میں جان نکل جاتی ہے، نہ معلوم اس میں کیسی کشش ہوگی؟ اور روح پر کیا گزرتی ہوگی؟ مگر چونکہ دیکھنے والوں کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور سر کٹنے، خون بہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے، اس لیے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کر لی، تمہارے سامنے بھیا تک منظر نہیں ہے، اس لیے اس سے قیاس کر لیا کہ جب میرے سامنے بھیا تک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ تکلیف نہیں، مگر یہ قیاس الفاتح علی الشاہد ہے اور یہی اصل ہے تمام مغیبات کے انکار کی جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے، انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم اصلی کی دلیل بنا لیا ہے، حالانکہ امریکا کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا، تو کیا وہ اس وقت بھی معدوم اصلی تھا؟ اور اس کا اعلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت و دوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی؟ تم کو نظر نہ آنے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں؟ اسی طرح تم کو اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نظر نہیں آتا، تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا ہے کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوئی؟ دلیل عقلی کا مقتضی تو یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے اور ان مہذب سزاقوں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے، کیونکہ موت نام ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جن طریق میں جان نکلنے کا راستہ پیدا کیا جائے، یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی اور جن صورتوں میں گھونٹ کر دبا کر جان نکالی جائے ان میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی، گودیر کم لگے گی۔

## شریعت کی قدر و قیمت

یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے مجرم کے ساتھ بھی احسان کیا ہے اور اس کی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے، رہا یہ کہ اس سے دیکھنے والوں کو وحشت



ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض کے لیے قصاص مشروع ہوا ہے، یہ وحشت اس غرض سے تحصیل میں معین و مددگار ہے، یعنی زجر و تنبیہ کہ اس منظر کو دیکھ کر ہر شخص خائف ہو جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رُک جائے اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں، اس سے دوسرے کو زجر و تنبیہ زیادہ نہیں ہوتی اور یہ سخت بے رحمی ہے جب ایک شخص کو جان ہی سے مارنا ہے تو اس کو راحت دے کر مارنا چاہئے۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے: "اذا قتلتم فاحسنوا القتل اذا ذبحتم فاحسنوا الذبح" جس میں قصاص کی بھی شخصیت نہیں، بلکہ قتل کفار کو اور ذبح حیوانات کو بھی عام ہے، پس شریعت نے ظالموں کی بھی رعایت کی ہے کہ ان کو بے رحمی اور بے دردی سے نہ مارا جائے اور دوسروں کو بھی رعایت کی ہے، دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے کہ "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَا اُولٰٓئِي الالْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" کہ قصاص میں لوگوں کو جرائم سے زجر کامل ہوتا ہے۔ (افتاء الجواب ص: ۴۰)

## نواں اعتراض..... کیا جنت و دوزخ کوئی چیز ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں محض تحویف و ترغیب کے لیے یہ نام بیان کیے گئے ہیں، نعوذ باللہ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جتنی وعیدیں چوری، زنا، ظلم و ستم، کفر و معصیت پر ہیں، یہ سب ایسی ہیں جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ رہو، ہوا آ جائے گا، ایسے جتنے انعامات جنت وغیرہ بیان کیے گئے ہیں، یہ بھی محض پھسلایا ہے جیسا کہ بچوں کو پھسلایا کرتے ہیں، میں ان لوگوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات ادنیٰ حاکم کے کلام میں ہونا بھی سخت عیب ہے، چہ جائیکہ اکہم الحاکمین کے کلام میں ہو، کیونکہ اس کو تو جھوٹ موٹ بہلانا بولتے ہیں اور خدا جھوٹ سے بالکل بری ہے۔ "نعالیٰ اللہ عن ذالک..... الخ۔ (ص: ۴۰)

لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جنت و دوزخ محض ترغیب و ترغیب کے لیے ہے اور واقع میں کچھ بھی نہیں تو رغبت و رہبت اسی وقت تک ہو سکتی ہے جب تک کہ مخاطب کو یہ راز معلوم نہ ہو، کیونکہ ظاہر ہے بعد اصل حال معلوم ہو جانے کے کہ یہ ترغیب و ترہیب ایک غیر واقعی امر ہے، رغبت و شوق و رہبت بالکل نہیں رہ سکتی، پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرنا کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں، سراپا غلط ہے، غرض اول تو اس کے خلاف جاننے سے معاذ اللہ! کلام اللہ پر انوعیت کا دھبہ آتا ہے، جس کو کلام الہی کے لیے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا، پھر جو مقصود شارع کو

ان وعیدوں اور ان کاموں کے بیان کرنے سے ہے کہ لوگوں کو مکلف و مقید بنایا جائے، اسی صورت میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا، ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارے میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں، یقیناً ارتکاب جرائم میں دلیر ہوگا، اول تو یہ سب کے سامنے جو چاہے گا کرے گا، اگر سامنا کرنے میں کسی کا پاس و لحاظ ہو، تو تنہائی میں بالکل نہ چوے گا، مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے اور وہاں ایک دوسرا شخص بھی موجود ہے، سوائے ان دو شخصوں کے وہاں کوئی موجود نہیں، نہ پولیس چوکی اور پہرہ، اب فرض کر لو کہ اتفاق سے اس دوسرے شخص کی موت آگئی اور اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ کا نوٹ ہے اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم کر لیا کہ فلاں خاندان کا اور فلاں شہر کا باشندہ ہے اور یہ بھی اسے خبر ہے کہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ ہے، یہ سب کچھ ہے، مگر اس واقعہ کی کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا؟ اور اس کے پاس مرتے وقت کیا سامان تھا؟ نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے، نہ مقدمہ چل سکتا ہے، بتلائے ایک ایسی حالت میں یتیم بچہ تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی خوف اس شخص کو بجز خوف خدا، عذاب آخرت کے مجبور کر سکتا ہے؟ اور کیا ایسا شخص جو وعید الہی کو محض تنخوف سمجھتا ہے، اس روپے کو اصل وارث تک پہنچا دے گا؟ بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس روپے کی حاجت بھی ہو یہ اسی شخص کا کام ہے جو خدا کے تمام وعدے وعید کو حق سمجھتا ہے اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے، اس گندے عقیدے سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں، مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہوئے جاتے ہیں، اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ تمدن کے لیے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے، صرف حکومت سے تمدن ہرگز قائم نہیں ہو سکتا، کیونکہ حکومت کا زور محض ظاہر تک منحصر ہے، دل میں شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں، مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں؟ اگر تمدن کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہوگا، مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے، دعویٰ تمدن کے بعد مذہب سے لاپرواہی کرنا ایسا ہے کہ:

یکے بر سر شاخ دین می برید

خداوند بستان نگہ کرد و دید

تو یہ لوگ جس تمدن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اسی کی جڑ کاٹ رہے ہیں، پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدن ثابت کی جاتی ہے اور فعل سے اس کی نفی کی جاتی ہے، غرض آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جنت و دوزخ دینی چیزیں ہیں۔ (وعظ شعب الایمان ص: ۱۰۸)

سوال اعتراض..... مسلمان کیا رسول ﷺ کو خدا تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں؟

جواب:

شاید کسی مخالف کو یہ شبہ ہو کہ کیا مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کے برابر ہیں؟ تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ عبادت میں مسلمانوں کے نزدیک خدا کا کوئی شریک نہیں، حصہ دار بھی اس میں شریک نہیں، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا، نہ ان کی زندگی میں جائز تھا، نہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو سجدہ جائز ہے، مگر اطاعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے، نہ اس لیے کہ آپ شریک فی الاطاعت ہیں، بلکہ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے پیغام ہوتا ہے تو آپ کا حکم درحقیقت آپ کا حکم نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی وجہ سے خدای کا حکم ہے، اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت خدا کے احکام کی اطاعت ہے۔

(ص: ۱۱۳۴)

”مَنْ طِيعَ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ“

اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ وزیر کو حکم دیتا ہے کہ رعایا میں یہ قانون شائع کر دو، پس اس وقت وزیر کی زبان سے جو قانون شائع ہو رہا ہے، وہ درحقیقت بادشاہ کا حکم ہے، اس لیے وزیر کی اطاعت بعینہ بادشاہ کی اطاعت ہے، مگر اس سے ہرگز کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا اور اگر کوئی شخص ایسا سمجھنے لگے اور آئندہ سے بجائے بادشاہ کے تخت کو بوسہ دینے کے وزیر کی کرسی کو بوسہ دینے لگے تو یقیناً وہ معتوب ہوگا، اسی طرح اگر آپ کسی مقدمہ میں ایک شخص کو وکیل کر دیں تو جو کچھ وہ کہتا ہے، سب آپ کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ گویا تم خود کہہ رہے ہو، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وکیل تمہارے برابر ہو گیا کہ تمہاری جائیداد کا مالک ہو جائے کہ اس میں جو چاہے تصرف کرے، ہرگز نہیں! پس مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اسی معنی میں کہتے ہیں، جیسے وزیر کی اطاعت بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور وکیل کا قول موکل کا قول ہوتا ہے، خوب سمجھ لو! کہ اس سے شرکت و مساوات ہرگز لازم نہیں آتی، مگر افسوس یہ ہے کہ مخالفین اعتراض کرتے ہوئے مسائل اسلامیہ کی حقیقت کو ذرا نہیں سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو منشاء اعتراض کا محض حسد ہے، ورنہ مسائل اسلامیہ پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔

(محاکم اسلام ص: ۲۰)

گیا رہو اس اعتراض..... رسول اللہ ﷺ کا اشاعت اسلام سے مقصود

کیا اپنی تعظیم ہے؟

جواب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اشاعت اسلام سے اپنی تعظیم کرانا نہ تھا، کیونکہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے، وہ خود اس کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ میرے سامنے جھکیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ان کو اس سے منع کیا اور صرف منع ہی نہیں کیا، بلکہ اپنا فانی ہونا اس پر ظاہر فرمادیا، مگر پھر بھی بعض جہلاء کفر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض ہے کہ نعوذ باللہ! آپ بڑا بننا چاہتے تھے اور دلیل میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر ایک صحابی کو اپنے موئے مبارک دیے تھے کہ مسلمانوں میں ان کو تقسیم کر دو، اس پر وہ جاہل لکھتا ہے کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال اس لیے تقسیم کرائے تاکہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر تعظیم سے رکھیں، تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا بننا چاہا، استغفر اللہ! یہ آج کل کی فہم و عقل ہے، افسوس! اس شخص کو عبادت و محبت کے معنی میں بھی فرق معلوم نہیں، واقعی کفار کو محبت و عشق کا چرکا نہیں لگا، اسی واسطے وہ ایسے واقعات کی حقیقت نہیں سمجھتے، جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب بھی نہ دیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے۔

بامدی بگوئید اسرار عشق و مستی  
بگزار تا بمیر دوررخ خود پرستی

محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حال

مگر میں تمہارا اس کا جواب دیتا ہوں، تاکہ کسی مسلمان کو اس اعتراض سے شہ ہو تو وہ اس جواب سے تسلی حاصل کر سکے، بات یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بال کن لوگوں میں تقسیم کرائے تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں میں بال تقسیم کرائے تھے، جن کی محبت کی یہ حالت تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تھے تو وضو کا ایک قطرہ بھی

زمین پر نہ گرنے دیتے تھے، بلکہ آپ کا تھوک اور سارا وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے، منہ کو ملتے آنکھوں سے لگا لے تھے اور ہر شخص اس کی کوشش کرتا تھا کہ سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک میرے ہاتھوں میں آئے، چنانچہ اس کی کوشش میں ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے اور ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھینے لگوائے اور اس کا خون ایک صحابی کو دیا کہ اس کو کسی جگہ احتیاط سے دفن کر دو، صحابی کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون زمین میں دفن کیا جائے انہوں نے الگ جا کر اسے خود پی لیا، اس پر یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ (نعوذ باللہ) صحابی رضی اللہ عنہ بہت ہی بے حس تھے کہ تھوک ملتے ہوئے اور خون پیتے ہوئے گھن نہ آتی تھی، بات یہ ہے کہ ان امور کا تعلق عشق و محبت سے ہے اور اس کی حقیقت عاشق ہی سمجھ سکتا ہے جس کا مذاق یہ ہے:

غیرت آں چشم برم روئے تو دیدن ندہم  
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

### محبت کا اثر

صاحبو! اگر آپ کو بھی کسی سے عشق ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ عاشق بعض دفعہ محبوب کی زبان اپنے منہ میں لے کر چومتا ہے اور عشاق لعاب دہن محبوب کی مدح میں دفتر کے دفتر اشعار میں لکھ جاتے ہیں، تو کیا یہ بے حس ہیں؟ ہرگز نہیں! اگر یہ بے حس ہیں تو سمجھئے کہ ساری دنیا بے حس ہے، کیونکہ محبت میں ہر شخص یہی کرتا ہے، کوئی عاشق اس سے بچا ہوا نہیں، اسی طرح اگر کسی کے محبوب کے بدن سے خون بہے تو عشاق اس جگہ منہ لگا کر خون چوستے ہیں تاکہ محبوب کو زخم کی تکلیف کا احساس نہ ہو، یا کم ہو جائے، معلوم ہوا کہ خون چوسنا بھی کوئی گھن کی بات نہیں، عاشق کو اس سے جو حظ ہوتا ہے، اس کے دل سے پوچھنا چاہئے، پھر جب ادنیٰ ادنیٰ محبوب کا لعاب دہن اور خون گھن کی چیز نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک اور پسینہ اور خون کیونکر گھن کی چیز ہو سکتا ہے؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ قدرتی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام بدن خوشبودار تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے میں اس قدر خوشبو تھی کہ عطر کی خوشبو اس کے سامنے بے حقیقت تھی، آپ کا لعاب دہن نہایت خوشبودار اور شیریں تھا اور یہی حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کا تھا، تو ایسی چیز سے کون گھن کر سکتا ہے؟ مگر کفار کو ان امور کی کہاں خبر؟ نہ ان کو عشق و محبت کی ہوا لگی ہے، نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے اطلاع ہے!!!

## صحابہ رضی اللہ عنہم کا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

بہر حال صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کا پانی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے ایک دوسرے پر گرگرتے پڑتے تھے، تو ایسی جماعت سے کیا یہ امید تھی کہ وہ آپ کے بالوں کو زمین میں دفن ہونے دیں گے؟ کیونکہ یقیناً بال کا درجہ وضو کے پانی سے زیادہ تھا، اس کو محض جسم سے تلبیس (ملاپ) ہوا تھا اور یہ تو بدن کا جزو ہے، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بالوں کو دفن کراتے تو یقیناً صحابہ زمین میں سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے، پھر اس میں ہر شخص یہ کوشش کرتا کہ میرے ہاتھ میں زیادہ بال آئیں، تو ایک دوسرے پر گرگرتے اور جب نہیں کہ قتال کی نوبت آ جاتی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح قتال سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بچانے کے لیے اپنے بال خود ہی تقسیم کرا دیے اور دفن نہ کرائے، بتلائے کہ اب اس میں کیا اشکال ہے؟ پس معلوم ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے بال تقسیم کرانا اپنی تعظیم و عبادت کے لیے نہ تھا، بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت پر نظر کرتے ہوئے ان کے نزاع و قتال کے رفع دفع کرنے کے لیے تھا، اگر معاذ اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ذرہ برابر بھی لڑائی و تکبر کا خیال ہوتا تو آپ عمدہ لباس پہننے مکان عمدہ بناتے، نفیس نفیس کھانے کھایا کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خزانہ جمع ہوتا مگر تاریخ شاہد ہے اور احادیث میں صحیح طریقے سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس موٹا جھوٹا ہوتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات سب کچھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھتے تھے۔

## آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کار

یہ نہیں کہ آپ کے پاس مال آتا نہ تھا۔ نہیں! بعض جنگوں میں اتنا مال آیا کہ اس کا شمار نہیں ہو سکتا تھا، بکریوں سے جنگل کے جنگل بھر گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سب بکریاں ایک اعرابی کو اس کے سوال پر عطا فرمادیں اور درابہم اس قدر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو سو، کسی کو دو سو عنایت فرمائے جب بحرین کا جزیرہ آیا تو اتنا روپیہ تھا کہ مسجد کے اندر سونے کا ڈبیر لگ گیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر میں سب کا سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تقسیم فرمایا اور اپنے واسطے ایک درہم بھی نہ رکھا، تو کیا بڑائی چاہنے والا یہ گوارہ کر سکتا ہے کہ خود خالی ہاتھ رہے اور مخلوق کو مال مال کر دے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ راستہ میں جب چلتے تھے، تو صحابہ رضی اللہ عنہم سواری پر سوار ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ

پیدل چلتے اور وہ اترنا چاہتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے، اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سودا بازار سے خود لے آیا کرتے تھے، اگر کوئی شخص کسی کام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے امداد لینا چاہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتا لے جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا کام کر دیتے تھے، گھر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کا کام بھی کرتے تھے، کبھی بکری کا دودھ خود نکال لیا کرتے تھے، کبھی جوتا اپنے ہاتھ سے گاٹھا لیا، کبھی آنا گوندھا لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ زمین پر بیٹھ جاتے، بور یہ پر لیٹ جاتے تھے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو پر نشان ہو جاتے، بعض دفعہ کسی یہودی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرض ہوتا اور وہ تقاضا کرنے میں سختی کرتا، برا بھلا کہتا اور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہودی پر غصہ آتا، وہ اس کو دھمکانا چاہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو منع فرماتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ صاحب کو کہنے سننے کا حق ہے۔

اس جاہل محترض سے کوئی پوچھے کہ کیا بڑائی اور عظمت چاہنے والوں کے یہی حالات ہوا کرتے ہیں؟ افسوس! کہ اس نے ایک بال تقسیم کرنے کا واقعہ لے لیا اور ان تمام واقعات سے اندھا ہو گیا، سو میری تقریر سے معلوم ہو گیا کہ بال تقسیم کرنے کا واقعہ بھی بڑائی یا عظمت کے واسطے نہ تھا، بلکہ اس میں وہی تمدنی اور سیاسی مصلحت تھی جو میں نے ابھی ذکر کی، دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال تقسیم فرما کر قیامت تک کے لیے یہ بات بتا دی کہ میں فانی ہوں اور بشر ہوں، کیونکہ بال متغیر و حادث ہیں، کبھی دوسرے اوپر ہیں، کبھی اترے سے سونڈ کر جدا کیے جاتے ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو دیکھے گا (چنانچہ بعض جگہ محمد اللہ اب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال محفوظ ہیں اور لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں) تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فانی و بشر ہونے پر استدلال کرے گا اور سمجھ جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے خدانہ تھے تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی توحید کو کامل فرمایا نہ کہ اپنی عظمت و بڑائی چاہی۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ روند

(ایضاً ص: ۵۷)

بارھواں اعتراض..... نجات کے لیے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ہے؟

جواب:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قطع کرنا مطلق سلب فیوض و کمالات کا سبب ہے، اگر چہ گستاخی

بھی نہ کرے، یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو محض توحید کو نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں، تصدیق رسالت کو ضروری نہیں سمجھتے، افسوس مسلمان میں بھی بعض لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تعلیم کے لیے آئے تھے، تو جو شخص توحید کا اقرار کر لے وہ نجات پالے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہ کرے، یاد رکھو! یہ قول بالکل باطل ہے، نجات بدون تصدیق رسالت کے ہرگز نہیں ہو سکتی، جس طرح توحید رکن ایمان ہے، اسی طرح تصدیق رسالت بھی رکن ایمان ہے، لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ دینا چاہا ہے۔

”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصُّبْحِيَّةَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“ (البقرة: ۶۲)

”جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی اور نصرانی ہیں اور جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے اور وہاں ان پر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں اور نہ مغموم ہوں گے۔“

اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہراً) نہیں ہے، بلکہ سب فرقوں کی نجات کا مدعا صرف ایمان و عمل اور ایمان بالآخرت قرار دیا گیا ہے، اس سے بعض لوگ نے اس غلطی میں ڈالنا چاہا ہے کہ نجات کے لیے تصدیق رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت نہیں، جواب اس کا یہ ہے کہ ایمان باللہ و ایمان بالآخرت بغیر تصدیق رسالت محمدیہ کے محقق ہی نہیں ہو سکتا ہے، پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں۔

## ایک واقعہ

تفصیل اس سے جواب کی وہ ہے جو میں نے ایک ڈپٹی کلنر سے کہلا بھیجی تھی، وہ بندہ خدا بھی اس غلطی میں مبتلا تھے، ویسے بڑے نیک پابند صوم و صلوة تھے، مگر شیطان نے ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈال رکھا تھا کہ نجات کے لیے صرف ایمان باللہ کافی ہے، تصدیق رسالت کی ضرورت نہیں، واقعی بدون علم دین کے کامل اصلاح نہیں ہوتی، عقائد بھی درست نہیں ہوتے، افسوس! آج کل لوگوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم سمجھ لیا ہے، پس وہ ایسا ہی علم ہے جس سے روپیہ پیسہ معلوم ہو جاتا ہے، خدا اس سے معلوم نہیں ہو سکتا، میں نے ڈپٹی صاحب کو کہلا کر بھیجا کہ ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مان لے، کیونکہ وجود کا انکار مشرکین بھی نہیں کرتے، بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفات کمال سے متصف اور صفات نقص سے منزہ سمجھتے،



اب میں کہتا ہوں کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے، جس کے ساتھ خدا کو موصوفین ماننا تو حید کے لیے ضروری ہے اور صفات نقص میں ایک صفت کذب بھی ہے، جس سے خدائے تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں۔ (محمد رسول اللہ) اور قرآن کا کلام الہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے، تو اس خبر کو بھی سچ سمجھنا واجب ہے، پس جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں مانتا، اس نے خدا تعالیٰ کو کاذب کہا تو پھر اللہ تعالیٰ پر کہاں ایمان لایا؟ پس ثابت ہو گیا کہ خدائے تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیق رسالت کے ممکن نہیں، میں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ جو اب کے لیے دس سال کی مہلت ہے، اس دلیل کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا، پھر خدا نے ان کی اصلاح کر دی، بعد میں مجھ سے ملے بھی تھے، اس وقت ان کا شبہ بھی رفع ہو چکا تھا، بیچاروں کا خاتمہ اچھا ہوا، بس خوب سمجھ لو کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے نجات ہرگز نہیں ہو سکتی۔

### ایک فلسفی کا قضیہ

ایک فلسفی کی بابت ایک شخص نے خواب دیکھا تھا میں اس فلسفی کا نام بتلانا نہیں چاہتا، خواہ مخواہ ایک مسلمان سے خواب کی بناء پر بدگمانی ہو جائے گی، مگر اس شخص کے خیالات تھے فلسفیانہ مگر ظاہر میں مسلمان کہلاتا تھا، خواب یہ تھا کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور! فلاں شخص کا کیا حال ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بدون میرے توسط کے جنت میں جانا چاہتا تھا، مگر میں نے ہاتھ پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا کہ دور ہو کم بخت، جنت میں بغیر میرے تعلق کے کوئی نہیں جاسکتا، غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے واسطہ فی العروض ہیں تمام کمالات و فیوض میں، بدون آپ کے واسطے کے کوئی شخص بھی کمالات بلکہ ایمان سے بھی موصوف نہیں ہو سکتا، اسی کو حضرت شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

پندار سعدی کہ راہ صفا  
توان رفت جز بر پے مصطفیٰ  
خلاف پیمبر کے رہ گزید  
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

یہ تو ان کے واسطے ہے جو بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے اس راستے کو قطع کرنا چاہیں اور تعلق والوں کے واسطے ان شاء اللہ یہ ہوگا:

نماز بعصیان کسے در گرد  
کہ دار و چینین سید پیش رو

اور یہ ہوگا:

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا  
من العنايت ركذا غير منهدم

(وعظ الرفیع والوضع ص: ۲۹)

## تیر ہواں اعتراض..... تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی!

جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج صوری یعنی عروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں اور اس معراج کو منامی (خواب) یا کشفی بتلاتے ہیں، سو یہ بالکل نصوص کے خلاف ہے، بلکہ احادیث مشہور سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمان پر تشریف لے جانا ثابت ہے اور بیت المقدس تک تشریف لے جانا نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا انکار بلا تاویل کفر ہے اور بتاویل بدعت، ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ ہے کہ اس سے افلاک میں خرق والتیام (پھٹنا اور ملنا) لازم آتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق والتیام پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے، تو اس وقت ان شاء اللہ ہم ان سب کا لغو اور باطل ہونا ظاہر کر دیں گے۔ چنانچہ متنگمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں، دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلدی سیر سموات سے فارغ ہو کر واپس آ گئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے حصے میں ہو جائے، ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ (محال ہونے) کی کیا بات ہے؟ ہاں استبعاد ہو سکتا ہے، سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوح ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے، چنانچہ چرات اور دن کا آنا طلوع و غروب ہونا یہ سب حرکت فلک (آسمان) سے مرہبط ہے۔ اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہوگا، وہی رہے گا، اگر رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی، دن موجود ہوگا، تو دن ہی رہے گا، تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لیے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں، معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے، ہم حیدرآباد آ گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی

لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں، اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ ان لوگوں صاحب کی سواری نکلنے والی ہے، اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لیے بند کر دیا ہو گا جو چیز جہاں ہے وہیں رہے، پس آفتاب جس جگہ تھا وہیں رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے، کوئی بھی اپنی جگہ سے ملنے نہ پایا، اس میں کیا تعجب ہے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوگی، تو آپ کی سیر میں چاہے جتنا بھی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا، کیونکہ حرکت کرنا اس وقت موقوف ہو چکی تھی، اب اگر کوئی دوام حرکت افلاک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے التزام کو ثابت کرے، ان شاء اللہ ایک دلیل بھی قائم نہ کر سکے گا، دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے:

تن اد کہ صافی از جان ملت  
اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسان ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے، چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے، تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا، خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے اور مادیات کی طرح کثیف نہیں، اس لیے اس کی سیر میں کوئی حاجب مانع نہیں ہوتا، مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے، جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر زمین سے آسمان اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہو آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ایک دلیل فلاسفہ پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونے کے سبب کوئی تنفس زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اگر گزرتے تو زندہ کیسے رہتے؟ مگر انہوں نے یہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس التزام کے یہ اس وقت ہے جب تنفس (سانس لینے والے) کو اس میں کچھ مگت (ٹھہرنا) بھی ہو، چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ کو نکالا جائے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سرعت کے ساتھ اس خلا سے گزر جائیں، تو وہ عدم تنفس میں موثر نہ ہوگا اور دلیل اعلیٰ ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:

”والله ما فقد حمداً محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلة الاسراء“

کہ بخدا شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا، اس کا جواب لوگوں نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کہاں تھیں؟ نیز اس وقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی، شاید چار پانچ سال کی ہو اور اگر معراج ۵ ہوتی ہوئی جیسا کہ زہری رحمہ اللہ کا قول ہے، تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہوگی (جامع) اس لیے اجل صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے، مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم نے بے تحقیق ایک روایت فرمادی، ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ گمان نہیں کر سکتے کہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہو سکتی ہے، یہ مانا کہ اس وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کم سن بھی تھیں، مگر جو بات وہ فرماری ہیں، وہ تو عقل و بلوغ کے زمانے میں ان سے صادر ہوئی ہے اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں، یقیناً تحقیق کے بعد فرماری ہیں، ہاں! یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرماتی ہوں، کیوں کہ معراج میں اقداد ہے، تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں، میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے، وہ بہت لطیف ہے، وہ یہ ہے کہ فقدان کے دو معنی ہیں، ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا، جانا، دوسرے تلاش کرنا، چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے:

”قَالُوا وَاقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَدُونَ“ یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم کس چیز کو تلاش کرتے ہو؟ یہاں فقدان کے معنی طلب کے زیادہ ظاہر ہیں، پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش کی جاتی، یہ مطلب نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے و ہیں رہے، تا کہ اس سے منامی معراج یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے جدا تو ہوئے، مگر زیادہ دیر نہیں گئی، جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو اور اگر فقدان کے وہی معنی لیے جائیں جو مقدر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب معراج میں گم نہیں ہوا، تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا نہیں ہوئے، کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم، اس کے معنی غیبت و انفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں، جس کے لیے ایک فائدہ اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے ہوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی کہ عادتاً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا، پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے بلکہ خود آ کر گھر والوں کو نماز صبح کے لیے بیدار کیا، تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات چھوڑ دہونے کے لیے ضروری ہے قلت ولعل هذا..... الخ (ص: ۶۱)

غرض اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے اس کا انکار ہرگز نہیں ہو سکتا اور یقیناً یہ صورت عروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا کمال ہے۔ (دعوى الرفع والوضع ص: ۳۳)

### چودھواں اعتراض..... تمہارے نبی تارک لذات!

آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک نہ تھے، قبیح شبوت تھے کہ نو نکاح کیے، جس سے ناواقف مسلمان ان کے سامنے چھپتے ہیں، سو اگر ترک لذات لازم زہد ہوتا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کو ضرور ترک کرتے، تا کہ مخالفین پر اعتراض کا موقع نہ ہوتا، جس اعتراض کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بے ادب گنوار نے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں بک دیا کہ پہلے تم یہ ثابت کرو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت مرداگی بھی تھی اسی وقت ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا، مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے عیسیٰ علیہ السلام کی۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس ضعف کا ہرگز شبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ حدیث بخاری میں ہر قول کا قول مذکور ہے، جس پر اجل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سکوت کیا، جس سے تقریر ہوئی، کذا لک الرسل تبعث فی احساب قومها“ کہ انبیاء علیہ السلام اعلیٰ حسب میں مبعوث ہوتے ہیں، اور حسب کہتے ہیں کمالات ذاتیہ کو، جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہ السلام تمام کمالات سے علی وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں، تا کہ کسی کو اتباع عارضہ ہو اور نظر ہے کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ عینین ہے تو طبیعت کو اس سے نفرت و رکاوٹ ہو جاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگا ہوں سے گر جاتا ہے، مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں، پھر اس کے روکنے میں فرشتہ ہو اور اگر خالص ہو تو اعتقاد کم ہو جاتا ہے، اس واسطے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضور آ وارد ہے، اس کے معنی مفسرین نے صبوراً لکھے ہیں اور عینین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے: ”کذا فی الشفاء معللاً بان هذه نقیضه و

عیب و لا تلیق بالا نبیاء علیہم السلام“ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں، چنانچہ سیرت سے معلوم ہوا کہ نبی علیہ السلام نے اخیر عمر نکاح کیا تھا (کنذالرفی الشفاء) جس سے ان کے عین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہو گیا؟ بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرد تھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں بھی باقی رہی اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہو کر نکاح کریں گے، حدیث میں بھی آتا ہے۔ ”و یولد لہ“ کہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعف ہونے کا شبہ ہونے نہیں سکتا، بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی، بلکہ اس سے تو بظاہر نظر ان کی قوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے، مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں تمام انبیاء علیہ السلام سے اکمل ہیں، اس لیے یہ شبہ نہیں ہو سکتا۔

### ترک لذات زہد نہیں

الغرض ترک لذات لازمی زہد نہیں، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہ کرتے، بلکہ تقلیل لذات زہد میں داخل ہے، کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تیس مردوں اور بعض روایات میں چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور مرد کی قوت چار عورتوں کے لیے کافی ہے، اسی لیے شریعت نے چار تک کرنے کی اجازت دی ہے، اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی، جو ایک سو بیس عورتیں کی اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لیے کافی تھی، بلکہ شرح شفاء میں ابو نعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مرد کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کے برابر آیا ہے، تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی، پس آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا۔

### آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و ضبط

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کر لیتے، چنانچہ جوانی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا، بھلا کنورا مرد ایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے؟ ہرگز نہیں پس جوانی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اس کے ساتھ بسر کر دینا، اس کی کافی

دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبع شہوات ہرگز نہ تھے، بلکہ آپ اعلیٰ درجہ زاہد تھے، مگر بڑھا پے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیے، تو ضرور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔

## آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کرنے کی حکمتیں

### حکمت اول:

ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین عالم محبت ہے، جیسا کہ ”کنذہ کمنزا من خفیا فاحیبت ان اعرف فخلقت الخلق“ سے معلوم ہوتا ہے، گویا یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں، مگر مضمون حدیث صحیح ہے، جو حدیث: ”ان اللہ جمیل یحب الجمال“ (اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور ہمال کو محبوب رکھتا ہے) سے ثابت ہے، جس کی تقریر بکثرت و دقیقہ کے مضمون ہشتہ ہم میں اور کلید مثنوی دفتر اول میں قبول کر دہن خلیقہ ہدیہ راتحت شعر گنج مخفی بدر پیری جوش کر دوس میں احقر نے کی ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محنت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقایع میں ہے کہ اس میں بھی محض بوا سطر وقایع کے سبب ہو جاتا ہے، تکوین ولد کا بدون کسی تدبیر خاص کے، جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہو گیا تکوین عالم کا بدون کسی خاص تدبیر کے، پس عارف کو عورت کی تلمییس میں یعنی جماع میں محبت کی تکوین کی تخلی کا مشاہدہ ہوتا ہے، اس لیے وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لیے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث ”حبیب من دنیا کم النساء“ کا مبنی اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔

## امت کو بتانا تھا کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہئے؟

### حکمت دوم:

دوسری حکمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ معلوم ہو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے، تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا، کسی کوشبہ ہو سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود نکاح کیا نہیں، اس لیے بلا تامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرمادیے، نکاح کر لیتے تو شاید حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا متہ نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کر کے

دکھلا دیے اور سب کے حقوق اس خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی چیز نہیں کر سکتا، حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا عقل مند کا کام ہے، کیونکہ بیوی سے دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں، ایک علاقہ حاکمیت و حکومت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم، دوسرا علاقہ محبت و محبت کا جو بیت کا ہے، محبت اور عورت محبوب ہوتی ہے، علاقہ حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے، اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں، چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں، ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی، نہ بیوی پر کچھ رعب ہوتا ہے اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں، ان سے محبت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں، دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے حقوق ادا کرنا کہ بی بی پر رعب بھی ہو، حکومت بھی ہو، اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو، کہ بے تکلف ہنس بھی لے، بول بھی لے مذاق بھی کر لے اور اس پر ناز بھی کر لے، یہ انسان کامل کا کام ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کر سکتے ہیں، یا وہ شخص کر سکتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل تابع ہو، چنانچہ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یاد فرمایا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان بڑھیا کو کیا یاد فرمایا کرتے ہیں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی بیوی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی، حدیث میں ”فغضب حتى قلت والذی بعثت بالحق لا اذکرھا بعد هذا الا بخیر“ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آ گیا جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ڈر گئیں اور تقسیم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کروں گی بھلائی سے کروں گی، یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز تھا اور دوسری ازواج کی کیا حالت ہوگی؟ تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری نہیں۔

### حکمت سوم:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نکاح کر کے یہ بھی بتا دیا کہ جس کی چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہئے، خصوصاً اگر ایک کے ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسروں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے اس کی ترجیح ظاہر ہو، بلکہ امور اختیار یہ میں برابری کا پورا خیال رکھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی کر کے دکھلا دیا کہ باوجودیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی،



مگر عدل میں بھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرق نہیں کیا، ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے۔

### دل کے میلان پر قابو نہیں ہوتا

دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار سے باہر تھا، اس میں برابری کیسے کرتے؟ اسی لیے فرمایا کرتے تھے: "اللہم هذا قسمی فی ما املك فلا تلمنی فیما لا املك" اے اللہ! یہ میری برابری ہے، اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے، پس مجھ سے اس بات میں مؤخذہ نہ کیا جائے، جس پر مجھے قدرت نہیں، اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف زیادہ تھا اور یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہ تھی، بلکہ غیب کی طرف سے ایسے سامان کیے گئے کہ خواہ مخواہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف میلان ہو، چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتے کے ذریعہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر بھیجی کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز ہے، اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھینچو اور گے، تو ہم منع نہیں کریں گے، یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بی بی کے ساتھ نہیں کیا، دوسرے وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہ آتی تھی، بجز عائشہ رضی اللہ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو بے تکلف آتی تھی، تو یہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب زیادہ مائل فرمایا، پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت و فتاہت اور حسن سیرت سونے پر سہاگا تھا، اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے، جو پہلے مذکور ہوئے کہ حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر کیوں نہ ہوتی؟ مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے ساتھ برابر تھا۔

### حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نو سال کی تھی، وہ بالکل بچی تھیں اور بچران کے کوئی بی بی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کنواری نہ تھیں، اس

ہیں حکمت یہ تھی کہ آپ کو امت کو یہ دکھانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو، اس کو کنواری بیگی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟ عموماً عبادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہوا کرتا ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کے بچپن کی عمر کا تقاضہ تھا، ان کے بچپن کی پوری رعایت فرماتے تھے۔

## حشیشوں کا کھیل

چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قریب میں حشیش لڑ کے عید کے دن کھیل کود رہے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حشیشوں کا کھیل دیکھو گی؟ انہوں نے خواہش ظاہر کی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ کر کے دیر تک ان کو کھیل دکھایا اور محض کہنے میں تو کھیل تھا، ورنہ ورزش اگر اچھی نیت سے ہو تو عبادت ہے اور چونکہ ان کھیلنے والوں کو دیکھنے میں کوئی فتنہ نہ تھا، اس لیے یہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اجنبی مردوں کو کیسے دیکھا؟ اور جب تک وہ خود ہی نہ بہت گئیں، اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر کھڑے ہو کر ان کو کھیل دکھاتے رہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بچپن کی وجہ سے گڑبوں (یہ نام کی گڑیاں تھیں تصویر نہ تھی) کے کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لیے آتی تھیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہو جاتیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جمع کر کے پھر لانے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو؟ جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو۔

## بیوی کی رعایت

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت بھی کی کہ دیکھیں کہ کون آگے نکلتا ہے؟ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہلکی پھلکی تھیں، وہ آگے نکل گئیں کچھ عرصہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مسابقت کی، اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بدن بھاری ہو چلا تھا، اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اس کا بدلہ ہے، فرمائیے! کنواری بیگی کی دل جوئی اور ولداری اور اس کے جذبات کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی؟ حاشا وکلا! بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے، مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو بی بی کے ساتھ کرنا چاہئے، بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا تھا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا۔

## وقار کا بھوت

آج کل جو لوگ وقار، وقار پکارتے ہیں، یہ وقار ”تکبر“ کا پونلہ ہے، ان لوگوں نے تکبر کا نام ”وقار“ رکھا ہے، یاد رکھو! وقار کے خلاف وہ کام ہے جس میں دین پر بات آتی ہو اور جس میں دینی مصلحت پر کوئی اثر نہ پہنچے، محض اپنی عرفی سبکی ہوتی ہے، تو ایسا کام عین تواضع ہے، آج کل جو لوگ وقار کا پونلہ بغل میں دبائے ہوئے ہیں، وہ بیوی کے ساتھ دوڑنے کو خلاف وقار سمجھتے ہیں، مگر وہ زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت کی ہے، تو کیا معاذ اللہ! وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اور اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے ایمان کی خیر نہیں، یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا، ہاں تکبر کے خلاف ضرور تھا، پس آج کے مدعیان تکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوڑ کر دکھلائیں، مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہوگا، ہاں! جو شخص متکبر نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تیج ہوگا، وہ ضرور ایسا کر سکتا ہے اور محمد ﷺ نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے۔

## حکمت چہارم

ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں، ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع اور موجب سہولت ہو سکتا ہے، دوسری عورتوں کے لیے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں، ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں، تو یہ نہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ واسطہ متعدد ہوں تا کہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کے برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہو سکتا، غرض یہ حکمتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونے کے طور پر چند بیان کر دی گئی ہیں، ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو ہم طویل چاہتے، ان وجوہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح کیے ہیں، ورنہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو بالکل صبر کر لیتے اور جس طرح پوری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گزار دی، بڑھاپے کو بھی ایک بیوہ کے ساتھ گزار سکتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے، متعدد نکاح کیے، جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترک لذت زہد کے لیے لازم نہیں، بلکہ صرف آفقیل لذات کافی ہے، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترک نکاح ضرور فرماتے۔

(وعلقہ آفقیل الکام ص ۳۴)

## پندرہواں اعتراض..... نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج فرمانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاج فرماتے تھے، اس میں بھی حکمت تھی، ایک تو تطہیب قلوب (دلوں کا خوش کرنا) اصحاب تھی اور دوستوں کا دل خوش کرنا بھی عبادت ہے، میں نے اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب رحمہ اللہ سے سنا ہے کہ ایک دفعہ وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں دیر تک بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے، جب اٹھنے لگے تو حضرت رحمہ اللہ نے عرض کیا کہ آج میں نے حضرت رحمہ اللہ کا وقت بہت ضائع کیا، حضرت رحمہ اللہ کی عبادت میں خلل ڈالا، حاجی صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کیا نفلیں پڑھنا ہی عبادت ہے؟ دوستوں سے باتیں کرنا عبادت نہیں؟ یہ تم نے کیا کہا کہ وقت ضائع کیا؟ نہیں! بلکہ سارا وقت عبادت ہی میں گزرا، اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ صبح کی نماز کے بعد بعض دفعہ مصلے پر بیٹھے رہتے تھے اور اشراق کے وقت تک دوستوں سے باتیں کرتے تھے، عامی تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ وقت عبادت سے خالی گزرا، مگر مولانا رحمہ اللہ اس کو بھی عبادت میں مشغول سمجھتے تھے، کیونکہ تطہیب قلوب مومن بھی عبادت ہے، پس ایک حکمت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں یہ تھی۔

## مزاج کی دوسری حکمت

دوسری حکمت وہ تھی جو مجھے خواب میں بتلائی گئی میں نے شباب میں خواب دیکھا کہ ملکہ وکنوڑیہ ایک ایسی سواری میں سوار ہے، جس میں نہ انجن ہے، نہ گھوڑا، نہ نبیل، اس وقت تو میں اس سواری کی حقیقت کو نہیں سمجھتا تھا، مگر اب موٹر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ لاری موٹر کی شکل میں تھی اور میں نے دیکھا کہ ملکہ کی سواری تھا نہ جھون کی گلیوں سرکوں میں پھر رہی ہے، پھر تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے کو بھی اس سواری میں سوار دیکھا، اس وقت ملکہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں، صرف ایک بات کھکتی ہے، اگر صل ہو جائے تو پھر اسلام کے حق ہونے میں مجھے کوئی اشکال نہ رہے گا، میں نے کہا بیان کیجئے، وہ شبہ کیا ہے؟ کہا: حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاج بھی فرماتے تھے (اور مزاج وقار کے خلاف ہے، نبی کے لیے وقار کا ہونا ضروری ہے، یہ اشکال سلاطین ہی کے مذاق کے مناسب ہے، کیونکہ وقار، خودداری کا سب سے زیادہ اہتمام انہی کو ہوتا) میں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں بڑی حکمت تھی، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب و جلال اس درجہ عطا فرمایا تھا کہ ہر قل و کسریٰ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے تھراتے تھے۔ حدیث میں ہے: ”نصرت بالرب مسیرة شہر“

کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد رعب سے بھی کی ہے جو ایک مہینہ کی مسافت تک پہنچا ہوا ہے، یعنی اس مخلوق پر بھی آپ کا رعب طاری تھا جو بقدر ایک مہینہ کی مسافت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور تھے، پاس والوں کو تو کیا ذکر! اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑی چیز ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان کے نام سے بھی سلاطین کا نپتے تھے، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت خالد رضی اللہ عنہ و امثالہا) اور یہ معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف سلطان نہ تھے، بلکہ رسول بھی تھے اور رسول کا کام یہ ہے کہ امت کی ظاہری و باطنی اصلاح کرے، جس کے لیے افادہ و استفادہ کی ضرورت ہے اور افادہ اور استفادہ کی شرط یہ ہے کہ مستفیدین کا دل مربی سے کھلا ہوا ہو، تا کہ وہ بے تکلف اپنی حالت کو ظاہر کر کے اصلاح کر سکیں اور جس قدر رعب و جلال خدا تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا تھا، وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو استفادہ سے مانع ہوتا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ مصلحت سے مزاح فرماتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل کھل جائیں اور وہ ہر وقت مرعوب رہ کر اپنے دل کی باتیں بیان کرنے سے نہ رکیں اور یہ مسلم نہیں کہ ہر مزاح خلاف وقار ہے، خلاف وقار صرف وہ مزاح ہے جس میں کوئی مصلحت و حکمت نہ ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار و عظمت میں کمی نہ آئی تھی، بلکہ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب میں انشراح پیدا ہوتا اور وہ انقباض جاتا رہتا تھا جو غایت رعب کی وجہ سے قلوب میں عادتاً پیدا ہوتا ہے، جس کا ثمرہ یہ تھا کہ قلوب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں ہوتی تھی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزاح نہ فرماتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوپر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف ہی غالب ہوتا، محبت غالب نہ ہوتی اور جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار میں کچھ بھی کمی نہ ہوئی، بلکہ پہلے سے بھی زیادتی ہو گئی کیونکہ پہلے تو وقار و عظمت کا منشا صرف خوف تھا، اب محبت و خوف دونوں مل کر کام کرنے لگے۔

### مزاح سے رعب کب کم ہوتا ہے؟

اگر کوئی یوں کہے کہ مزاح سے تو خوف زائل ہو جاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں ہوتا ہے جہاں مزاح کرنے والے میں شان رعب کم ہو اور وہ مزاح بکثرت کرے اور اگر شان رعب بہت زیادہ ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت احادیث میں وارد ہے اور مزاح بھی بکثرت نہ ہو، تو اس صورت میں مخاطب بے خوف نہیں ہو سکتا، چنانچہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے اور احادیث سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کس اور کتنی اور جب کبھی کسی بات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قصہ آ گیا ہے تو صحابہ

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کیا حالت ہوتی تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے قوی القلب شجاع بھی تھرا جاتے تھے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عاجزانہ التجا کرنے لگتے تھے، اس جواب کے بعد ملکہ نے کہا کہ اب میرا اطمینان ہو گیا اور اب مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں رہا۔  
(الحمد وودو القیود ص: ۹)

سولہواں اعتراض..... مرتد کا درجہ کافر اصلی سے کیوں بڑھا ہوا ہے؟

جواب:

ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ بعد قبول کے ترک کر دے، دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے، چنانچہ تو انین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں، بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں، ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں، یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں، یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں، مگر باغی کے بجز قتل یا عبور دریا سے شور کے کچھ سزا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توجہ ہے۔

ارتداد کا انجام

اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توجہ ہے اور اس کی تعلیم کو دوسرے کی نظر میں حقیر کرنا ہے، دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے، اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر وہ کبھی آپ کی خدمت و بھجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں: ”مہاں! اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت رہی ہے، دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے“ اور ایک وہ شخص ہے جو سا لہا سال سے آپ کا دوست رہا، پھر کسی وقت مخالف بن گیا، اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہنچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے لوگ اس پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے، اس کا نشاء محض عداوت نہیں ہے۔ اگر دشمن ہوتا تو سا لہا سال تک دوست کیوں بنتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں، اسی لیے مخالف ہو گیا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو، ممکن ہو کہ اس نے دوستی بھی اس نیت سے

کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے، تو مخالفت کی حالت میں مجھ کو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہے، اس کو ضرور کچھ راز کی باتیں معلوم ہوئی ہیں، اس لیے مخالف ہو گیا، چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا بناؤا کرنے کا ارادہ کیا تھا:

”وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُونَا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيْنَا لَنُنَوِّجَهُ نَجَارًا وَآكُفِّرُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ يَكْفُرُونَ“

پس ہر چند کہ دوست کے دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے، مگر عادیہ لوگ دوستوں کی مخالفت میں عموماً جلدی متاثر ہوتے ہیں (اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لیے عقلاء و شرعاً قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے، اس لیے شریعت میں مرتد کے لیے دنیاوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔ (محاسن اسلام: ۱۹)

## ستر ہواں اعتراض..... مسلمان کا اقدام علی الکبائر اور اس کی وجہ!

اس کا جواب یہ ہے کہ اقدام جرائم اگر عقیدہ اسلام کا ثمرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو اسلام سے جتنا زیادہ تعلق ہے، مثلاً علماء اقلیاء، صوفیاء ان میں یہ شرہ زیادہ ظاہر ہوتا، کیونکہ قاعدہ ہے کہ مذہب کے ثمرات کا ظہور ان ہی لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے، جن کو مذہب سے زیادہ تعلق ہے، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں اور کفار بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلام سے تعلق زیادہ ہے، وہ جرائم کا ارتکاب کم تو کیا کرتے، وہ شہادت سے بھی احتراز (چمنا) کرتے ہیں۔

## ایک مسلمان کا واقعہ

چنانچہ ہمارے ایک دوست کا جو کہ ”بی اے“ ہیں، واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ریل کا سفر کر رہے تھے، ان کے پاس اسباب پندرہ سیر سے زیادہ تھا، اسٹیشن پر تنگی وقت کی وجہ سے وہ اس کو وزن نہ کر سکے، اس وقت تو جلدی میں سوار ہو گئے، لیکن جب منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بالوں سے جا کر اپنا واقعہ بیان کیا کہ جلدی میں اسباب کو وزن نہ کر سکا، اب آپ اس کو وزن کر لیں اور جو محصول میرے ذمہ ہو، اس کو وصول کر لیجئے، ہاؤ نے انکار کیا کہ مجھ کو فرصت نہیں، تم ویسے ہی سہل جاؤ، ہم تم سے محصول نہیں لیتے، انہوں نے کہا کہ صاحب آپ کو اس معافی کا کوئی حق نہیں، کیونکہ آپ ریلوے کے مالک نہیں ہیں، بلکہ لازم ہیں، آپ کو محصول مجھ سے لینا چاہئے، مگر اس نے

پھر بھی انکار کیا، تو یہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے، اس نے بھی کہا آپ بلا تکلف سامان لے جائیں، ہم آپ سے محصول نہیں لیتے، انہوں نے اس سے بھی کہا کہ معافی کا کوئی حق نہیں ہے، اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر اور اس بابو میں انگریزی میں گفتگو ہونے لگی، وہ یہ سمجھے کہ یہ مسافر انگریزی نہیں سمجھتا ہوگا، کیونکہ ان کی صورت ملاؤں کی سی تھی، غرض ان دونوں نے اس گفتگو میں یدرائے قرار دی کہ یہ شراب پیئے ہوئے معلوم ہوتا ہے، باوجود ہمارے انکار کے یہ محصول دینے پر اصرار کرتا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ صاحب میں نے شراب نہیں پی ہے، بلکہ ہمارا مذہب ہی قسم ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رکھو، اس پر وہ دونوں بولے کہ ہم تو اس وقت اسباب وزن نہیں کر سکتے آخر یہ اسباب اٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر لائے اور سوچنے لگے یا اللہ! اب میں ریلوے کے اس حق سے کیسے سبکدوشی حاصل کروں؟ آخر اللہ تعالیٰ نے امداد کی اور یہ بات دل میں ڈالی کہ جتنا اسباب زیادہ ہے، اس کے محصول کے برابر ٹکٹ اسی ریلوے کے کسی اسٹیشن کالے کر چاک کر دیا جائے اس طرح ریلوے کا حق اس کو پہنچ جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا۔

### دیانت داری کا دوسرا واقعہ

میرے ایک دوست جو ڈپٹی کلکٹر تھے، واقعہ یہ ہے کہ ان کا ایک بچہ ریل کے سفر میں ان کے ہمراہ تھا، جس کا قد بہت کم تھا دیکھنے میں دس سال کا معلوم ہوتا تھا، مگر اس کی عمر تقریباً ۱۳ سال کی تھی اور ریلوے کے قاعدے سے اس عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لینا ضروری ہے، انہوں نے ٹکٹ لینا چاہا تو ساتھیوں نے بہت منع کیا کہ اس کو تیرہ سال کا کون کہہ سکتا ہے؟ آپ آدھا ٹکٹ لے لیجئے، کوئی کچھ نہیں کہے گا، انہوں نے کہا کہ بندے کچھ نہ کہیں گے تو کیا حق تعالیٰ بھی باز پرس نہ فرمائیں گے؟ کہ تم نے دوسروں کی چیز میں تھوڑی اجرت بدول اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا؟ غرض انہوں نے پورا ٹکٹ لیا اور ان کے ساتھی ان کو بے وقوف بناتے رہے مگر:

”اوست دیوانہ کہ دیوانہ شد“

بھلا اس کی نظیر کوئی قوم بھی دکھلا سکتی ہے کہ ایک شخص کو ریل بابو اور اسٹیشن ماسٹر خود کہہ دے کہ تم بلا تکلف اسباب لے جاؤ، ہم محصول نہیں لیتے اور وہ پھر بھی اس پر اصرار کرے کہ نہیں تم کو محصول لینا پڑے گا، تم کو معافی کا کوئی حق نہیں اور جب وہ کسی طرح وصول نہیں کرتے تو یہ شخص خدا کے خوف سے ریلوے کا ٹکٹ مقدار محصول کے برابر خرید کر چاک کر دیتا ہے اور یہ صورت شہادت سے احتراز کرنے کی عام لوگوں کی نظروں میں ہے، ورنہ حقیقت میں یہ شہادت کی قسم نہیں بلکہ صریح واجب کا امتثال ہے۔



## عقیدہ کا اثر

پس اگر اس عقیدہ کا اثر اقدام علی الجرائم ہوتا تو علما، صلحاء، سب سے زیادہ بے باک اور جرائم پر اقدام کرنے والے ہوتے، حالانکہ مسلمانوں میں یہ طبقہ جو اسلام کے حقیقی مرتبہ پہچانتا ہے، سب سے زیادہ جرائم سے بچنے والا اور شہادت سے احتراز کرنے والا ہے، پس معلوم ہوا کہ عقیدہ کا یہ اثر نہیں ہے جو معتزضوں نے سمجھا ہے، بلکہ اس کا اثر جرائم سے رکنا اور گناہوں سے نفرت پیدا ہونا ہے، جس کی وجہ سے میں عنقریب بتلاؤں گا کہ اس عقیدے کا اثر گناہوں سے نفرت پیدا ہونا کس طرح ہے، مگر افسوس:

چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد

عیب نماید ہنرش در نظر

ایسا پاکیزہ مسئلہ جو جرائم کی جزا کاٹنے والا ہے، بداندیش کو اقدام جرائم کا سبب معلوم ہوتا ہے، یہ جواب تو مشاہدہ کے متعلق ہے کہ حسا و مشاہدۃ اس عقیدہ کا یہ اثر جو تم بتلا رہے ہو غلط ثابت ہو رہا ہے۔

## عقلی جواب: ۲

اور جو جواب عقلی اس کا یہ ہے کہ عقیدہ عقلاً اقدام جرائم کا سبب نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے باوجود کبائر کے، عذاب سے معاف کر دیں گے، جس میں تعین نہیں ہے، یعنی کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت الہی بصورت عفو ہے، یا بصورت عذاب؟ پھر اس صورت میں کوئی شخص بھی عذاب سے بے فکر نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ شاید میرے ساتھ قانونی برتاؤ گیا جائے، اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عمنین (نامرد) شخص شرم و ندامت کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہو کر سگھیا استعمال کرے اور وہ اتفاقاً سگھیا کھا کر بلاک نہ ہوا، بلکہ سگھیا ہضم ہو کر اس کے اندر قوت مردی پیدا کر دے، چنانچہ بعض جگہ ایسے واقعات ہوئے ہیں مگر کیا اس اتفاق واقعے سے کسی کو سگھیا کھانے کی جرأت ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ ہر حال سمجھتا ہے کہ زہر کا خاصہ تو بلاک کرنا تھا، مگر اتفاقاً اس شخص میں اس کی خاصیت کا ظہور نہ ہوا تو اس سے یہ خاصیت نہیں بدل گئی اس لیے مردانگی بڑھانے کے لیے سگھیا کھانے کی کوئی نہ اجازت دے سکتا ہے اور نہ ہر شخص اس پر جرأت کر سکتا ہے۔

مراحم خسروانہ سے فریب نہیں کھانا چاہئے

علیٰ ہذا سب لوگوں کو معلوم ہے کہ بعض دفعہ سلاطین و حکام مراحم خسروانہ سے کسی قاتل کو رہا کر دیتے ہیں، مگر اس علم کی وجہ سے ہر شخص کو قتل پر جرأت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قتل کی اصل سزا تو پھانسی ہی ہے اور عمل بھی اکثر اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور مراحم خسروانہ کوئی قانون نہیں، بلکہ مراحم خسروانہ کے بھروسے پر اقدام جرائم کی جرأت نہیں ہو سکتی بعینہ اسی طرح کبار کا بدون عذاب کے معاف ہو جانا بطور مراحم خسروانہ کے ہے، پس اس مسئلہ کو اقدام جرائم کا سبب کیونکر سمجھ لیا گیا؟ بھلا اگر کوئی شخص جنگل میں پاخانہ کرنے جائے اور استنجے کے لیے ڈھیلا توڑتے ہوئے اس کو زمین میں سونے کا گھڑا مل جائے تو کیا اس اتفاق بات پر بھروسہ کر کے کوئی شخص بھی زراعت و تجارت سے مستغنی ہو کر بیٹھ سکتا ہے کہ مجھ کو کبھی اسی طرح پاخانہ کرتے ہوئے سونے کا گھڑا مل جائے گا؟ ہرگز نہیں! اسی طرح اتفاقاً کسی مرتکب کبار کا بدون عذاب کے بخش دیا جانا اتفاق ہے، اس لیے یہ اقدام جرائم کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا، مگر چہر بھی جو لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ اپنی طبیعت کے خبث سے ایسا کرتے ہیں، اس عقیدے کا اس میں کیا دخل.....؟

گنہگاروں کی مغفرت

جواب ۳: پھر یہ جو بعض گنہگاروں کی مغفرت بدون عتاب کے بھی ہو جاتی ہے، اس کی وجہ بھی معلوم ہے کہ مغفرت کیونکر ہوگی؟ یہ بھی کسی عمل صالح کی وجہ سے ہوگی، ابوداؤد کی ایک حدیث شریف سے ابھی یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے، وہ حدیث شریف یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی اور اس طرح کہا: "بإسئلہ الذی لا الہ ہو ما فعلت ذالک" قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا "فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بل قد فعلت لكن غفر الله لك بالخلاص قول لا الہ الا هو"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے یہ کام ضرور کیا (اور تیری قسم جھوٹی ہے، جس کا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے) لیکن حق تعالیٰ تجھے اس اخلاص کی برکت سے بخش دیا جو "لا الہ الا اللہ" کہتے ہوئے تجھے سے صادر ہوا، نہ معلوم اس وقت کس دل سے اس خدا کا نام لیا ہے، جو اس درجہ مقبول ہو گیا، (یعنی اس نے خدا کا نام اس وقت کامل اخلاص سے لیا تھا، اس کی برکت سے حلف کا ذب کا گناہ معاف ہو گیا) اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈگری اس کی کر دی بلکہ محض اس گناہ کی مغفرت کا ذکر فرمانا مقصود ہے، کیونکہ جب وجہ سے اس کا ذب فی الخلف ہونا معلوم

ہو گیا تو اب ڈگری اس کے حق میں کیونکر ہو سکتی تھی؟ تو دیکھئے اگناہ کتنا سنگین تھا کہ جھوٹی قسم کھانی اور وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھانا ایسا ہے کہ جیسا خدا کے سامنے اور ظاہر ہے کہ محل و زمان کی عظمت سے بھی فعل میں عظمت پیدا ہو سکتی ہے، زنا کرنا گناہ ہے، مگر مسجد میں زنا کرنا اور بھی اشد ہے اور اگر کوئی نامعقول کعبہ شریف میں ایسا فعل کرے تو بہت ہی سخت ہے، اسی طرح جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نائب خدا ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے جیسی خدا کے سامنے ہو۔

### ایک شبہ کا ازالہ

شاید کوئی یہ کہے کہ ہم تو اس وقت بھی جو کرتے ہیں، سب خدا ہی کے سامنے کرتے ہیں اور جس جگہ جو کام بھی ہوگا، وہ خدا کے سامنے ہوگا، تو چاہیے ہر جگہ وہی گناہ ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم سے ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تو تم خدا کے سامنے ہو، مگر خدا تمہارے سامنے نہیں ہے اور میرا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قسم کھانا ایسا ہی ہے جیسے خدا کو سامنے سمجھ کر قسم کھانا، خلاصہ یہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں، ایک قرب حسی، یہ تو جہاں ہوتا ہے طرفین سے ہوتا ہے اور ایک قرب علمی، یہ ایک طرف سے بھی ہو سکتا ہے، پس اس وقت جو تم خدا کے سامنے ہو، یہ قرب علمی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تمہارا کوئی حال مخفی نہیں، وہ سب کچھ جانتے ہیں، مگر اس حالت میں تم کو قرب حاصل نہیں، ورنہ ہر شخص کا مقرب ہونا لازم آئے گا اور قیامت میں جو تم خدا کے سامنے ہو گے، وہ قرب جانین سے ہوگا کہ تم بھی خدا تعالیٰ کے سامنے ہو گے اور خدا تعالیٰ بھی تمہارے سامنے ہوں گے، ”لنحسب اقرب البہ من حبیل الوریثہ“ میں قرب علمی مراد ہے، اسی لیے یہ نہیں فرمایا گیا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو، بلکہ صرف اپنا قرب بیان فرمایا ہے، کیونکہ یہاں تماشہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہم سے قریب ہیں، مگر ہم ان سے دور ہیں۔

یار نزدیک تر زمن بہ من است

دین مجب تر کہ من ازوے دورم

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے، جیسی قیامت میں خدا کے سامنے جھوٹی قسم کھانا، جب کہ تم بھی حق تعالیٰ کو اپنے سامنے سمجھو گے۔

(محاسن اسلام ص: ۹)

## اللہ تعالیٰ کا بے انتہا عفو و کرم

جواب ۳: چوتھا جواب یہ ہے کہ بعض گناہوں کا بدوں عقاب کے معاف ہو جانا یہ حق تعالیٰ کا عفو و کرم ہے، اس کو ن کر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ بڑے ہی رحیم و کریم ہیں، جو اپنے بندوں پر بے حد عنایت فرماتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ طبائع سلیمہ میں عنایت و کرم سے طاعات و عبادات کو ترقی ہوتی ہے، نہ کہ سرکشی کو اگر آقا کی عنایات زیادہ ہوں تو اس کی اطاعت کا شوق بڑھتا ہے، وہ نوکر بڑا ہی پاچی ہے جو آقا کی بے حد عنایات کے بعد بھی سرکشی ہی کرے، طبائع سلیمہ تو احسان و کرم و عنایات سے بندہ بے درم ہو جاتی ہیں، اس لیے یہ عقیدہ اقدام علی الجرائم کا سبب ہرگز نہیں، بلکہ جرائم و سرکشی کی جڑ کاٹنے والا ہے، جن لوگوں کی طبائع سلیم ہیں، وہ خدا کی ان نعمتوں اور عنایتوں کو دیکھ کر اور زیادہ عبادت کرتے ہیں، چنانچہ جو لوگ کہ اسلام سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں، ان میں یہ اثر مشاہد ہے، اب اگر اس عقیدہ سے کسی میں اقدام جرائم کا وصف پیدا ہو تو کہا جائے گا کہ یہ اس عقیدہ کا اثر نہیں، بلکہ اس شخص کی کجی طبع کا اثر ہے، جیسا بادشاہ کا کریم ہونا طبائع سلیمہ کے لیے زیادت و فاداری کا سبب ہوتا ہے گو بعض نالائق، بادشاہ کے کرم کی وجہ سے جرائم پر بھی دلیر ہو جاتے ہیں، مگر کیا اس کا سبب بادشاہ کے کرم کو کہا جائے گا؟ یا ان کی بد طبیعتی کو؟ اس کا فیصلہ عقلاء خود کر سکتے ہیں بعض لوگوں کو یہ آیت ”لَا تَغْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا“ سے دھوکا ہوا ہے اور وہ بے فکر ہو گئے ہیں، کیوں وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کر دیں گے، کیونکہ ”لَسُنُ يَغْفِرُ“ کی قید نہیں ہے، سوائے کوسمجھ لینا چاہئے کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے، بلکہ اس کا شان نزول ان لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے، مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کیے ہیں، ان کا کیا حشر ہوگا؟ آیا اسلام کے بعد ان پر مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟ اگر مؤاخذہ ہوا تو پھر اسلام ہی سے کیا فائدہ؟

## کفر سے پہلے والے گناہ

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ”لو اسلمنا فما يفعل بذنوبنا التي اسلفنا او كما قالوا“ کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں کیے گئے ہیں سب معاف ہو جائیں گے، پس اس

میں مغفرت کا دعویٰ حتمی ہے، وہ عام نہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدوں عقاب کے معاف نہ ہوں گے، نہیں دوسرے کے بھی معاف ہوں گے، جیسا کہ پہلے بیان کیا ہوں، لیکن ان کے لیے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے: "وَسِعَ غُفْرُ مَا ذُكِرْتُمْ بِهِ"۔ جس میں حتمی وعدہ نہیں کیا، بلکہ مشیت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید حتمی وعدہ کیا گیا ہے، یہ صرف نومسلموں کے لیے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو رہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے، بہت سے انصوفی اظہار عام ہیں، لیکن شان نزول سے ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔ (وعظ محاسن اسلام: ۸)

### اشھارواں اعتراض..... مسلمانوں کا جانوروں کو ذبح کرنا عقل و نقل کی روشنی میں!

دوسری قوموں کا یہ شبہ کہ یہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں کہ انہیں جانوروں کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آتا، محض ناواقفی یا تعنت (سرکشی زیادتی) سے ناشی (پیدا ہونے والی) ہے، مگر عجیب بات ہے کہ یہ شبہ اور اعتراض فقط گائے کی قربانی کے متعلق ہے، چوہے، بکری، مرغی، کیوتر کے متعلق نہیں، معلوم ہوتا ہے دل میں کالا ہے، یعنی اس شبہ کا سبب ترحم نہیں ہے، بلکہ محض حمیت مذہبی ہے اور اگر کوئی ذین آدمی مذہب سے قطع نظر کر کے سب جانوروں کے متعلق یہی الزام دے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے یہ خبر کہ مسلمان نرم دل ہوتے ہیں یا سخت دل؟ پس ان کا اعتراض اگر حمیت مذہب سے نہیں تو ناواقفیت سے ضرور ہے، پس ان کا یہ فیصلہ بہت ہی ظاہر ہے، مگر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے علماء مناظرین نے معلوم جواب میں کہاں کہاں پہنچتے ہیں؟ لیکن ان پر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہاں تحقیق مقصود نہیں ہوتی، محض الزام و اسکاٹ (خاموش کرنا) مقصود ہوتا ہے، باقی جہاں تحقیق منظور ہوتی ہے وہاں حق تعالیٰ کی جانب سے اصل حقیقت کا القاء ہوتا ہے، سوا الحمد للہ! حق تعالیٰ نے اس وقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھائی کہ انہیں کیا خبر کہ مسلمانوں میں رحم نہیں؟ اب آپ سب مسلمانوں کو ٹول لیجیے کہ ذبح کے وقت قلب کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کڑھتا ہے؟ یا نہیں؟ بعض موجودہ بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے، آخر یہ کیا بات ہے؟ رحم اور کسے کہتے ہیں؟ لیکن اس سے بڑا کمال مسلمانوں کا عدل (انصاف) ہے کہ ایک ہی طرف نہیں چلے گئے۔

"وَوَكَّلْنَاكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا"

وسط کی تفسیر عدل ہے کہ اعتدال ہو، قوت و عمل دونوں ہیں کہ جزیرہ و بلاہت کے وسط میں حکمت، جہن و تہذیب کے وسط میں شجاعت، اسی طرح قوت شہو یہ خمود فوج میں توسط عفت ہے اور تینوں کے مجموعہ یعنی حکمت اور شجاعت و عفت کا نام عدل ہے، تو یہ امت عادلہ ہے، حق تعالیٰ نے احکام ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر صفت عدل کم ہو تو ان احکام کے برتنے سے درست ہو جائے، نہ افراط ہو کہ چھری ڈال دو اور نہ تفریط کہ رحم ہی نہ ہو، غرض دونوں میں اعتدال رکھو، تو ہمارا کمال یہ ہے کہ رحم بھی ہے اور چھری بھی پھیرتے ہیں مگر یہ سمجھ کر:

”آنکھ جان بخشد گر بخشد رواست“

اگر کوئی کہے کہ انہوں نے تو مارا نہیں، تو اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں دیتے ہیں:

”نائب است او دست او دست خداست“

یہ تو مسلم ہے کہ جان جس کی دی ہوئی ہو، وہ لے سکتا ہے، ہم اس کے نائب ہیں، اس نے ہمیں حکم دیا ہے، اس لیے ہم نے چھری پھیر دی، باقی ہم نے جان نہیں نکالی، ہم نے تو فقط راستہ کھول دیا ہے، جان تو انہی نے نکالی ہے، پھر کیا شبہ رہا اہل اسلام پر کہ بڑے سنگدل ہوتے ہیں؟ آپ بڑے رحم دل ہوتے ہیں کہ خود چوہے نہیں مارتے مسلمانوں کے محلے میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہ ماریں جب تم ہمیں موش کشی میں اپنا نائب بناتے ہو، تو اگر اللہ تعالیٰ نے گاؤ کشی میں ہمیں اپنا نائب بنایا تو کیا قیاحت ہوگئی؟ اللہ تعالیٰ کی نیابت میں یہ فائدہ بھی ہے کہ مارو اور کھاؤ اور تمہاری نیابت میں تو فقط مار کر پھینک دینا ہی ہے اور کچھ بھی نہیں، سبحان اللہ! یہ رحم دلی ہے کہ ہم سے نہیں مارے جاتے تو تم مارو، نیابت اور کسے کہتے ہیں؟ یہ تو زبان سے بھی کہنے سے بڑھ کر ہے، اگر زبان سے کہتے تو ایک مسلمان بھی نہ کر سکتا، کیونکہ یہ کس کی غرض تھی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تمہارے گھروں اور دوکانوں پر چوہے مارنے جاتا مگر ان کے گھر لاکر چھوڑ دے کہ اچھی طرح ان کو مار سکیں۔

## ایک حکایت

یہ رحم تو ایسا ہی ہو گیا کہ کسی شخص کی بے حیا بہن تھی، اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے؟ حیا کی وجہ سے منہ سے تو نہ کہہ سکی، مگر بتلانا بھی ضروری تھا تو اس نے کیا کیا لہنگا اٹھایا، اس کے سامنے موٹا اور پھانڈ گئی، مطلب یہ کہ ندی پار گیا ہے تو حضرت! بعض ترحم بھی ایسا ہوتا ہے کسی نے زنا کیا ”حمل رہ گیا“ رسوائی ہوئی لوگوں نے کہا: کم بخت! تو نے عزل کیوں نہ کر لیا؟ (عزل انزال سے پہلے علیحدہ ہو جانے کو کہتے ہیں) تو آپ کہتے ہیں کہ ساتھ کہ عزل مکروہ ہے، کم بخت منحوس! افسوس! اور زنا کون سا فرض ساتھ؟ بعضوں کا تقویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے، یہ تو ترحم ویسا ہی

جیسی اس بہو کی شرم تھی کہ منہ سے بولنے میں تو حیا تھی اور لہنگا کھول کر سامنے بیٹھ جانے میں لاجمانہ تھی اور پھر مسلمانوں پر اعتراض! حضرات! میں تقسیم کہتا ہوں کہ ترحم مسلمانوں کے برابر کسی قوم میں نہیں، مگر امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے، کسی کا قطعہ ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

دے کر قسم کہے کہ تو میرا لہو پیئے  
گر پٹی نہ جائے جلد سے پیالہ شراب کا!  
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو  
گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا!  
اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام  
عامل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

### مسلمانوں کی رحم دلی

دنیا کے واقعات نے کھلم کھلا ثابت کر دیا ہے کہ ترحم کے موقعوں پر ترحم کرنا، یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے، مسلمانوں کے برابر کوئی قوم رحم دل نہیں، میرے پاس ایک بڑھن کا خط آیا تھا کہ مسلمانوں ہی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جو مارتے ہیں، مثلاً گاؤں، کشتی وغیرہ کرتے ہیں، مگر وہ ”جیوگا“ نہیں مارتے (”جیوگا“ آدمی کے لٹس کو کہتے ہیں) مگر یہ معترض قوم ”جیوگا“ مارتی ہے، یعنی آدمیوں پر ظلم کرتی ہے، مجھے اس شخص کے قول نقل کرنے سے فقط یہ مقصود ہے: ”الحق ما شهدت به الاعداء“ یعنی جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اب تو کئی شہادتیں ہو گئیں کہ مسلمان بڑے رحم دل ہوتے ہیں، بہر حال ان کی رحم دلی ثابت ہو گئی۔  
(دعوت روح لعل و اشعاع ص: ۱۵)

### انیسواں اعتراض..... ذبح کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب!

ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں، بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبح ہو کر مرنا بہتر ہے، کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے، رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو ذبح کر دیا جائے تو اسے، تاکہ آسانی سے مرجایا کرے، اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دیدہ و دانستہ قتل کرنا ہے اور حالت یاس پتہ نہیں چل سکتی، کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرے کے قریب ہو گئے تھے، پھر اچھے ہو گئے اور شبہ حیوانات میں کیا جائے کہ ان کی تو یاس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا، جواب یہ ہے کہ بہائم اور انسان میں فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کا تو

إبقاء (باقی رکھنا) مقصود ہے، کیونکہ خلق عالم سے وہی مقصود ہے، اس لیے ملائکہ کے موجود ہونے سے اس کو پیدا کیا گیا، بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا، کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوا کرتا ہے، اس لیے انسان کے قتل اور ذبح کی اجازت نہیں دی گئی، ورنہ بہت سے لوگ ایسی حالت میں ذبح کر دیے جائیں گے، جس کے بعد ان کے تندرست ہونے کی امید تھی اور ذبح کرنے والوں کے نزدیک وہ یاس کی حالت تھی اور جانور کا ابقاء مقصود نہیں، اس لیے ان کے ذبح کی اجازت اس بناء پر دے دی گئی کہ ذبح ہو جانے میں ان کو راحت ہے اور ذبح ہو جانے کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقائے انسانی میں مفید ہے، جس کا ابقاء مقصود ہے، اس کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور یونہی مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ مردہ ہو کر اس کے گوشت وغیرہ میں سمیت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لیے مضر ہوگا، تو ابقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص جہاد میں چونکہ اثناء (فنا کرنا، چلنا کرنا) بعض افراد، بغرض ابقاء، جمیع الناس متعین ہے، اس لیے وہاں قتل انسانی کی اجازت نہیں دی گئی، مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے۔ تلوار سے اور جہاد میں مثلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔ (افنا، لکھنا، ص: ۵)

### بیسواں اعتراض..... مردہ کو دفن کرنا بہتر ہے یا جلادینا؟

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ مردہ کے دفن کا حکم دیا گیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں اکرام ہے اور احراق (جلادینا) میں اس اصل سے عدول ہے، بعض مدعیین فلسفہ جلانے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کرنے کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہوتی ہے اور اس سے جو بخارات اٹھتے ہیں، وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں، اس طرح کے نکتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے، مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفن کی قبر پر ہمیں بد بو نہیں آتی، مگر مرگھٹ پر اس قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی، ایسے مہمل سکتے تو ہر چیز میں بیان ہو سکتے ہیں، مگر سلامتی فطرت حق و باطل کا فیصلہ خود کر لیتی ہے، بلکہ قتل تو دفن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا، باقی خاک ہونا اصل ہے، سو اس کی دلیل یہ ہے کہ غیر عنصر کا اپنی چیز کی طرف میلان ہے۔ اگر کوئی شخص کو مٹھے پر اچھلے اگر وہ اوپر چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی، اب تو خاک غالب ہے اور آب (پانی) کا غلبہ نہ ہونا بھی ظاہر ہے، ورنہ آب میں پہنچ کر عمق کی طرف نہ جاتا، بس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ ”مسل ششی یرجع“



الی اصلہ“ (ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے) تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق ہے اور اس کے ماسوا سب فطرت سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے، باقی احراق (جلانے کی) کی رسم کیسے نکلی؟ سو ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پرانی تاریخ میں اوتار اور دیوتاؤں کی معاشرت کا ذکر ہے، یہ وہ جن تھے غالباً ان کے شرائع اور تھے اور انسان کے اور تو ان عنصر غالب یعنی ناراکا مقتضی عقلی یہ تھا کہ بعد موت ان کے ابدان کو اسی میں ملا دیا جائے، چونکہ ان میں آگ غالب تھی، اس لیے آگ میں جلادیے جاتے تھے، یہ قصے ان کی کتابوں میں مذکور ہوں گے، جہالت اور نادانی سے خدا بچائے، یہ ایسے بزرگوں کی سنت سمجھ کر خود بھی یہی کرنے لگے:

”چوں ندیدند حقیقت افسانہ زوند“

گو یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں مگر قرآن سے یہی مؤید ہے۔

(وعظ روح الحج و الحج ص: ۱۳)

## حصہ دوم

## روافض کے اعتراضات کے جوابات

پہلا اعتراض..... وصال حضور ﷺ کا دوات مانگنا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما

کا یہ کہنا کہ کیا ضرورت ہے؟

(الف) یہ اعتراض حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نہیں، بلکہ اس میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کتمان حق کا اعتراض لازم آتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام فرض تھی۔ اگر کوئی حکم واجب تھا تو آپ نے کیوں نہ ظاہر فرما دیا؟ اگر اس وقت قلم نہیں آئے تو دوسرے وقت منگا کر تحریر فرما دیتے، کیونکہ آپ کئی روز اس واقعہ کے بعد زندہ رہے ہیں، چنانچہ یہ واقعہ پچھنچہ کا ہے اور وفات دوشنبہ کو ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نیا حکم ارشاد فرمانا نہ تھا، بلکہ کسی امر قدیم کی تجدید تاکید مقصود تھی۔

(ب) چونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمجھ گئے، اس لیے آپ نے گوارا نہ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف فرمائیں، اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب کسی کو زبانی نسخہ بتلا دے، پھر براہ راست شفقت کہے کہ قلم دوات لاؤ، لکھ دوں اور سرلیٹس یہ دیکھ کر کہ اس وقت ان کو تکلیف ہوگی کہے کہ کیا حاجت ہے؟ اس وقت تکلیف مت دو۔

الزامی جواب:

اور جواب الزامی یہ ہے کہ قصہ حدیبیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ لکھا تھا: ”ہذا ما قضی علیہ محمد رسول اللہ“ کفار نے مزاحمت کی کہ ”ابن عبد اللہ“ لکھو کیونکہ اس میں تو جھگڑا ہے، اگر ہم رسالت کو تسلیم کر لیں تو نزاع ہی کس بات کی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اس کو منادو، انہوں نے انکار فرمایا، پس ایسی سختی تو اس میں بھی ہوئی، جس طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مخالفت کی تھی، پھر فرمایا کہ جواب الزام مجھے پسند نہیں ہے، مگر بطور لطیفہ کے اس وقت بیان کر دیا۔

(مجادلات معدلت حصہ اول، ہجرت عبدیت ص: ۲۳۳)

دوسرا اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اول کیوں نہیں بنایا

جواب اول:

ہمارے بعض بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے لڑتے ہیں کہ شیخین نے خلافت لے لی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دی، میں کہتا ہوں کہ شیخین کے لیے دعا کیجئے اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اول سے خلافت دے دی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت و تعب دین کے لیے اور قلت دنیا کے لیے معلوم ہو چکی، تو ان کو کس قدر مزید تکلیف ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی، ان حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس منصبیت کو خود بانٹ لیا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تکلیف نہ پہنچنے دی اور جو بچکان حضرات میں شکر رنجی ہوئی، اول تو بہت واقعات غلط مشہور ہیں، دوسرے جب اتحاد اور دوستی ہوتی ہے تو شکر رنجی بھی ہو ہی جاتی ہے، مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اپنے دو حامدوں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے، پوچھا تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ انہوں نے عرض کیا حضور! کبھی کبھی ہو جاتی ہے، مگر پھر اتحاد ہو جاتا ہے، فرمایا کہ تمہارا اتحاد پائیدار ہے، ذوق کہتا ہے:

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے!

بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے!

ایک اعرابی حکیم لکھتا ہے: "ویسقی الود ما یسقی العناب" (جب تک عتاب رہتا ہے محبت باقی رہتی ہے) اور جب اس کی یہ ہے کہ ذوق جب باقی رہتی ہے کہ دل میں غبار باقی نہ رہے اور اگر عتاب نہ کیا جائے اور بات کو دل میں رکھا جائے تو عمر بھر بھی دل سے گدو ست نہ نکلیگی اور اگر دل کی بھڑ اس نکال لی جائے تو پھر دل صاف ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو کہ سب سے زیادہ محبت اور محبوب تھیں، وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہاری خوشی و ناراضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی ہو تو قسم میں "لا ووب السراھیم" (نہیں ابراہیم کے رب کے قسم) کہتی ہوں اور جب خوش ہوتی ہو تو قسم میں

”لا ورب محمد“ کہتی ہو، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتی تھیں: ”وہ لہو! ہاجر لا اسمک“ (میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں) کہ حضور اس وقت صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بے ہوئے ہیں، تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوئی بھی ہو تو باہم ایک دوسرے پر ناز ہے، ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔

## ایک واقعہ

کاپور میں ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میں ان سے ملا، انہوں نے وہی تذکرہ چھیڑا اور یہ حدیث پڑھی: ”مَنْ سَبَّ أَصْحَابِي فَقَدْ سَبَّنِي وَ مَنْ سَبَّنِي فَقَدْ سَبَّ اللَّهَ“ اور کہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہہ دیتے تھے، تو وہ حدیث کے مصداق ہو گئے۔ میں نے کہا کہ صاحب! آپ نے غور نہیں کیا؟ اس حدیث کے یہ معنی نہیں جو آپ نے سمجھے بلکہ اس کے معنی دوسرے ہیں، ان کے سمجھنے کے لیے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا، میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا تو اب بتلائیے کہ یہ وعید کس شخص کے لیے ہے؟ آیا اپنی دوسری اولاد کے لیے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو ان کے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا، یا غیروں اور اجانب کے لیے ہے؟

ظاہر ہے کہ اجانب کے لیے یہ وعید ہے، بس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو برا کہے اس کے لیے یہ حکم ہے۔ (فضائل الخیص: ص ۳۶)

## شیخین رضی اللہ عنہما کے احسانات

ب: میں بتسم کہتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل سے پوچھا جائے تو وہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے احسان مند ہوں گے کہ انہوں نے ان کو مصیبت سے بچالیا کیوں کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت شایان اودھ کی سی بادشاہت نہ تھی کہ رات دن عیش و مستیاں کرتے ہوں، وہاں تو ایسی بادشاہت تھی کی ایک دن گرمی کی سخت دوپہر میں جب کہ لوچل رہی تھی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تنہا جنگل کی طرف جا رہے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیر المؤمنین ہیں جب ان کے گھر سے قریب ہوئے تو آواز دی کہ امیر المؤمنین اس وقت سخت گرمی اور لو میں کہاں جا رہے ہیں، فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ ضائع ہو گیا ہے، اس کی تلاش میں جا رہا ہوں، انہوں نے عرض کیا: ”کسی خادم کو نہ بھیج

دیا؟ فرمایا کہ قیامت میں تو سوال مجھ سے ہوتا، خادم سے سوال نہ ہوتا، عرض کیا: ”پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو وقف کر کے تشریف لے جائیے زرا گرمی کم ہو جائے، فرمایا: ”نار جہنم اشد حرا“، جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، یہ کہہ کر اسی دھوپ اور لوہ میں جنگل تشریف لے گئے، یہ سلطنت تھی! ایک بار آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ پڑھ رہے تھے، خطبہ میں فرمایا: ”اسمعوا واطیعوا“ (سنو اور مانو) ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: ”لا نسمع ولا نطیع“ (نہ نہیں گے اور نہ مانیں گے) آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کیوں؟ اس نے جواب میں کہا آپ نے دو کپڑے پہن کر رکھے ہیں جو مالِ نینمت سے تقسیم ہوئے ہیں، مگر سب کے حصہ میں تو ایک کپڑا آیا تھا، آپ نے دو کپڑے کیسے لیے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”بے شک تم سچ کہتے ہو! اے عبداللہ! تم اس کا جواب دو، اسی پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: امیر المؤمنین کے پاس آج کوئی کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر نماز پڑھاتے، تو میں نے اپنے حصہ کا کپڑا ان کو عاریتاً دے دیا ہے، اس طرح ان کے پاس دو کپڑے ہو گئے، جن میں سے ایک کی لنگی بنائی اور ایک کی چادر یہ جواب سن کر سائل رونے لگا اور کہا: جزاک اللہ خیر! اب آپ خطبہ پڑھیں، ہم نہیں گے اور اطاعت کریں گے، یہ ان حضرات کی حکومت تھی کہ رعایا کا ہر شخص ان پر روک ٹوک کرنے کو مجبور تھا، تو ایسی صورت میں خلافت کوئی راحت کی چیز تھی؟

### کیا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ طالب دنیا تھے؟

تو کیا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہو سکتے تھے؟ کبھی نہیں! دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ خلافت بڑی راحت کی چیز تھی تو اس کی وہ تمنا کرے جس کے دل میں دنیا کی ہوس اور وقعت ہو، تو کیا نعوذ باللہ! ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دنیا اور طالب دنیا سمجھ رکھا ہے جو وہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوئے ہوں گے، اگر وہ ایسا سمجھیں تو ان کو یہ خیال مبارک ہو، ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر میں دنیا کی کچھ بھی وقعت یا ہوس نہ تھی، کیونکہ ان کو تعلق مع اللہ کی سلطنت حاصل تھی جس کی خاصیت یہ ہے کہ:

آں کس ترا شناخت جان را چہ کند

فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

• پھر خلافت دہریں ملی تو کیا؟ اور نہ ملتی تو کیا؟ ان کو کبھی بھی اس کا رنج نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو اس سے خوش ہوتے، پھر جس بات سے ان کو خوشی ہو آپ اس میں رنج کرنے والے کون ہیں؟ یہ وہی

مثلاً ہوئی: مدعی سست گواہ چست، اسی کی بے وقعتی کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مال و بنون زینت  
حیات دنیا ہیں۔ (مظاہر الآمال صفحہ: ۱۹)

### گمراہ فرقہ کا غلط دعویٰ

ج: ایک فرقہ ضالہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بلا فصل ایک حدیث سے ثابت کی  
ہے جس سے حضرت کی نسبت: "لحمک لحمی و دمک دمی" آیا ہے اور استدلال اس طرح  
کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے ان کے ہوتے  
ہوئے کسی دوسرے کو خلافت کا استحقاق نہیں تھا، اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ حدیث ثابت نہیں،  
دوسرے میں کہتا ہوں کہ اگر اس سے عینیت حقیقہ مراد ہے تو اس سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی  
خلافت ہی کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ خلیفہ تو غیر ہی ہونا چاہئے، کوئی شخص خود اپنا خلیفہ نہیں ہوا کرتا، بس  
بہت سے بہت تم یہ کہہ سکتے ہو کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ  
تھے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھی خلیفہ تھے، تو اس میں ہم تم سے نزاع نہ کریں گے۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی

گو مشت خاک ماہم برباد رفتہ باشی

مگر ان کا مدعا تو باطل ہو گیا اور ایک جواب دوسرے علماء نے دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ عین رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ ان کا نکاح  
کیسے ہوا، یہ تو حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں معاذ اللہ! سخت گالی ہوگی اور اگر  
عینیت حقیقہ مراد نہیں اور یقیناً مراد نہیں، بلکہ صرف عینیت عرفیہ مراد ہے، جیسا کہ صوفیہ حضور صلی  
اللہ علیہ وسلم کو اسی معنی سے عین حق کہتے ہیں، تو پھر یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ خاص  
نہیں، یہ معنی کریں تو ہر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عین رسول تھا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سبھی کو  
تعلق تھا کسی کو بھی اجنبیت نہ تھی۔ (ارضاء الحق حصہ دوم صفحہ: ۱۲)

## تیسرا اعتراض..... ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن بھی اہل

### بیت میں داخل ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے ”اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا“ کہ اللہ! آل محمد کا رزق بقدر قوت کیا جائے اور بقدر قوت وہ ہے جس میں بقدر کفایت گزار ہو جائے کچھ فاضل نہ ہو اور اس میں شک نہیں کہ ازواج مطہرات بھی آل محمد میں داخل ہیں، اس لیے دعا ان کو بھی شامل تھی اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہے، بلکہ اصل مقصد لغت یہ ہے کہ ازواج تو آل محمد میں اصالتاً داخل ہوں اور ذریت تبعاً داخل ہوں، کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو، یعنی گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے، پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہو اور ازواج داخل نہ ہوں، بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے، وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و حضرات حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا ”اللھم ہولاء اہل بیتی“ کہ اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں، حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں، ان کو بھی ”انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اہل البیت ویطہرکم تطہیر“ (اے اہل بیت! اللہ تم سے چاہتا ہے کہ گندگی دور فرمادے اور تم کو خوب اچھی طرح پاک و صاف کر دے) کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے، یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو عبا میں داخل فرما کر یہ دعا کی، تو ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو عبا میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں، تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو، دوسرے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اجنبی تھے، ان کے ساتھ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو عبا میں کیونکر داخل کیا جاسکتا تھا؟ یہ اشکالات کا جواب تھا اور اصل دعا کے لیے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد میں ازواج اولاد داخل ہیں، دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے۔ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب کہ ملائکہ نے ان کو ولد کی

بشارت دی اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو اس بشارت پر تعجب ہوا، ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے:

”قَالُوا اتَّعَجِبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَةً لِلَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَجِيدٌ“  
ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہ رضی اللہ عنہا یقیناً داخل ہیں کیونکہ خطاب انہیں سے ہے، معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔ (النسوان فی رمضان صفحہ ۴۰)

**چودھواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ بعض علوم سینہ بہ سینہ ہیں!**

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

”سئل هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشئى دون الناس؟ قال الا

فهما اوتيه الرجل فى القرآن او ما فى هذه الصحيفة“

یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ حضرات (اہل بیت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں دوسروں سے الگ بتائی ہیں؟ فرمایا: ”نہیں! مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قرآن کا فہم (خاص درجہ میں) عطا فرمادیں (تو وہ دوسروں سے زیادہ صاحب علوم ہو جائے گا) یا وہ چند باتیں جو اس صحیفہ میں ہیں، اس کو دیکھا گیا تو اس میں دیت وغیرہ کے کچھ احکام تھے جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مخصوص نہ تھے، بلکہ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس علم تھا، مقصود اس سے نفی کرنا تھا تخصیص کی، اس سے معلوم ہوا کہ فہم میں تفاوت ہو سکتا ہے، جس کی وجہ سے ایک شخص کو قرآن سے وہ علوم حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ قرآن سے خاص مناسبت تھی، اس لیے ان کو بعض دوسروں سے زیادہ قرآن کے علوم حاصل تھے، شاید اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ باتیں دوسروں سے الگ بتائی ہیں، یا کسی نے اڑائی ہو، یہ خیال اسی وقت سے لوگوں میں پیدا ہو گیا کہ بعض علوم سینہ بہ سینہ ہیں، یہ خیال کتاب اور حدیث میں نہیں۔

**سینہ بہ سینہ علم کا موجد**

یہ خیال عبداللہ ابن سبا بنی فرقة سبا نے ایجاد کیا ہے جس سے مقصود اس کا اسلام کا استیصال تھا، کیونکہ عبداللہ بن سبا اول یہودی تھا، پھر بطور نفاق کے مسلمان ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہا کی محبت کا دم بھرنے لگا اور ان کے متعلق مسلمانوں میں غلط اعتقادات پھیلانے لگا، کیونکہ وہ لوگ یہ



کچھ چکے تھے کہ تلوار سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، تو اب انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ احکام اسلام کو غلط کرنا چاہئے اور اس کا ذریعہ یہ نکالا کہ بعض علوم کو سینہ بہ سینہ بتلایا، مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: "انسان نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحاظون" اللہ تعالیٰ نے دین کی خود حفاظت کی ہے کہ احکام میں غلط نہیں ہو سکتا، گو فرق ضالہ (گمراہ فرقہ) اسلام میں بہت ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں، جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے اور یہ تہتر تو اصول کے اعتبار سے ہیں، ورنہ ہر فرقے کے اندر بہت سے فرقے ہوں گے ہیں، بلکہ آج کل تو ہر شخص ایک مستقل فرقہ ہے، کیونکہ ہر شخص دین کے متعلق اپنی الگ رائے قائم کرتا ہے اور اور اس میں بھی حکمت ہے، تاکہ اس تفرق سے پریشانی نہ ہو، کیونکہ اختلاف تو ناگزیر تھا، کسی قدر اختلاف تو ضرور ہوتا، اس عالم میں بنائے حکمت یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی امر میں اختلاف نہ ہو، اب اگر اختلاف کبھی کبھی ہوتا تو طالب حق کو تبعا احتمال ہو سکتا تھا کہ نہ معلوم ان میں سے کون حق پر ہے؟ اور جب روزانہ نئے نئے فرقے نکلتے آتے ہیں تو اس کا اثر طبعاً کم ہو جائے گا اور دیکھنے کا کہ اختلاف کی تو کہیں انتہائی نہیں یہ تو روز کی دال روٹی ہوگی کہاں تک ہر چیز کی تحقیق کیا کریں پس وہ پرانا ہی طریقہ اسلام ہے، بہر حال یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بعض علوم سینہ بہ سینہ ہیں، ہاں! یہ ضرور ہے کہ بعض علوم فہم عالی سے کچھ میں آتے ہیں، عقل متوسط یا ادنیٰ ان کے لیے کافی نہیں۔ (الاریاب صفحہ ۴۳)

### صوفیہ پر الزام

اور بعض لوگ صوفیہ کو بھی اس مضمون کے ساتھ بدنام کرتے ہیں کہ ان کے یہاں بھی کچھ علوم سینہ بہ سینہ ہیں، مگر یہ بالکل غلط ہے، صوفیہ کے یہاں جو چیز سینہ بہ سینہ ہے وہ علوم نہیں، علوم تو ان کے پاس وہی ہیں جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں، ہاں! ایک بات ان کے یہاں سینہ بہ سینہ ہی ہے، یعنی نسبت اور طریق سے مناسبت اور یہ وہ چیز ہے جو علم میں سینہ بہ سینہ ہی ہے، حتیٰ کہ بڑھی اور باورچی کے پیشے میں بھی مناسبت اور مہارت جس کا نام ہے، وہ سینہ بہ سینہ ہے، یعنی یہ بات استاد کے پاس رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے، محض کتاب پڑھے لینے یا زبانی طریقہ سے دریافت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی، خواں نعمت ایک رسالہ چھپ گیا ہے جس میں ہر قسم کے گھانوں کی ترکیب لکھ دی ہے، لیکن کیا اس کو دیکھ کر کوئی شخص باورچی بن سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! جب تک کہ کسی پکانے والوں کو پکانا ہوا نہ دیکھے اور ایک دو بار کاہ کینا کافی نہیں، بلکہ بار بار کاہ مشاہدہ شرط ہے۔

## ایک حکایت

چنانچہ ایک عورت گلگے پکار رہی تھی، خاندان آئے اور کوئی کام بتلایا کہ تم فلاں کام کر لو، گلگے میں پکالوں گا، بیوی نے کہا کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے، اس نے کہا واہ! یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ڈالا اور نکال لیا؟ اس نے کہا بہت اچھا! ابھی معلوم ہو جائے گا، چنانچہ شوہر صاحب نے کھڑے کھڑے ہی اوپر سے گلگے کو گھی میں ڈال دیا، جس سے گھی کے چھینٹے گرم گرم اڑ کر ان کے بدن پر گرے اور بدن جل گیا، چھالے پڑھ گئے، بیوی نے کہا میں نہ کہتی تھی کہ تم سے یہ کام نہ ہوگا، وہ یہ سمجھے تھے کہ اس میں کیا مشکل بات ہے؟ بس ڈالا اور نکال لیا، جیسے گنگوہ کے ایک پیر جی کہا کرتے تھے کہ کھانا کیا مشکل ہے؟ منہ میں رکھا اور نگل لیا اور چلنا کیا مشکل ہے؟ قدم اٹھایا اور رکھ دیا، وہ ظالم بہت کھانا کھا جاتا تھا اور دن میں بہت مسافت طے کر لیتا تھا، مگر ان دو لفظوں سے کہیں کام چلتا ہے، ذرا آپ تو ایسا کر کے دیکھیں، حقیقت معلوم ہو جائے گی، اسی طرح نجاری کا کام ایک دوبار دیکھنے سے نہیں آسکتا، بندر بھی تو بڑھتی کود کبھ کر بڑھتی بنا تھا، مگر کیا گت بنی تھی! اسی لیے کہتے ہیں: "کار بوزینہ نسبت نجاری" غرض تصوف میں سینہ بہ سینہ ایک چیز ہے یعنی نسبت اور مناسبت اور مہارت ایک اور چیز ہے، یعنی برکت جو مشاہدہ سے معلوم ہوگی، بدون مشاہدہ کے اس کا علم نہیں ہو سکتا، جیسے نابالغ کو لذت جماع قبل البلوغ کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

## ایک مشہور قصہ

ایک قصہ مشہور ہے کہ چند سہیلوں نے مل کر آپس میں تذکرہ کیا کہ شادی کی لذت کیسی ہوتی ہے، ایک لڑکی نے کہا میرا نکاح ہو جائے تو میں بتلاؤں گی، جب اس کا نکاح ہو گیا تو سہیلیوں نے اس سے پوچھا کہ اب بتلاؤ؟ اس نے جواب دیا کہ:

بیاہ یوں ہی جب تمہارا ہو جائے گا!

تب مزا معلوم سارا ہو جائے گا!

غرض امور ذوقیہ کو عبارت میں بیان نہیں کر سکتے، وہ مشاہدہ ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں، اسی طرح برکت بھی مشاہدہ ہی سے معلوم ہوتی ہے، اس کے بغیر نہیں معلوم ہو سکتی، پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ معلوم سینہ بہ سینہ عطا ہوئے ہیں، وہ احکام میں غلط کرنا چاہتے ہیں۔

## حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس خیال کی تردید خود فرمادی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا: ”الا فہما او تبہ الرجل فی القرآن“ کہ ہاں! ایک چیز تو سینہ بہ سینہ ہے کہ انسان کو قرآن کا خاص نغم عطا ہو جائے، اس میں قرآن سے مراد تمام شریعت الہیہ ہے جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص آئے اور انہوں نے کہا ”اقض بیننا بکتاب اللہ“ کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجئے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لیے رجم کا حکم دیا، مرد کے لیے سوڑے اور جلا وطنی کا، حالانکہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے، تو یہاں بھی کتاب اللہ سے مراد شریعت الہیہ ہے، کیونکہ تمام احکام شریعہ کتاب اللہ ہی کی طرف راجع ہیں، لکھیا جزیئاً، چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعض احکام حدیث کو قرآن کا مدلول فرما کر یہ آیت پیش کی: ”ما انکم الوسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا“ اور یہی فہم ہے، جس کا اختلاف بعض اوقات اس وجہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو حدیث معلوم ہے، مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس حدیث سے فلاں مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

## امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا واقعہ

چنانچہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قصہ ایک محدث کے ساتھ جو کوفہ کے بہت بڑے محدث ہیں مشہور ہے کہ محدث نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ تمہارے استاد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خلاف کیوں کیا؟ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا جس مسئلہ میں؟ کہا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ باندی کی بیع طلاق ہے (یعنی جو باندی کس کے نکاح میں ہو اگر مالک اس کی بیع کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کرے تو بیع ہوتے ہی باندی پر طلاق ہو جائے گی) اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ باندی کی بیع طلاق نہیں، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کہا کہ تم ہی نے تو ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع جاریہ کو طلاق نہیں قرار دیا، محدث نے کہا کہ میں نے ایک حدیث یہ بیان کی، کہا تم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بربرہ کو خرید لیا اور آزاد کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بربرہ رضی اللہ عنہا کو اختیار دیا کہ خواہ اپنا نکاح شوہر سابق سے برقرار رکھیں یا فسخ کر دیں تو اگر بیع جاریہ سے ہی طلاق واقع ہو جایا کرتی تو اختیار دینے کے کیا معنی؟ محدث سوچنے لگے اور کہا اے ابو یوسف رحمہ اللہ! کیا یہ مسئلہ اس

حدیث میں ہے؟ کہاں ہاں! محدث نے کہا: ”واللہ انتم الاطباء و نحن الصبادلۃ“ بخدا! طبیب ہو اور ہم عطار ہیں!

صاحبو! فقہاء کے بیان کے بعد اب تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ فلاں حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور فلاں آیت سے وہ مسئلہ مگر بدون بیان فقہاء کے اس کا سمجھنا دشوار اور سخت دشوار ہے، اسی کا نام اجتہاد ہے اور یہی وہ فہم ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”الا فہما“ (ایضاً صفحہ ۷۰)

## اہل بدعت کے شہادت کے جوابات

### پانچواں اعتراض..... بدعت کی ایک پہچان اور اس کی صحیح حقیقت!

ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن و حدیث اور اجتماع و قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جائے، وہ بدعت ہے، اس کی پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں، مثلاً عرس کرنا، فاتحہ دلانا، تخصیص اور تعین کو ضروری سمجھ کر ایصالِ ثواب کرنا، وغیرہ وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت نہیں ہیں اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے، یا نہیں؟ اگرچہ خواص کا عقیدہ اس مسائل میں خراب نہیں، لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے جس مستحسن امر سے جب کہ وہ مطلوب عند الشرع نہ ہو، عوام میں خرابی پھیلے تو خواص کو چاہیے کہ اس امر کو ترک کر دیں، ہاں! اگر وہ امر مطلوب عند الشرع ہو اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہوں، تو منکرات کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھڑائیں گے، مثلاً: اگر جنازہ کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو مشابعت (پچھپے چلنا) جنازہ کو ترک نہ کریں گے، کیونکہ مشابعت جنازہ کی مطلوب عند الشرع ہے، بس ایصالِ ثواب میں دو امر ہیں، ایک تعین وقت، دوسرا ایصالِ ثواب اور ان میں تعین وقت مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے اور چونکہ تعین سے عوام میں خرابی پھیلتی ہے، اس لیے ہم تعین کو ترک کر دیں گے، البتہ اگر ساری امت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خود اس کو بلکہ سب کو تعین کی اجازت دے دیں گے، لیکن حالات موجودہ میں جب کہ اکثر و کثیر خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ مقبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے، کیسے اجازت دے دی جائے؟

## ایصال ثواب کے لیے تاریخ مخصوص کرنا

ایک شخص نے مجھ سے کہا گیارہویں، اٹھارہویں تاریخ تک ہو سکتی ہے، پھر نہیں ہو سکتی ایک وعظ میں میں نے اس رسوم کا بیان کیا، بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے لگے کہ علماء کو ایسے مضامین نہ بیان کرنے چاہئیں کہ تفریق امت ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے، جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے، ویسا ہی ہم بیان کریں گے، اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں گے، تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے، تو تفریق کا الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر غرض یہ امور مطلوب عند الشرع نہیں اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہیں، اس لیے ان کو ترک کر دینا چاہئے، ایک تو تخصیص اور تعین قابل ترک ہے، دوسرے جو بینات ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہیں وہ قابل ترک ہیں، مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھانے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو حرج ہی کیا؟ میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں، ہنسی روپے یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتیں؟

## نیت کی اصلاح

اور ایک نیت کی اصلاح کرنی ضروری ہے، کیونکہ اکثر یہ نیت ہوتی ہے کہ ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو ان سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے، تو صاحبو! قطع نظر نفاذ اعتقاد کے، اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیہ منھائی لے جائیں اور پیش کرنے کے بعد اس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمہ میں گواہی دے دیں، اندازہ کیجئے! یہ شخص کس قدر کبیدہ ہوگا اور اس سے اس کو کیسی اذیت ہوگی، پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے، تو اہل اللہ کو اس سے زیادہ اذیت ہوگی، پھر خصوصاً وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہ نفس عنصری ٹوٹ جاتا ہے اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے، پس جس وقت ان کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے، کس قدر ناگواری ہوتی ہوگی، اس کے پاس اس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لیے تعلق اور محبت ہو، صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے؟ ان سے دنیا کی امید رکھنی ایسی بات ہے جیسے کسی سنا سے کھر پانانے کی امید رکھنی، یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنی کہ تم چل کر ہمارے گھر کی گھاس کھو دو، صاحبو! ہم کو حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ سے جو محبت ہے تو اس لیے کہ انہوں نے ہم کو راہ ہدایت دکھائی، اس کے

مکافات میں ہم ان کو کچھ ثواب بخش دیں کہ ان کی روح خوش ہو اور اس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ خوش ہوں اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ ایصالِ ثواب سے منع نہیں کرتے، بلکہ اس کی اصلاح کرتے ہیں جس دن اصلاح عام ہو جائے گی، اس دن ہم یہ بھی نہ کہیں گے، مگر جب تک اصلاح نہ ہو، اس وقت تک ہم ضرور لایحسوز کہتے رہیں گے، رہی بدنامی سو بجز اللہ اشاعتِ دین میں ہم کو اس کی مطلق پروا نہیں ہے، ہمارا وہ مذہب ہے:

ساقیا بر خیز و در وہ جام را  
 خاک بر سر کن غم ایام را  
 گرچہ بدنامیت نزد عاقلان  
 مانمی خوابیم ننگ و نام را

(تقویم الزلیغ صفحہ ۳۲۹)

## بدعت کی مثال:

(ب) بدعت کے بارے میں فرمایا کہ کوئی ظہر کی چار رکعت کے بجائے پانچ رکعت پڑھ لے، تو اس کی وہ چار رکعت بھی نہ ہوگی، حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے کوئی برا کام تو کیا ہی نہیں! نماز ہی پڑھی ہے، بلکہ اور اچھا ہے کہ چار رکعت کے بجائے پانچ پڑھیں، پھر نماز کیوں نہ ہوئی؟ بات یہ ہے کہ اس نے خلاف ضابطہ کام کیا، اس لیے چار رکعت بھی گئی گزری ہوئیں، جیسے لفظ پر کوئی بجائے ڈاک کے دو پیسہ کے ٹکٹ کے کورٹ فیس کا ٹکٹ آٹھ آنے کا لگا دے، تو خط بیرنگ ہو جائے گا، وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے بجائے دو پیسے کے آٹھ آنے صرف کیے اور پھر بھی بیرنگ ہو گیا! لیکن چونکہ اس نے ٹکٹ کا استعمال بے محل اور خلاف ضابطہ کیا، اس لیے آٹھ آنے کا ٹکٹ ضائع ہو گیا، اسی ٹکٹ کو اپنے موقع پر یعنی عدالت میں لگاتا تو کام کا ہوتا، اسی طرح ان پانچ رکعتوں کو سمجھ لیجئے! مگر ان پانچ رکعتوں کے نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کرتا، لیکن اور بدعتوں کو ایسا نہیں سمجھتے، اس میں شبہ کرتے ہیں کہ صاحب! یہ تو نیک کام ہیں، ان میں کیا برائی ہے؟

## حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا واقعہ

ایک شخص نے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تو ”لا الہ الا اللہ“ کے ساتھ ”محمد رسول اللہ“ کہنے سے روکتے ہیں، بعد کو تحقیق ہوا کہ اذان کے آخر میں جو ”لا الہ الا اللہ“ مؤذن کہتا ہے، اس کے جواب کے بعد اکثر نادائق ”محمد رسول اللہ“ بھی کہہ لیتے ہیں، حالانکہ حدیث

شریف میں ہے کہ اذان کا جواب کلمات اذان ہی میں دینا چاہئے، چنانچہ بعد کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ کے چونکہ مؤذن ”محمد رسول اللہ“ کہتا نہیں ہے، اس لیے صرف ”لا الہ الا اللہ“ کہہ کر جواب بھی ختم کر دینا چاہئے، یہ مقصود تھا حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا اس کو اس صورت میں پیش کیا گیا کہ صاحب! وہ تو کلمہ میں ”محمد رسول اللہ“ کہنے سے منع کرتے ہیں (نعوذ باللہ) اذان کا دین ہونا ظاہر ہے، اس کے احکام میں اپنی طرف سے زیادت کرنا بھی بدعت ہے، اسی طرح ساری ممنوع بدعتیں دین کی یکساں ہیں، فرق کی کوئی وجہ نہیں۔

(مقالات حکمت دوات عبدیت حصہ سوم صفحہ: ۷)

## بدعات کی قباحت

(ج): بدعت کے تیج کا یہی راز ہے، مگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے معنی میں تعجب نہ ہو، روزمرہ میں اس کی مثال دیکھنے اگر کوئی صاحب مطیع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کرے اور انجیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کر دے اور وہ ملک و سلطنت کے لیے بھی بے حد مفید ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائے گا اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا، پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے، تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں، کیوں جرم نہ ہوگا؟ تو اگر کوئی اس طرح سے گوشت وغیرہ کو ترک کرے گا، تو بلاشبہ جرم ہوگا، لیکن ان حضرات نے ایسا ہی کیا، بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے، بخلاف اس وقت کے جہلاء کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں۔

(احسان اللہ بیہ صفحہ: ۱۴)

## خیر القرون کے بعد کی چیزیں

(د) پس جاننا چاہئے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں ایجاد کی گئی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ کہ ان کا سبب دائی بھی جدید ہے اور وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ (جس کا حکم دیا گیا ہو) کی ہیں کہ بغیر ان کے اس مامور بہ پر عمل نہیں ہو سکتا ہے، جیسے کتاب دینیہ کی تصنیف اور تدوین، مدرسوں اور خانقاہوں کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شے نہ تھی اور سبب داعی ان کا جدید ہے اور نیز یہ چیزیں موقوف علیہ ایک مامور بہ کی ہیں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے، اس کے بعد سمجھئے کہ زمانہ خیریت نشانہ میں دین کی حفاظت کے لیے مسانکھہ میں سے کسی شے کی ضرورت نہ تھی، تعلق مع اللہ یا بلغذ آخرنسبت سلسلہ سے بہ برکت حضرت نبوت سب مشرف تھے، قوت حافظہ اس قدر قوی

تھی کہ جو کچھ سنتے تھے، وہ سب نقشِ کالج ہو جاتا تھا، فہم ایسی عالی پائی تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کی طرح ان کے سامنے تقریر کریں، ورع (پرہیزگاری) و تدین بھی غالب تھا۔

### کتابوں کی تصنیف اور مدارس و خانقاہوں کی تعمیر

بعد اس زمانہ کے دوسرا زمانہ آیا، غفلتیں بڑھ گئیں، قوی کمزور ہو گئے، ادھر اہل ہوا اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا، تدین مغلوب ہونے لگا، پس علماء امت کو قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا، پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی تکمیل اجزاء، تدوین کی جائے، چنانچہ کتب دینیہ حدیث، اصول حدیث، فقہ، عقائد میں تصنیف ہوئیں اور ان کی تدریس کے لیے مدارس تعمیر کیے گئے، اسی طرح نسبت سلسلہ کے اسباب تقویت و ابقاء کے لیے بوجہ عام رغبت نہ رہنے کے مشائخ نے خانقاہیں بنائیں اور اس لیے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی، بس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سب ان کا جدید ہے کہ وہ سب خیر القرون میں نہ تھا اور مقوف علیہ حفاظت دین مامور بہ کی ہیں، بس یہ اعمال صورت بدعت ہیں، لیکن واقعہ میں بدعت نہیں بلکہ حسب قاعدہ، مقدمۃ الواجب واجب واجب ہیں۔

### بدعات میں کیا چیزیں داخل ہیں

اور دوسری قسم وہ چیزیں ہیں، جن کا سبب قدیم ہے، جیسے مجالس میلادِ مروجہ اور نتیجہ دسواں، چہلم وغیرہا من البدعات کہ اس کا سبب قدیم ہے، مثلاً میلاد کے منعقد کرنے کا سبب فرح علی الولادۃ النبویہ ہے اور یہ سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے یہ مجالس منعقد نہیں کی، کیا (نعوذ باللہ) صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا فہم یہاں تک نہیں پہنچا؟ اگر سب اس کا اس وقت نہ ہوتا، تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ نشاء ان کا موجود نہ تھا، لیکن جب کہ باعث اور بناء اور مدار موجود تھا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے؟ پس جس شے کو باوجود اس بناء کی اور مدار کی موجودگی کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی شے کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت صورت بھی اور معنای بھی اور حدیث: ”من احدث فی امرنا هذا مالیس منہ فهو رد“ (مشکوٰۃ) میں ”جس نے ہمارے دینی امور میں کوئی نئی چیز پیدا کی جن کا دین سے تعلق نہیں وہ مردود ہے) میں داخل ہو کر واجب الرد ہیں اور پہلی قسم ”مامنہ“ میں داخل ہو کر مقبول ہے، یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہنچانے کا اس سے تمام تر جزائیات کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان دو قسموں میں ایک اور



فرق عجیب ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام کھلے نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کرنے والے عوام کا لانعام ہوتے ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں، چنانچہ مولود شریف کی مجلس کو ایجاد ایک بادشاہ نے کیا ہے کہ اس کا شمار عوام ہی میں ہے اور عوام ہی اب تک اس میں شرکت بھی کر رہے ہیں۔ (السرور صفحہ: ۲۷)

## چھٹا اعتراض..... اہل حق کو وہابی کہنا بہتان ہے!

اہل بدعت کی جماعت ہے جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے، لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا؟ کیونکہ وہابی وہ لوگ ہیں جو ابن عبد الوہاب کی اولاد میں ہیں، یا ان کے متبع ہیں، ابن عبد الوہاب کے حالات مدون ہیں، ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں، نہ نسب کی رو سے البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے ان کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کے اکثر خیالات ابن عبد الوہاب سے ملتے جلتے ہیں، البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہئے، کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصول چار ہیں: کتاب اللہ حدیث رسول اجماع امت قیاس مجتہد، سوان چار کے اور کوئی اصل نہیں اور مجتہد اگرچہ متعدد ہیں، لیکن اجماع امت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک بن انس رحمہم اللہ) کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں جس کا مذہب رائج ہو اس کا اتباع کرنا چاہئے تو چونکہ ہندوستان میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب رائج ہے، اس لیے ہم انہیں کا اتباع کرتے ہیں، ہم لوگ وہابی کے لقب سے برا نہیں مانتے لیکن اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی باز پرس ضرور ہوگی۔ (تقویم الزلیغ صفحہ: ۲۹)

سنا تو اہل اعتراض..... شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی گیارہویں

## منانے والوں کی غلطیاں

اس روز لوگ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی گیارہویں مناتے ہیں، اول: "لا تسخذوا قبوری عیدا" (میری قبر کو میل نہ بنانا) سے اس کا بھی رد ہو گیا، کیونکہ منل یوم المیلاد وغیرہ کے یہ دن بھی متبدل ہو گیا، جب غیر متبدل یعنی قبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عید منانا حرام ہے، تو

متبادل یعنی بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کا عید منانا کیسے جائز ہوگا؟ دوسرے یہ شیخ حضرت کے وفات کی کسی مؤرخ نے نہیں لکھی، نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کس کشف والہنامے سے معلوم کر لی، بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے، تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں، اس کا ثبوت دینا چاہئے، دوسرے اگر ہو بھی تو کیا حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو؟ یہ تو ان کے خلاف ہے، کیونکہ اگر بالفرض وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے، تو وہ اس کو ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میری گیارہویں کی جائے، تیسرے اس میں عقیدہ بھی فاسد ہے کہ لوگ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلا دگرتے ہیں، تو بڑے پیر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا میلا دگ بھی ہونے لگا، گویا بالکل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہو گئے۔

### عقائد کی خرابیاں

اور غضب یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں نہ کریں گے تو بلا نازل ہوگی، بڑے پیر صاحب ناخوش ہو جائیں گے اور پھر نہ معلوم کیا سے کیا کریں گے؟ نعوذ باللہ! وہ مخلوق کو تکلیف دیتے پھرتے ہیں، نیز گیارہویں کرنے کو مال و اولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں، اس میں حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دنیا کے لیے تعلق رکھنا ہوا کہ کسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو وہ چھوڑ کر الگ ہوئے تھے، اسی کے لیے ان سے تعلق کیا جائے، غرض گیارہویں کے اندر بھی محبت کا دعویٰ ہو تو کچھ قرآن پڑھ کر ان کی روح کو ثواب بخش دیا جائے، یا یاقین تاریخ غرباء کو کھانا کھلا دے۔

(الحجہ رصفیہ: ۳۲)

آٹھواں اعتراض..... حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے

### متعلق ایک بے بنیاد حکایت!

ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی، جس کا لڑکا مر گیا تھا کہ حضرت! اس کو زندہ کر دو، آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہو چکی، اب زندہ نہیں ہو سکتا، وہ رونے اور اصرار کرنے لگی، تو آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کر دو، یا

جائے، وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں حیات نہیں، اس لیے اب زندہ نہیں ہو سکتا، تو حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے! یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت! آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو آپ مجبور ہو کر خود ہی زندہ کرتے (نعوذ باللہ منہ) وہاں سے حکم ہوا کہ پھر تقدیر کے خلاف تو نہیں ہو سکتا، اس پر شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کو جلال آیا اور آپ نے قدرت کشفیہ سے ملک الموت کو ٹٹولا کہ وہ کہاں ہیں؟ آخر نظر آئے تو دیکھا کہ ایک تھیلے میں اس دن کے مردوں کی روئیں بھر کر لے جا رہے ہیں، ابھی تک ہیڈ کوارٹر نہ پہنچے تھے کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کر دو، تم اس کو نہیں لے جا سکتے، وہ انکار کرنے لگے، آپ نے وہ تھیلا ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا، جتنی روئیں تھیں سب پھر پھر اڑ گئیں اور اس دن جتنے مردے مرے تھے، سب زندہ ہو گئے، تو شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہو گئے؟ ایک مردے کے زندہ کرنے پر راضی نہ ہوئے اب جی بہت خوش ہوا ہوگا، جب ہم نے سارے مردوں کو زندہ کر دیا، تو بے! تو بے! استغفر اللہ! کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے؟ مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور ان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ! شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ وہ کام کر سکتے ہیں، جو خدا بھی نہیں کر سکتا، جھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا جب جاہلوں نے شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا، تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازم بشریہ کو ذکر نہ کیا جاتا تو نہ معلوم یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں پہنچاتے.....؟؟ (فناء النفوس فی رضا القدوس صفحہ: ۸)

نواں اعتراض..... بعض لوگوں نے حضور ﷺ کے خدا ہونے کی

### حدیثیں گھڑی ہیں

بعض لوگوں نے اس مضمون کی احادیث بھی گھڑی ہیں، جن سے معاذ اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا ہونا ثابت کیا ہے، چنانچہ ایک حدیث یہ گھڑی ہے: 'انسا عرب بلا عین' اس کے الفاظ یہ بتلاتے رہے ہیں کہ کسی جاہل نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے، جھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیتان کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے صاف ہی کیوں نہ فرما دیا: 'انسا رب' ہمیر پھیر کے ساتھ 'انا عرب بلا عین' کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر اس سے مدعا کیونکر حاصل ہوا؟ کیوں کہ

”عرب“ میں ”با“ مشدد نہیں ہے، مخفف ہے تو عین نکال کر ”رب“ بلا تشدید باقی رہا اور یہ کوئی لغت نہیں ہے۔ ”رب“ بالتشدید ثابت نہ ہوا، دوسرے آپ عرب کہاں تھے؟ آپ تو عربی تھے، پھر ”انَاعَرَبْتُ“ میں حمل کیوں صحیح ہوگا؟ حدیث ہی گھڑی تو ایسی جس کے سر نہ پاؤں، جس میں ایک ادنیٰ طالب علم بھی غلطیاں نکال سکتا ہے، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے فصیح و بلیغ تھے کہ آپ کے کلام میں کسی کی مجال نہیں کہ انگلی بھی دھر سکے، اسی لیے محدثین نے فرمایا کہ رکاکت الفاظ بھی حدیث کے موضوع ہونے کی علامت ہے اور یہاں تو رکاکت الفاظ کے ساتھ مضمون بھی رکیک ہے، کیونکہ اس سے ”رب“ ہونا نہیں نکلتا، بلکہ ”رب“ نکلتا ہے اور ”رب“ بلا تشدید ایک مہمل لفظ ہے۔ ایک حدیث یہ گھڑی ہے: ”اننا احمد بلا ميم“ یہ حدیث نہیں ہے، بلکہ احمد جام رحمہ اللہ کا قول ہے، جو ان سے حالت سکر (مستی و بے ہوشی) میں صادر ہوا اور قابل تاویل ہے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو قابل رد ہے، کیونکہ غلبہ حال کے اقوال و افعال قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ ایک حدیث یہ گھڑی ہے: ”رَأَيْتُ رَبِّي يَطْوِفُ فِي سَكَاكِ الْمَدِينَةِ“ (میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں پھرتے ہوئے دیکھا) یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے آپ کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا تو فرمایا: ”رأيت ربي يطوف في سكاك المدينة“ کہ میں نے خدا کو مدینہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا، بس پھر تو ہر صوفی خدا ہو گیا، جیسے ایک جاہل صوفی کہتا ہے کہ نعوذ باللہ!

”اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں!“

## جاہلوں کے خرافات

ان بیوقوفوں نے تصوف کو ان خرافات سے بدنام کر دیا، مخالفین بھی ان باتوں پر ہنستے ہیں، ایک انگریز ایک مسلمان سے کہتا تھا کہ ہم پر خدا کے تین کنبے پر اعتراض کرتا ہے، تمہارا تو پی (صوفی) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے، یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ناس مارا ہے، ان جاہلوں نے اس کی حقیقت تو سمجھی نہیں، بس یہ سمجھے کہ ہر چیز کو خدا کہنے لگے، ان ہی لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بشریت سے نکالنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ واقعات اس پر یقینی شاہد ہیں کہ آپ بشر تھے، چنانچہ اکل و شرب، بول و براز سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم منزہ نہ تھے، جنگ اُحد میں کفار کے ہاتھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے، یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا اور اس کا اثر ہو گیا، حضرت جبرائیل علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست کی کہ مجھے اپنی اصلی صورت میں دکھاؤ، جب وہ اصلی صورت میں ظاہر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش ہو گئے۔ (وعظ تحویل المرام: ۱۱)

دسواں اعتراض..... جانوروں وغیرہ کو منحوس سمجھنا سب و اہیات ہے!

ایک بار عرض کیا گیا کہ لوگ جو بعض گھوڑوں وغیرہ کو منحوس سمجھتے ہیں، اس کی بھی کوئی اصل ہے؟ فرمایا کہ جی نہیں! سب و اہیات ہے، اس پر تو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی حبشی کوراہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا، اٹھا کر دیکھا تو اپنی ہی صورت پر نظر پڑی اور اس آئینہ کا قصور سمجھا، اسی طرح ہم لوگوں کو اپنے عیوب و دوسروں میں نظر آتے ہیں، مصیبت تو آتی ہے اپنے معاصی کی نحوست سے اور اس کو منسوب کر دیتے ہیں، بے گناہ جانوروں کی طرف فلاں گھوڑا ایسا منحوس آیا، یا فلاں جانور فلاں وقت بول دیا، اس لیے کام نہ ہوا، اس پر عرض کیا گیا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی شگون دل میں کھٹکے تو فلاں دعا پڑھے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ جب اس میں کچھ اثر ہو اور اس کے ازالہ کے لیے یہ دعا بتلائی گئی ہو، فرمایا کہ یہ محض رفع تردد اور حصول اطمینان کے لیے ہے اور اس سے کسی اثر کا اثبات لازم نہیں آتا، فال نیک لینے کی جو اجازت ہے، اس کی بابت استفسار کیا گیا، فرمایا کہ وہ بھی مؤثر نہیں، بلکہ فال نیک کا حاصل صرف یہ ہے کہ کوئی اچھی چیز پیش آئی، اس کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان نیک رکھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ میرا کام ہو جائے گا اور فال بد کو اگر اسی درجہ میں سمجھے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ پر بدگمانی رکھے اور اللہ تعالیٰ پر گمان نیک رکھنا بہت اچھا ہے اور بدگمانی ناجائز ہے، اس لیے فال نیک کی اجازت ہوئی اور فال بد کی ممانعت۔

(مجادلت معدل دعوات عبدیت حصہ سوم صفحہ: ۴)

گیارہواں اعتراض..... اصطلاح صوفیہ میں کافر سے مراد فانی ہے!

علماء ظاہر تو امکان کذب ہی میں آج تک لڑ رہے ہیں، اس میں تو وقوع کذب لازم آ گیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں! کذب نہیں! کیونکہ کافر با اصطلاح صوفیہ بمعنی فانی ہے، خسرو فرماتے ہیں:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

ہر رگ من تار گشت حاجت ز نار نیست

اے فانی عشقم! تو اس نہیں آواز کا مطلب یہ ہوا کہ جو چاہے عمل کر تو فانی ہو کر مرے گا، اب یہ کلام ایسا ہو گیا ہے کہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ”لعل الله اطلع الی اهل بدر فقال: اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم“ اور صوفیہ نے یہ اصطلاح لغت سے لی ہے، کیونکہ لغت میں کفر بمعنی ستر (چھپانا) ہے اور فانی بمعنی اپنی ہستی کا ستر ہے، صوفیہ کی اصطلاحات کہیں لغت سے ماخوذ ہیں،



الفاظ معلوم ہیں، تو مجھے آپ کیوں بے ادب بناتے ہیں؟ فرمایا اس میں بے ادبی کیسی؟ اس وقت تمہاری زبان سے وہ الفاظ ادا نہ ہوں گے، بلکہ تمہاری زبان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کا پارک ہوگی، تم تو محض سفیر ہو، غرض اس نے وہی الفاظ کہے کہ اپنے بدعتی پیروں کو ہمارا بھی سلام کہنا، یہ سنت ہی شیخ پر وجد طاری ہوگئی اور یہ شعر پڑھا:

بدم گفتی و خور سندم عفاک اللہ کلو گفتی

جواب تلخ می زبید لب لعل شکر خارا

یہی راز تھا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بار بار ”وان رغم انف ابی ذر“ کہنے میں، ایک بزرگ فرماتے ہیں:

اگر ایک بار بگوید بندۂ من

از عرش برگزر و خندۂ من

”اگر وہ کہدے مجھے اپنا غلام سب سے پیارا نام ہو میرا یہی۔“

## حق تعالیٰ کا مزاح

حق تعالیٰ کا مزاح فرمانا بھی حدیث سے ثابت ہے کہ جہنم سے جو مسلمان نکالے جائیں گے، ان کا لقب جہنمین ہوگا، کیونکہ ان کو اسی میں حظ ہوگا، جس کی مثال اوپر گزر چکی، ان میں سے ایک شخص جو سب سے اخیر میں نکالا جائے گا، حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ وہ عرض کرے گا کہ میرا منہ جہنم کی طرف سے پھیر دیا جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے بس! اس کے بعد کچھ نہ مانگے گا؟ وہ کہے گا نہیں! اور کچھ نہ مانگوں گا، چنانچہ جہنم کی طرف سے اس کا منہ پھیر دیا جائے، اس وقت اس کو جنت کا ایک درخت نظر آئے گا، عرض کرے گا: اس درخت کے نیچے مجھے پہنچادے ارشاد ہوگا کہ تو نے تو ابھی وعدہ کیا تھا کہ کچھ نہ مانگوں گا؟ معذرت کرنے لگے گا کہ بس! یہ درخواست پوری کر دیجئے، پھر کچھ نہ مانگوگا۔ غرض اسی طرح رفتہ رفتہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا تو یہ بھی مزاح ہی ہے کہ مقصود تو جنت میں پہنچانا تھا مگر اس کو رٹ کر پہنچایا جائے گا۔

لہذا اب اس حکایت پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ مزاح کا ثبوت اس میں بھی ہے، دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کافر سے مراد خدا نے نبی میں کافر بنا لیا تھا، بلکہ کافر بالظنوت ہے اور یہ استعمال نص میں بھی وارد ہے: ”فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ“ جس نے ظنوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط دستے کو تھام لیا۔“

## بارہواں اعتراض.....خطبہ الوداع محض بدعت ہے

خطبہ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض ہے، سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصاح مطلوب ہونیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب و سنت کی تعلیم نا تمام ہوتی کہ بعض مصاح ضروریہ کی تعلیم میں فروگذاشت ہوگئی، کیا کوئی اس کا قائل ہو سکتا ہے؟ اور اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت فرمایا ہے اور بعض بدعت کے حسنہ ہونے سے اگر شبہ ہو تو درحقیقت وہ بدعت ہی نہیں اور اس قسم کا احتمال خطبہ الوداع میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر یہ معنی سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی، پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی زور کی نظیر نکال بھی لی جائے تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہو گیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناریک وعید فرما رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عین ارشاد حق ہے، تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا اور رسول پر اعتراض بھی ہے اور خدا اور رسول سے مزاج بھی ہے، لیکن ہمارے اس قول سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ارشاد خداوندی ہے کوئی یہ نہ سمجھ جاوے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہ فرماتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد موقوف رہتا تھا، اگر وحی میں اس پر تکیہ نہ ہوتی تب تو وہ حجت رہتا تھا، کیونکہ سکوت اس کی تقریر پر دلالت کرتا ہے، ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہو جاتی تھی، غرض ہر حال میں وہ اجتہاد نہ فرماتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد موقوف رہتا تھا، اگر وحی میں اس پر تکیہ نہ ہوتی تب وہ حجت رہتا تھا، کیونکہ سکوت اس کی تقریر پر دلالت کرتا ہے، ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہو جاتی تھی، غرض ہر حال میں وہ اجتہاد بھی حکماً وحی ہو جاتا تھا، لہذا باوجود اجتہاد کے بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ:

گفتہ او گفتہ اللہ بود  
اگرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(اکمال العوام والعید صفحہ: ۶)

تیرہواں اعتراض.....عوام کا اہل قبور سے مدد مانگنا شرک سے خالی نہیں!

(الف) فرمایا شرک جس کی نسبت وعید ہے: 'إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ' "بلاشبہ اللہ تعالیٰ شرک کرنے والے کو بخشا نہیں ہے" اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی کو مستحق



عبادت سمجھنا اور عبادت کہتے ہیں کسی کے سامنے نہایت تضرع و تذلل سے پیش آنے کو پچھلے حق تعالیٰ قادر مطلق و خالق و رازق ہیں، ان کو غیرت آتی ہے کہ سو ان کے کسی دوسرے کے سامنے غایت تضرع و تذلل سے پیش آئے، مثلاً دو شخص ہوں، ایک ان میں بڑے مرتبے کا ہے اور اس مرتبے والے نے کسی سائل کو کچھ دیا اور سائل بجائے معطلی کے دوسرے کی ایسی ہی تعریف و توصیف کرنے لگے جو اس کے لیے چاہیے تھی، تو طبعی بات ہے کہ معطلی کس قدر غضب ناک ہوگا، اسی طرح حق تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے جو لوگ مزارات پر اولیا، اللہ سے سوال کرتے ہیں، اب دیکھنا چاہیے آیا شخص وسیلہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں یا کوئی امر اس سے زائد ہے؟ سو مشرکین عرب بھی بتوں کی عبادت وسیلہ قرب الہی سمجھ کر کرتے تھے، چنانچہ مذکور ہے: "مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ" نہ خدا سمجھ کر، مگر پھر بھی وہ مشرک قرار دیے گئے سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وسیلہ میں دو صورتیں ہیں، مثال سے فرق معلوم ہوگا۔

### شُرک کی ایک مثال

مثلاً ایک کلکٹر ہے، اس کے پاس ایک منشی نہایت زیرک عاقل ہے، کلکٹر نے اپنا سارا کاروبار حساب و کتاب اسی منشی کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے ذمہ چھوڑ دیا اور ایک دوسرا کلکٹر ہے، اس کے پاس بھی منشی ہے، مگر کلکٹر زبردست عادل ہے، اپنا کاروبار خود دیکھتا رہتا ہے، منشی کے ذمہ نہیں چھوڑا، اب اگر کوئی شخص اس منشی زیرک کے پاس جو پہلے کلکٹر کے پاس ہے جس کے سپرد سب کام ہیں، کوئی درخواست پیش کرے تو کیا سمجھ کر کرے گا؟ یہ ظاہر ہے کہ منشی کو کاروبار میں ذخیل سمجھ کر پیش کرے گا اور اسی واسطے اس کی خوشامد کرے گا کہ یہ خود سب کام کر دیں گے، کیونکہ ان کے کل کام سپرد ہیں، کلکٹر تو فارغ بیٹھا ہے، گونابط کے دستخط وہی کرے گا، مگر اس منشی کے خلاف کبھی دستخط نہ کرے گا اور اگر دوسرے کلکٹر کے منشی کے یہاں عرضی دی جائے گی، تو محض اس خیال سے کلکٹر زبردست ہے، رعب والا ہے، اس کے سامنے کون جا سکتا ہے؟ اس منشی کے ذریعہ درخواست کرنی چاہئے، کیونکہ اس منشی کا تقرب حاصل ہے، یہ وہاں پیش کر دے گا، کیونکہ کل کام کلکٹر خود دیکھتا ہے، اب دیکھئے ان دونوں صورتوں میں کس قدر فرق ہے، عوام اہل مزار سے اکثر پہلی صورت کا برتاؤ کرتے ہیں، ان کے انفعال اعمال سے یہ ظاہر ہے، پھر شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ برخلاف محض وسیلہ سمجھنے کے، پس شرع شریف میں عبادت غیر اللہ جہاں صادق آئے گا کہ بہ نیت تو سئل ہی سہی، وہ شرک ہوگا، عرض تو سئل تو جائز مگر تعبد تو سئل شرک۔

(مقالات حکمت نمبر ۵۵، دعوات عبدیت حصہ اول)

## قبروں سے مدد چاہنا

(ب) لوگ قبروں پر جا کر ان سے دنیا کے کاموں میں مدد اور اعانت چاہتے ہیں اور قبروں پر جانے میں بالکل یہی اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ ہمارے مدد و معاون ہو جائیں گے، سو یہ اور بھی بے ادبی ہے، اس لیے کہ وہ حضرات مقرب ہیں، جب دنیا میں زندہ رہ کر دنیوی تذکروں اور جھگڑوں کو پسند نہیں فرماتے تھے، تو اب عالم آخرت میں جا کر کیسے پسند کریں گے؟ جب کہ امور آخرت میں مستغرق (دوبلے ہوئے) بھی ہوں اور ایسی حالت میں ان سے دنیوی قصوں میں مدد چاہنا دین کے خلاف تو ہے ہی وہ عقل کے بھی خلاف ہے، کیونکہ جب دنیا ان کے پاس نہیں رہی تو ان سے دنیا مانگنا یا دنیوی کاموں میں مدد یا اعانت کی خواہش کرنا کیسے تسلیم کر سکتی ہے؟ ہاں! ان سے وہ چیزیں مانگو جو ان کے پاس ہوں تو اب بھی صاحب نسبت ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور روپیہ اور دینا تو ان کے پاس ہے بھی نہیں، پس وہ تم لوگوں کو کیسے دیں گے؟ کوئی قبر کھول کر دیکھتے تو وہاں ایک روپیہ بھی نہ ہوگا، تو پھر ایسی چیزیں ان سے مانگنا جو ان کے پاس بھی نہیں، کیسی بے عقلی کی بات ہے؟ رہا یہ خیال کہ وہ دعا کر دیں گے، تو ایسا کون خیال کرتا ہے؟ کوئی بڑا ہی خوش عقیدہ ہوگا کہ اس خیال سے قبروں پر جاتا ہوگا، ورنہ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ وہ خود دیتے ہیں۔

## ایک حکایت

چنانچہ کانپور میں ایک بڑھیا ایک شخص کے پاس آئی کہ بڑے پیر صاحب کی نیاز دے دو، انہوں نے کہا کہ بڑی بی نیاز تو اللہ میاں کی دیے دیتا ہوں اور ثواب بڑے پیر کو پہنچائے دیتا ہوں، اس نے جواب دیا کہ نہیں اللہ میاں کی نیاز تو دلا چکی ہوں اس پر بڑے پیر ہی کی نیاز دے دو، اس سے صاف ظاہر ہوا کہ عوام بزرگوں کو صاحب اختیار بالاستقلال سمجھتے ہیں، اسی طرح ایک مرتبہ جامع مسجد میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ ایک پرزہ تعزیہ پر لڑکانے کو لکھ کر دو، ہم نے کہہ دیا کہ یہاں کسی کو ایسا پرزہ نہیں لکھنا آتا، ایک اور قصہ مجھے یاد آیا۔ ایک صاحب یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ میں نے تعزیہ میں ایک پتلا موم کار کھا دیکھا، قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عرضی لڑکانی اور اولاد کی درخواست کی، ایک شخص نے اس عرضی کے نیچے یہ جواب لکھ دیا کہ تمہاری بیوی بانجھ ہے، اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لو اور یہ شعر لکھ دیا:

زمین بشور سنبل بر نیاید  
در و تخم عمل ضائع مگر دال

اور اس کے نیچے لکھ دیا، راقم امام حسین، عرضی والے نے جو اس جواب کو دیکھا تو بہت بگڑا کہ یہ کس نے میرے ساتھ مذاق کیا؟ کسی نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ اور کسی لکھ دیا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ انہوں نے ہی لکھا ہو، کیونکہ اگر وہ اس کے پڑھنے پر تادور ہیں تو لکھنے پر بھی ممکن ہے، لہذا ممکن ہے کہ خود حضرت امام ہی لکھ گئے ہوں۔

### خلاف ادب کام

سو آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے اور یہ شریعت اور ادب اور عقل سب کے خلاف ہو رہا ہے، غرضیکہ جب زندوں سے اس قسم کی باتیں کرنا خلاف ادب ہیں، تو مردوں سے تو اور بھی زیادہ خلاف ادب ہوں گی، ان حضرات کو ایسی باتوں سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسے کسی مہذب مجلس میں موت کے ذکر سے، میں سچ کہتا ہوں کہ ان حضرات کو تو دنیا کے تذکرہ سے بھی نفرت ہوتی ہے، حضرت رابعہ رحمہ اللہ علیہا کے یہاں چند بزرگوں نے دنیا کی مذمت کی، تو انہوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس سے کھڑے ہو جاؤ، معلوم ہوتا ہے کہ تم کو دنیا کی محبت ہے: ”من احب شیئاً اکثر ذکرہ“۔ (اتباع المنیب صفحہ: ۹)

### چودھواں اعتراض..... حضور ﷺ کے یوم ولادت پر جلوس نکالنا!

آج کل ہمارے چند اخوان زمان (زمانے کے بھائیوں) نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے، یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے اور نہ یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے، لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر لوگوں کو کچھ لینا چاہئے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیوی خوشی نہیں ہے، یہ مذہبی خوشی ہے، پس اس کے تعین طریق کے لیے وحی کی اجازت ضروری ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سالگرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں، تو میں کہوں گا کہ ایسا کرنے والے تخت بے ادنی اور گستاخی جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کر رہے ہیں، اصحابو! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جلالت و عظمت پر دنیا اور دنیا کے بادشاہوں پر جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے، قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس فرحت کے لیے بس ایک دنیوی رذیل سامان اسی طرح کا کرتے ہو، جیسا کہ ان سلاطین کے لیے کرتے ہو۔

”چہ نسبت خاک را با عالم پاک“

## ایک بزرگ کی حکایت

مجھے اس موقع پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آگئی کہ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ ایک کتیا پال رکھی تھی، اتفاق سے ایک مرتبہ کتیا نے بچے دیے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا، لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے، ان کو نہیں بلایا، ان بزرگ نے ازراہ بے تکلفی دوستانہ شکایت کی، تو ان بزرگ نے جواب میں کہا کہ بیچا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیے تھے، اس کی خوشی میں سگان دنیا کی دعوت کر دی، سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ مدعو کرتا جس روز میرے اولاد ہوگی اور مجھ کو خوشی ہوگی، اس دن آپ کو مدعو کروں گا اور کتوں میں سے ایک کو بھی نہ پوچھوں گا۔

## دنیا داروں کا معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

جب اولیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ ہے ادبی ہے، تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی؟ اب اس کی دلیل سنئے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے، دنیوی خوشی نہیں ہے، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دنیا کا اطلاق اس خطہ زمین پر یا زیادہ سے زیادہ چند فرخ اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے، پاس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی، تو اس کا اثر اس خطہ زمین تک محدود رہے گا، اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش و کرسی اور باشندگان عالم سب کے سب مسرور اور شاداں تھے، وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کفر و ضلالت کی ماحی اور توحید حق کی حامی تھی، جس کی بدولت عالم کا قیام ہے، کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت کے قائم ہونے سے فرشتے بھی اکثر فنا ہو جائیں گے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور چونکہ سب تھا تمام عالم کے بقاء کا اس لیے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہو گیا، تو اس خوشی کو دنیوی خوشی نہیں کہہ سکتے جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوش نہیں، بلکہ مذہبی خوشی ہے، تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی، یعنی اس کے وجود میں بھی اور اس کی کیفیت میں بھی۔

## یوم ولادت پر خوشی منانے کی کوئی دلیل ہیں

اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم عید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے؟ اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے؟ اگر کوئی: "قل بغضل اللہ" سے استدلال کرے تو میں

کہوں گا کہ صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے، ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا؟ بالخصوص جب کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی، علیٰ ہذا تابعین رحمہ اللہ جن میں بڑے بڑے مجتہدین ہوئے ہیں، ان کی نظر یہاں تک کہ کیوں نہیں پہنچی؟ ہاں! جن امور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت ہے، اس کو ضرور کرنا چاہئے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا: "ذَلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي وُلِدْتُ فِيهِ" اس لیے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے، دوسرے پیر کے دن نامہ اعمال حق تعالیٰ کے روبرو پیش ہوتے ہیں۔ پس یہ مجموعہ وجہ ہوگی اس حکم کی۔ اگر مضر و ناجہی مانا جائے تب بھی صحیح ہے، لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے۔

(اکمل الصوم والسید صفحہ ۳۴۰)

پندرہواں اعتراض..... عرس کے حقیقی معنی اور بزرگوں کے مروجہ عرسوں

### کا خلاف شرع ہونا!

آج کل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختیار کیا ہے، یہ بھی محض لغو اور تجاؤز علی الحد ہے، اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عرس معنی لغت میں شادی کے ہیں حاصل شادی کا یہ ہے کہ محبت کا محبوب سے وصل ہو، پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لیے وصل محبوب ہے، اس لیے کہ ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتہ ان کی قبر میں آ کر سوال کرتے ہیں، تو سوال و جواب کے بعد کہتے ہیں "بِسْمِ كُنُومَةِ الْعُرُوسِ" (دلہن کی طرح بے فکر ہو کر سو جا) تو وہ دن ان حضرات کے لیے یوم العرس ہوا، اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں:

خوشامد روزے و خرم روزگارے

کہ بارے بر خور و از وصل یارے

اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اس وصل میں فرق ہے کہ

یہاں پر حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب جیسا مولانا نے فرمایا:

گفت کشوف و برہنہ گو کہ من

سے نہ نیم باصنم در پیرہن

اگر چہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے، لیکن مثال کے لیے کہا جاتا ہے اور جیسا کہ حضرت غوث فرماتے ہیں:

بے حجابانہ در آرز در کاشانہ ما  
 کہ کسے نیست بجز درد تو درخانہ ما  
 یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیرمی نہ ہونے کے ان کی یہ حالت  
 ہوتی ہے:

دل آرام در بر دل آرام جو  
 لب از تشنگی خشک و بر طرف جو  
 گویم کہ بر آب قادر نیند  
 کہ بر ساحل نیل مستستی اند  
 اور چونکہ ان کو مر کر یہ دولت نصیب ہوتی ہے، اس لیے وہ تمنا کیں کرتے ہیں اور شدت شوق  
 میں یوں کہتے ہیں کہ:

خرم آرزو کز بر منزل و یراں بردم  
 راحت جاں طلعم و ز پنے جاناں بردم  
 اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے، اس لیے اس میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں۔

### مرنے پر خوشی

چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ لے  
 چلو تو ایک شخص ساتھ ساتھ یہ اشعار پڑھتا چلے:

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو  
 شینا نند از جمال روئے تو  
 دس بکشا جانب زنبیل ما  
 آفریں بر دست و بر بازوئے تو

کیوں صاحب! کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوجھ بکھتی ہے؟ یہ نایت فرحت کا  
 اثر تھا، حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی حکایت مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال  
 ہو گیا اور جنازہ لے چلے، ایک مہمید نے شدت غم میں در: کے ساتھ یہ اشعار پڑھے:

سر و سیمینا بصر ا می روی  
 سخت بے مہری کہ بے ما میروی  
 اے تماشا گاہ عالم روئے تو  
 تو گنجا بہر تماشا می روی  
 لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہو گیا، صاحبو! ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ:  
 ”پا بدستی دگرے دست بدست دگرے“

کیا اس کو وجد ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے، ایک دوسرے  
 بزرگ انتقال کے وقت منتظران و مشتاقانہ فرماتے ہیں:

وقت آن آمد کہ من عریاں شوم  
 جسم بگزارم سرا سر جاں شوم  
 اور یہ حالت کیوں نہ ہو جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اب پروہائے ہولانی جو کہ مانع دیدار تھے،  
 اٹھے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار نصیب ہوگا، صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت یا عوروں  
 کی ہوس ہوتی ہے۔

### ابن الفارض کا واقعہ

حضرت ابن الفارض کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کا انتقال ہونے لگا تو جنت منکشف ہوئی، آپ نے  
 اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا:

ان کسان منزلتسی فی الحب عند کم  
 ما قد راہت فقد ضیعت ایامی  
 کہ جان تو آپ کے لیے دے رہا ہوں، جنت کو کیا کروں؟ آخر جنت چھپ گئی اور فوراً تجلی  
 ظاہر ہوئی اور جاں بحق ہوئے، ان کی بالکل وہی حالت ہو گئی کہ:  
 گر نباید ملک الموت کہ جانم بہرہ  
 تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندیم  
 اکثر لوگ ان حالات کو سن کر تعجب کریں گے، لیکن یہ تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس  
 سے محروم ہیں، مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ:  
 ”تو مشو منکر کہ حق بس قادر است“

## بزرگوں کی موت یوم مسرت ہے

غرض بزرگوں کے حالات اور حدیث وغیرہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی وفات کا دن یوم العرس ہے، لیکن لوگوں نے اس کے مفہوم و مصداق دونوں کو بالکل خراب کر دیا ہے، مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا بڑھو گئی ہیں، باقی مفہوم کی خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنی لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیے، چنانچہ اکثر جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر مہندی چھڑھاتے ہیں، انوبت نقارہ رکھتے ہیں، اسی طرح مزامیر وغیرہ سب لغو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں، غریب مردہ پر تو بس چلتا نہیں، قبر کی گت بنائی جاتی ہے۔ یہ تحقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی کا دن ہے اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے، تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لیے ضرورت وحی کی ہوگی اور وحی ہے نہیں، بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”لا تتخذوا قبوری عیداً“ کہ میری قبر کو عید نہ بنانا، عید میں تین چیزیں ضروری ہیں: ایک اجتماع، دوسرے تعیین وقت، تیسرے فرحت، تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم تعیین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا، ہاں! اگر خود بخود کسی وقت میں کسی غرض سے اجتماع ہو جائے اور بات ہے، دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں سے تشریف لے جانا۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث سرور ہے، لیکن ہمارے لیے باعث حزن ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا ہے، وہ دوسرے اعتبار سے ہے، پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں، تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر جائز ہوگا؟ اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی خاص دن معین نہیں ہوا۔

(ایضاً صفحہ: ۳۶)

## سو لوہاں اعتراض..... شادی اور غمی کی رسوم خلاف شرع اور واجب

## الترک ہیں!

(الف) شادی اور غمی کی جو رسمیں ہیں، کیا آج کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ رسمیں شریعت کے خلاف نہیں ہیں؟ اور اگر واقعی کسی کو معلوم نہیں تو اس کو چاہئے کہ اس قسم کی کتابیں مطالعہ کرے جو اس کے بیان کرنے کے لیے تصنیف کی گئی ہیں، یا جو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں، وہ



اسی وقت کچھ سن لیں، سنیے! شادی، غمی کی رسمیں دو قسم کی ہیں: ایک تو وہ ہیں جن کا قبیح ہونا نہایت ہی ظاہر ہے اور شرفاً، وثقافت نے ان کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، اب صرف اطفال اور فساق الناس اس میں مبتلا ہیں، مثلاً ناچ رنگ وغیرہ اور بعض وہ رسمیں ہیں کہ ان کا قبیح اتنا ظاہر نہیں، ان میں عوام و خواص قریب قریب سبھی مبتلا ہیں اور ان کو بالکل جائز سمجھا جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات ادعائے تقویٰ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شادی میں کون سی رسم کی ہے؟ نہ ہمارے ہاں ناچ ہوا ہے اور نہ باجا مگیا گیا! پھر ہم نے کیا گناہ کیا؟ سو میں بتلاتا ہوں کہ آپ نے کیا گناہ کیا ہے؟ لیکن پہلے مجھے یہ بتلا دیجئے کہ گناہ کہتے کس کو ہیں؟ ظاہر ہے کہ جو امر شرعاً ممنوع ہو، وہ گناہ کہلاتا ہے، خواہ وہ ناچ ہو یا کوئی دوسرا امر ہو، کیونکہ ناچ بھی تو اسی واسطے حرام ہے کہ شریعت نے اس کو حرام اور جرم قرار دے دیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ ناچ کے علاوہ دوسری رسم کو بھی شریعت نے جرم قرار دیا ہے یا نہیں؟ اس پر مفصل گفتگو تو اصلاح المرسوم میں ملے گی۔

### تکبر کی حمایت

میں مختصراً اس وقت بقدر ضرورت بیان کیے دیتا ہوں، یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں تکبر کی سخت ممانعت فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ"

حدیث شریف میں ہے: "لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال حبة من خردل من كبر"

دوسری حدیث میں ہے: "من لبس ثوباً شهرة البسه الله ثوب الذل يوم القيامة" آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کسی اکڑنے والے فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے اور حدیث اول کا ترجمہ یہ ہے کہ جس کے قلب میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر شہرت کے لیے کپڑا پہنے گا تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے، اس آیت اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ فخر کے لیے کوئی کام کرنا حرام ہے، ایک حدیث شریف کا ارشاد ہے: "من سمع سمع الله به و من رأى الله به" اس سے معلوم ہوا کہ دکھاوے اور شہرت کا کام کرنا حرام ہے۔

### شادی میں انسان کا حال

اب غور کر کے دیکھئے کہ شادیوں میں جو کام ہم کرتے ہیں، جن کے لیے ہم نے نہایت خوبصورت الفاظ تراش رکھے ہیں کہ بجات دیا ہے اور بھائیوں کو کھلایا ہے اور بیٹی کو دیا ہے، وغیرہ

وغیرہ۔ ان میں نیت ہماری کیا ہوتی ہے؟ صاحبو! محض الفاظ کے خوبصورت ہونے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی، سب سے بڑی چیز نیت ہے، لہذا نیت کو دیکھنا چاہئے کیا ہم لڑائی پر تمام رسمیں محض رسم اور نمود کے لیے نہیں کرتے؟ بہنوں کو بڑا بھات دیا جاتا ہے اور اس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے، کیوں صاحب! آج سے آٹھ دن پہلے بھی تو یہ بہن آپ ہی کی بہن تھی، پھر کیا آپ نے اس کی خبر لی ہے؟ کبھی بہن کے فخر و فاقہ پر آپ کو رحم آیا ہے؟ نیز اگر یہ صلہ رحمی ہے تو تمام برادری کو اس کا معائنہ کرانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کبھی اپنی لڑکی کے لیے یا کپڑا خریدنے وقت اس کو کھلاتے پلاتے وقت بھی آپ نے برادری کو جمع کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو بھات اور جیز دیتے وقت برادری کو کیوں جمع کیا جاتا ہے؟ معلوم ہوا کہ محض فخر اور نام و نمود کے لیے ایسا کیا جاتا ہے، بس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ سب رسوم محض شہرت کے لیے ہیں اور شہرت کے لیے جو کام کیا جاتا ہے، وہ بروئے حدیث شریف حرام ہوتا ہے تو سب رسوم بھی حرام ہوئیں۔

### نیوتہ کی رسم

بالخصوص ایک رسم تو ایسی گندی ہے کہ وہ توبہ سے بھی معاف ہونا مشکل ہے، کیونکہ اس کی توبہ بھی مشکل ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کو بظاہر عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے اور وہ رسم نیوتہ لینا دینا ہے، لوگ اس کو قرض حسنہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنا عبادت ہے تو گویا نیوتہ دینا عبادت ہو حالانکہ نیوتہ دینا اس قدر بری رسم ہے کہ سب رسموں میں گندی ہے، اس کو شاید آپ نے آج تک نہ سنا ہوگا، مگر میں اس وقت ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت بیان کر دوں گا اور وہ کوئی عجیب اور نئی بات نہ ہوگی، بلکہ پرانی بات ہے، لیکن آپ نے عدم توجہ کے سبب اس میں غلطی کر رکھی ہے، مقدمات سب آپ کے مسلم ہیں، صرف نتیجے میں آکر غلطی ہو رہی ہے، جیسے کسی شخص نے بکٹ کے بچے کے تھے۔ ت ب زرت ب ت زرت اور رواں پڑھا تھا لیکن تو آپ نے بھی بچے تو صحیح کیے ہیں، مگر رواں میں غلطی کر رکھی ہے، جس کو میں بتلاتا ہوں وہ یہ کہ امر سب کو مسلم ہے اور کوئی شخص اس سے منکر نہیں کہ نیوتہ قرض ہے، دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض واجب الادا ہوتا ہے، تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض خواہ کی موت کے بعد اس کا کل ترکہ اس کے ورثاء کی ملک ہوتا ہے، خواہ وہ ترکہ میں ہو یا کسی کے ذمہ دین ہو، مثلاً اگر کوئی شخص مرے اور سو روپے اس کے گھر میں موجود ہوں اور سو روپے ادھار ہیں تو اس کا کل ترکہ دو سو روپے سمجھا جائے گا اور یہ دو سو روپے ملا کر سب ورثاء کو تقسیم کیے جائیں گے، ان تینوں مسئلوں کے معلوم ہونے بعد دیکھیں نیوتہ میں کیا ہوتا ہے، سو نیوتہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے بیچیں جگہ دو دو

روپے دیے اور اس طرح پچاس روپے اس کے قرضے میں پھیل گئے اور ان کے بعد یہ شخص مرا اور دو بیٹے اس نے وارث چھوڑے جن میں ایک بالغ ہے اور دوسرا نابالغ تو موجود ہے کہ میں سے تو ان دونوں نے نصف نصف لے لیا، وہ بھی جب بڑا بھائی بڑا ایماندار ہو۔

### نیوتہ کی خرابیاں

لیکن جو نیوتہ میں قرض سے، اس کو کوئی بھی تقسیم نہیں کرتا، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر چند روزے کے بعد اس بالغ لڑکے کی کسی اولاد کی شادی ہونے لگی وہ نیوتہ اسی کو لا کر دیں گے اور یہ بلا تامل سارا نیوتہ خود ہی خرچ کر لے گا اور اپنے ہی کو اس کا مالک سمجھے گا حالانکہ ان پچاس روپیوں سے پچیس روپے اس کا حق ہے اور پچیس اس کے چھوٹے نابالغ بھائی کا حصہ ہے، اسی طرح علی العموم تمام نیوتوں میں یہی کیا جاتا ہے، ایک جزئی بھی اس کی نہیں بتلائی جاسکتی تو اس میں ایک گناہ تو اسی بالغ بھائی کا، ہوا کہ اس نے یتیم کا مال کھایا، قرآن شریف میں ہے: "إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتْمَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا"

"یعنی یا اللہ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں ظلم کر کے وہ اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ کھاتے ہیں۔"

اور ایک گناہ نیوتہ واپس کرنے والوں پر ہوا کہ انہوں نے مشرک مال ایک شریک کو دے دیا اور لطف یہ ہے کہ نیوتہ دینے والے سمجھتے ہیں کہ ہم قرض سے سبکدوش ہو گئے حالانکہ ابھی پچیس روپے یتیم کے ان کے ذمے باقی ہیں اور در مختار میں روایت لکھی ہے کہ اگر کسی کے ذمے کسی کے تین پیسے رہ جائیں گے تو قیامت میں سات سو نمازیں قرض خواہ کو دلائی جائیں گی اور یہ اس وقت ہے کہ جب مالک کے بیٹے ہی کو رسول ہو گیا، ہوا اور آرد و تین پشتیں گزر گئیں اور مناسخہ جاری ہو گیا تو پھر تو خدا جانے اور دوسرے تک کس کس کا حق اس میں متعلق ہو گیا، جس کا پہچانا سخت ہی دشوار ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے، تو میں کہوں گا یہ عذر ہرگز قابل سماعت نہیں! کیونکہ اگر اسی پر عمل کیا جاتا تو آج ہم مسلمان نہ ہوتے، آخر ہم کو اسلام تو اسی لیے نصیب ہوا کہ ہمارے باپ دادا نے اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج کو ترک کر دیا، لہذا یہ عذر نہایت کمزور ہے، اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چھپتے قرض کو تحقیق کر کے ادا کیا جائے اور آئندہ کو یہ رسم بالکل چھوڑ دی جائے، یا کوئی عربی خواں یا انگریز خواں اس کے ساتھ کوئی دوسرا علاج مجھے بتا دیں، غرض نیوتہ کی رسم نہایت گندی اور خراب ہے، اگرچہ بظاہر یہ ثواب کا کام نظر آتا ہے اور جب یہ اس قدر خراب رسم ہے، جس میں ایک گونا گونا غریب کی مصالحت بھی ہے، تو دوسری رسموں تو جس میں کوئی مصالحت نہیں بالکل ہی قابل ترک ہوں گی۔

## دوسری رسمیں

اسی طرح ہم نے ہر قدم پر ایک ایک رسم ایجاد کی ہے کہ جب تک وہ نہ ہو گا یا شادی ہی نہیں ہو سکتی اور ان رسوم میں جو دنیا کی مہضرتیں ہیں، ان کا بیان کرنا گو میرا منصب نہیں ہے، لیکن ایک مختصر سے جملے میں ایک گونہ رعایت غریب کی مصلحت بھی ہے، تہرعا ان کو بھی بیان کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں پر جس قدر تہا ہی آئی ہے، زیادہ تر انہیں رسوم کی بدولت آئی ہے، کیوں کہ آمدنی ہر مسلمان کی جتنی ہے، سب پر ظاہر ہے اور خرچ ان رسوم کی بدولت جیسا کچھ ہوتا ہے، وہ بھی سب کو معلوم ہے، مال اس مجموعہ کا اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ آج زمین رہن ہو رہی ہے، کل مکان پر قرض ہے، پرسوں زیور اور اثاثہ البیت نیلام ہو رہا ہے، چوتھادن نہیں آیا کہ میاں پابند رسوم بیک بنی و دو گوش رہ گئے، بعض لوگ اس کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم میں گنجائش ہے اور ہم کو قرض لینا نہیں پڑتا، سوال تو یہ جواب مسلم نہیں، کیونکہ ہر حیثیت کا آدمی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا چاہتا ہے اور اس میں قرض لینا لازمی ہے، دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ ان کو قرض لینا پڑے گا، تو کم از کم ان کو اپنے غریب بھائیوں کا تو خیال ضروری ہی کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ ہم کریں گے تو حرص کے مارے وہ بھی کریں گے اور تباہ ہوں گے تو اس لیے ہم بھی نہ کریں، تیسرے جب یہ گناہ ہے اس لیے بھی اس کو چھوڑ دینا چاہئے، گودنیوی مہضرت بھی نہ ہو۔

## غموں کی رسمیں

اسی طرح غمی کی رسمیں ہیں کہ ان میں بھی جو کچھ کیا جاتا ہے، وہ محض شہرت کے لیے کیا جاتا ہے، نہ کہ خدا کے لیے کیونکہ اگر خدا کے لیے کیا جاتا تو پوشیدہ طور پر کرنا بھی گوارا کیا جاتا اس دکھلانے اور سب پر ظاہر کرنے کا اہتمام کیوں ہوتا؟ معلوم ہوا کہ محض شہرت ہی مقصود ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر کسی پابند رسوم سے یہ کہا جائے کہ بجائے اس ڈھونگ کے تم پچاس روپے دس مساکین کو دے دو اور کسی کو خبر نہ کرو تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا، بلکہ یوں سمجھے گا کہ اس طرح کرنے سے یہ پچاس روپے ضائع ہی ہو جائیں گے اور کہے گا: ”اچھا مولوی صاحب نے رائے دی کہ پچاس روپے بھی کروں اور کسی کو خبر بھی نہ ہو، صاحبو! یہ تو آپ لوگوں کی حالتیں ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ مولوی ثواب بخشے سے روکتے ہیں، یہ تو بتلاؤ کہ خود آپ کو ہی کب ثواب ہوا تھا کہ دوسرے کو بخشے؟ میں سچ کہتا ہوں کہ مولوی تو آپ کو ثواب ملنے اور ثواب بخشنے کی ترکیب بتلاتے ہیں، ثواب سے منع نہیں کرتے اور وہ ثواب بخشنے کی ترکیب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو اور بائیں کو خبر نہ ہو،

اپنے خاص حصے سے دو، مردہ کے وہ کپڑے جن میں تمام درتاء، نابالغ و بالغ کا حق متعلق ہو گیا ہے، وہ نہ دو، اگر دو تو ان کو تقسیم کر لو اور جو تمہارے حصہ میں آئیں وہ دو، مشترک ہرگز نہ دو، ثواب کا طریقہ یہ ہے کہ نہ وہ جو آپ نے تراش رکھا ہے، لوگ جانتے ہیں کہ نام بھی ہو اور ثواب بھی ہاتھ سے نہ جانے، سوریاہ میں ثواب کہاں؟ اللعذاب ہے، شیخ رحمہ اللہ اس کی بابت فرماتے ہیں:

کلید در دوزخ است آن نماز

کہ در چشم مردم گزاری دراز

نمونہ کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے، دوسری رسموں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئے۔

### دلائل عقلیہ

یہ تو دلائل قویہ تھے، عقلی بھی سنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی کر کے دکھا دیا ہے کہ شادی اس طرح کرنی چاہئے، علی ہذا اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غمی کر کے بتا دیا کہ غمی یوں ہونی چاہئے، پھر جب اس کے موافق نہ کیا اور ہر امر میں اپنی ٹانگ اڑائی اور اس کا خلاف گراں ہوا، تو سہولت اطاعت کہاں ہوئی؟ پھر محبت مطلوبہ کہاں ہوئی؟ اس محبت کا اثر تو یہ ہے کہ اطاعت میں سہولت پیدا ہو اور جب کہ ہم نے بالکل شریعت کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی جو شریعت کے بالکل خلاف ہے، معاشرت وہ پسند ہوئی جس کو شریعت سے کچھ بھی لگا نہیں، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا اور رسول سے ہے؟  
(آثار محبت صفحہ: ۱۳)

### ایصال ثواب کے غلط طریقے

(ب) وصول ہونے کے لیے ہی زیادہ تر ان لوگوں نے اپنی ہوشیاری سے ایصال ثواب کے ایسے طریقے ایجاد کیے ہیں جن کو سوائے ان کے دوسرے انسانی آدمی جان ہی نہیں سکتا کہ اول قیل ہو اللہ احد ہو، پھر تبارک الذی ہو اور پھر یہ ہو اور پھر وہ ہو، بعض سورتوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر نہیں، یہ ایسی بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے، تو چونکہ یہ طریقہ وہی لوگ جانتے ہیں، اس لیے مجبوراً سب عوام الناس ان کے محتاج ہو کر انہی کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح سے انہیں کو ملتا ہے اور پھر غصہ یہ کہ یہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کرتے تھے، ایک سب انسپکٹر مجھ سے کہتے تھے کہ میں کسی تھانہ میں تھا کہ میرے پاس ایک شخص یہ رپٹ لکھوانے آیا کہ کوئی آدمی میری فاتحہ چرا کر لے گیا، میں سخت پریشان ہوا کہ فاتحہ چرانے کے کیا معنی؟ اس شخص سے

پوچھا، تو اس نے کہا موقع پر چلے، آخر موقع پر جا کر دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ ایک ٹکلی میں پیر جی ایک سال کے لیے فاتحہ پڑھ کر بند کرتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے تھوڑی سی جھاڑ لینا، یہ ٹکلی (عد) ان کی مقرر ہے، اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں اور ایسی کو فاتحہ کی ضرورت ہوئی، تو اس نے اس شخص کی ٹکلی چرائی۔

## ایک حکایت

اس سے بڑھ کر ایک حکایت حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ سناتے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملا رہتا تھا، سب لوگ اس سے فاتحہ وغیرہ دلاتے تھے، ایک مرتبہ ایک بڑھیا کھانا لے کر آئی، اتفاق سے ملا جی اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے، ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا، وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود ثواب ہی ہے، چلو مسافر ہی کو دے دو، اس کو کھانا دے کر چلی گئی، مسجد کے دروازے سے ٹکلی ہی تھی کہ ملا جی مل گئے، پوچھا کہ بڑھیا کیسے آئی تھیں؟ اس نے سب واقعہ بیان کر دیا، آپ فوراً مسجد میں آئے اور ملا جی لے کر تمام مسجد کے فرش کو خوب پیٹنا اور شور مچانا شروع کیا اور پیٹتے پیٹتے تھوڑی دیر میں دھم سے مسجد کے فرش پر گر گئے، لوگوں نے جو غل و شور سنا تو سب آ کر جمع ہو گئے، پوچھا کہ ملا جی! کیا ہوا؟ کہنے لگے بھائیوں میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں، سب مردوں سے واقف ہوں، انہیں کو ثواب بخش دیتا ہوں، یہ نیا آدمی ہے، خدا جانے اس نے کس کو ثواب بخش دیا کہ یہاں کے سب مردے مجھے آ کر لپٹ گئے، میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا، لیکن میں تمہا تھا، کہاں تک لڑتا؟ آخر تھک کر گر گیا، اگر دو چار دفعہ ایسا ہوا تو میں مر ہی جاؤں گا، اس لیے اور کہیں جاتا ہوں، لوگوں نے کہا ملا جی! آپ کہیں نہ جائیے ہم آپ ہی کو ہر چیز دیں گے، تو جب بنا، ان رسوم کی یہ اغراض ہیں کہ جب فاتحہ کے عوض ان کو کچھ نہ ملے گا، تو الگ الگ پتہ پر فاتحہ پڑھنا ان کو خود ہی مشکل معلوم ہوگا اور اسی طرح بہت جلد اس کا اندا ہو جائے گا اور یہ بھی ایک علامت ہے، ان رسوم کے زائد علی الدین ہونے کی، کیونکہ اصلی چیز منجانب اللہ ہر حالت میں محفوظ رہتی ہے، چنانچہ جس زمانے میں طاعون کی کثرت ہوئی تو تہجہ، دسواں وغیرہ سب چھوٹ گئے تھے، صرف وہی چیزیں باقی رہ گئی تھیں، جو شرعاً ضروری تھیں، بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسوم کیوں نہیں ہوتیں؟ تو کہنے لگے کہ صاحب کس کس کی رسمیں کریں! یہاں تو ہر روز تہجہ ہی رہتا ہے، میں نے کہا: ’’دیکھو! اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ امور محض زائد ہیں، ورنہ اس کثرت موت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مردے کو بغیر کفن دیے اور بلا نماز پڑھائے دفن کر دیا ہو اور تہجہ اور دسواں بہت لوگوں کا نہیں ہوا، غرض یہ کہ دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کیے ہیں، جن سے مقصود دین میں

کا میا بی یعنی رضائے حق بحراصل بعید ہے۔ (احسان اللہ بیہ صفحہ: ۱۹)

(ج) اصل میں یہ بارات وغیرہ ہندوؤں کی ایجاد ہے کہ پہلے زمانے میں امن نہ تھا، امن کی حفاظت کے لیے ایک جماعت کی ضرورت تھی اور اس وجہ سے فی گھر ایک آدمی لیا جاتا تھا کہ اتفاق سے کوئی بات پیش آئے تو ایک گھر میں ایک ہی بیوہ ہو اور اب تو امن کا زمانہ ہے، اب اس جماعت کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر خوف بھی ہو تو اس قدر پہنا کر کیوں لاؤ؟ اور اگر کہیں گا اس میں بھی مصلحت ہے، تو اس کا کیا جواب دو گے کہ بارات والے جاتے تو ہیں جمع ہو کر اور لوٹتے ہیں متفرق ہو کر اور اکثر لہن اور کبارا کیلئے رہ جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت وغیرہ مقصود نہیں، صرف رسم پورا کرنا اور نام آوری مد نظر ہوتی ہے اور شامت یہ کہ اکثر عصر کے وقت برات چلتی ہے اور لڑکی کے ماں باپ بھی ایسا غضب کرتے ہیں کہ اسی وقت رخصت کر دیتے ہیں شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری چیز رہی ورنہ حفاظت کی اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ زیب وزینت کی حالت میں ہے، خدا جانے کیا بات پیش آئے!

### دین چھوڑنے کا انجام

صاحبو! جب انسان دین چھوڑتا ہے تو عقل بھی رخصت ہو جاتی ہے، لوگوں کا یہ عام خیال ہے کہ کنواری کی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے، بیابھی ہوئی کی نگہبانی کی ضرورت نہیں اور یہ خیال ہندوؤں سے ماخوذ ہے، اس کا نشاء یہ ہے کہ اگر کنواری سے کوئی بات ہو جائے اس میں بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے اور بیابھی سے کوئی بات سرزد ہو تو بدنامی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کے تو شوہر ہے، اسی کی طرف نسبت کی جائے گی، مگر یہ خیال محض جہالت پر مبنی ہے، اگر عقل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کنواری کی حفاظت کی اتنی ضرورت نہیں، جتنی بیابھی ہوئی کے لیے ضرورت ہے اور اس میں یہ ہے کہ کنواری کو قدرتی طور پر بھی شرم و حجاب بہت ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ ایک طبعی مانع موجود ہے، اس کی زیادہ نگہبانی کی ضرورت نہیں اور بیابھی کا حجاب چونکہ کم ہو جاتا ہے، اس کی طبیعت کھل جاتی ہے، مانع طبعی اس کے ساتھ نہیں رہتا، اس کی عفت و عصمت محفوظ رکھنے کے لیے بہت بڑی نگہبانی کی ضرورت ہے، نیز کنواری کو علاوہ مانع طبعی کے خوف انشیت بھی زیادہ ہوتا ہے اور بیابھی ہوئی کو اتنا خوف نہیں ہوتا، کنواری میں تو کوئی آڑ نہیں اور اس میں شوہر کی آڑ ہے۔ اس کا فعل اس کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، اس لیے بیابھی ہوئی کی طبیعت برے کاموں میں کنواری سے زیادہ مائل ہو سکتی ہے، اس کی حفاظت کنواری سے زیادہ ہونی چاہئے مگر لوگوں نے اس کا الٹا کر رکھا ہے۔

## عفت و عصمت کی حفاظت

وجہ یہ ہے کہ اس کی پرواہ آج کل نہیں کی جاتی کہ عصمت و عفت محفوظ رہے صرف بچوں بدنامی اور رسوائی کی پرواہ کی جاتی ہے، سو چونکہ کنواری میں بوجہ کوئی آڑ نہ ہونے کے بدنامی کا تو ہی اندیشہ ہے، اس کی نگہبانی تو کی جاتی ہے اور بیاہی ہوئی میں ایک آڑ موجود ہے، اس لیے بدنامی کا خوف کم ہے، اس کی حفاظت کم کی جاتی ہے، اسی خیال کی بناء پر رخصت کے وقت ماں باپ کچھ خیال نہیں کرتے کہ یہ وقت مناسب ہے یا نہیں؟ جب چاہیں برات کے ساتھ کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک تو حفاظت کا وقت کنوارن تک تھا، وہ اب ختم ہو چکا ہے، چاہے راستے میں ڈاکو ہی مل جائیں، بھلاڑ کے والوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان باتوں پر خیال کریں، مگر لڑکی والوں کو تو سمجھ کر رخصت کرنا چاہئے، یہ خرابیاں ہیں برات میں جن کی وجہ سے برات کو منع کیا جاتا ہے اور میں جو پہلے بار اتوں میں جایا کرتا تھا، جب تک میری سمجھ میں خرابیاں نہ آئی تھیں، اب میں ان رسوم کو بالکل حرام سمجھتا ہوں اور اگر تمہاری سمجھ نہ آوے، تو اصلاح الرسوم دیکھ لو، ان ہی رسوم کو روکنے کی وجہ سے ایک گاؤں کا آدمی مجھ سے کہنے لگا کہ یوں سنا ہے کہ تمہارے مسئلے کڑوے بہت ہیں، میں نے کہا مسئلے تو ایسے ہی ہونے چاہئیں جن میں احتیاط ہو، تو حقیقت میں میرے مسئلے کڑوے نہیں، مگر خدا نے میرے قلم سے بعض باتوں کی خرابیاں ظاہر کرا دیں، جو دوسروں نے ظاہر نہیں کیں، اس لیے مجھے لوگ سخت مشہور کرنے لگے۔

## دلہن کی حفاظت

غرض اگر دلہن کی حفاظت کے لیے برات ہی ہوتی ہے، تو متفرق ہو کر کیوں لوٹتے ہیں؟ حتیٰ کہ بعض دفع دلہن اور دولہا کیلئے رہ جاتے ہیں، اگر کوئی کہے کہ دولہا تو دلہن کے ساتھ ہوتا ہے، تو وہی حضرت کون سے بہادر ہوتے ہیں؟ کیونکہ آج کل رائے یہ ہے کہ شادی جلدی ہونی چاہئے، کیونکہ اب وہ عفت و دیانت طبائع میں نہیں رہی جو پہلے تھی، اب زیادہ ضبط کی ہمت نہیں ہوتی، غرض آج کل دولہا صاحب کو خود حفاظت کی ضرورت ہے، اگر کہیں چور یا ڈاکو چلا آئے تو پہلے دولہا صاحب ڈولے میں گھسیں گے، بعض دفعہ دولہا اور دلہن اور دو چار عزیزوں نے ایک گاہ میں قیام کیا اور برات آگے چلی گئی، یہ لوگ حفاظت کے لیے تھے، لہذا اب برات کو چھوڑ دینا چاہئے۔

(دعوات عہدیت حصہ ہفتم، مظاہر الجاہلیت ص: ۵۵)



ستر ہواں اعتراض..... شوہر کے مرنے کے بعد شوہر والوں کا عورت

### کے نکاح میں اپنا حق سمجھنا غلط ہے!

بعض مسلمان قوموں میں یہ آفت ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد عورت میں شوہر والے اپنا حق سمجھتے ہیں، یعنی ماں باپ اس کے مالک نہیں رہتے بلکہ دیور، سر مالک ہو جاتے ہیں، بلکہ وہ عورت خود بھی اپنی مالک نہیں رہتی، نہ وہ خود کہیں اپنا نکاح کر سکے، نہ ماں باپ کر سکیں، بلکہ جہاں جینے وغیرہ چاہیں وہاں ہوگا، مثلاً سر تو چاہے کہ اپنے چھوٹے بیٹے سے نکاح کر دوں اور باپ چاہے کہ غیر جائز کرے، تو باپ کا کچھ زور نہ چلے گا اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ بہو گھر سے باہر نہ جائے، چنانچہ ایک عورت نے اپنی شوہر کا نکاح ایک بچے سے کر دیا، افسوس تو یہ ہے کہ عورتوں کی عقل پر تو پردہ پڑا ہی تھا، مردوں کی عقل بھی ماری گئی، ان کو بھی اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا اور اس کو اپنے نزدیک ہلکی بات سمجھتے ہیں، اس لیے میں نے اس وقت یہ آیت پڑھی، جس میں ارشاد ہے کہ ایسا دستور کہ عورتوں کو اس طرح سے اپنی ملک میں سمجھنا جائز ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَجِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرْتُمُوا النِّسَاءَ كَرِهًا وَلَا تَعْضَلُوهُنَّ لِيَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْنَهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبِينَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَ يُجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا“

”اے ایمان والو! تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے جبراً مالک ہو جاؤ اور ان کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے، اس میں کا کوئی حصہ وصول کر لو، مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزارا کیا کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بڑی منفعت رکھ دے۔“

یہ ہے اس کا ترجمہ، دیکھئے کہ قرآن میں اس رسم کو مٹایا گیا ہے یا نہیں؟ اور کرحا کی قید واقعی ہے، اجترازی نہیں، کیونکہ عورتیں اس وراثت سے راضی بھی نہ ہوتی تھیں، اگر وہ راضی ہوں تب بھی حرہ کی مملوکیت جائز نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو اس کی زبان سے اذان نکاح کہلوایا تھا، تو یہ زبان سے کہلوانا بھی محض نام کو ہے، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ بے پوچھے نکاح کر دیا، کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ بیوہ کا نکاح بدون زبان کے کہے جائز نہیں ہوتا، طیب خاطر کا اس میں خیال نہیں کیا جاتا۔

## زبردستی نکاح

اور بعض مرتبے بے پوچھے ہی نکاح کر دیتے ہیں، نانوتہ میں ایک بیوہ کا نکاح ہوا اور دیوبند رخصت ہوئی، وہ راضی نہ ہوئی تھی، تو اس کو جبراً رات کے ساتھ کر دیا اور کہہ دیا کہ وہاں جا کر اس کو راضی کر لینا اور یہاں ایک نکاح عدت میں ہوا، جب میں نے پوچھا کہ کیا یہ واجبات کیا؟ تو کہنے لگے کہ نکاح کی نیت سے نہیں کیا، ذرا باڑھ لگا دی تاکہ کسی اور جگہ نکاح نہ کر سکے، مگر اس کم بخت نے بعد عدت کے پھر بھی نکاح نہیں کیا، اس پر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ وہاں آگئی ہے، طاعون آ گیا، جب لوگ اس طرح حلال کے پردے میں حرام کاری کریں تو طاعون کیوں نہ آئے؟ صاحبو!

از زنا افتد وبا اندر جہاں

سو بعض لوگ تو زبان سے بھی نہیں کہلواتے اور بعض لوگ زبان سے گو کہلواتے ہیں، مگر پھر بھی اس پر تو ظلم ہوا، چونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر کہلواتے ہیں، دوسری خرابی اس میں یہ ہوئی کہ ماں باپ کو مالک نہیں سمجھتے، حالانکہ خدا اور رسول کے بعد ماں باپ کا حق ہے، اطاعت کا۔

(دعویٰ ایضاً صفحہ: ۵۸)

## اٹھارہواں اعتراض..... مائیموں بٹھانے کی رسم ناجائز ہے!

اپنی دلہن کو دیکھئے کہ سال بھر تک منہ پر ہاتھ رہتے ہیں، شادی کے زمانے میں تو کبھی وہ اپنے منہ سے پانی تک بھی مانگ بیٹھے، تو چاروں طرف غل مچ جائے کہ بے کسی بے حیائی کا زمانہ آ گیا، بلکہ شادی کے پہلے ہی سے یہ مصیبتیں اس بے چاری پر آ جاتی ہیں۔ اول سخت قمر نظیہ میں رکھی جاتی ہے، جس کو آپ کی اصطلاح میں مایوں بیٹھنا کہتے ہیں ایک کوشٹری میں بند کر دی جاتی ہے جہاں ہوا تک اس کو نہیں پہنچتی، سارے گھر سے بولنا بند ہو جاتا ہے، اپنی ضرورت تک میں دوسرے کی محتاج ہو جاتی ہے، اپنے آپ پانخانہ پیشاب کو نہیں جاسکتی، یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ ان رسموں کی بدولت دنیا کی سزائیں بھگتیں، لیکن غضب یہ ہے کہ اس قمر نظیہ میں نماز تک نہ پڑھتی، کیونکہ اپنے منہ سے پانی مانگ نہیں سکتی اور اوپر والیوں کو اپنی ہی نماز کی پروا نہیں، اس کی کیا خبر لیں؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ نماز جو کہ مرتے وقت بھی معاف نہیں، چنانچہ کتاب میں لکھا ہے کہ ایک شخص کشتی میں سوار ہوا اور کشتی ٹوٹ جائے اور یہ شخص ڈوبنے لگے اور وقت نماز کا آ گیا ہو تو اس شخص کے ذمے واجب ہے کہ اسی غوطہ کرانے کی حالت میں نماز کی نیت باندھ لے، پھر چاہے ڈوبے، دیکھئے! نماز

کی یہ تاکید ہے، مگر اس قرطینہ میں قضا کی جاتی ہے، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ باوجود ان منکرات کے یہ ریمیں جائز ہو سکتی ہیں؟ حاشا وکلا! دین سے قطع نظر، عقل کے بھی تو یہ بات خلاف ہے کہ اس کو آدمی سے حیوان بلکہ جماد بنا دیا جائے، اس کا کھانا پینا بند کیا جاتا ہے، محض اس لیے کہ اگر تم کھانے کی عادت نہ ہوگی تو سسرال میں کھائے گی، پھر باخانہ جاوے گی جو قانون حیا کے خلاف ہے، حتیٰ کہ بہت جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فاقے کرتے کرتے لڑکیاں بیمار ہو گئیں، لا حول ولا قوۃ الا باللہ! جب دین کو کوئی چھوڑتا ہے تو عقل بھی سلب ہو جاتی ہے، شادی کی تقریبات کو کہاں تک بیان کروں جس کو چاہے دیکھ لیجئے و دین کے خلاف ہونے کے ساتھ عقل سے بھی خارج ثابت ہوگی۔

(دو نظما سنار زند الہوی صفحہ ۶۳ دعوات عبیدت حصہ ثلثم)

## انیسواں اعتراض..... چالیسویں وغیرہ کا کھانا محض برادری کی

### خوشنودی کے لیے کیا جاتا ہے!

برادری کا کھانا فقط اسی واسطے ہوتا ہے کہ یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں نے کیا کیا کھلایا تھا غمی میں؟ دیکھتے کہ زبان سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ثواب کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، مگر امتحان یہ ہے کہ اگر اس شخص سے خلوت میں کہا جائے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جس مصرف میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس میں روپیہ دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جن کی تم دعوت کرتے ہو، یہ سب کھاتے پیتے سنی ہیں، تم یہ دعوت کا روپیہ فلاں مدرسہ میں فلاں مسجد میں دے دو، یا فلاں آبرو دار غریب آدمی کو چپکے سے دے دو اور اس کا ثواب میت کو بخش دو، ثواب دیکھئے اس شخص کے دل پر کیا گزرتی ہے؟ یہی کہے گا سبحان اللہ! روپیہ بھی خرچ ہوا اور کسی کو بھی خبر نہ ہوئی، تو بتلائیے کہ یہ صاف ریا (دکھاوا) ہے کہ نہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ سب دکھاوے کے لیے کیا جاتا ہے، جب یہ حال ہے تو ثواب کہاں سے ملے گا اور جب اس کو ثواب نہ ملا تو میت کو کیا بخشے گا کیوں کہ ثواب پہنچانے کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نے ایک نیک کام کیا اور جو ثواب اس کا تم کو ملا وہ تم نے کسی دوسرے کو بخش دیا اور جب یہاں ہی صفر ہے، تو وہاں کیا بخشو گے.....؟؟

### ایک حکایت

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ رامپور کے ایک شخص کسی جھوٹے پیر سے مرید ہو گئے، کچھ دنوں کے بعد کسی نے ان سے پوچھا، کو پیر صاحب سے کیا فیض پہنچا؟ یہ تھے صاف آدمی، کہا:

”جب پائی سقاہہ ہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آئے تو یہی صورت ہے تو اب ملنے کی، پہلے کرنے والے کو ملتا ہے پھر وہ دوسرے کو دیتا ہے، تو جب اسی کو نہ ملتا تو یہ کسی کو کیا دے گا؟ گویا سارا روپیہ ضائع ہو گیا اور یہ تو سب دعوے ہی دعوے ہیں کہ تو اب کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، صرف برادری سے شرم کر کیا جاتا ہے اور لوگ اس کا زبان سے اقرار بھی کرتے ہیں۔

### ایک گوجر کا واقعہ

گیرانہ میں ایک گوجر بیمار تھا، اس کا لڑکا حکیم صاحب کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ حکیم جی! اس مرتبہ تو کسی طرح میرے باپ کو اچھا ہی کر دو، مجھے اس بڑھے کے مرنے کا تو غم نہیں، مگر آج کل چاول بہت گراں ہیں، برادری کو کھانا کھلانا تو مشکل ہوگا، وہ بیچارہ تو سیدھا تھا، اس نے سچی بات کہہ دی۔ ہم باوضع ہیں، زبان سے ظاہر نہیں کرتے، مگر دل میں سب کے یہی ہے، یہ تو کھلانے والوں کی حالت ہے، باقی کھانیوالے وہ تو پورے ہی بے حیا ہیں کہ ایسے غم میں بجائے ہمدردی کے اور الناسا پرد باؤ ڈالتے ہیں۔

### ایک رئیس زادے کی حکایت

اسی باب میں ایک صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ضلع بلند شہر میں ایک رئیس کا انتقال ہو گیا، چالیسویں دن رسم ادا کرنے کو ان کے تمام عزیز و قریب، دوست احباب ہاتھی گھوڑے لے کر جمع ہوئے، رئیس زادے نے سب کی خاطر مدارات کی، عمدہ عمدہ کھانے پکوائے، جب کھانے کا وقت آیا اور تمام دسترخوان پر جمع ہو گئے اور سب کے آگے کھانے چن دیے گئے رئیس زادے نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ صاحبو! کھانے سے پہلے میری ایک بات سن لیجئے، پھر کھانا شروع کیجئے گا، آپ کو معلوم ہے کہ آپ لوگ اس وقت کس لیے جمع ہوئے ہیں، چونکہ مجھ پر ایک بڑا حادثہ گزرا ہے کہ میرے والد صاحب کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے، اس لیے آپ لوگ میرے ساتھ ہمدردی کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، تو کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ میں تو غم میں مبتلا ہوں اور اس کی وجہ سے نہ کھانے کا رہنا پینے کا اور آپ لوگ آستین چڑھا کر عمدہ عمدہ کھانے کھانے بیٹھ گئے تم کو شرم نہیں آتی بس اب کھانا شروع کیجئے، مگر اب کون کھاتا؟ تمام شرفاء مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کیا کہ واقعی یہ چالیسویں کی رسم اٹھادینے کا قابل ہے، چنانچہ سب نے متفق ہو کر اس رائے پر دستخط کر دیے اور وہ تمام کھانا غراب کو تقسیم کر دیا گیا۔

## حاصل کلام

حقیقت میں اگر غور کرو تو یہ سارے کھانے جو برادری کو کھلائے جاتے ہیں اسی قسم کے ہیں جن سے کھلانے والوں کو بجز تکلیف کے اور کھانے والوں بجز بے حیائی اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اب بھی لوگ مولوی ہی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ ایصالِ ثواب سے منع کرتے ہیں، صاحبو! ایصالِ ثواب سے کوئی منع نہیں کرتا، البتہ بے ڈھنگے پن سے منع کیا جاتا ہے، دیکھو: ”اگر کوئی قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھے تو اس کو منع کریں گے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق عمل ہو تو پھر دیکھوں کون منع کرتا ہے؟ جس کی بڑی شرط یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو، یعنی ثواب کی نیت سے کیا جائے۔“ (وعظ ”الدرین الخالص“، صفحہ: ۴۵)

## بیسواں اعتراض..... تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

(الف) تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک تو وہی زیادتی کی جارہی ہے جو اور بدعات میں ہے کہ اس کو لوگوں نے عید بنا رکھا ہے، اس باب میں اکثر لوگ یہاں تک کہ بعض طلبہ بھی شک میں ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ جبہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باعث برکت ہے۔ اگر کوئی صرف زیارت کی نیت سے جائے تو کوئی مضا لکھ نہیں معلوم ہوتا، مجھ سے ایک طالب علم نے جن کا مکان جلال آباد میں ہے اور جبہ شریف کے مکان کے پاس اس کی دکان ہے، سوال کیا کہ میں دکان پر بیٹھ کر جبہ کی زیارت کر لوں گا، مگر میں نے اس کی اجازت نہیں دی، کیونکہ وہ مجمع بالکل میلوں، عرسوں کی طرح ہوتا ہے، تاریخ کی تعیین ہوتی ہے، دعوت ہوتی ہے، دور سے آدمی آتے ہیں، عورتوں کا اجتماع بھی ہوتا ہے، ایسے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے، زیارت کو آتے ہیں، حالانکہ زیارت جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہو سکتی، حدیث: ”لا تتخذوا قبری عیسا“ (عبری قبر پر عید کا سا جوم نہ لگاؤ) سے اس کی نفی ہو گئی، کیونکہ جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہو سکتی، گو اس میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مثل یوم ولادت وغیرہ کے اس میں تبدیل ہو گیا، اگرچہ عدم تبدیل کا یقین بھی نہیں مگر خیر جو بات دل میں نہیں، اس کو زبان پر بھی نہ لانا چاہئے، مگر ایک دوسری بات ماہہ الاتیاز یہاں بھی موجود ہے کہ اس وقت وہ ملبوس جسد اطہر سے مماس (ملا ہوا) نہیں اور قبر شریف کو شرف مماس حاصل ہے، اس لیے جبہ نبوی کو کسی نے عرش سے افضل نہیں کیا، پس جب قبر کا عید بنانا حرام ہے، تو ملبوس شریف کو عید بنانا کس طرح جائز ہوگا.....؟؟

## موئے مبارک

کہیں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس وقت تک موجود ہیں، عید بنانا ان کی بھی جائز نہیں، کیونکہ اگرچہ بظاہر یہ خیال کر کے کہ موئے مبارک جزو بدن ہے، قبر سے افضل معلوم ہوتا ہے، مگر قبر میں اتصال اور تماس کی ایسی فضیلت موجود ہے، جو موئے مبارک کو بالفعل حاصل نہیں، اس لیے دونوں خیر مساوی ہوئے، موئے مبارک جز ہے، مگر اب تماس نہیں اور قبر شریف جز نہیں، مگر تماس (ملا ہوا) ہے، تو دونوں برابر ہوئے اور ایک مساوی سے دوسرے مساوی کا حکم معلوم ہو سکتا ہے، پس حدیث: ”لا تتخذوا قبری عبداً“ سے موئے مبارک کو عید بنانا حرام ہو گیا، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت بلاغت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا، جس سے ملبوس اور شعر وغیرہ سب کے احکام خود بخود معلوم ہو گئے، علاوہ ازیں صحابہ اور سلف صالحین نے عید منانے کو کبھی اختیار نہیں کیا، حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکات نبویہ موجود تھے اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی، اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تو اصل ہوتی، اب صرف یہ سوال رہ گیا تھا کہ صحابہ میں عید کی طرح اجتماع نہ تھا، تو آخر تبرکات کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا؟ تو اس کے لیے میں چند احادیث ایک پرچہ پر لکھ لی ہیں، کیونکہ ان کا بلغظ یاد رکھنا دشوار تھا، اس وقت ان کو نقل کیے دیتا ہوں۔

## تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں احادیث

”عن عثمان بن عبد اللہ بن وہب قال فارسلنی اهل الی ام سلمة رضی اللہ عنہا بقدح من ماء وکان ذا اصاب الانسان عین او شئی بعث الیہا مخضبة لہا فاخرجت من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت تمسکہ فی حلجل من فضة فحضنحضنت لہ فشرب منه قال فاطلعت فی الحلجل فرایت شعرات حمراء“ (رواہ البخاری)

”عثمان بن عبد اللہ بن وہب سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پیالہ پانی کا دے کر بھیجا اور قاعدہ تھا کہ جب کسی انسان کو نظر وغیرہ کی تکلیف ہوتی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پانی کا پیالہ بھیج دیتا، ان کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے، جن کو انہوں نے چاندی کی ٹکلی میں رکھ رکھا تھا، پانی میں ان بالوں کو بلا دیا کرتی تھیں اور وہ پانی بیمار کو پلا دیا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے جو جھک کر ٹکلی کو دیکھا تو اس میں چند سرخ بال تھے۔“

اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ایک صحابیہ کے پاس نکلی میں رکھے ہوئے تھے جس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جاتا تھا کہ بہاروں کی شفا کے لیے اس کا غسل پلا دیا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارے میں اختلاف ہوا ہے، صحیح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال پکنے لگے تھے جس سے دیکھنے والوں کو خضاب کا شہہ ہوتا تھا، ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خضاب نہیں کیا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سفید بال قریب بیس کے تھے یا کچھ زائد۔

### جپہ مبارک کا تذکرہ

”عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا انھا اخرجت جبة طرابلسية كسروانية لها لبنة ديباج و فرجيهما مكفوفين بالدباج و قالت هذه جبة رسول الله صلى الله عليه وسلم كانت عند عائشة، فلما قبضت قبضتها و كان النبي صلى الله عليه وسلم يلبس بها فتحن نغسلها للمرضى يستشفى بها“ (رواه مسلم)

”حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک جپہ طرابلسی کسروی نکالا جس کے گریبان اور دونوں چاک پر شیم کی سنجاف لگی ہوئی تھی اور کہا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا ان کی وفات کے بعد میں نے اسے لے لیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے ہم اس کو پانی میں دھو کر وہ پانی بیماروں کو پلا دیتے ہیں شفا حاصل کرنے کے لیے۔“

### موئے مبارک سے متعلق حدیث

”عن انس رضی اللہ عنہ قال قال النبي صلى الله عليه وسلم اتى منى فاتى الجمرة فرماها، ثم اتى منزلة بمنى و نحر نسكه ثم دعا بالحلاق و ناول الحالق شقه الايمن فحلقه ثم دعا ابا طلحة الانصاري فاعطاه ايام ثم ناول الشق الايسر فقال: احلق فحلقه فاعطاه ابا طلحة، فقال: اقسامه بين الناس“

”حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں عرفات سے منیٰ میں تشریف لائے تو حجرہ عقبہ کے پاس پہنچے اور اس کی رمی کی، پھر منیٰ میں جو مکان آپ کے لیے مقرر تھا، اس میں تشریف لائے اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا، پھر حلاق (نائی) کو بلا لیا اور اس کو سر کا داہنا حصہ اول دیا اس نے داہنے حصے کو موٹا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا لیا اور وہ بال ان کو عطا کیے پھر نائی کو سر کا بائیں حصہ دیا اور فرمایا:

”موندو! اس نے ہائیں حصہ کو بھی موندنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بال بھی یوں اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
اللہ تعالیٰ عنہ کو دیے اور فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کرو۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مقدار میں اپنے مونے مبارک صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم شرقاً و غرباً منتشر ہو گئے تھے اور اگر کہیں مونے مبارک پایا جائے تو جلدی سے اس کا انکار نہ کر دیا جائے بلکہ اگر سند صحیح سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے تب تو اس کی تعظیم کی جائے، ورنہ اگر یقینی دلیل انفرادی و اختراع کی نہ ہو تو سکوت کیا جائے یعنی نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب مشتبہ امر میں شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔

## لباس مبارک

و عن ام عطیہ فی قصہ غسل زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و تکفینہا  
انہا قالت فالقی حقوہ فقال اشعرنہا اباہا فقال الشیخ فی اللمعات و هذا الحدیث  
اصل فی البرکة باثار الصالحین و لباسہم“

”حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل و کفن کے واقعہ میں روایت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہنہ ہمارے پاس ڈال دیا کہ اس کو مرحومہ کے بدن سے ماس کر کے پہناؤ، یعنی سب سے نیچے اس کو رکھو تا کہ اس کی برکت بدن سے متصل رہے، حضرت شیخ عبدالحق رحمہ اللہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آثار و ملبوسات صالحین سے برکت لینے میں اصل ہے۔“

معلوم ہوا کہ تبرکات سے برکت حاصل کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بعد موت کے اس کو کفن میں رکھ دیا جائے، مگر اس سے قرآن اور دعاؤں کی کتابوں کا کفن میں رکھنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس میں ان کا احترام باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ قرآن کے ساتھ ناپاکی کا اتصال حرام ہے اور بدن میت چند روز کے بعد بھولے پھٹے گا، وہ نجاست قرآن کو بھی لگے گی، اسی طرح وہ کتابیں جن میں دعائیں اور اس اللہ و رسول کا نام جا بجا ہے، قابل احترام ہیں، بلکہ الفاظ و حروف مطلقاً قابل احترام ہیں، بلکہ سادہ کاغذ بھی بوجہ آہ علم ہونے کے قابل احترام ہے، بعض لوگ فرعون و ہامان کا نام لکھ کر اس پر جوتے مارتے ہیں، یہ بالکل لغو و ہمل حرکت ہے، اس پر تو بس نہ چلا، الفاظ کی ہی بے حرمتی پر بہادری دکھائی، مگر ان سب کے ساتھ ان کو عید نہ بنانا چاہئے، کیونکہ یہ سمجھنے کی بات ہے کہ ان چیزوں کی قدر کس لیے ہے؟ اس لیے ناکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں،



پھر احکام بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، ان کی بھی تو قدر کرنی چاہئے، ان میں بھی تو بڑھتی ہیں، اس برکت کو بھی تو لینا چاہئے فرض وہ جو سوال کیا گیا تھا کہ سلف صالحین کا تبرکات کے ساتھ کیا سا برتاؤ تھا؟ ان روایتوں سے اس کا جواب معلوم ہو گیا، انہی کے موافق ہم کو بھی عمل کرنا چاہئے اس سے زیادہ تعدی نہ کرنا چاہئے۔

### تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غلو

بعض لوگ یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ جب شریفیہ کے لیے نذریں مانتے ہیں، فقہاء نے اس کو حرام لکھا ہے، کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لیے نہیں ہو سکتی عبادت خالی جل وعلی شانہ کے لیے خاص ہے، بحر المراتق میں اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ نذر ماننا مخلوق کے لیے سب کے نزدیک اتفاقاً حرام ہے، مجاوروں کو اس کا کھانا لینا اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں۔  
(ومعظما لہو رصفحہ ۲۱)

### تبرکات کام نہیں آتے

(ب) تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے، بدون ایمان کے سب بے کار ہیں، چنانچہ دیکھ لو کہ ابن ابی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیض مبارک اس کے کفن میں دیا، بھلا یہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے؟ آج کل کوئی بہت کرے گا، غلاف کعبہ کا ٹکڑا رکھ دے گا، مگر غلاف کعبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیض سے کیا نسبت؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر عرش و کعبہ سے افضل ہے اور اگر غلاف کعبہ کو قمیض نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر مان بھی لیا جائے تو یہ دولت کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعب مبارک اس کے منہ میں پڑے، عبد اللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا تھا، وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جزو تھا، جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنازے کی نماز پڑھی، گویا اس کے لیے دعا مغفرت فرمائی، بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں، مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبد اللہ ابن ابی کو ان تبرکات سے کچھ بھی نفع نہ ہوا، کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا، حق تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے: **لَا تَنْفَعُهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَ مَاتُوا وَ هُمْ فَاٰسِئُوْنَ**“ (الرفع والوضع صفحہ ۳۰)

## ایک سوال اعتراف..... رمضان شریف کے لیے نیک کاموں کا روک رکھنا؟

بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روک رکھتے ہیں، مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شعبان میں پورا ہو گیا، اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، رمضان کے انتظار میں روک رکھتا ہے، چاہیے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو، روپیہ چوری ہی ہو جائے، یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ ہی ہو جائے، یاد رکھو! شائع کا اس ترغیب سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے، بلکہ شارع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے کہ اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہوئی ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے، جو کرنا ہو کر ڈالے تقدیم علی رمضان سے روکنا مقصود نہیں، 'وَسَمَّانٌ يَنْهَمَا' (یعنی ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے) مگر کم نہیں نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے لیے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے، خوب سمجھ لو! کہ تعجیل فی الخیر میں خود بہت بڑا ثواب ہے اور وہ اتنا بڑا ہے کہ رمضان سے پہلے جو تم خرچ کرو گے تو گویا اس میں کما نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے ثواب کم ہو، مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کیفا و تقریباً الی اللہ وہ تعجیل بہتر ہے اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائے گا، مجھے کوئی تو اطمینان ہے جو میں شرح صدر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں، بس قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا ذریعہ میرے پاس کوئی نہیں تمہیں کیا خبر ہے کہ شعبان میں اگر تم غریب کو زکوٰۃ دے دیتے ہیں تو اس وقت اس کے دل میں سے کیسی دعا نکل جاتی: جس کے سامنے شہر رمضان میں بھی بیچ ہیں۔

## نیکی کی تاخیر کرنا چاہئے

یہی بات لوگوں کو معلوم نہیں، یاد رکھو کہ جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے، اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں، بعض وجوب علی الفور کے قائل ہیں، ان کے نزدیک تاخیر سے گناہ ہوتا ہے اور بعض وجوب علی التراخی کے قائل ہیں، ان کے نزدیک گناہ نہیں ہوتا، بس احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کرے، تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے، پھر اگر رمضان سے انتظار میں صدقات کا روکنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہہ دیا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے صدقات کو روک دو، جب شریعت نے کہیں یہ نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرنا یہ زیادتی فی الدین اور بدعت ہے کہ جس کام کے لیے شریعت نے ثواب بیان نہیں کیا، تم اس میں ثواب سمجھ کر کرتے ہو، یہ مقابله ہے، حکم

شرعی کی مگر چونکہ اب تک جہل میں مبتلا تھے، علم نہیں تھا، اس لیے امید ہے کہ گنہگار نہیں ہوتے ہوں گے، ہاں! اب جو لوگ ایسا کریں گے وہ گنہگار ہوں گے، کیونکہ اب مطلع صاف ہو گیا۔  
(تفہیم القرآن صفحہ ۳۰)

## بائیسواں اعتراض..... عید میلاد النبی ﷺ کی دلائل اربعہ سے تردید!

جاننا چاہئے کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام جو ایک رسم شائع ہوئی ہے اس کے متعلق دو کلام ہیں۔ ایک تو اس کے نام شروع ہونے کے متعلق دلائل، دوسرے مخالفین کے دلائل کا جواب، اس کے بعد کچھ شریعت کے دلائل چار ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع، قیاس ان شاء اللہ چاروں سے گفتگو کی جائیگی۔

## میلاد کی تردید قرآن میں

اول کتاب اللہ کو لیجئے! حق تعالیٰ کا ارشاد فرماتا ہے: "أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ مَشَرَعُوا لَهُمْ مِّنَ الدِّينِ مَلَمَّ بِأَذْنِ بِلِلَّهِ"

”یعنی کیا ان کے شرکاء کے لیے ہیں کہ انہوں نے ان کے لیے دین کی وہ بات مقرر کر دی، جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی، یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ دین کی بات بدون اذن الہی، یعنی بدون دلیل شرعی کسی کو مقرر کرنا مذموم (برا) و مستنکر (مکروہ) ہے، یہ تو کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد النبی دین ہی کی بات سمجھ کر بلا دلیل مقرر کی گئی ہے اور دلیل نہ ہونا جزئاً تو ظاہر ہے کہ یہ امر شریعت میں نہیں، امر مستحدث (نیا گھڑا ہوا) ہے، اگر احتمال ہے تو اس کا ہے کہ کسی کلیہ میں داخل کرتے ہوں گے، مفصل گفتگو تو ان کلیات کی جس میں یہ داخل ہو سکتی ہے، آگے آئے گی باقی مجملاً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سب داعی اس کا قدیم ہے، خواہ وہ فرج ہو، یا اظہار شوکت اسلام ہو کہ وہ بھی قدیم ہے، بہر حال ان میں سے جو بھی سبب ہو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جب کہ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ و خیر القرون کے زمانہ میں موجود تھا اور وہ حضرات قرآن و حدیث کو خوب سمجھنے والے تھے اور ایسا سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھ کر اب اجتہاد کو جائز نہیں رکھا گیا، پس جب مسلم ہو چکا کہ وہ کتاب و سنت کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے اور یہ اسباب بھی اس وقت موجود تھے، یعنی اظہار فرخ اور شوکت اسلام کی اس وقت بھی ضرورت تھی، بلکہ اس وقت سے زیادہ ضرورت تھی، مگر ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا، پس معلوم ہوا کہ کسی کلیہ میں اس کا داخل ہونا صحیح نہیں اور یہ امر بالکل مستحدث اور جدید ہے کہ جس کی کچھ اصل نہیں اور بدعت کی

ءقئقء ٱبى هءء كه ءرفء ءفن كو ءفن سمءه كر ءفا ءاءء هفن؁ ٱس فه ءءءء واءءب الرءك هفن فه ءو ءرآن مءفء سه مءءلق ءلام ءها۔

### مفلا ءكى ءرء ءءءء مفس

اب ءءء لٱءء؁ ءءور صلى الله علىه وسلم ارشاء فرمائه هفن كه: ”مَنْ أَحَدَكَ فِى أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ“؁ لعنف ءو ءءء هماره اس ءفن مفس وه شه ءءله ءواس مفس سه نفس ٱس وه واءب الرءءه؁ ءو ءفر فراءء آفء كه ذفل مفس كى ءفى هفن؁ وه فف هفاا هف هف اور مرءءنى شه سه وه هفء ءس كا سب ءءم ءء اور ٱءر اس وءء مءمول به نه هوفى هف؁ باقى سب ءء ءء هف اور نفزه وه مءو ءوف علىه كى مامور به كى هف؁ وه مامنه مفس ءاىل هف كر واءب هف اور ءوسرى ءءء لٱءء! مسلم كى رواءفء هف۔ ”فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تختصوا ليلة الجمعة بقيام من بين الليالي ولا تختصوا يوم الجمعة بصيام من بين الايام الا ان يكون فى يوم بصومه احدكم“

”لعنف ءءاب رسول الله صلى الله علىه وسلم نه فرمافا كه شب ءءه كو اور راءو ءل مفس سه شب ءءءءى كه ساءه ءء مء كر و اور ءوم ءءه كو افام مفس سه روزه كه ساءه ءء مء كر وه؁ مءر فه كه اس ءل مفس كوئى ءم مفس سه ٱهله سه روزه رءهءا هف۔“

اس ءءء سه فه ءاءه ءءه ءءا كه ءو ءءءء مءقول نه هف وه مئى عنء (لعنف ءءس سه روكا ءفا هف) هف؁ فه ءوسرى باء هف كه ءءه كه روزه رءهءا ءفا هف؟ هماره علماء نه ءوسرى ءللم مءءقل سه ءوا ءءءم ءا هف اور نفى كو عارضى ءفا هف؁ اس وءه سه كه روزه رءه كر وءائف ءءه سه ضعفف نه هف ءاءء؁ فه فرمى ءفءءو هف؁ هفاا ءو صرف اس ءاءه ءءه كا مءنظف كرنا مءءوء ءه؁ سو ءاءه كى ءءء مفس ءءوزفن صوم ءءه كو هففى ءلام نفس هف؁ ءرض فه ءاءه ءءه كو ءءءءف ءفر مءقول ءفن كه انءر ءا ءءز نفس ءءء هف فه ءو ءءءى هف؁ اب ءءء ءوم ولاءء كى عفء منائى كى ءءءءف ءءه ءه فه ءءءءف ءفسى هف؟ ءا هف هف كه مءقول نفس اور نه ءءءءف عاءى هف؁ بلءه اس كو ءفن كى باء سمءه هفن؁ ءءا ءءه اس كه ءارء كو ملاءء كرءه هفن اور ءءفن سمءه هفن؁ اءر ءءءءف عاءى هوفى ءو ملاءء نه كرءه اور نه ان كو ءءفن ءاءه؁ ءفسه كسى كو عاءء ءللم ٱهءنه كى هف ءو اس كه ءارء كو ملاءء نفس كرءه؁ بهر ءال اس كو ءفن سمءه هفن؁ بس فه ءءءءف ءفن مفس هوفى اور ءفر مءقول هوفى فه صفرى هف و اور ءءءى اول آءءا هف؁ ءءءه ءا هف هف كه فه ءءءءف نا ءا ءءه هف۔ اءر ءور ءفا ءاءءه ءو مءففس علىه لعنف ءوم ءءه سه هفى ءو ءه كر هف؁ اس لعفه كه ءوم ءءه كه فضائل ءو اءاءءء مفس صراءءه هفى واءء هفن اور ءوم ولاءء كى كوئى فضفاءء صراءءه واءء نفس؁ ءو ءو انءء سه فن نفءه ءوم ولاءء مفس برءء كا ءائل نه هف؟ ءءا ءءه

سیوطی رحمہ اللہ یا ملا علی قاری رحمہ اللہ اس ماہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں:

هذا الشهر فى الاسلام فضل  
و منقبة تفوق على الشهور  
ربيع فى ربيع فى ربيع  
و نور فوق نور فوق نور  
اور میں اس پر اضافہ کر کے کہتا ہوں:

ظهور فى ظهور فى ظهور  
سرور فى سرور فى سرور

### فضائل یوم ولادت کی صراحت نہیں

پس نفس برکت اور فضیلت کا انکار نہیں، گفتگو اس میں ہے کہ جیسے جمعہ کے فضائل تصریحاً وارد ہیں، ایسے یوم ولادت کے نہیں، پس جس کے فضائل منصوص نہ ہوں، اس کی تخصیص کیسے ناجائز نہیں ہوگی؟ بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یوم ولادت کی فضیلت بھی حدیث میں آئی ہے، چنانچہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبہ کے روز روزہ رکھا کرتے تھے، کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہیں، فرمایا: ”ولدت يوم الثنين“، یعنی میں پیر کے دن پیدا ہوں، تو اس کا جواب ان شاء اللہ مخالفین کے دلائل کے ذیل میں آئے گا۔

### روضہ مبارک کی زیارت

ادریسری حدیث سینے نسائی نے روایت کیا ہے: ”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تجعلوا قبري عيداً و صلوا على فان صلوتكم تبلغني حيث كنتم“  
”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری قبر کو عید مت بناؤ اور مجھ پر درود بھیجو، کیونکہ تمہارا درود میرے پاس پہنچے گا جہاں کہیں تم ہوں گے۔“  
اس حدیث میں غیر عید کو عید بنانے کی بالخصوص ممانعت ہے، شاید اس میں کوئی شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر تو سب جمع ہوتے ہیں، جواب یہ ہے کہ عید میں جیسے جمع ہوتے ہیں، اس طرح میری قبر پر مت جمع ہو اور عید میں اس طرح جمع ہوتے ہیں کہ اس کی تاریخ معین ہوتی ہے اور نیز اس میں تداعی یعنی اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو وہاں جمع ہونے کے لیے

بلایا جاتا ہے، پس اس طرح جمع ہونے کی ممانعت ہے اور اتفاقی اجتماع سے ممانعت نہیں ہے، چنانچہ روضہ اقدس کی زیارت کے لیے جو جاتے ہیں اس میں یہ دونوں امر نہیں ہیں، اس کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے، بلکہ آگے پیچھے کیف ما اتفق قافلے جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلتے آتے ہیں اور نہ کچھ اہتمام ہے کہ سب کا اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہو، بہر حال اس حدیث سے صراحہ ثابت ہوتا ہے کہ قبر شریف پر بطور عید کے جمع ہونا ناجائز ہے، پس جس طرح عید مکانی ممنوع عنہ (جس سے روکا گیا ہو) ہے، اسی طرح عید زمانی بھی منہی عنہ ہوگی، اب رہ گئی یہ بات کہ اس کے بعد "صلو علی صلا تکم تبلیغی حیث کنتم" اس پر دال ہے، سو شراح نے مختلف توچہات اس کی کی ہیں، میرے ذہن میں سب سے اقرب تو جیہ اس کی یہ آتی ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس نمی (لا نعلوا) میں اہل بدعات یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم تو صلوة یعنی درود شریف پڑھنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر جمع ہوتے ہیں اور صلوة مامور بہ ہے تو ہمارا اجتماع جائز ہوگا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں اور اس احتمال کا استیصال فرماتے ہیں کہ درود شریف یہاں آنے پر موقوف نہیں ہے جہاں کہیں تم ہو گے درود شریف میرے پاس پہنچتا ہے، اس لیے یہ عذر غیر موجب ہے اور اس سے ایک بہت بڑی بات مستنبط ہوتی ہے کہ صلوة جس کے بعض افراد مندوب اور بعض واجب اور بعض فرض ہیں جب اس کے لیے عید کے طرز پر جمع ہونا جائز نہیں تو کسی اور فرض مخترع کے لیے جمع ہونا کیسے جائز ہوگا؟ لیکن اس سے کوئی شبہ نہ کرے کہ خود زیارت کے لیے جانا بھی جائز نہیں، اس لیے کہ وہاں جو جاتے ہیں تو مقصود اصلی صلوة نہیں ہے، بلکہ زیارت مقصود ہے اور وہ بدون قبر جگہ ممکن نہیں۔

### چوتھی حدیث سے استدلال

چوتھی حدیث یہ ہے کہ عید کے روز کچھ لڑکیاں کھیل رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے، انہوں نے لڑکیوں کو ڈانٹا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان لکل قوم عیدوا و هذا عیدنا" یعنی اے عمر! منع نہ کر، ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے، اس حدیث میں علت ان کے کھیلنے کی اباحت کی یہ فرمائی کہ یہ ہماری عید ہے، اس میں جو از لعب کو یوم عید ہونے پر معلل فرمایا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عید کے ساتھ خاص ہے، سو اگر ہر شخص کو عید منانا جائز ہو تو ہر روز ایسا لعب جائز ہو جائے گا اور تخصیص منصوص باطل ہو جائے گا جس سے مخترع ثابت ہوئی۔

## عدم جواز پر اجماع سے ثبوت

اب رہا اجماع، سو اس سے بھی ثابت ہے، تقریر اس کی یہ ہے کہ قاعدہ اصولیہ ہے کہ قاعدہ ہر امر کے ترک پر متفق ہو جانا یہ اجماع ہوتا ہے کہ اس کے عدم جواز پر، چنانچہ فقہاء نے جابجا اس کے قاعدے سے استدلال کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کو ہمیشہ ترک کرنے سے استدلال کرتے تھے، مثلاً فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی، لیکن اس میں اذان اور تکبیر نہیں تھی، اسی طرح جس شے کو تمام امت نے ترک کر دیا ہو، وہ واجب الترتک ہے، اسی بناء پر فقہاء نے صلوة عیدین میں بلا اذان و تکبیر کہا ہے، پس اگر یہ قاعدہ مسلم نہ ہوتا تو آج سے ہی عیدین میں اذان اور تکبیر کا بھی اضافہ کر دینا چاہئے اور اگر مسلم ہے تو اس قاعدے سے اور جگہ بھی کام لو۔

## ایک شبہ کا جواب

اس پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ تمام امت نے عید میلا والنبی کو ترک نہیں کیا، اس لیے کہ امتی تو آخر ہم بھی ہیں سو ہم اس کو کرتے ہیں، پس اجماع کہاں رہا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اصول فقہ کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ اختلاف متاخر اتفاق مستقدم کا رافع نہیں ہے، یعنی جس امر پر تمام امت کا اتفاق زمان سابق میں متحقق ہو چکا ہو اب اس اتفاق کو بعد کا اختلاف نہ اٹھائے گا جب تک تم لوگوں نے ایجاد نہیں کیا تھا، اس وقت تک تو امت کا اس کے ترک پر اتفاق تھا، اب وہ اتفاق مرتفع نہیں ہو سکتا، اس قاعدہ کی ایک جزئی اور ہے کہ علما، حنفیہ نے نماز جنازہ کا کمرار جائز نہیں رکھا اور دلیل یہی لکھی ہے کہ صحابہ اور تابعین سے ثابت نہیں غرض یہ قاعدہ مسلم ہے کہ امت کا کسی امر کو ترک کرنا اس کے عدم جواز کی دلیل ہے، پس بلفظہ تعالیٰ اجماع امت سے بھی ثابت ہو گیا کہ یہ عید بدعت اور امر منخترع واجب الترتک ہے۔

## عید میلا د کا عدم جواز قیاس سے

اب رہا قیاس تو قیاس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ قیاس جو مجتہد سے منقول ہو اور ایک وہ جو مجتہد سے منقول نہیں اور یہ قاعدہ کہ غیر مجتہد کا قیاس معتبر نہیں ہے، ان واقعات میں ہے کہ جو مجتہدین کے زمانے میں پائے گئے ہیں اور جو نئے واقعات پیش آئیں ان میں قیاس غیر مجتہد کا معتبر ہے، چنانچہ جس قدر نئی تجارتیں اور ایجادات اس زمانے میں ہوئی ہیں، سب کا حکم قیاس سے ہی ثابت

ہوتا ہے، مع بذلہ ہم خود قیاس نہیں کرتے اس لیے ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت تو جب تھی جب سلف کے کلام میں اس سے تعرض نہ ہوتا، اس لیے کہ ان حضرات کا قیاس ہمارے قیاس سے مقدم ہے اور ان کے کلام میں اس سے تعرض ہے، چنانچہ تعبد الشیطان و صراط مستقیم میں بہت زور شور سے اس امر پر گفتگو کی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ کسی زمانہ یا مکان کو عید بنانا ممنوع ہے، پس قیاس سے بھی اس عید کا ناجائز ہونا ثابت ہوا۔ یہ تو ہمارے دلائل تھے۔

## موجدین کے دلائل اور ان کا جواب

اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور اس کا جواب سنئے! اور ان کی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کر دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے، ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے، بلکہ ہو تو اگر برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو، اسی واسطے جی تو نہیں چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیے جائیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش نہ رہے، اس لیے میں ان دلائل کو بھی مع جواب نقل کیے دیتا ہوں۔

## پہلا استدلال اور اس کا جواب

اول آیت یہ ہے: "قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا" سے استدلال کر سکتے ہیں کہ اس آیت سے فرحت کا مامور بہ ہونا ثابت ہوا اور عید بھی اظہار فرحت ہے، لہذا جائز ہے جو اب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا نکلا اور گفتگو اس ہیئت خاص میں ہے، لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح ہو تو فقہاء نے کتب فقہ میں جن بدعات کو روکا ہے، وہ بھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہیں، چاہیے کہ وہ بھی جائز ہو جائیں، حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں، ان میں ان کی ممانعت مصرحاً مذکور ہے اور ان اہل زلفی کو ہمیشہ یہ دھوکہ ہوتا ہے اور یا تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہی ہے، اسی بناء پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے، ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں، وہ ہیئت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت فَلْيَفْرَحُوا سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلق ہے، پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں، بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں، اس لیے یہ موجدین تو سال بھر میں ایک مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش ہیں۔ (اس لیے کہ اہل نسبت ایمان کی بشارت اور اس کے ذوق سے ہر وقت محذور



رہتے ہیں) اور اہل حق میں ہی بہت سے افراد اس دولت سے مشرف ہیں: "وَذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَ هَذَا هُوَ الْفَرْحُ الْمَمُورُ كَمَا سَرَفِي تَفْسِيرًا لِآيَةِ " (جامع) پس جو فرح کو منقطع کر دیں وہ آیت کے تارک ہیں، ہم تو کسی وقت بھی قطع نہیں کرتے، پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی بروقت عمل کرتے ہیں اور دلائل منع بدعات پر بھی عمل کرتے ہیں، اہل بدعات کو دونوں امر نصیب نہیں، خاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں: افراط، تفریط اور اعتدال تفریط تو یہ ہے کہ تجدید بالما، المہملہ کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح (خوشی) ہوگی جیسا محض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہو گیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جلدی رکھیں مگر حد و شرعیہ سے تجاوز کریں، جیسا کہ اہل تجدید باحکیم اجمہد کا طریق متعارف ہو گیا اور اعتدال ادا امت میں ہے، پس نہ ہم محدود ہیں نہ مجدد بلکہ قدیم ہیں۔ و الحمد لله على ذلك۔

## دوسرا استدلال اور اس کا جواب

دوسرا استدلال موجودین کا اس حدیث سے ہو سکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر تو خوشی میں آ کر ایک باندی کو آزاد کر دیا اور اس پر عنقوت میں تخفیف ہو گئی، پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز ہے اور ما جب برکت ہے جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں، بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں، گفتگو تو اس بیعت کذاییہ میں ہے۔

## تیسرے استدلال کا جواب

تیسرا استدلال اس آیت سے ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "وَإِذْ قَالَ السَّحَوٰرِيُّونَ بَلْغَيْبِئْسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ [الہی قولہ] رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عَيْدًا آلَؤَلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ"

"یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادیں، عیسیٰ ابن مریم کی اس دعا تک کہ اے اللہ! ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے عید بن جائے، ہمارے پہلو کے لیے اور ہمارے پچھلوں کے لیے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے۔" اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ امام سابقہ کے شراعیہ اگر حق تعالیٰ ہم پر نازل فرمائے اور ان پر انکار نہ فرمائیں تو وہ ہمارے لیے حجت ہیں اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ظاہر ہے کہ

نعمتِ عظیمہ ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا، جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار ہی جگہ ہو، جہاں وہ منقول ہے، دیکھئے: ”وَإِذْ قُلْنَا لِمَلَائِكَةِ اسْمُحُذُوا لِآدَمَ“ میں سجدہ تحیت منقول ہے اور سجدہ رُبعیہ ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں پر اس پر انکار منقول نہیں، اس کے لیے دوسرے دلائل ہیں، اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیات و احادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں، وہ اس پر انکار کے لیے کافی ہیں، یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جب کہ آیت کے معنی یہی ہوں جو مستدل نے بیان کیے ہیں، ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عید کا مطلب یہ ہے کہ نزولِ مائدہ کی تاریخ کو عید بنائیں اس لیے کہ نکون میں ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے، پس اس سے یومِ نزولِ المائدہ لینا مجاز ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں، مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، پس معنی یہ ہے کہ نکون المائدہ سرور لنا یعنی وہ ہمارے لیے سرور کا باعث ہو جائے، عید کے معنی متعارف نہیں ہیں، بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آئے اس سے عید میلا والہی ہی مراد ہو؟ جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م، ت، ع، آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں، ان کے نزدیک جہاں گویا شیخ سعدی رحمہ اللہ کے شعر ”تمتع ہر گوشہ یا نتم“ سے یہی ”متعہ“ نکلتا ہے اور آیت ”رَبَّنَا اسْتَمْنَعْ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ“ کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے رب ہمارے بعض نے بعض سے ”متعہ“ کیا ہے، ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع، ی، د آئے اس سے عید میلا والہی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

### چوتھا استدلال اور اس کا جواب

چوتھا استدلال اس قصہ سے ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت ”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ“ نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت کریمہ عید کے دن ہی نازل ہوئی ہے، یعنی یومِ جمعہ اور یومِ عرفہ کو نازل ہوئی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے: ”نَزَلَتْ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ وَعَرَفَةَ“ یہ حدیث کا مضمون ہے، تقریراً استدلال کی اس آیت سے یہ ہے کہ حضرت عمر و ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے، اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک نہ سوجھتا، لیکن ہم نے تمبر انا نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہو سکتی ہے، اس کے دو جواب ہیں، ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ

کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا، تو یہ کیا ضروری ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو؟ چنانچہ ہمارے فقہاء نے تعریف یعنی یوم عرفہ حجاج کے مشابہت سے جمع ہونے پر انکار فرمایا ہے، یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے تھکب کو لیس ہشتی کہا ہے، حالانکہ وہ منقول بھی ہے، مگر صرف عبادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے انکار فرمایا، تو غیر منقول کو قربت سمجھنا تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انکار اجتماع علی الشجرۃ الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے، پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہو گیا۔ گو ہر ہر مقام پر انکار منقول نہ ہوا، دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا، یہودی تھا، اس کا خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے، بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنانا جائز نہیں، یعنی مطلب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چونکہ تعیند جائز نہیں ہے، اس لیے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے تھے، مگر خدائے تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا۔

## پانچواں استدلال اور اس کا جواب

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ کر سکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن روزہ رکھا، کسی نے وجہ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا: 'ذالک الیوم الذین ولدت فیہ' یعنی میں اس دن پیدا ہوا ہوں، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادت عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی الولادت قربت ہے، لہذا یہ جائز ہے، اس کے بھی دو جواب ہیں۔ اول یہ کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے، اس لیے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش ہوں، اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم عرض اعمال ہے، بس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے، اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہیں، تو تم نے حکمت کو اصل علت ٹھہرایا، حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم و امر نہیں ہوتا، دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے، لیکن علت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو اور ایک وہ جس کا تعدد یہ دوسری جگہ بھی ہو۔ اگر یہ علت متعدد ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہما کیوں منقول نہیں؟ اور نیز منقل یوم الاثین کہ یوم ولادت ہے، تاریخ ولادت میں بھی

کہ ۱۲ ربیع الاول ہے، روزہ رکھنا چاہئے، دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں، مثلاً ہجرت، مکہ، معراج وغیرہ، آپ نے ان کی علت سے کیوں کوئی عبادت نہ فرمائی؟ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام ہے، بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وجہ ہے۔ باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا، ورنہ دوسری نعمتوں کے دن بھی روزہ و تعہد چاہئے اور اگر اس پر کہا جائے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے، تمام نعمتوں کی، پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے، اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص کی گئی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ حمل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہیے، پھر حیرت یہ ہے کہ یوم الولادة دو شنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ ولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید منائیں، یوم الاثنین میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے، پس اس دلیل کا متقاضی تو یہ تھا کہ ہر ہیر پیر کو عید کیا کریں، غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجودین کا ثابت نہیں ہوتا، یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔

### عقلی دلائل کا جواب

اب ہم اس بات میں عقلی گفتگو کرتے ہیں، اس لیے کہ ان لوگوں میں بعض عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے ہیں، جو راجح ہیں۔ ملک اور قوم کی طرف، اس لیے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کیے دیتے ہیں، جاننا چاہیے کہ جس قدر عبادت شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہے، ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے مامورہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں، اول تو یہ کہ سبب میں تکرار ہو، یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو، سبب کے تکرار ہونے سے مسبب بھی پایا جائے گا، مثلاً وقت صلوٰۃ کے لیے سبب ہے، پس جب وقت آئے گا، صلوٰۃ بھی واجب ہوگی، اسی طرح صیام رمضان کے لیے شہر شہر سبب ہے جب شہر شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کے لیے نطر اور اضحیہ کے لیے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مسبب بھی ایک اور سبب بھی ایک، جیسے بیت اللہ شریف حج کے لیے، چونکہ سبب ایک ہے، اس لیے مامورہ یعنی حج بھی عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے، یہ دونوں قسمیں تو مدرک بافضل ہیں، اسی لیے کہ عقل بھی اسی کو متقاضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحد (ایک ہونا) سے مسبب متکرر (مکرر ہونا) اور متوحد (ایک ہونا) ہو، تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور مسبب کے اندر تکرار ہو، جیسے حج کے طواف میں رُل کا سبب اراءۃ توت بھی، اب وہ اراءۃ توت تو ہے نہیں، اس لیے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان حج کے لیے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو

بیشرب کے بخار نے ضعیف اور بو دھا کر دیا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں، یعنی شانے ہلاتے ہوئے اکڑ کر طواف کرو تا کہ ان کو قوتِ مسلمین کی مشاہدہ ہو اب وہ سب تو بے نہیں، لیکن ماسور بہ یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے، یہ امر غیر مدرک بالمعقل ہے اور جو عقل خلاف قیاس ہوتا ہے، اس کے لیے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے، اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گزر گئی، یا بار بار آتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ ختم ہو گئی، کیونکہ اب ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے، وہ اس خاص یومِ ولادت کی مثل ہوتی ہے نہ کہ عین اور یہ ظاہر ہے کہ پس مثل کے لیے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا، بوجہ غیر مدرک یا بالمعقل ہونے کے، قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا، لیکن یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ الاثین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولادت فیہ سے فرمائی ہے، تو اس میں بھی یہ کلام ہو سکتا ہے، کہ یومِ ولادت تو گزر گیا ہے، اب یہ اس کی مثل ہے، اس کو حکم اصل کا کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے، اس لیے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا، اب ہم تبرعاً ان حضرات کو بھی ایک دلیل عقلی لکھ کر اور اس کا جواب دے کر مضمون کو ختم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادتِ مسیح علیہ السلام میں عید کرتے ہیں، تا کہ اسلامی شوکت ظاہر ہو، جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی درجہ میں صحیح ہو جب ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لیے کوئی شے نہ ہو، ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہار شعائر اسلام کے لیے ہیں، دوسرے یہ کہ اگر ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے، تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدیں اور میلے ہوتے ہیں، تم کو کبھی چاہیے کہ ہر ہر دن کے مقابلے میں تم بھی عید کیا کرو، اس طرح عاشورہ کے دن تعزیر بھی کیا کرو، تا کہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو، چنانچہ بعض جاہل محض مقابلہ کے لیے ایسا کرتے بھی ہیں اور جناب اگر یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی، دیوالی ہوتی ہے، ان کے مقابلہ کے لیے ہولی، دیوالی کیا کرو۔

### ایک قصہ

میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصول اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا، اس پر ہتھیار لٹکائے تھے اور اس کا نام ”ذات انواط“ رکھا تھا، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ”یسا رسول اللہ اجعل لنا ذات انواط“ یعنی یا رسول اللہ! ہمارے لیے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ذات انواط مقرر فرمادیجئے یعنی کوئی ایسا درخت ہمارے لیے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقرر فرمادیجئے کہ اس پر ہم ہتھیار اور کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں، دیکھئے اتفاقاً اس میں کوئی حرج معلوم

نہیں ہوتا، اس لیے کہ کسی درخت پر کپڑے یا ہتھیار لٹکا دینا ایک امر مباح ہے، اس میں تشبیہ بھی کچھ نہیں، لیکن صورت ان کی مشابہت تھی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور متغیر ہو گیا اور فرمایا: ”سبحان اللہ! یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے قوم موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ”اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ“، پس جب اس مشابہت کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا، جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جائے، یہ تو بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا، یہ اس باب میں گفتگو تھی جو اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہے، غرض عقل سے، نقل سے، ہر طرح بجز اللہ ثابت ہو گیا کہ یہ عید مختراع (من گھڑت) ناجائز اور بدعت، واجب الترتک ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تحدید یا تجدید کا حکم نہیں، بلکہ فرح دائم اور مسرت دائمی کا حکم ہے، اس لیے کسی خاص دن کو اس کے لیے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت اسی آیت پر عمل کریں۔ (السرد و صفحہ: ۲۹)

تینیسواں اعتراض..... پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے

### مذاق کے خلاف ہے

حضرات اولیاء اللہ کے مزارات اسی تعظیم کی وجہ سے بڑا عالی شان پختہ پختہ بنائے جاتے ہیں، یہاں بھی منشا، وہی عظمت ہے، مگر اس کا ظہر بری طرح ہوا، کیونکہ شرعاً تعظیم اولیاء کی یہ صورت حرام ہے، اہل اللہ کی تعظیم کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ ان کے مزارات پختہ بنائے جائیں وہ تو سبکی قبریں بھی ویسے ہی معظم و محترم ہیں، جیسے کئی قبریں، بلکہ کئی قبروں پر بوجہ موافقت سنت کے انوار زیادہ ہوتے ہیں، حضرت شیخ بختیار کا کی رحمہ اللہ کی کچی قبر پر ایسی ہیبت برستی ہے جو سلاطین کی قبروں پر خاک بھی نہیں اور اگر کسی کی آنکھیں ہوں تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کچی قبر پر جو انوار ہیں، وہ پختہ قبر پر کہاں؟ اور اگر کسی کی آنکھیں بند ہوں تو وہ اس دلیل ہی سے سمجھ لے کہ اول تو انوار سنت کے ساتھ مخصوص ہیں اور پختہ مزارات تمام تر رؤساء اور امراء اور سلاطین کے بنائے ہوئے ہیں، بزرگوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ امراء اور سلاطین کی بنائی ہوئی چیز میں انوار کہاں؟ اور اہل اللہ کو اپنے بدن تک کی تو پرواہ نہیں ہوتی، پھر یہ جو چلے قبروں کے پختہ و آراستہ بنانے کے ان میں کہاں سے آجاتے؟ یقیناً یہ بزرگوں کا کام نہیں، بلکہ سلاطین و امراء کے جو چلے ہیں، انہیں کو ایسی باتیں سوچنا کرنی ہیں جو سلاطین و رؤساء و دین سے نا آشنا ہیں، ان کو تو دوسری طرح فسق و فجور کے جو چلے سوچتے ہیں اور جن کو ذرا دین سے کچھ تعلق اور دینداروں سے کچھ محبت ہے، ان کو پختہ مزار بنانے کے اور بدعات کے جو چلے سوچتے ہیں، جیسے ایک رئیس

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے واسطے ایک نہایت قیمتی خوشنما بھڑکدار پوستین لائے تھے کہ حضرت اس کو پہنا کریں، مولانا رحمہ اللہ نے اسے ایک نواب صاحب کو دے دیا اور فرمایا کہ نواب صاحب اس کو آپ پہن لیجئے آپ کے کپڑے پر یہ اچھی لگے گی کیوں کہ آپ کا لباس بھی اس کے موافق قیمتی ہوگا اور میں لٹھے گاڑے دھوڑے اور پراس کو پہن کر کیا اچھا لگوں گا؟ پھر اس کی حفاظت کپڑے سے کون کرے گا، مجھے اتنی فرصت نہیں، فضول اس کو رکھ کر بھی ضائع کروں، غرض اہل اللہ جب اپنے بدن کے واسطے یہ جھگڑے پسند نہیں کرتے تو قبروں کے لیے ان خرافات کو کیسے پسند کریں گے؟ یہ پختہ مزارات اہل اللہ کے مذاق کے بالکل خلاف ہیں، پھر یہ قبر کی وضع کے بھی خلاف ہیں، کیونکہ قبروں کی زیارت سے جو مقصود ہے، وہ ان پختہ قبروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

### زیارت قبور کا منشاء

زیارت قبور سے غرض یہ ہے کہ موت یاد آئے اور دنیا کے زوال و فنا کا نقشہ سامنے آجائے تو یہ بات کہی اور شکتہ قبروں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، شکتہ قبر سے دل پر اثر ہوتا ہے اور موت یاد آتی ہے، ان شاہی قبروں سے موت تیزوڑی یاد آتی ہے نہ زوال و فنا کے دنیا پیش نظر ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی قبروں سے بزرگوں کی محبت و عظمت تو دل میں آتی ہے، تو میں کہوں گا یہ محبت تعزیوں والی جتنی ہے کہ ان کو بدون تعزیوں بنائے اور مرثیہ گائے شہداء پر رونائیں آتا، جتنی محبت و عظمت کو اس ساز و سامان کی ضرورت نہیں، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت نہ تھی؟ ان کو تو ایسی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی کبھی زمین پر نہ گرتا تھا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ اور آنکھوں پر ملتے تھے۔

### صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل

مگر بایں ہمہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پختہ نہیں بنائی بلکہ کہی ہی رکھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے سے منع فرمایا ہے، ایسی محبت و عظمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا یہی تھا کہ قبر پختہ نہ بنائی جائے اور ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ اپنی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر جان و مال سے فدا تھے، پس جس بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہے، اسی میں اولیاء اللہ کی بھی خوشی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پختہ قبر بنانے میں اہل اللہ کے نشان کا بقاء ہے، تو اس کے جواب میں اول تو میں یہی کہتا ہوں کہ خدا ان کو باقی رکھنے والا ہے، تمہارے باقی رکھنے سے وہ باقی نہیں رہ سکتے، دیکھو، بہت سی پختہ قبروں کے لمرے ایسے بھی ہیں، جن

کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں، تو کیا پختہ قبر ہی بنانا بقاء کا ذریعہ ہے؟ ہرگز نہیں! باقی اہل برکتے والی چیز اہل اللہ ولایت اور ان کے کمالات معرفت و محبت ہیں، پس وہ آپ کی ابقاء کے محتاج نہیں، عارف رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنگہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اور مولانا نیاز فرماتے ہیں:

طبع فاتحہ از خلق نداریم نیاز

عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقی است

## چکی قبریں

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نشان باقی رکھنے کی یہ بھی صورت ہے کہ قبر چکی رکھو اور ہر سال اس کی لپ پوت کرتے رہو، مٹی ڈلواتے رہو اور ایک عجیب تماشا ہے کہ یہ اہل دنیا کی قبر اس بزرگ کی بنواتے ہیں جس کو اپنے زعم میں پورا قبیح سنت نہیں سمجھتے اور جس کو قبیح سنت سمجھتے ہیں، اس کی قبر چکی ہی بناتے ہیں، چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کا کی رحمہ اللہ کی قبر چکی ہے اور وہاں عورتیں بھی حاضر نہیں ہوتیں، ان کے مجاروں سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا: ”حضرت رحمہ اللہ قبیح شریعت بہت تھے، اس لیے ان امور کو جائز نہیں رکھا گیا، گویا نعوذ باللہ! دوسرے اولیاء اللہ قبیح شریعت نہ تھے، تو اس فعل سے اپنے بزرگوں پر ایک سخت الزام لگانا ہے کہ یہ قبیح شریعت نہ تھے، سو اس وجہ سے بھی یہ فعل قابل ترک ہے۔“

## پختہ قبر ممنون

قبر پختہ بنانا شریعت میں ممنوع ہے اور اس کے ممنوع ہونے کی ایک اور حکمت سمجھو! وہ یہ کہ چکی قبر بنانے سے جو شریعت نے منع کیا ہے، حقیقت میں یہ ہم پر بڑا احسان کیا، کیونکہ اگر ابتداء سے اس وقت تک سب قبریں پختہ ہی ہوتیں، تو آدمیوں کو تو رہنے کے لیے جگہ بھی نہ ملتی، نہ زراعت کے لیے زمین ملتی، کیونکہ مردے اس قدر گزر چکے ہیں کہ کوئی حصہ زمین کامردوں سے خالی نہیں، بتلائیے! اگر سب کی قبریں پختہ ہوتیں تو ہمارے لیے کہاں ٹھکانا ہوتا؟ پس قبروں کے اوپر دو منزلہ سے منزلہ مکان بناتے جو ایک پہاڑ سا ہو جاتا اور چکی قبر میں تو یہ بات ہے کہ جب نشان مٹ گیا، تو اب وہاں دوسری قبر بنا سکتے ہیں اور اگر زمین وقف نہ ہو تو اس پر اتنی



مدت کے لیے بعد زراعت بھی کر سکتے ہیں، جس میں یہ یقین بھی ہو جائے کہ مردہ کا جسم خاک تک خوردہ ہو گیا ہوگا اور یہ بات کہ ہر جگہ مردے ہیں، زندوں کی مردم شماری پر نظر کر کے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جب ایک زمانے میں اتنے آدمی جمع ہیں، تو چھ سات ہزار سال کی مدت میں کس قدر بے شمار ہوں گے؟ اور ہر شخص کی قبر کے لیے کتنی جگہ ضروری ہوتی ہے، تو زمین میں اتنی جگہ کہاں پھنسی؟ اور اسی حساب پر نظر کر کے اہل سائنس یہ کہتے ہیں کہ اگر آج سب زندہ ہوتے تو اس زمین پر رہنے کی جگہ نہ ملتی، غرض قبروں کے پختہ ہونے سے یہ تنگی ہوتی اور اب تو انہی کے دفن ہونے کی جگہ میں سب بس رہے ہیں، ان ہی کے دفن بلکہ خود ان کے جسد کی مٹی سے مکان بنا رہے ہیں، برتن بنا رہے ہیں، ممکن ہے کہ ہمارے گھروں کے گھڑے، صراحی، پیالے ہمارے بزرگوں کی مٹی کے بنے ہوئے ہوں، تو قبروں کا پختہ بنانا ان مفاسد پر مشتمل ہے، علاوہ اس کے موت تو مٹانے کے واسطے ہے، اس کے بعد بقاء کا سامان کرنا ایک امر فضول ہے۔

### قبروں پر فیض کا سوال

اس پر اگر کوئی کہے کہ قبر سے فیض ہوتا ہے، اس لیے قبروں کی بقاء کی ضرورت ہے، تو میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کرتا، مگر اول وہ فیض معتد بہ نہیں، کیونکہ قبروں سے جو فیض ہوتا ہے، وہ ایسا نہیں جس سے تکمیل ہو سکے یا سلوک طے ہو سکے، بلکہ اس کا درجہ صرف اتنا ہے کہ صاحب نسبت کی نسبت کو اس سے کسی قدرت قوت ہو جاتی ہے، غیر صاحب نسبت کو تو خاک بھی فیض نہیں ہوتا، صرف صاحب نسبت کو اتنا فیض ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے نسبت کو قوت اور حالت میں زیادت ہو جاتی ہے، مگر وہ بھی دیر پانہیں ہوتی، بلکہ اس کی ایسی مثال ہے، جیسے تنور کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے جسم میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے کہ جہاں تنور سے بٹے اور ہوا لگی، وہ سب گرمی جاتی رہی اور زندہ مشائخ سے جو فیض ہوتا ہے، اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کوئی مقوی دوا کھا کر قوت و حرارت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تمام جسم میں پوسٹہ ہو جاتی ہے، پس صاحب نسبت کو اول ضرورت بھی ہو تو صاحب نسبت کے لیے قبر کا پختہ ہونا ضروری ہے، وہ تو آثار سے معلوم کر لے گا یہاں کوئی صاحب کمال مدفون ہے، پس یہ وجہ بھی کالعدم ہوگی۔

(الفاظ القرآن صفحہ ۵۶)

### چوبیسواں اعتراض..... ربیع الاول کی مخصوص تاریخ میں میلاد کی ممانعت!

ربیع الاول کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، کیونکہ یہ مہینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و تشریف آوری کا ہے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

یاد تقاضہ کے ساتھ دل میں پیدا ہوتی اور ایک خاص تحریک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی ہوتی ہے، اگر اس کے ساتھ منکرات منضم نہ ہوتے تو اس ماہ میں یہ حالت اور اس حالت میں آپ کا ذکر کرنا علامت محبت ہوتی، مگر افسوس ہے کہ منکرات کی وجہ سے اہل فتویٰ کو اس ذکر کی ہیئت مخصوصہ سے روکنے کی ضرورت ہوتی ورنہ یہ مسئلہ فی نفسہ اختلافی ہونے کے لائق نہ تھا، مگر اہل فتویٰ کو روکنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ دفع حضرت جلب نفع سے مقدم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حاصل ہے، اس لیے اس کی تبلیغ و جوہر کے درجے میں نہیں ہے، صرف مستحب اور احب المستحب ہے اور منکرات سے بچنا واجب ہے، تو اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا اسی وقت مستحب ہو سکتا ہے جب کہ منکرات سے خالی ہو علماء کہتے ہیں کہ بعض احوال میں منکرات کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی ہے، جب تک کہ خود بھی اس کو ترک نہ کیا جائے، اس لیے شیوع منکرات کے وقت وہ اس مستحب ہی کے ترک کا امر کرتے ہیں جس کے ساتھ منکرات کا انضمام ہوا ہے اور اس بارے میں رائے علماء کی مانی جائے گی، کیونکہ صوفیہ تو اہل شوق ہیں، ان کو دوسروں کے انتظام کی پرواہ نہیں جو صوفیہ کہ محض صوفی ہوں عالم محقق نہ ہوں اور علماء منتظم ہوتے ہیں اور منتظم کی رائے غیر منتظم سے مقدم ہوتی ہے۔

### صوفیہ اور علماء کے ذوق کا فرق

اب اس میں صوفیہ کی اور علماء کی رائے مختلف ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ فعل مستحب کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے۔

### صوفیہ اور علماء کی رائے کا فرق ایک مثال سے

دونوں کی حالت کا فرق ایک مثال سے سمجھئے! مثلاً موسم و با میں اطباء کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے کہ آج کل امرود کھانا زیادہ مضر ہے، اس کے بعد ایک طبیب نے تو یہ کیا کہ امرود کھانا نہیں چھوڑنا بلکہ قلیل مقدار میں مصلحات کے ساتھ کھانا اور ایک طبیب وہ ہے جس نے خود بھی امرود کھانا چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں قلیل مقدار میں یا مصلحات کے ساتھ کھاؤں گا تو مجھے کھانا ہوا دیکھ کر دوسرے بھی کھائیں گے اور وہ ان امور کی رعایت نہ کریں گے جن کی میں رعایت کرتا ہوں، بلکہ اندھا دھند کھائیں گے اور ہلاک ہوں گے اس لیے وہ بالکل ہی امرود کھانا چھوڑ دیتا ہے، دوسروں کو بھی علی الاطلاق منع کرتا ہے بلکہ لوکرے کے لوکرے چھینکوا دیتا ہے اور دوا دیتا ہے جس کی اس حالت کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو امرود سے رغبت نہیں اور جو طبیب امرود کھانا

رہے ہیں، ان کو امر و نہی سے بہت رغبت ہے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ رغبت کو اس کو ان کے برابر یا ان سے بھی زیادہ ہے، مگر محض دوسروں کی رعایت سے ترک کر رہا ہے، بتلا جائے ان دونوں میں سے کون سا طیب لائق اتباع ہے؟ یقیناً یہ دوسرا طیب زیادہ قابل اقتداء ہے، کیونکہ اس کی رائے انتظام پر مبنی ہے، سب اسی کی رائے کو ترجیح دیں گے، بس یہی حال علماء و صوفیہ کا ہے، صوفیہ اپنے غلبہ شوق کا ضبط نہیں کرتے، بلکہ مستحب کو برابر کرتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اصلاح منکرات کا قصد کرتے ہیں اور علماء بشرطیکہ خشک نہ ہوں انتظام کی وجہ سے اپنے شوق کو ضبط کر لیتے اور ظاہر میں اس مستحب ہی کو ترک کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عوام بدون ترک مستحب کے منکرات کو ترک نہیں کر سکتے۔

صاحبو! کیا ہمارے دل میں یہ دیکھ کر گدگدی نہیں اٹھتی کہ ہر طرف مجلس مولد ہو رہی ہے، مگر محض انتظام عوام کی وجہ سے ہم اپنے شوق کو دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔ (نور النور صفحہ ۵)

### حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ

اس پر لوگ ہم کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ لوگ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کرتے ہیں، استغفر اللہ! ارے ذکر رسول و حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے یہاں عین ایمان ہے، پھر بھلا عین ایمان سے بھی کوئی مسلمان منع کر سکتا ہے؟ بلکہ دراصل ہمارے علماء ان منکرات سے روکتے ہیں، جو اس ذکر کے ساتھ عوام نے منظم کر رکھی ہیں، مگر چونکہ ان منکرات کی اصلاح اس ذکر کو باقی رکھ کر نہیں ہو سکتی اور یہ ذکر خاص ایام میں واجب نہیں، اس لیے وہ منکرات کی اصلاح کے لیے قیود کے ساتھ ذکر ہی سے منع کرتے ہیں، چنانچہ جملہ ان منکرات کے ایک قیام بھی ہے، جس میں عوام کے اعتقادات حدود شرع سے متجاوز ہیں، اس میں بھی بعض لوگ ہمارے علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ قیام تو ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے لیے ہے اور یہ مولوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے نہیں روکتے بلکہ ذکر اللہ کی بے تعظیسی سے روکتے ہیں، کیونکہ تم لوگ ذکر اللہ کے وقت قیام نہیں کرتے، پس اگر سارا ذکر مولد قیام ہی سے کرو اور سامعین بھی سارا ذکر کھڑے ہو کر سنیں تو ہم اس قیام سے کبھی منع نہ کریں گے اور مزا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات مولویوں ہی پر کیے جاتے ہیں، جو فیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، حالانکہ بعض دفعہ وہ مولویوں سے بھی زیادہ وحشت ناک حکم دیتے ہیں۔

## واقعہ خواجہ باقی باللہ

چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک شخص کی زبان سے جہر کے ساتھ لفظ اللہ نکل گیا چونکہ وہ نقشبندی تھے، جن کے یہاں ضبط احوال کی تاکید ہے، یہاں تک کہ ذکر بھی خفی بتلاتے ہیں، جہری نہیں بتلاتے، اس لیے آپ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نکال دو اس کو، ظاہر میں یہ حکم بہت وحشت ناک تھا کہ اللہ کے کہنے پر مجلس سے نکال دیا اگر کوئی مولوی ایسا کرتا تو اسی وقت کفر کا فتویٰ دیا جاتا کہ ذکر اللہ سے منع کرتے ہیں، مگر صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، یہاں بڑی جلدی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں، کہ ذکر اللہ پر نہیں نکالا، بلکہ عدم ضبط رکنا لا اتنا ضبط بھی نہ ہو سکا اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو قرآن سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس کو ضبط کی طاقت تھی، باوجود طاقت ضبط کے پھر ضبط نہیں کیا اور اگر واقعی حد ضبطی سے نکل جاتا تو پھر ملامت نہ فرماتے، اسی کو شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

دامد شراب الم در کشند  
دگر تلخ بیند دم در کشند  
پہ تسلیم سر در گریبان برند  
چو طاقت نماند گریبان درند

اسی طرح مولوی بھی قیام تعظیمی کو منع نہیں کرتے بلکہ قیام بے تعظیمی سے روکتے ہیں، جس میں احکام شریعت کی مخالفت کی جاتی اور شریعت میں ایک جدت تراشی جاتی ہے، لیکن وہ غریب دنیا میں بدنام ہیں، ان کے اقوال کی حقیقت سمجھنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا، مگر مولویوں کو شریعت کی حفاظت کے سامنے اپنی بدنامی کی بھی پروا نہیں چاہئے، کوئی کچھ کہے، ان کی بلا سے! ایک نازی پوری مولوی اٹاواہ میں مجھ سے کہنے لگے کہ جماعت دیوبند کے تقویٰ اور تقدس کی تمام دنیا معتقد ہے، صرف ایک بات لوگوں کو کھٹکتی ہے کہ آپ حضرات قیام نہیں کرتے۔ اگر آپ قیام کرنے لگیں تو تمام دنیا آپ کی غلام ہو جائے میں نے کہا وہ ہمارے آقا بن جائیں، لیکن مکھی، بال، تو ہم قصد انہیں کھا سکتے! اب چاہے دنیا معتقد ہو یا بے اعتقاد ہو۔ (ایضاً صفحہ ۵۲)

چکیوں اور اعتراض..... نماز پجنگا نہ یا فجر وعصر کے بعد مل کر بلند آواز

سے ذکر کرنا بدعت ہے!

ہر نماز کے بعد فجر وعصر کے بعد سارے نمازی مل کر جہراً ”لا الہ الا اللہ“ کہتے ہیں اور اس کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہیں، حالانکہ سب کے واسطے بزرگوں نے نہیں کہا تھا، بلکہ خاص لوگوں کو بتلایا تھا، مگر جاہلوں نے اس کو حکم عام ہی بنا لیا اور التزام کر لیا، اسی واسطے علماء نے اس کو بدعت کہا، اب ان پر آواز کے جاتے ہیں کہ لو بھائی ذکر اللہ بھی بدعت ہو گیا، ہائے! علماء کی بھی معصیت ہے، ان سے بھی کوئی جماعت خوش نہیں، مگر محققین صوفیہ ان سے خوش ہیں، وہ ان کی قدر کرتے ہیں، چنانچہ علامہ شعرانی رحمہ اللہ جو بہت بڑے محقق صوفی ہیں، فرماتے ہیں کہ شرح صوفیہ دقیق ہے، جو عوام کی فہم سے بالا ہے، اس لیے عوام کو بھی لازم ہے کہ علوم میں صوفیہ کا اتباع نہ کریں، بلکہ علماء اور جمہور کا اتباع کریں، کیونکہ یہ لوگ منتظم ہیں۔

علماء کی مثال

نظام شریعت بلکہ عالم علماء ہی کے اتباع سے قائم رہ سکتا ہے، ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ اگر علماء دنیا میں نہ ہوتے تو ہم تو سب لوگوں کو کافر بنا دیتے کیونکہ ہماری باتیں عوام کی فہم سے خارج ہیں، نہ معلوم وہ کیا سے کیا سمجھتے؟ اور ایمان کو برباد کر دیتے، مولویوں کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے مخلوق کا ایمان سنبھال رکھا ہے، تو اے! وہ صوفی جو مولویوں سے ناخوش ہے اور ان پر آواز کے کسا کرتا ہے، تو ان کا احسان مان کہ تو انہیں کی بدولت چین سے بیٹھا ہو! اللہ اللہ کر رہا ہے اور گوشہ عافیت میں بیٹھا ہوا ہے کی قدر جب ہی ہوتی جب کہ رات کو راحت پڑ کر سوتے ہو، پس یہ علماء منتظم پولیس ہیں کہ مخلوق کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنا کام چھوڑ دیں تو پھر صوفی صاحب کو حجرہ سے نکل کر یہ کام کرنا پڑتا اور سارا تصوف اور حال و حال رکھا رہ جاتا، کیونکہ اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے۔ اگر مولوی اس کو چھوڑ دیں تو پھر صوفیوں پر ملا بننا فرض ہو جائے، پس تیری گٹھڑی کی خیر اسی وقت تک ہے جب تک یہ منتظم جماعت دنیا میں موجود ہے، تم تو رات کو پڑ کر آرام کرتے ہو اور آکھ کھل گئی تو نماز اور ذکر میں مشغول ہو جاتے ہو۔

مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کا حال

اور مولویوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ رات کو حضرت سید صاحب

رحمہ اللہ کے مہمانوں کے پیر دیا کرتے تھے اور کوئی پوچھتا کون ہے؟ تو فرمادیتے ہیں کہ میں ہوں سید صاحب کا نوکر یہ سن کر مہمان خاموش ہو جاتے بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا اسماعیل شہید صاحب پیر دبانے آیا کرتے ہیں۔

### شیخ الہند رحمہ اللہ کا واقعہ

یہ تو پہلے بزرگوں کا قصہ ہے اور میں نے اپنے استاد مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی ایک حکایت اس سے براہ کرسی ہے، مجھے تو یہ حکایت سن کر پسینہ آ گیا کہ حضرت نے اپنے کو کس درجہ مناد یا تھا؟ وہ یہ کہ حضرت کے یہاں ایک مہمان آئے جن کے ساتھ ایک کافر بھی تھا، گرمی کی دوپہر میں جب مہمان سو رہے، تو مولانا دبے پاؤں تشریف لائے اور اس ہندو کے پاؤں دبانے شروع کیے، روای کا بیان ہے کہ اس وقت میں اتفاق سے جاگ رہا تھا، میں گھبرا کر پہنچا اور عرض کیا کہ حضرت! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا یہ بے چارہ تھکا ماندہ ہے، اس کی تھکن اتار رہا ہوں، میں نے کہا کہ حضرت! پھر میں دباؤں گا۔ آپ لہہ ہٹ جائیں، فرمایا نہیں! تم تو خود تھکے ہوئے ہو اور مہمان بھی ہو، بس تم پڑے رہو، غرض نہ معلوم کتنی دیر تک اس کافر کے پیر دبانے اور وہ بے ہوش پڑا سوتا رہا، کیونکہ کافروں کی آنکھ تو مرنے ہی پر کھلے گی، جب عذاب کے فرشتے نظر آئیں گے یہ تو بیداری میں بھی سوتے ہی ہیں اور مولانا پر غلبہ حال تھا کہ مثنیٰ ہو کر ایسا کام کیا، بھلا آج کل کسی صوفی نے بھی ایسا کیا ہے.....؟؟ ہم نے تو کسی کو بھی نہیں سنا، پھر وہ کس منہ سے علماء پر آواز کتے ہیں۔

(الرغیۃ المرغوبیۃ صفحہ: ۳۰)

### چھبیسواں اعتراض..... سجادہ نشینی محل میراث نہیں، بلکہ محض رسم ہے!

آج کل سجادہ نشینی بھی میراث ہو گئی ہے، چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں اور تماشا ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پر خلافت کی پگڑی باندھتے تھے، آج کل مرید مشائخ کو خلافت کی پگڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا، مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بٹھا کر خلافت کی دستار دے دی، بس! اب وہ سب کے پیر ہو گئے، ہمارے حاجی صاحب رحمہ اللہ نے اس گدی نشینی کی رسم کو بالکل منادیا، چنانچہ حاجی صاحب رحمہ اللہ کی گدی پر کوئی نہیں ہے، بلکہ ان کی گدی ایک کنگوہ میں تھی، ایک دیوبند میں تھی (یعنی مولانا قاسم رحمہ اللہ) اور ایک کہیں، ایک کہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ شان ہے کہ ایک شخص کی گدیاں جا بجا ہوں یہ کچھ نہیں کہ ایک ہی گدی ہو، سو خوب سمجھ لو کہ یہ چیزیں میراث کا مکمل نہیں۔

## حکیم الامت رحمہ اللہ کا ایک واقعہ

مجھ سے میرے قصبہ والوں نے ایک بار جمعہ کی مستقل امامت قبول کرنے کے لیے کہا تھا، تو میں نے چند شرطوں کے بعد قبول کیا تھا ایک یہ کہ امامت میرا حق نہ ہوگی، دوسرے میں پابند نہ ہوں گا، جب چاہوں گا چھوڑ دوں گا اس کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ لوگوں کے اصرار پر امامت کرتا ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ میرا حق نہ ہوگا، نہ اس میں وراثت چلے گی، جس وقت کسی ایک شخص کو بھی میری امامت ناگوار ہو، چاہے وہ جو لاہا، یا قضاہ کیوں ہو وہ ڈاک میں ایک کارڈ پر اتنا لکھ کر میرے نام ڈال دے کہ ہم کو تیری امامت ناگوار ہے، پس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک جو لاہا بھی منع کر دے گا تو میں اسی روز سے امامت چھوڑ دوں گا یہ انتظام کر کے پھر میں نے امامت کی کیونکہ اب وراثت کا خطرہ نہ رہا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ہی چھوڑ دی۔

## گلدی نشینی

غرض آج کل امامت کی طرح گلدی نشینی بھی میراث ہو گئی اور بعض لوگ ایسی گلدی کی تعظیم کرتے ہیں، بس یوں سمجھتے ہیں کہ اسی میں سب کچھ ہے، یہ سب رسم پرستی ہے، ان لوگوں میں ایک اور رسم دیکھی گئی کہ گلدی نشینی کے بعد خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے، میں بھاگلپور گیا تو ایک سجادہ نشین کی بابت سنا کہ وہ چالیس سال سے خانقاہ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور ان کے مرید اس بات کو فخر کے طور پر بیان کرتے تھے، میں نے کہا کیا وہ مستورات ہیں؟ مرد تو وہ ہے جو شمشیر برہنہ لیے پھر ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا مرادنگی نہیں البتہ کوئی معذور ہو، یا کوئی ضرورت مصلحت مفتضحی ہو تو اور بات ہے، پھر اس التزامی کے بعد اگر سجادہ نشین صاحب کو کبھی حاضری عدالت میں طلبی ہوگی تو اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح سجادہ صاحب کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کرایا جائے، کیونکہ آج کل کے مشائخ عدالت کی حاضری کو بھی عیب سمجھتے ہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں عیب و ذلت کی کیا بات ہے؟

## حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ

کانپور میں ایک مقدمہ چل رہا تھا، کسی طرح طے ہوئے نہ ہوتا تھا، حاکم نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ تم کسی کو حکم بنا کر فیصلہ کر لو، پھر اس فیصلہ کو عدالت کی طرف سے نافذ کر دیا جائے گا، فریقین حکم بنانے پر راضی ہو گئے اس کے بعد عدالت کی طرف سے کئی علماء کا نام لیا گیا مگر کسی پر دونوں

فریق کا اتفاق نہ ہوا، پھر میرا نام لیا گیا تو دونوں راضی ہو گئے، بلاخر میرے نام سمن آیا، مجھے شہادت کے لیے عدالت میں بلایا گیا، تو اس وقت بعض دوستوں کا یہ خیال تھا کہ عدالت میں جانا ذلت ہے، میں نے کہا اس میں ذلت کی کیا بات ہے؟ بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے کہ ہماری شہادت پر ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوگا، چنانچہ میں گیا اور میرا بیان ہوا اور میری شہادت پر اٹھارہ سال کا مقدمہ طے ہو گیا، اسی طرح ایک دفعہ میں بریلی گیا تو وہاں کے جنٹ نے مجھے سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا، کیونکہ ان کو اہل علم سے ملنے کا شوق تھا، اسی وقت بھی بعض دوستوں کی یہ رائے تھی کہ جنٹ صاحب مکان پر آئیں، اس میں عزت ہے اور خود جانے میں ذلت ہے، مگر میں نے سوچا کہ اگر وہ یہاں آیا تو ہم کو اس کی تعظیم و استقبال کرنا پڑھے گا اور اگر میں جاؤں گا تو وہ میری تعظیم و استقبال کرے گا، پھر میں خود گیا اور جنٹ نے نہایت عزت سے تعظیم و استقبال کیا، یہ جواب تو دوستوں کے مذاق پر تھا، ورنہ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے ان کو حکومت دی ہے، ہمارے اوپر حاکم بنایا ہے، مجھے شرم آتی ہے کہ حاکم کو محکوم بناؤں اور اس کو اپنے یہاں بلاؤں، جب خدا نے ایک شخص کو ہم پر حاکم بنایا ہے تو ادب کا منتہی یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں، جو محکوم کو حاکم کے ساتھ کرنا چاہئے اس لیے جب کوئی حاکم مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میں خود جانا پسند کرتا ہوں، مگر آج کل رسم کا غلبہ ہے، لوگ اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔

## ایک حکایت

اصل مضمون گدی نشین اور قضا، پر میراث ملنے کے متعلق تھا، ایک خرابی یہ ہے ہندو ریاست میں ایک مقام پر کوئی قاضی صاحب ایک بننے کے مقروض ہو گئے اس نے نالاش کر دی، جہاں قاضی صاحب کی زمین قرق ہوئی وہاں خطابت کی آمدنی بھی قرق ہو گئی، کیونکہ عید بقر عید کو قاضی صاحب کی آمدنی ہوتی تھی، روای کہتے تھے کہ انہوں نے ایک سال دیکھا کہ سب لوگ کپڑے بدل کر عید گا، میں بیچنے رہے اور امام صاحب کے منتظر ہیں، تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک لالہ صاحب دھونی باندھے آ رہے ہیں، اس کے آتے ہی لوگوں میں شور ہوا کہ امام صاحب آ گئے، میں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ! یہ کیسا امام ہے؟ کیا بنیا عید کی نماز پڑھانے گا؟ اب وہ بنیا آ کر سلام کر کے منبر پر کھڑا ہو گیا اور کہا: ”صاحبو! اجازت ہے؟“ لوگوں نے کہا: ”جی ہاں! اجازت ہے، اس کے بعد اس نے کپڑا بچھا دیا اور لوگوں نے روپیہ پیسہ ڈالنا شروع کیا جب سب دے چکے تو اس نے رقم کو جوڑا اور یہی (روزنامچہ) میں لکھ لیا کہ اس سال عید کو اتنی آمدنی ہوئی، پوئلہ باندھ کر گردن پر رکھا اور کہا: صاحبو! اجازت ہے؟“ لوگوں نے کہا: اجازت ہے، وہ سلام کر کے اپنے گھر



چل دیا اور اس کے بعد لوگ بھی اپنے گھر چلے گئے، نہ نماز تھی، نہ خطبہ، انہوں نے پوچھا کہ یہاں کیا عید کی نماز نہ ہوگی؟ تب لوگوں نے قصہ بیان کیا کہ امام صاحب اس بننے کے مقروض ہیں عیدین کی آمدنی بھی اس نے قرض کرائی ہے، اس لیے امام صاحب کئی سال سے نماز نہیں آتے، ہم لوگ بدستور آجاتے ہیں اور یہ بنیا آمدنی لے جاتا ہے، کئی سال سے نہیں ہوئی، یہ نتیجہ ہے امامت اور قضاء کی موروثیت کا کہ ہندو بھی اس کی آمدنی قرق کرانے لگے، ایک خرابی اس موروثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی رنڈی بھڑوں میں صرف ہوتی ہیں، ہزاروں اوقاف آج کل برباد ہو رہے ہیں، کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کے لیے جو آمدنی وقف تھی اس گدگی نشینی کی وجہ سے ان کی اولاد ہی اس کی متولی ہوتی ہے، خواہ وہ لائق ہوں یا نالائق، پھر تولیت سے گزر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا، اسی طرح ہزاروں اوقاف برباد ہو گئے۔

(اصلاح ذات البین صفحہ: ۴۹)

## ستائیسواں اعتراض..... عید گاہ میں بچوں کے لانے کی ممانعت

عید گاہ میں بچوں کا وجود کسی مفیدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے، بلکہ اس میں جو مفیدہ بچوں کے اجتماع سے ہے، اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے؟ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کی اصلاح فرما گئے ہیں، ارشاد ہے: "احبوا مساجدکم صیبا نکم" کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بال بچوں کو علیحدہ رکھو، لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عید گاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اسی لیے استدلال مذکورہ کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مساجد کس میں دو احتمال ہیں، یا تو اس کو عام لیا جائے کہ مطلق مقام صلوة مراد ہے، تب تو عید گاہ کا اس حکم میں داخل ہونا ظاہر ہے۔ اگر اس کو عام نہ لیا جائے تو گوان الفاظ میں عید گاہ داخل نہ ہوگی، لیکن یہ دیکھنا چاہئے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے؟ سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چون کہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ ملوث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی اور اس سے نماز میں خلل پڑے گا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے، عید گاہ میں بھی پائی جاتی ہے، لہذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا۔ چنانچہ خود عید گاہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "و لیعتزلن الحیض المصلی" اس مثال سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ وہ کلیہ اس وقت ہے جب کہ وہ امر مطلوب نہ ہو، ورنہ مفیدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔

(وعظ اکمال الصوم والعید صفحہ: ۶)

اٹھائیسواں اعتراض..... حضور ﷺ کی تعریف میں ایسا مبالغہ کہ جس

سے دیگر انبیاء علیہم السلام کی توہین ہو، جائز نہیں!

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی کوکھ میں انگلی چھودی، انہوں نے کہا کہ میں تو بدلہ لوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً فرمایا کہ بدلہ لے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کر دی، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا بدن تو کھلا تھا اور آپ تو کپڑا پہنے ہوئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کرتا اٹھا دیا، وہ صحابی رضی اللہ عنہ آپ کے پہلوئے مبارک سے چٹ گئے اور بو سے دینے لگے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا تو یہ مقصود تھا لوگوں نے وفات نامہ میں حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کی حکایت گھڑ لی ہے، وہ صحیح نہیں، صحیح حکایت یہ ہے جو میں نے اس وقت بیان کی ہے۔

غلط کتابیں

ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں عورتوں میں رائج ہیں، سب گھڑی ہوئی ہیں، جیسے سائپن نامہ، معجزہ آل نبی، وفات نامہ، نور نامہ، معراج نامہ، علی محمد البتہ معجزہ برنی صحیح ہے، اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں، بالخصوص جن کا میں نے نام لگوا دیا ہے، سب لغویں اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں، ایک وہ مسدس ہے جس کا ٹیپ ٹاپ کا مصرعہ یہ ہے:

”مری یار کیوں دیر آتی کری“

یہ مسدس بھی نہایت لغو ہے، اس کو بھی ہرگز نہ پڑھنا چاہئے اس ظالم نے ابتداء سے انتہاء تک خدائے تعالیٰ سے لڑائی کی ہے، کہیں انبیاء کے نبوت کے مل جانے پر حسد ہے، کہیں سلاطین کی بادشاہت پر رشک ہے اور پھر حسد کے بعد یہ شکایت ہے مجھے کیوں نہیں ملی؟ یہ کتابیں ہرگز اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں، یہ اس قابل ہے کہ اس کو بلا تامل آگ میں رکھ دینا چاہئے، معجزہ آل نبی جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دے دیا اور اس نے بیچ ڈالا، بالکل ہی غلط ہے اور لغو ہے، اسی طرح حضرت عکاشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکایت جو مشہور ہے بالکل غلط ہے۔ (بہ نضار المعصیت صفحہ: ۶)

## انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی

بعض مصنفین اور واعظین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت جزئی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شان میں صریح گستاخی ہو جاتی ہے۔

(الف) ارشاد فرمایا ہے کہ جو بعض مصنفین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور انبیاء علیہم السلام پر ثابت کرنے کے لیے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک فضیلت جزئی میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کریں، خواہ اس کی نسبت کوئی ثبوت نصوص سے بہم پہنچ سکے، یا نہ خواہ و لاکل نصوص اس اثبات دعا کے معارض ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تنقیص ہی ہو جائے، پر فضیلت جزئی بھی ثابت ہو جائے یہ کوشش پسندیدہ نہیں، کیونکہ فضیلت کلی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت ہے اور کسی جزئی فضیلت کا ثابت نہ ہونا قیاسی فضیلت نہیں، جیسا کہ کسی صحیح البصر کی آنکھ کا کامل ہونا دلیل اس کی نہیں کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے افضل ہو، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن ظاہری کی فضیلت خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ”و هو قد اعطى شطر الحسن“ سے ثابت ہے، اب اس میں فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کرنا ایک معارضہ ہے خود ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایہا م تنقیص ہے جمال یوسفی علیہ السلام کا جو بے ادبی سے خالی نہیں۔

## حسن کی دو قسمیں

ہاں! یوں کہا جائے تو سب پہلوؤں کی رعایت ہے کہ حسن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو دفعۃً ناظر کو متحیر کر دے، مگر اس کے دقائق تامل کرنے سے متناہی ہو جائیں اور اس کا لقب حسن صباحت مناسب ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو دفعۃً تو متحیر نہ کرے، مگر صدق ہو اس شعر کا:

بـزیدک وجہ حـسنا

اذا ما زدته نظرا

اور اس کا لقب حسن ملاحظت بہتر ہے، پس قسم اول میں حضرت یوسف علیہ السلام کو افضل الخلق کہا جائے گا اور قسم ثانی میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ (مقالات حکمت نمبر ۱۱، دعوات عبدیت حصہ اول)

نبی کی ایسی تعریف جس سے دوسرے کی تنقیص ہو

(ب) آج کل بعض نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتاب لکھی ہے ”سیرۃ النبی صلی

اللہ علیہ وسلم، اس کا نام ہے (مولوی شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی تصنیف) اور آپ کو جامع اوصاف و کمالات قرار دے کر اس کو اڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین کا، آپ کے تو کمالات ظاہر کیے ہیں اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام پر حملہ کیا ہے، ان کی تنقیص کی ہے، لکھتے ہیں کہ:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی، ترحم تھا، باقی اور انبیاء علیہم السلام میں سے کسی میں سیاست نہ تھی، کسی میں ترحم نہ تھا، کسی میں یہ صفت نہ تھی، کسی میں وہ صفت نہ تھی، گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی، ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں، تو ایسی مدح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کب خوش ہو سکتے ہیں؟ اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے کہ دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام میں ترحم نہیں تھا، ترحم کا مادہ کم تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست کا مادہ کم تھا، درویشانہ زندگی تھی۔

میرے سامنے یہ کتاب لائی گئی، کاغذ اس کا نہایت عمدہ قیمتی خط نہایت نفیس پر رونق ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام میں ترحم نہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست نہ تھی، کس قدر بے ادبی کی انبیاء علیہم السلام کی شان میں؟

### ہر خوبی کا ہر وقت ظہور لازم نہیں

اے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے، کیا مادہ کے لیے ظہور بھی لازم ہے؟ اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے، آپ اس کے پاس گئے، اس وقت دیکھا کہ وہ خرچ بھی نہیں کر رہا تھا، پس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے، اس کو یہی کہا جائے گا کہ جس وقت آپ گئے، اس وقت ظہور کا موقع نہ ہوگا، ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا سخی ہے؟ ایسے انبیاء علیہم السلام میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں، مگر خدائے تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں، اس کا ظہور ہوتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام تو ایسے رحیم تھے کہ نوسو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مضائب اٹھاتے رہے، مگر بد دعا نہیں کی، اس سے زیادہ کیا ترحم ہوگا؟ کیا نظیر ہو سکتی ہے اس ترحم کی؟ پھر اس وقت بدعا فرمائی جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آ گیا: ”اِنَّهٗ لَنْ يُؤْمِنُ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ“ تمہاری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا، معلوم ہوا کہ ان میں دونوں مشینیں تھیں، نو پچاس برس تک ترحم کی مشین چلائی اس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی

چلا دو، اب جدھر اللہ تعالیٰ ادھر وہ دیکھو تو حضرت نوح علیہ السلام میں ترجمہ کیا تھا کہ نوح علیہ السلام برس تک قوم کی تکالیف پر صبر کیا اور بددعا نہیں کی۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ

ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصنف صاحب کے تختہ مشق ہیں کہتے ہیں کہ بس وہ تو فقیر اور صوفی تھے ان میں تمدن اور سیاست کہاں تھی؟ ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ اگر گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو مصنف صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ حق ادا کیا ہے، اول تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب مدعی ہیں، ان کے ذمہ دلیل ہے اور کیا دلیل اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا؟ عدم ظہور سے عدم وجود لازم نہیں آتا، دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلطنت کریں گے، ان کے سامنے ساری سلطنتیں مٹ جائیں گی، سارے عالم کا انتظام ان کی مٹھی میں ہوگا، ظاہر ہے جب تک سیاست کا مادہ نہ ہو، یہ باتیں ان سے کہے ہو سکتی ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا؟ حضرت! یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے، لکھ مارتا ہے، خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء علیہم السلام میں سارے کمالات ہوتے ہیں، مگر جس مادے سے کام لینے کا حکم ہوتا ہے، اسی کو کام میں لاتے ہیں۔ (وعظ الخیرۃ صفحہ: ۲۱)

### انداز بیان میں احتیاط

(ج) غضب ہے کہ بعض مصنفین بھی جن پر معقول کا غلبہ ہے، اس مرض میں مبتلا ہیں، میرے تو ایسی باتوں میں روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں، چنانچہ ایک مصنف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح فضیلت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب وہ کفار کے آجانے سے پریشان ہوئے تسلی دی تھی: "لَا تَحْزَنْ اِنَّ السَّلٰةَ نَعَمًا" جس میں اول "لا تحزن" فرمانم کو ہکا گردو یا، پھر اپنے ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا جس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کو مقدم فرمایا اور معیت میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی شریک فرمایا کہ سینہ جمع معنا استعمال فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو جب فرعون اور لشکر فرعون کے آجانے سے پریشانی ہوئی اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس پریشانی کو ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا: "كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ" جس میں سب سے پہلے کلا کا استعمال فرمایا جو زہم کی کے واسطے موضوع ہے، عربی میں لفظ کلا کا ایسے موقعوں پر استعمال ہوتا ہے، جہاں اردو کا کلا بھی استعمال ہوتا ہے، گویا کلا پر طمانچہ مار دیا، پھر اپنے ساتھ معیت حق کو بیان فرمایا تو

اپنے ذکر کو خدا تعالیٰ کے ذکر سے مقدم فرما یعنی لفظ معنی کو ربی سے پہلے ذکر کیا، گویا یہ حضرت مصنف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بولنا سکھاتے ہیں کہ حضرت! آپ کو خدا کا ذکر اپنے ذکر سے پہلے کرنا چاہیے تھا گویا ان کو آداب کلام بھی نعوذ باللہ! معلوم نہ تھے، پھر یہ بھی وجہ فضیلت بیان کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معنی بصیغہ مفرد بیان فرمایا، جس میں معیت الہیہ کو اپنے ساتھ خاص کیا، تو م کو اپنے ساتھ اس دولت میں شریک نہ کیا، مجھے اس مصنف صاحب پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلا کیونکر؟ بس میں تو یہ کہوں گا کہ:

سخن شناس این دلہرا خطا اینجا است

اول تو ان جزئیات میں کام کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کلیہ مخصوصہ کیا کچھ کم ہیں؟ جو جزئیات غیر مخصوصہ سے آپ کا افضل ہونا ثابت کیا جائے، اگر ان کو ایسا ہی شوق تھا تو یہ غور کرنا چاہیے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب کون ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب کون ہے؟ کیونکہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ ہر حال و ہر موقع محل کے لیے ایک ہی طرز کلام نہیں ہوتا، بلکہ ہر موقع کے لیے جدا طرز ہوا کرتا ہے،

ہر سخن نکتہ و ہر گفتہ مقامے دارد

میں بطور احتمال کے کہتا ہوں اور مانع کے لیے بمقابلہ متدل کے احتمال کافی ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جیسے لوگ ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

### صدق اکبر رضی اللہ عنہ کی جان نثاری

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ غار ثور میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ تھے، جن کی جان نثاری یہ حالت تھی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار ثور پہنچے ہیں تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر یا لنگی پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کیے، تاکہ کوئی موذی جانور نکل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دے سارے سوراخ تو بند ہو گئے، مگر ایک رہ گیا، اس کے لیے کپڑا نہ رہا تھا، اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا پیر لگایا کہ اگر کچھ نکلا تو میرے ہی پیر میں کاٹ لے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے گا، اس حالت میں جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی، بلکہ محض حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ کو دیکھ پائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائیں جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھ دیے جس میں سانپ نے کاٹ لیا تھا، اس کو بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں! ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشاء بھی محض یہ تھا:

عشق است و ہزار بدگمانی

ورنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دولت توکل سے پوری طرح مالا مال تھے، ایسے شخص کی تسلی کے لیے وہی کلام مناسب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لیے لا تحزن فرمایا پھر معیت حق میں ان کو بھی شریک کیا اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حصر مقصود نہ تھا، اس لیے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا۔

### حضرت موسیٰ علیہ السلام

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ نہ حضرت صدیق اکبر صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر متوکل تھے، نہ ایسے جاں نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بالکل نہ تھا، محض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا، پھر خطرہ ہی نہیں، بلکہ انہوں نے اس کو جزم و یقین کے ساتھ ظاہر کیا: "قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُعَذِّبُونَ" جس میں ان جملہ اسیب اور لام تاکید، تین مؤکدات موجود ہیں، یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے، حالانکہ بار بار دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نضر کو سن کر چلے تھے، ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا ایسا جزم ہو گیا، صاف ان کے غیر متوکل اور غیر کامل یقین ہونے کی دلیل ہے، اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا: "سکلا! گویا چپٹ لگا دیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، جس تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا، اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کلا میں ہے، پھر چونکہ یہ لوگ بوجہ کامل یقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لیے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا، کیونکہ وعدہ ہے: "تَقْدِيمُ مَا حَقَّهُ النَّاجِرُ يُغَيِّرُ النِّصْرَ" اور اسی وجہ سے معنی بصینہ نضر فرمایا، بصینہ جمع استعمال نہیں فرمایا: "منطلب یہ تھا کہ میرے ہی ساتھ میرا

پر وہ گارہے تم بوجہ ضعیف البقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو، اب بتلائیے! اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصود کو ادا فرمانا چاہتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ادا فرمایا، کیا اس وقت بھی آپ ”لَا تَحْزُنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا“ فرماتے جو لوگ بلاغت سے کچھ بھی ذوق رکھتے ہیں، وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے، بلکہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقصود کے ادا کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی طرز اختیار فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے اختیار فرمایا، لیجئے! تفصیلی جزئیات میں کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس کو ایک ادنیٰ طالب علم بھی احتمال نکال کر باطل کر سکتا ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں ہمیشہ اجمالی گفتگو کرنا چاہئے، تفصیلی کلام کبھی نہ کرنا چاہئے۔

(وعظ الرفیع والوعظ صغی: ۴۶)

انتیہواں اعتراض..... حضور ﷺ کو خدا تعالیٰ کا معشوق قرار دینا سخت

بے ادبی اور گستاخی ہے!

بعض لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا معشوق کہتے ہیں چنانچہ شعراء، اشعار نقیہ میں اس مضمون کو باندھتے ہیں، معشوق کا خاصہ ہے عاشق کو مضطرب کر دینا اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے، مگر غضب یہ ہے کہ بعض بے باکوں نے اس اضطراب کو بھی نعوذ باللہ! خدا تعالیٰ کے لیے مان لیا چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

بچے تسکین صورت خاطر پیراہن یوسف

محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا!

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دنیا میں بھیج دیا اور چونکہ وہ معشوق تھے اور عاشق کو بدون معشوق کے قرار نہیں ہوتا، اس لیے تسلی کے واسطے سایہ ان کا دہاں رکھ لیا کہ اسی سے مجھ کو تسلی رہے گی، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے سے تسلی ہو گئی تھی، یہ نعت نہیں، یہ حدردہ کی بے ادبی ہے، باری عزاسمہ کی جناب میں اور نیز حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی ایسے اشعار سننا اور پڑھنا گناہ ہیں، احقر از ضروری ہے، بعض دیندار کو بھی خبط ہوتا ہے کہ اشعار نعتیہ خواہ ان کا مضمون شریعت پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، ذوق شوق سے پڑھتے ہیں، بعض اشعار نعت کے ایسے ہیں کہ ان میں دیگر حضرات انبیاء علیہم



اسلام کی بے ادبی ہوتی ہے، الحاصل معشوق کہنا یہ سخت بے ادبی ہے، اس لیے کہ عشق خاصہ اللہ کی کا ہے، اس لیے عشق نام ہے نفس کے ایک خاص انفعال کا اور اللہ تعالیٰ انفعال اور تاثیر سے پاک ہے، ہاں! یہ کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں۔ اگر کوئی معشوق کو معنی مجازی میں لینے لگے، تو حق تعالیٰ کی جناب میں ایسا اطلاق اذن شرعی کا محتاج ہے، البتہ اگر کسی مغلوب الحال کے کلام میں ہو تو اس کو معذور سمجھیں گے، بدو غلبہ حال کے کسی کو اجازت نہ ہوگی، خلاصہ یہ ہے کہ مقرر بان الہی کو مجبوبان مجازی پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ (دعوت تریح المفسدہ صفحہ ۱۸۰، دعوات عبدیت حصہ ششم)

## تیسواں اعتراض..... مردہ کی روح دنیا میں واپس نہیں آتی!

کسی مردہ کی روح کا جیسا کہ عوام میں مشہور ہے، دنیا میں آنا صحیح نہیں معلوم ہوتا گو بعض آثار سے ایسا شبہ ہو جاتا ہے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ کافر بعد موت کے کہتا ہے: ”رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلَى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے مابین وہ ایسی حالت میں رہتے ہیں کہ دنیا میں آنے کی تمنا ہوتی ہے، لیکن برزخ یعنی حائل دنیا میں آنے سے باز رکھتا ہے اور عقلاً بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اگر تنعم (عیش و راحت) میں مردہ ہے تو اسے یہاں آ کر لپٹے پھرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر معذب (عذاب میں مبتلا) ہے، تو فرشتگان عذاب کیونکر چھوڑ سکتے ہیں کہ وہ دوسرے کو لپٹتا پھرنے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے، حدیث میں آیا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان رہتا ہے، ممکن ہے کہ وہی شیطان ہوتا ہو جس کا لوگوں پر اثر ہوتا ہے اور جس شخص پر مسلط تھا اس کام لے دیتا ہوں اور ممکن ہے کہ دوسرا کوئی شیطان ہو جس کا لوگوں پر اثر ہوتا ہے شیطان کے متعلق حدیث میں آیا ہے: ”يُسْجَرُ مِنْ اِلَآئِنْسَانٍ مَّجْرَى الدَّمِ اَوْ سَحْمًا قَالِ“، غرض کہ جنوں اور شیطان کا اثر کہ وہ بھی شریعہ جن میں ہوتا ہے اور مردہ روجوں کا اثر جیسا کہ مشہور ہے، صحیح نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تصرف کرنے کے لیے ارواح کا یہاں آنا ضروری نہیں، دور سے بھی تصرف ہو سکتا ہے، جو اب ارشاد فرمایا کہ احتمال تو ہے، لیکن جب تک اس کی دلیل قوی نہ ہو، اس احتمال کو قبول نہیں کیا جاسکتا، محض امکان کافی نہیں۔ (مجادلات معدلت صفحہ ۱۸۰، دعوات عبدیت حصہ ششم)

## اکتیسواں اعتراض..... غیر مقلدین کے اعتراضات کا حل اور اس کا جواب!

کسی کو شبہ قیاس فقہی کے بطلان کا نہ ہو کہ ظاہر اوہاں بھی اتباع ہے، ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں، کیونکہ حکم مجتہد فی ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے، خصوصاً میں جب کہ دوسری آیت میں بھی

اجتہاد ظن کی خدمت فرمائی گئی ہے: "إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا" جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے یہ مسئلہ تحقیق کو پہنچ گیا کہ قیاس اور اجتہاد جائز اور واجب العمل ہے، تو اس پر "مَالِكٌ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" صادق نہ آئے گا، بلکہ وہ مَالِكٌ بِهِ عِلْمٌ کا مصداق ہوگا، کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلہ مشتبہ حجت قیاس بالیقین داخل ہیں، اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بے شک اس کا اتباع: "مَالِكٌ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع: "مَالِكٌ بِهِ عِلْمٌ" کا ہوگا خوب سمجھ لو! اور اتباع ظن کی جو خدمت آئی ہے، وہاں ظن کے معنی مصطلح فقہی نہیں، بلکہ ظن اصطلاح قرآن میں عام ہے، باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی، چنانچہ مسکین بعث کے قول میں: "إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا" آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کا احتمال بھی نہ تھا، چہ جائیکہ احتمال راجح، بلکہ وہ اس کو اپنے علم میں صحیح کے خلاف سمجھتے تھے، پھر بھی اس کو ظن کہا گیا، بس ثابت ہوا کہ اصطلاح قرآن میں "ظن" عام ہے امور باطلہ کو بھی، پس معنی آیت ذم ظن کے یہ ہیں: "ان يتبعون الا ما حلف الدليل القطعي و كل ما حلف الدليل القطعي لا يغني من الحق شيئا بل هو باطل قطعا" پس اس آیت سے بھی شبہ کی گنجائش نہ رہی۔

(تظہیر الاعضاء، صفحہ: ۱۰)

### بتیسواں اعتراض..... انقطاع اجتہاد پر شبہ کا جواب!

غیر مقلد کہا کرتے ہیں کہ کیا حنفیوں کے پاس انقطاع اجتہاد کی وجہ آگئی ہے؟ حالانکہ قدرتی قاعدہ ہے کہ ہر شے عموماً اپنی ضرورت کے وقت ہی ہوا کرتی ہے جس فصل میں عموماً بارش کی حاجت ہوتی ہے، اسی فصل میں بارش ہونے کا قاعدہ ہے، اسی طرح ہوا کس حاجت کے وقت چلا کرتی ہیں، جہاں سردی زیادہ پڑتی ہے وہاں کے جانوروں کے اون بہت بڑے ہوتے ہیں، اس کے بے شمار نظائر ہیں، اسی طرح جب تک تدوین حدیث کی ضرورت تھی، بڑے بڑے قومی حافظ کے لوگ پیدا ہوتے تھے، اب ویسے نہیں ہوتے اور تو اور اہل حدیث حضرات میں سے بھی کسی کو بخاری اور مسلم تک خود امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ کی طرح مع سند حفظ نہیں، اسی طرح جب تک تدوین دین کی ضرورت تھی، قوت اجتہاد یہ لوگوں میں بخوبی موجود تھی، اب چونکہ دین مدون ہو چکا ہے اور اصول و قواعد مہذب ہو چکے ہیں، اب اجتہاد کی اتنی ضرورت نہیں رہی، ہاں! جس قدر اب بھی اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے، اتنی قوت اجتہاد یہ بھی باقی ہے (یعنی اصول مجتہدین کے تحت جزئیات جدیدہ کا استخراج کر لینا)

(مجادلات معدلت صفحہ: ۲۳ حصہ ہفتم)

تین تیسواں اعتراض..... آج کل دین کی حفاظت کے لیے تقلید شخصی

### نہایت ضروری ہے!

گوئی نفسہ یہ بھی جائز ہے کہ مختلف لوگوں کا اتباع ہو، مثلاً کسی شیخ سے کوئی مشغل پوچھ لیا اور کسی دوسرے سے اور کوئی مشغل پوچھ لیا، تو اسی طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہ جائز ہے اور سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھ لیا، کبھی اوزاعی رحمہ اللہ سے اور اسی طرح سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے، سوئی نفسہ تو یہ جائز ہے، مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہو گیا، اس کے سمجھنے کے لیے اول ایک مقدمہ سن لیجئے وہ یہ کہ حالت غالب اعتبار ہوتا ہے سو حالت غالب کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں یہ فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدین غالب تھا، ان کا مختلف لوگوں سے پوچھنا، یا تو اتفاقاً طور پر ہوتا تھا اور یا اس لیے کہ جس کے قول میں زیادہ اعتیاد ہوگی، اس پر عمل کریں گے، بس! اگر تدین کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کر کے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی؟ حدیث میں ہے: ”لنم یفشیوا الکذب“ کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی، سو جتنا خیر القرون سے بعد (دوری) ہوتا گیا، اتنی ہی لوگوں کی حالت اتر ہوتی گئی، اب تو وہ حالت ہو گئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے، اب مختلف لوگوں سے اس لیے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہو، اس پر عمل کریں گے۔

### خود غرضی کا ایک واقعہ

ہمارے وطن کے قریب ایک قصہ ہے، وہاں ایک مرد کا ایک عورت سے نکاح ہوا، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا، ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا ان کا نکاح جائز نہیں، ان میں جدائی کر دینی چاہیے، کہنے لگے: اس میں تو بڑی بدنامی ہے، اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے! میں نے کہا: ”اول تو تفریق میں بدنامی نہیں، بلکہ تفریق نہ کرنے میں ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی کو بیعت کر رکھا ہے، دوسرے اگر دوتو ہوا کرے جب شریعت کا حکم ہے، تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جاسکتا! کہنے لگے: اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا، میں نے کہا: خواہ اگلا ہو، یا نہ اگلا ہو، حرمت کے حق میں کبساں ہے جب میرے پاس انہیں صاف جواب ما، تو وہ وہی پچھتے وہاں ان کو ایک عامل باللحدیث

مل گئے مجھے اس وقت ان پر طبع کرنا منظور نہیں ہے، بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اچھی غرض حاصل کرنے کے لیے عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے، اس نے کہا: ”اگر پانچ گھنٹ سے کم پیا ہے، تو حرمت ثابت نہیں ہوگی، پس! آپ نے ایک استفتا، تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ دو گھنٹ پیا تھا، حرمت ثابت ہوئی یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ: ”لا تحرم المصصة ولا المصتان“ آپ بہت خوش ہوئے اور ان میاں بیوی کو وہ فتویٰ لا کر دے دیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے، اس پر عمل کر لیا جائے گا تو کون سی خرابی ہے؟ آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے، بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندہ خدا! تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے کتنے گھنٹ پیئے تھے؟ اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی تھی، تو اس کی وجہ ان کے فتویٰ کو تو مانا جنہوں نے حلال بتایا اور ان کے فتویٰ کو نہ مانا، جنہوں نے حرام بتایا حالانکہ جنہوں نے حلال بتلایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا، ہاں! اگر اول ہی سے اس کا وہی مذہب ہوتا، تو مضائقہ نہ تھا، مگر اول تو یہ شخص ان کے مذہب پر نہ تھا جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے اپنا کام نکلتا ہے تو ان کا مذہب لے لیا، سو اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی اور افسوس ہے کہ بعض اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہو گیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کر لیا جائے؟ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ: ”انما الاعمال بالنیات“ کہ نیت کا اعتبار ہے، سو آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ اپنی دینی غرض کے حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔

### ایک حکایت

علامہ شامی رحمہ اللہ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں اس کی لڑکی کے لیے پیغام بھیجا، اس نے کہا کہ اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ رافع یدین اور آئین بالجہر کیا کر، فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور نکاح ہو گیا، اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا، تو انہوں نے اس کو سن کر سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر سوچ کر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے، اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بدون اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو، صرف دنیا کے لیے اس کو چھوڑ دیا، لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کے لیے ہو گئی ہے۔

### تقلید شخص کی ضرورت

ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہوگا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے مطلب کی

پاویں گے، اختیار کریں گے، مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا، سو یہاں تو یہ شخصی شافعی مذہب اختیار کر لے گا اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگا یا، تو اب شافعی رحمہ اللہ کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا، تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا، حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک وضو نہیں رہا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے، مگر اس شخص کو ذرا پروا نہیں ہوگی، ہر امام کی رائے کو وہ اسی میں قبول کرے گا، جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے، اس کو نہ مانے گا، سو دین تو رہے گا نہیں، غرض پرستی رہ جائے گی، پس یہ فرق ہے، ہم میں اور سلف میں، ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ ان میں تین غالب تھا اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے، بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی غالب ہے اور ہم سہولت پسند اور غرض کے بندے ہیں، اس لیے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں کہ ہم تقلید شخصی کوئی نفسہ واجب یا فرض نہیں کہتے، بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے، ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے اس حوط کو تلاش کر کے عمل کرے گا، تو مصیبت میں رہے گا اور اگر آسان کو تلاش کرے گا تو غرض پرستی میں مبتلا ہو جائے گا، پس تقلید شخصی میرا حق بھی اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسے کہ مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ سہولت ہے، اسی طرح اس مذہب کے علماء، اختیار میں سے ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے، پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائیں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی، اس کو مان بھی لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا۔ (اجتار المنیب صفحہ ۳۴)

چوتھیں سوال اعترض ..... اس اعترض کا جواب کہ مقلدین حدیث

چھوڑ کر اقوال ائمہ پر عمل کرتے ہیں!

بعض اہل تعصب کو ائمہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے حادثہ صیحیح غیر معارضہ کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں، میرا تو اس سے رو نکلنے کھڑے ہوتے ہیں، چنانچہ ایک ایسے ہی شخص کا قول ہے:

قال قال بسیار است

مرا قال ابو حنیفہ درکار است

اس جملہ میں احادیث نبویہ کے ساتھ کسی بے اعتنائی اور گستاخی ہے؟ خدا تعالیٰ ایسے جمود سے بچائے، ان لوگوں کے طرز عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں، اب اس تقلید کو کوئی شرک فی النبوت کہہ دے تو اس کی کیا خطا ہے؟ مگر یہ بھی غلطی ہے کہ ایسے دوچار جاہلوں کی حالت دیکھ کر سارے مقلدین کو شرک فی النبوت سے مطعون و متہم کیا جائے، خدا نہ کرے، سب مقلد ایسے کیوں ہوتے؟ میرے دل میں تقلید کی تفسیر یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و ارشادات پر عمل کرتے ہیں اس تفسیر پر جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بیان کی ہے، کیونکہ وہ ہمارے نزدیک درایت و فقہ میں اعلیٰ پایہ ہیں، اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ امام صاحب کا فقہ الامت ہونا تمام امت کو تسلیم ہے اور ان کے علوم اس پر شاہد عدل ہیں، اب بتلائیے! اس تفسیر کی بنا پر تقلید میں شرک فی النبوت کیونکر ہو گیا؟ اس لیے کہ جس کے نزدیک تقلید کا پورا درجہ ہوگا، اس کے نزدیک اتباع حدیث مقصود بالذات ہوگا اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ محض واسطہ فی الفہم ہوں گے، جو شخص بلا واسطہ عمل باللحدیث کا دعویٰ کرتا ہے، وہ حدیث کا اتباع اپنی فہم کے ذریعہ سے کرتا ہے اور یقیناً سلف صالحین کی فہم و عقل و ورع و تقویٰ و دیانت و امانت و خشیت و احتیاط ہمارے اور آپ سے زیادہ تھی، تو بتلائیے! عمل باللحدیث کس کا کامل ہوا؟ آپ جو اپنی فہم کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتے ہیں؟ یا مقلد جو سلف کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتے ہیں؟ اس کا فیصلہ اہل انصاف خود کر لیں گے، بہر حال تقلید کی جو تفسیر میں نے بیان کی ہے، یہ عظیم ہے، اس کو یاد رکھیے۔

## ایک اعتراض اور اس کا جواب

رباعیان عمل باللحدیث کا یہ اعتراض کہ تمہارے سامنے ایک حدیث پیش کی جائے اور تم اس کو نہیں مانتے، بعض اس وجہ سے کہ تمہارے امام کا قول اس کے خلاف ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو تقلید حدیث مقصود بالذات نہیں، بلکہ تقلید قول امام مقصود ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے، اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں، جس حدیث کو تم ہمارے سامنے پیش کرتے ہو، ہمارا عمل اس حدیث پر نہیں تو اس مسئلہ میں دوسری حدیث پر ہمارا عمل ہوتا ہے اور تم اس حدیث کو نہیں مانتے جس کو ہم مانتے ہیں، پھر ہمارے اوپر کیا الزام ہے؟ تم پر بھی تو الزام ہے! رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجح ہے، تمہاری مرجوح ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے، تمہارے ذوق میں ایک حدیث راجح ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ذوق

دوسری راجح ہے اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اسلم وارجح، پھر کہا جاتا ہے آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا، جنس ہٹ دھرمی ہے، اسی کو دوسرے عنوان سے کہتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی آیا عمل بكل الاحادیث ہے یا عمل ببعض الاحادیث اگر کوئی عمل بكل الاحادیث مراد ہے، سو یہ تم بھی نہیں کرتے اور یہ ممکن بھی نہیں، کیونکہ آثار مختلفہ و احادیث متعارضہ میں سب احادیث پر عمل نہیں ہو سکتا یقیناً بعض پر عمل ہوگا اور بعض کا ترک ہوگا اور اگر عمل ببعض الاحادیث مراد ہے، تو اس معنی کو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں، پھر تم اپنے ہی کو عامل بالحدیث کہہ رہے کتھے ہیں؟

### مسائل اجتہاد

دوسری بات یہ ہے کہ مسائل منصوصہ تو بہت کم ہیں، زیادہ مسائل اجتہاد یہ ہیں اور ان میں مدعیان عمل بالحدیث بھی حنفیہ کی کتابوں سے فتوے دیتے اور ان پر عمل کرتے ہیں، یا اور کسی امام کے قول کو لیتے ہیں، تو زیادہ مسائل میں آپ بھی مقلد ہوئے تو یہ کیا بات کہ تقلید کرنا تو حرام نہیں صرف تقلید کا نام لینا ہی ناجائز اور شرک ہے؟ اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ تمام مسائل میں احادیث منصوصہ ہی پر عمل کرتا اور فتویٰ دیتا ہے، تو وہ ہم کو اجازت دیں کہ معاملات و عقد و فسخ و شفعہ و رہن وغیرہ کے چند سوالات ہم ان سے کریں اور ان کا جواب وہ ہم کو احادیث منصوصہ صریحہ صحیحہ سے دیں، قیامت آجائے گی اور احادیث سے وہ کبھی جواب نہ دے سکیں گے، اب یا تو وہ کسی امام کے قول سے جواب دیں گے، تو یہ تقلید ہوئی، یا یہ کہیں گے کہ شریعت میں ان کا مسائل کا کوئی حکم نہیں ”الْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنِکُمْ“ کے خلاف ہوگا اور ہمیں سے قیاس و استنباط کا جو بھی معلوم ہو گیا، کیونکہ جب حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دین کو کامل کر دیا گیا تو چاہئے کہ کوئی صورت ایسی نہ ہو جس کا حکم شریعت میں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ احکام منصوصہ بہت کم ہیں، تو اب تکمیل دین کی صورت بجز اس کے اور کیا ہے کہ قیاس و استنباط کی اجازت ہو کہ ان ہی مسائل منصوصہ پر غیر منصوصہ کو قیاس کر کے ان کا حکم معلوم کریں یہاں سے ان مدعیان علم بالا احادیث کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی جو قیاس اور استنباط کو مطلقاً رد کرتے ہیں اور بعض احادیث میں جو قیاس کی مذمت ہے، وہ قیاس ہے جو اصول شریعت کے خلاف ہو یعنی جس کی اصل نص میں موجود نہ ہو بلکہ اس کا مبنی انھیں اپنی رائے ہو اور جس قیاس کی اصل نص میں موجود ہو اس کی مذمت ہرگز نہیں، ورنہ دین کا نقص لازم آئے گا۔

(ارضاء الحق حصہ اول: ۲۳)

پینتیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ توسل میں بزرگ کی

بزرگی کو رحمت حق میں کیا دخل ہے!

توسل باصلحاء کی جو صورت ہے کہ بزرگ کے طفیل سے ہمارے حال پر رحم فرما اس کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ! فلاں شخص میرے نزدیک آپ کا مقبول ہے اور مقبولین سے محبت رکھنے پر "المرء مع من احب" میں آپ کا وعدہ رحمت ہے، میں آپ سے اس رحمت کو مانگتا ہوں، پس توسل میں یہ شخص اپنی محبت کو اولیاء اللہ کے ساتھ ظاہر کر کے اس محبت پر رحمت و ثواب مانگتا ہے اور محبت اولیاء اللہ کا موجب رحمت و ثواب ہونا نصوص سے ثابت ہے، چنانچہ محتاجین فی اللہ کے فضائل سے احادیث بھری پڑی ہیں، اب یہ اشکال جاتا رہا کہ بزرگی کی بزرگی اور برکت کو رحمت میں کیا دخل ہے؟ دخل یہ ہوا کہ اس بزرگ سے محبت رکھنا حب فی اللہ کی فرد ہے اور حب فی اللہ پر ثواب کا وعدہ ہے، اس تقریر کے بعد: "و اما بنعمة ربك فحدث" پر عمل کر کے تحدیث بالنعمة کے طور پر کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اگر یہ تقریر سنتے تو توسل کے جواز کا ہرگز انکار نہ کر سکتے، کیونکہ اس کے سب مقدمات صحیح ہیں، میرا حسن ظن یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے زمانہ کے جاہلوں کے توسل کو منع فرمایا ہے، جس کی حقیقت استعانت و استغاثہ ہے۔

(اکبر الاموال صفحہ: ۷)

چھتیسواں اعتراض..... اس شبہ کا حل کہ لا الہ الا اللہ کے سوا تمام

اذکار بدعت ہیں!

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ "لا الہ الا اللہ" کے سوا ان سب اذکار کو بھی بدعت کہتے ہیں، کیونکہ سنت سے ان کا ثبوت نہیں، اگر میں اس وقت ہوتا تو ادب کے ساتھ ان سے استفتا کرتا کہ علماء دین اس مسئلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک شخص قرآن حفظ کرتے ہوئے: "اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" کے کلمات کو الگ الگ یوں ادا کرتا ہے "اِذَا السَّمَاءُ اِذَا السَّمَاءُ" یاد کرتا ہے، پھر فطرت فطرت یاد کرتا ہے، اس کے بعد ملا کر "اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" کہتا ہے تو اس کو اس طرح یاد کرنا جائز ہے، یا نہیں؟ شبہ کی وجہ یہ ہے "اِذَا السَّمَاءُ" لفظ بے معنی ہے، اسی طرح "فطرت فطرت" بے معنی ہے، تو میں حلفاً کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کو ضرور جائز کہتے ہیں اور وجہ یہ بتلاتے



کہ یہ تلاوت نہیں ہے، نہ اس شخص کو اس وقت تلاوت مقصود ہے، بلکہ مقصود ذہن میں جمانا ہے، تو اس پر میں کہتا ہوں کہ ”اللا الہ“ اور ”اللہ، اللہ“ کرنا کیوں بدعت ہے؟ اس میں بھی تو ذکر اللہ کو ذہن میں جمانا ہے اور ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ بناؤ برتجزہ برسوخ ذکر کے لیے یہ ترتیب بے حد نافع ہے، اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، جس کو شک ہو تجزہ کر کے دیکھ لے، اب اگر وہ کہیں کہ جیسا وہ قرآن یاد کرنے والا اس حالت میں تالی نہیں مبتدی للتلاوت ہے، اسی طرح یہ شخص اس حالت میں ذکر تو نہ ہوا، مبتدی للذکر ہوا تو میں کہوں گا کہ انتظار صلواتہ بکلم معلوٰۃ ہے، اس لیے وہ حکماً ذکر ہے، افسوس یہ ہے کہ کسی نے ان کے سامنے یہ مقدمات ذکر نہیں کیے، اس لیے وہ ان کو بدعت کہتے ہیں، محذور ہیں، بلکہ طرفہ یہ ہوا کہ ان کے سامنے جہاں صوفیہ کے غلط مقدمات پیش ہوئے چنانچہ بعض نے: ”قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ“ سے استدلال کیا ہے، اس کی دلیل پر علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ نے صوفیہ کے بہت تلتے لیے ہیں اور واقعی اس سے استدلال ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس میں ”اللہ“ ”قل“ کا متوالہ نہیں، کیونکہ قول کا متوالہ مفرود نہیں ہوتا بلکہ جملہ ہوتا ہے، بلکہ یہ تو انزل مقدر کا فاعل ہے جس کا قرینہ سیاق کلام ہے، کیونکہ اوپر ارشاد ہے:

”قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَعْلَمُونَهُ قُرْآنًا مِّسًّا تَدْرُوْنَهَا وَتَخْفُونَ كَثِيرًا وَغَلَبْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ قُلِ اللّٰهُ اِی قُلِ انزل اللہ“  
تو یہ استدلال کسی جاہل نے کیا ہوگا، ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو خوب موقع مل گیا انہوں نے خوب خبر لی، مگر انارزی طیب غلطی کرے تو اس سے محمود خاں اور عبدالحمید خان سے تو بدلمانی جائز نہ ہو جائے گی، ہاں! موت خان کو برا کہو تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں، یہ کیا کہ انارزیوں کے ساتھ تحقیقین کو بھی ایک کلگری سے بانٹا جائے، تحقیقین کے دلائل سنے ہوتے تو ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو صوفیہ پر انکار کی ہرگز جرات نہ ہوتی، خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کرو، تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا بھی واسطہ نہ رہے، محض ذات کے ذکر پر قادر ہو جائے۔ (اکبر الایمان صفحہ: ۲۷۷)

## سینتیسواں اعتراض..... حنفی کہلانے پر اعتراض کا جواب!

مبتوع صرف حق تعالیٰ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے اتباع کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جائے، تو حنفی کہتے اور محمدی کہتے ہیں جواز اور عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا، کیوں کہ اگر اس نسبت سے اتباع بالا استقلال و بالذات مراد لیا جائے، تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح ہوگی، کیونکہ ایسا اتباع تو خدائے تعالیٰ کے ساتھ خاص اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق حق

تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے، اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جائے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز؟ پس معلوم ہو گیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحت نہیں، اس نسبت کو کفر و شرک کہنا غلطی ہے، کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ متبوع مستقل ہیں، بلکہ یہی معنی ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو فروع مستنبط کیے ہیں، ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے، اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں اور بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے تو جیسی نسبت ہم حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہیں، ایسی نسبت خدا کے کلام میں بھی دوسرے کی طرف موجود ہے، ارشاد ہے:

”وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ“ ”أَقُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ“

سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ”وَيَصَدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ“ میں سبیل کی نسبت اللہ کی طرف ہے تو یہ ایسا کہ

”عبارة ناشتہ او حسنک واحدہ“

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من بہر انداز قدر می شام

بات یہ ہے کہ جن کو محبت ہوتی ہے، وہ محبوب کو ہر حالت میں پہچان لیتے ہیں، اسی طرح جنہوں نے دین کو سمجھا ہے، ان کے سامنے وہ قرآن کے لباس میں آئے یا حدیث کے لباس میں وہ یہی شعر پڑھ دیتے ہیں، بعض نے حدیث کو اور بعضوں نے فقہ کو صرف عنوان بدلنے سے قرآن سے الگ کر دیا، حالانکہ وہ سب اصل میں ایک چیز ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مطب لکھنؤ کا کہلاتا ہے اور ایک دہلی کا، مگر ہیں دونوں طب یونانی، سوائے طرح قرآن و حدیث اور فقہ گو فرعیات کے اندر مختلف ہیں، مگر میں دین الہی، اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تو کیا وہ دین الہی نہیں رہا؟ جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے تو کیا لکھنؤ کا مطب اور دہلی کا مطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا؟

مقصد اتباع الہی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو ”سَبِيلِي“ فرمایا تھا، اس کو یہاں ”سَبِيلِ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ“ فرمایا ہے، پس ”سَبِيلِ“ اور ”سَبِيلِي مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ“ مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے اسی طرح ایک جگہ فرمایا: ”لَسْمَ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيْعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا“ اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ”و“

اَتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيفًا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے اب اس کے کیا معنی ہیں؟  
 ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب ہے ملت ابراہیم علیہ السلام یہ ہے کہ عنوان کا اختلاف، بانی  
 اصل اتباع احکام الہیہ کا ہے، پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہیں۔  
 باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل ہیں، مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ "واتبع ملة ابراهيم" سو  
 اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ جو ان کا طریقہ ہے، اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے، کیونکہ  
 یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقے کا اتباع کرے، اندک نہی کا، تو بے تکلف توجیہ اس کی تقریر  
 سے سمجھ میں آجائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الہیہ کا نام ہے، اس کے بہت سے لقب ہیں، ان  
 میں ایک لقب ملت ابراہیم بھی ہے، چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بکثرت متفق ہیں، اس  
 مناسبت سے اس ملت کا نام ملت ابراہیم رکھا گیا ہے، تو واقع میں ملت ابراہیم کا اتباع نہیں ہے،  
 بلکہ ملت الہیہ کا اتباع ہے، جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی گئی ہے  
 تو جیسے یہاں پر ملت الہیہ کو ملت ابراہیم کہہ دیا گیا ہے اسی طرح اگر ایک دین کو مذہب شافعی یا  
 مذہب ابوحنیفہ یا قول قاضی خاں کہہ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

### ائمہ اربعہ کی طرف نسبت

اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مولوی صاحب کا فتویٰ ہے، کوئی خدا اور رسول کا حکم تو نہیں ہے؟  
 حالانکہ واقع میں وہ مولوی صاحب کا فتویٰ نہیں، بلکہ خدا کا مسئلہ ہے، مولوی صاحب نے اس کو سمجھ  
 کر بتلا دیا ہے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "القیاس مظہر لا مثبت" پس اب بعد نبی صلی  
 اللہ علیہ وسلم علماء نبی کا اتباع لازم ہوا کیا خوب کہا ہے:

چونکہ خورشید و مارا کرد داغ

چارہ نبود در متعاش جز چراغ

یعنی آفتاب چھپ گیا تو اب سوائے چراغ کے اور کیا علاج ہو سکتا ہے؟ تو جب صاحب وحی

ہماری نظروں سے غائب ہو گئے تو سوائے اتباع علماء کے اور کیا چارہ ہے؟

چونکہ گل رفت گلستان خراب

بونے گل را از کہ جویم از گلاب

یہ شعر مجمع اجزا، تو یہاں منطبق نہیں ہوتا ہے کیونکہ گلستان شریعت الحمد لہذا ویسا ہی ہر انجرا ہے،

مگر مطلب یہ ہے کہ اب چونکہ صاحب وحی تشریف نہیں رکھتے، اس لیے اب دین گوان لوگوں سے

حاصل کرنا چاہیے، جن کے اندر صاحب وحی کا فیض موجود ہے، کیونکہ اس وقت تک بھی جو کچھ نبیوں میں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تو ہیں، جو مجتہدین اور علماء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئے ہیں اور ان کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں، پس بغیر ان کی اتباع کیے چارہ نہیں اور ان میں یہ علماء کا اتباع نہیں، بلکہ خدا اور رسول کا اتباع ہے، جس کا طریقہ ان سے معلوم کر لیا جاتا ہے اور گویہ ”سَبِيْلٌ مِّنْ اَنْبَاءٍ“ کہلاتا ہے، مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، علماء، چونکہ اسے نہیں سمجھتے ہیں اس معنی سے وہ واسطہ ہیں، صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کر کے ”سَبِيْلٌ مِّنْ اَنْبَاءٍ“ کہا گیا۔ (وعظ اتباع الہنیب صفحہ: ۲۴)

اڑتیسواں اعتراض..... روضہ نبوی ﷺ کی زیارت کے لیے سفر کرنے

پر شبہ کا جواب، نیز یہ کہ زیارت حقوق محبت نبوی سے ہے!

(الف) فرمایا: کہ ایک بار حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ کا ایک تشدد غیر مقلد سے مناظرہ ہوا اور غیر مقلد مدینہ منورہ جانے سے منع کرتا تھا ”و لا تشدوا الرحال الا الی ثلثة مساجد“ سے استدلال تھا، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: کیا زیارت ابوین، طلب علم وغیرہ کے لیے سفر جائز نہیں؟ اس کا جواب نہیں دیا، پھر کہنے لگا: اگر جانا جائز بھی ہو تو کوئی فرض دو واجب تو ہوگا نہیں کہ خواہ مخواہ جائے! حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: شرعاً تو فرض نہیں، لیکن طریق عشق میں تو ہے، خیال کیجئے۔ سلیمان علیہ السلام بیت المقدس بنائیں اور قبلہ بن جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام مسجد بنائیں تو قبلہ قرار پائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بنائیں تو کیا اتنا بھی نہ ہو کہ وہاں لوگ زیارت کو جایا کریں؟ چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عبودیت کی تھی اور شہرت ناپسند تھی، اس لیے آپ کی مسجد قبلہ نہیں ہوئی، اس شخص نے کہا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو جانا جائز ہے، مگر روضۃ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قصد سے نہ جانا چاہیے حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: ”مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں فضیلت آئی کہاں سے ہے؟ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے، تو مسجد کے لیے تو جانا جائز ہو اور صاحب مسجد جن کی وجہ سے اس میں فضیلت آئی، ان کی زیارت کے لیے جانا جائز ہو؟ عجب تماشہ ہے! وہ لا جواب ہوئے اور اگر کوئی کہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کہاں ہوتی ہے؟ صرف قبر کی ہوتی ہے، جواب یہ ہے کہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو مساوی فرمایا: ”من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی“

حیاتی“ (جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی) اس کے بعد حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اهدنا الصراط المستقیم“ پڑھتے وقت معنی کا خیال کر کے پڑھنا کرو اور ہدایت کی دعا مانگا کرو، وہ کہنے لگا کہ مجھے اس بات میں دعاۓ ہدایت کی ضرورت نہیں، حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: ”دعا کرنے میں حرج کیا ہے؟ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اگر حق پر نہ ہوں تو خدا حق کی ہدایت کرے، اس کے بعد قریب ہی مغرب کی نماز میں وہ غیر مقلدیت کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا، پھر اس نے کہا کہ میں تو مدینہ منورہ ضرور جاؤں گا، اسی وقت چھوٹ کر آ گیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گیا۔ (مجادلت معدلت صفحہ ۲۴، حصہ ایضاً)

### نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق

(ب) ایک حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے شرف ہو، بالخصوص جو حالت حیات میں زیارت سے شرف نہیں ہوئے، وہ روضہ اطہر ہی سے برکات حاصل کر لیں کہ وہ برکات اگرچہ زیارت کی برکات جیسی بالکل نہ ہوں، مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں، حدیث میں ارشاد موجود ہے: ”من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی“ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی خود قابل توجہ ہے، اگر آپ سے تعلق صرف مبلغ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی، کیونکہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے؟ انہوں نے کہ بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کو فضیلت نہیں مانتے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجائز ہونے کے قائل ہیں۔

### کانپور کا ایک واقعہ

کانپور میں ایک مرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا، جلسہ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص کہ جو زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے، کہ ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا، اس نے اتفاق سے یہ حدیث شریف پڑھی: ”من حج ولم یزرنی فقد حفتانی“ (جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہیں آیا، اس نے میرے ساتھ ظلم کیا) ان صاحب نے اعتراض کیا: ”لم یزرنی“ فرمایا ہے تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے، بعد وفات زیارت ثابت نہیں، طالب علم بچہ تھا، اشکال سمجھا نہیں، نہ اس کو کوئی جواب معلوم تھا، وہ سادگی سے آگے پڑھنے لگا، خدا کی شان آگے جو حدیث موجود تھی، وہ اس طرح اعتراض ہی کا جواب تھی کہ ”من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی“ جتنے علماء اس وقت موجود تھے، سب نے ان صاحب

سے کہا کہ لیجئے حضرت! آپ کے اعتراض کا جواب من جانب اللہ ہو گیا، پس خاموش رہے۔ بعض لوگ زیارت قبر پر ایک شبہ کرتے ہیں، کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیوں کہ قبر شریف نظر نہیں اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے، جس کا دروازہ بھی نہیں، یہ عجیب اشکال ہے، میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لیے قبر کا دیکھنا ضروری ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے حالانکہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نابینا تھے، حضرت عبداللہ ابن مکتوم صحابی ہیں یا نہیں؟ مستورات کے بارے میں کیا کہو گے؟ جس طرح صحابیت کے لیے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے، اسی طرح زیارت قبر شریف میں بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا؟ یعنی ایسی جگہ پہنچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہوتا تو قبر شریف کو دیکھ لیتے، یہ بھی حکم از زیارت قبر شریف ہے۔

### امام مالک رحمہ اللہ کا جملہ اور اس کا جواب

”رُزْتُ قَبْرَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ“ یعنی امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں نے قبر شریف کی زیارت کی، تو جب زیارت قبر کا قول تک مکروہ ہے، تو فعل زیارت کیسے مکروہ نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں، جو تم کہتے ہو، ورنہ ان کو اس قدر پھیر پھار کی کیا ضرورت تھی؟ وہ صاف یہی نہ فرمادیتے کہ: ”یکرہ زیارة القبر النبوی صلی اللہ علیہ وسلم“ یہ قول کی کراہت بیان کرنا، اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی ان کو کیا ضرورت تھی؟ بلکہ ان کا مطلب تو یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں، اس لیے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں نے قبر کی زیارت کی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں، غرض دنیا میں ایسے خشک مذاق بھی موجود ہیں، جن کو زیارت قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا؟ اس کو حرام کر کے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں، مگر جو زیارت قبر کر چکے ہیں، ان سے پوچھو! کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں؟ بس! اب میں بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں، جس سے زیارت قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا۔

### سید احمد رفاعی رحمہ اللہ کا واقعہ

سید احمد رفاعی رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے تو عرض کیا: ”السلام علیک یا جدی“ جواب سموع ہوا: ”و علیک السلام یا ولدی“ اس پر ان کو وجد ہوا اور بے

اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے:

فی حالت البعد رومی کنت ارسلها  
تقبل الارض عنی وہی ثابتی  
فہذہ دولة الاشباہ قد حضرت  
فامدد یمینک کسی تخطی بہا شفتی

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ، جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا، باہر نکلا، انہوں نے بے ساختہ دوز گراس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے ایک بزرگ سے جو اس واقعہ میں حاضر تھے، کسی نے پوچھا کہ آپ کو اس وقت کچھ رشک ہوا تھا؟ فرمایا: ہم تو کیا تھے؟ اس وقت ملائکہ کو رشک تھا! (شکر العمرہ صفحہ: ۴۴)

### انتالیسواں اعتراض..... تراویح میں رکعت سنت ہیں!

آج ہی میں نے ایک خط کا جواب لکھا ہے، تعجب تو یہ ہے کہ وہ حضرت پڑھے جن ہیں، اگر کوئی جاہل ہو تو اسے سمجھانا سہل ہے، مگر یہ پڑھے جن بہت مشکل سمجھتے ہیں، اس خط میں لکھا تھا کہ آج کل کسل غالب ہے، اگر ان احادیث پر عمل کیا جائے، جن میں آٹھ یا بارہ رکعت کی تصریح ہے، تو کیا حرج ہے؟ مجھے بھی فکر ہوئی کہ اس کا جواب کیا لکھوں؟ پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! اس مولوی کا کوئی جواب بھجھا دے، چنانچہ حق تعالیٰ نے مجھے بھجھا دیا، میں نے یہ لکھا کہ سیدھی سی بات ہے کہ بیس رکعت کے سنت مؤکدہ ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اجماع کی مخالفت ناجائز ہے اور یہ اجماع علامت ہے، ان احادیث کے منسوخ ہونے کی اور اگر اجماع میں شبہ ہے کہ بعض علماء نے صرف آٹھ کو سنت مؤکدہ لکھا ہے، تو جواب یہ ہے کہ اس قول سے پہلے منعقد ہے، پس اس کے مقابلہ میں شاذ قول قابل اعتبار نہیں ہوگا، جب تا کید ثابت ہوگئی تو اس کے ترک کرنے سے مورد عقاب ہوگا، انہوں نے ایک اور بات لکھی تھی کہ صاحب فتح القدر کی رائے ہے کہ آٹھ رکعتیں پڑھنا چاہیے۔ میں نے لکھا کہ جمہور کے مقابلہ میں ایک صاحب فتح القدر کی رائے نہیں چل سکتی، خصوصاً جب کہ ان کا عمل خود اس کے خلاف ہو، کیونکہ صاحب فتح القدر کی علمی تحقیق ہے، مگر پڑھیں انہوں نے بھی ہمیشہ میں ہی، لہذا ان کی تحقیق قابل عمل نہیں۔

### ایک واقعہ

ایک شخص دہلی کے نئے مجتہدین سے آٹھ تراویح سن کر مولانا شیخ محمد صاحب رحمہ اللہ کے

پاس آئے تھے اور انہیں تردد تھا کہ آٹھ ہیں یا نہیں؟ یہ نئے مجتہدین اپنے کو عامل بالحدیث کہتے ہیں، کیوں صاحب! حدیث میں بھی تو بیس آئی ہیں، ان پر کیوں نہ عمل کیا؟ کہ ان کے ضمن میں آٹھ پر بھی عمل ہو جاتا۔

### مقصد سہولت ہے

بات یہ ہے کہ نفس کو سہولت تو آٹھ میں ہے، بیس کیونکر پڑھیں؟ اصل یہ ہے کہ جو کچھ ان کے جی میں آتا ہے، کرتے ہیں اور شاذ اور ضعیف حدیث کو کبھی سہارا بنا لیتے ہیں، قاری عبد الرحمن صاحب رحمہ اللہ ان علماء کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ یہ بیشک عامل بالحدیث ہیں، لیکن الف لام الحدیث میں عوض میں مضاف کے ہے اور وہ مضاف الیہ نفس ہے، یعنی عامل بحدیث انفس، تو واقعی یہ لوگ حدیث نفس کے عامل ہیں، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل نہیں ہیں، یہ لوگ اپنے نفس کے موافق احادیث تلاش کر لیا کرتے ہیں۔

### ایک مشہور حکایت

جیسے کسی کی حکایت مشہور ہے کہ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں قرآن کا کون سا حکم سب سے زیادہ پسند ہے؟ کہا: ”رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ“ تو اسی طرح انہوں نے بھی تراویح کی تمام احادیث میں سے صرف آٹھ والی حدیث پسند کی، حالانکہ بارہ بھی آئی ہیں اور ترکی تمام احادیث میں سے ایک رکعت والی حدیث پسند کی، حالانکہ تین رکعتیں بھی آئی ہیں، پانچ بھی آئی ہیں، سات بھی آئی ہیں، خیر وہ تو بیچارے ان کے بہکانے سے تردد میں پڑ گئے تھے، مولانا سے پوچھا، مولانا نے فرمایا کہ بھئی سنو محکمہ مال سے اطلاع آئے کہ مال گزاری میں داخل کرو اور تمہیں معلوم نہ ہو کہ کتنی ہے؟ تم نے ایک نمبر دار سے پوچھا کہ میرے ذمے کتنی مال گزاری ہے؟ اس نے کہا: اٹھارہ روپے، پھر تم نے دوسرے نمبر دار سے پوچھا، اس نے کہا: ”میں روپے، تو اب بتاؤ تمہیں کچھری کتنی رقم لے کر جانا چاہیے؟ انہوں نے کہا: میں روپے لے کر جانا چاہتا ہوں، اگر اتنی ہی ہوئی تو کسی سے مانگنا نہ پڑے گی اور اگر کم ہوئی تو رقم منج جائے گی اور اگر میں کم لے کر گیا اور وہاں زیادہ ہوئی تو کس سے مانگتا پھروں گا؟ مولانا نے فرمایا: ”بس! خوب سمجھ لو کہ اگر وہاں بیس رکعتیں طلب کی گئیں اور ہیں تمہارے پاس آٹھ، تو کہاں سے لاکر دو گے اور اگر بیس ہیں اور طلب کم کی ہیں، تو منج رہیں گی اور تمہارے کام آئیں گی، کہنے لگے: ٹھیک ہے! سمجھ میں آ گیا، اب میں ہمیشہ بیس رکعتیں پڑھا کروں گا، بس بالکل تسلی ہوگئی، سبحان اللہ! کیا طرز ہے سمجھانے کا؟ حقیقت میں یہ لوگ حکماء امت ہوتے ہیں۔“

(روح القیام صفحہ: ۷)



## عہد عمر رضی اللہ عنہ میں تراویح و وتر

(ب) اس وقت اس کے اثبات سے ہم کو بحث نہیں عمل کے لیے ہم کو اتنا کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بیس رکعات تراویح اور تین وتر جماعت کے ساتھ پڑھے جاتے تھے، یہ روایت مؤطا مالک میں گو منقطع ہے، مگر عملاً متواتر ہے، امت کے عمل نے اس کو متواتر کر دیا ہے، بس عمل کے لیے اتنا ہی کافی ہے، دیکھئے! اگر کوئی پسناری کے پاس دوا لینے جائے تو اس سے نہیں پوچھتا کہ دوا کہاں سے آئی؟ اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی دوا ہے، جو میں لینا چاہتا ہوں؟ بلکہ اگر شہر ہوتا ہے تو ایک دو جانے والوں کو دکھلا کر اطمینان کر لیا جاتا ہے، اب اگر کوئی پسناری سے یہ کہے کہ میرا اطمینان تو اس وقت ہوگا، جب کہ بائع کے دستخط دکھلا دو گے کہ تم نے اس سے یہ دوا خریدی تو لوگ کہیں گے کہ اس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں اور پسناری بھی صاف کہہ دے گا کہ مجھے دستخط دکھلانے کی ضرورت نہیں، لیتے ہو لو، نہیں لیتے ہومت لو، اسی طرح محققین سلف کا طرز یہ ہے کہ وہ دوا کے لیے مغز زنی نہیں کرتے تھے، بس مسئلہ بتلا دیا اور اگر کسی نے اس میں جتیں نکالیں تو صاف کہہ دیا کہ کسی دوسرے سے تحقیق کر لو، جس پر تم کو اعتماد ہو، ہمیں بحث کی فرصت نہیں، مولانا عبدالقیوم مقیم جھوپال رحمہ اللہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو کتاب میں دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور جو کوئی حدیث پوچھتا، تو وہ فرمادیتے کہ بھائی میں نو مسلم نہیں، میرے آباؤ اجداد سب مسلمان تھے اور اسی طرح ان کے آباؤ اجداد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک سب مسلمان تھے، جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو دیکھ کر عمل کیا اور جوان کے بعد تھے انہوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا، اسی طرح سلسلہ بسلسلہ ہمارے گھر میں وہی ہوتا آ رہا ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا، اس لیے مجھے حدیث دھونڈنے کی ضرورت نہیں، اس کی ضرورت تو نو مسلموں کو ہے۔ اس جواب کا حاصل وہی قطع نزاع ہے کہ فضول بحث کو یہ حضرات پسند کرتے تھے، بھلا اگر عوام کو بتلا دیا جائے کہ حدیث میں یہ ہے کہ ان کو بطریق استنباط کا علم کس طرح ہوگا؟ اس میں پھر وہ فقہاء کے محتاج ہوں گے، تو پہلے ہی فقہاء کے بیان پر اعتماد کیوں نہیں کرتے؟

الغرض عمل کے لیے تو تراویح کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس کو مسنون فرمایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں حتیٰ کہ ام رضوان اللہ علیہم اجمعین عملاً تراویح کی بیس رکعتیں پڑھتے تھے، عوام کے لیے اتنا کافی ہے، اس سے زیادہ تحقیق علماء کا منصب ہے، اس وقت اس سے بحث نہیں، اس تراویح کا نام قیام رمضان بھی ہے، کیونکہ یہ

رمضان کے ساتھ مخصوص ہے اور احادیث میں ان کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے۔ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے، کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں اور اس کے علاوہ اس پر اور بھی دلائل قائم ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔

(تفہیم النام بصورت القیام صفحہ: ۱۷)

چالیسواں اعتراض..... حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ درایت میں

سب ائمہ میں بڑھے ہوئے ہیں!

ابن خلدون کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کو کل ستر و حدیثیں پہنچی ہیں، یہ قول اگرچہ کسی درجہ میں بھی صحیح ماننے کے قابل نہیں، کیونکہ امام صاحب رحمہ اللہ کے واسطے سے جس قدر روایات مؤطا و آثار محمد و غیرہ میں اس وقت موجود ہیں، اگر ان سب کو ہی جمع کر لیا جائے تو وہ اس سے بدرجہا زیادہ نکلیں گی اور یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے مسند امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے احاطہ کا قصد نہیں کیا تھا، بلکہ بیجا و ضمناً امام صاحب رحمہ اللہ کو روایات کی بھی دیگر شیوخ کی روایات کے ساتھ ذکر کر دیا، تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کی روایات کس قدر ہوں گی؟ ستر کا غلط ہونا تو بالکل بدیہی ہے، مگر میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ابن خلدون کے اس قول کی تردید کیوں کرتے ہو؟ اس سے تو ہمارے امام رحمہ اللہ کی منقبت نکلتی ہے، منقبت نہیں نکلتی، کیونکہ امام صاحب رحمہ اللہ کا مجتہد ہونا تو سب کو مسلم ہے، اس کا تو کسی کو انکار نہیں اور انکار کیونکر ہو سکتا ہے؟ جب کہ ہر باب میں امام صاحب رحمہ اللہ کے اقوال موجود ہیں اور ہر مسئلہ میں وہ دخل دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مسائل میں امام صاحب رحمہ اللہ کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں، اس سے معلوم ہو گیا کہ مخالفین کو امام کو محدث نہ تسلیم کریں، مگر مجتہد ضرور مانتے ہیں، علاوہ ازیں صراحت کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ و محدثین نے ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے فقیہ و مجتہد ہونے کا اقرار کیا ہے اور نہ صرف مجتہد ہونے کا بلکہ تمام فقہاء کا نفع میں عیال ابوحنیفہ ہونا تسلیم کیا ہے تو ایک مقدمہ تو یہ لے لیا جائے، اس کے ساتھ دوسرے مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ امام صاحب رحمہ اللہ کو حدیثیں کل ستر ہی پہنچی تھیں۔ اب دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ وہ نتیجہ یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی فہم بہت ہی عالی تھی کہ صرف ستر حدیثوں سے اس قدر مسائل استنباط کیے کہ دوسرے ائمہ باوجود لاکھوں

احادیث کے حافظ ہونے کے بھی، ان کے برابر مسائل مستنبط نہ کر سکے، اس سے زیادہ ہونے کی کیا دلیل ہوگی؟ معلوم ہوا کہ بہت ہی بڑے مجتہد تھے تو ہمارے احباب حنفیہ ابن خلدون کے اس قول سے فضول جیسی سمجھیں ہوتے ہیں، اس پر تو وہ امام صاحب رحمہ اللہ کی اتنی مدح کر گئے جس کی کوئی حد نہیں، خواہ مخواہ اس قول کی تردید کے درپے کیوں ہوں؟ مان لینا چاہیے کہ حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کو سترہ ہی حدیثیں کل ملی تھیں کس قدر عالی فہم تھے کہ چند حدیثوں سے لاکھوں جزئیات اور مسائل سمجھ گئے، خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا، اس قول کے غلط ہونے کا تو خود محدثین کو بھی اقرار ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ روایت میں حنفیہ کا پلہ دوسرے ائمہ و محدثین کے برابر نہیں، مگر روایت میں یہ اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث و قرآن کو بڑھاپڑھایا سب نے، مگر گنا حنفیہ ہی نے ہے۔

### عامل بالحدیث کا قصہ

ایک عامل بالحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات کے متعلق مسائل پوچھا کرتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے علماء سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے مجھ سے کس لیے پوچھتے ہو؟ تو حالانکہ وہ اپنے مسلک میں بہت ہی پختہ ہیں، مگر انصاف کی بات چھپا نہیں کرتی، زبان سے بے ساختہ یہی نکلا کہ ہمارے علماء تو آئین، رفیع یدین کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے، یہ مسائل ان کو نہیں آتے، آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے، غرض معلوم ہو گیا کہ کسی بات کا سننا اور گننا اور ہے۔

(الجلال بلا بتنا صفحہ: ۳)

### عوام کے شبہات کا حل!

اقتالیسوا الاعتراض..... حضور ﷺ کا اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ

### کی وفات پر رونا

ایک شبہ ظاہری یہ ہوتا ہے کہ ہمارے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ (اپنے صاحبزادے کے) انتقال پر رونے اور بعض اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ وقت مصیبت کے انہوں نے الحمد للہ کہا، حالانکہ انبیاء علیہ السلام کے مرتبے کو کوئی نہیں پاسکتا، جو اب اس شبہ کا یہ ہے کہ حق فرزند یہ ہے کہ ایسے وقت میں اس پر رونے، حق خالق یہ ہے کہ امر الہی پر صبر کرے،

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جمع فرمایا، حق فرزند بھی اور حق خالق بھی اور دونوں کو ادا فرمایا اور بعض اولیاء مرتبہ میں کم ہیں کہ ایک حق ان سے ادا ہوا اور دوسرا نہ ہوا، اسی طرح حدیث میں ہے کہ قیامت میں بعض انبیاء بعض اولیاء پر رشک کریں گے، ظاہر اس پر بھی شہد ہوتا ہے کہ افضل کو مفضول پر غبطہ کیوں ہوگا؟ بات یہ ہے کہ غبطہ کئی قسم کا ہوتا ہے، کبھی تو کمال کے فقہان سے، سو یہ تو ہوگا نہیں اور کبھی بسبب ایک خاص قسم کی عافیت کے مثلاً کوئی بڑے عہدہ پر ہوا اور پھر ذمہ داریوں کی کثرت سے یہ کہے کہ پانچ روپے والے مجھ سے اچھے ہیں کہ آرام سے تو ہیں اس قدر حساب کا بوجھ تو نہیں، حضرت انبیاء علیہم السلام کا رشک کرنا اسی طرح پر ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا بڑا مرتبہ ہے، امت کی فکر میں مشغول ہوں گے اور بعض اولیاء اللہ ایسی مشغولی سے آزاد ہوں گے، پس اس غبطہ کا یہ محل ہے۔

(عجالات معدلت صفحہ: ۳۶)

### بیابیسواں اعتراض..... لڑکا لڑکی کی عمر بوقت شادی برابر ہی ہونی چاہیے!

بعض لوگ غضب کرتے ہیں کہ مال کے لالچ میں بوڑھوں سے نکاح کر دیتے ہیں، لنگوہ میں ایک لڑکی اپنی ساتھیوں سے کہا کرتی تھی کہ جب میاں گھر میں آتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نانا جان آگئے، امام صاحب رحمہ اللہ کی روح پر ہزاروں رحمتیں ہوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ جب لڑکی بالغ ہو جائے تو اس پر کسی کا اختیار نہیں رہتا، یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر اتفاق سے امام صاحب رحمہ اللہ کا فتویٰ بالکل مصلحت کے موافق آ کے پڑا، آج کل اس کو بے شرمی سمجھتے ہیں کہ ماں باپ نکاح کرنا چاہیں اور لڑکی انکار کر دے، حالانکہ استدعاء بے شرمی ہے، انکار بے شرمی نہیں، بلکہ یہ تو عین حیاء ہے کہ پیار کے نام کو بھی پسند نہیں کرتی، دیکھ لو یہ عقل کی بات ہے یا نہیں؟ تو ایسے مواقع میں لڑکیوں کو ضرور انکار کر دینا چاہیے، بعض لوگ اس خرابی کے جواب میں کہ لڑکی کم سن اور مرد سن ہو، تو غالب یہ ہے کہ وہ بیجاری بہت جلد بیوہ ہوگی، یوں کہا کرتے ہیں کہ اجی! یہ تو خبر نہیں کہ پہلے کون مرے گا، اس لیے کیا عجیب ہے کہ لڑکی پہلے مر جائے، مگر ظاہر تو یہی ہے کہ پہلے بڑے میاں مرے اور پھر لڑکی کی مٹی خراب ہوتی ہے۔

### ہم عمر کا خیال

لوگ ہم عمر کا بالکل خیال نہیں کرتے، بالخصوص بعض قوموں میں اس کے برعکس ہی رواج ہے، یعنی لڑکا چھوٹا ہوتا ہے اور لڑکی بڑی، دلیل سے اس کے عکس کی خرابی بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگی، بات یہ ہے کہ خود حکماء نے کہا ہے کہ اگر عورت کچھ چھوٹی ہو تو مضائقہ نہیں اور اس میں راز یہ ہے کہ عورت

مخکوم ہوتی ہے اور مرد حاکم۔ نیز عورت کے قویٰ ضعیف ہوتے ہیں، بوجہ رطوبت کے اعلیٰ جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ کہتے ہیں بیسی کھی سی، ساٹھا پٹھا، تو اگر لڑکی چھوٹی ہوئی تو وہ جب ضعیف شروع ہوگی تو چونکہ مرد کی عمر اس سے زیادہ ہے، وہ بھی ضعیف ہوگا تو دونوں ساتھ ساتھ بوڑھے ہوں گے تو باوجود یکہ عقل اس کو جائز رکھتی ہے، مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا، تو لڑکے کی کم عمر اور لڑکی کی زیادہ عمر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا، خلاف عقل ہے، خاص کر ان دو وجوہ سے کہ شوہر حاکم ہوتا ہے اور عورت مرد سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہے، جب عورت کی عمر زیادہ سے تو وہ شوہر سے بہت پہلے ہی بوڑھی ہو جائے گی، تو اماں جان پر حکومت کرتے ہوئے کیا اچھا لگے گا؟ تو لامحالہ دوسری کواوے کا اور عیش متیغ ہوگا۔

### عورت کا کم عمر ہونا مناسب ہے

بعض قوموں میں تو یہ آفت ہے کہ لڑکا نابالغ ہے اور لڑکی پوری جوان اور دونوں کا نکاح ہو جاتا ہے، پھر اخیر میں فتنے ہوتے ہیں، صاحبو! میرے پاس اس قسم کے سوالات بکثرت آتے ہیں کہ لڑکا تو بالغ ہے، کوئی ایسی تدبیر بھی ہے کہ نکاح ٹوٹ سکے، باپ کے اختیار میں جوڑنا تو ہے، مگر توڑنا نہیں، کیونکہ ولی صبی کو منافع کا اختیار ہے، مضار کا نہیں، بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر لڑکے سے طلاق دلوائیں تو ہو جائے گی، یا نہیں؟ تو نابالغ کی طلاق نہیں پڑتی، بعض دفعہ لڑکا تو جوان ہو جائے اور لڑکی بہت جوان، مگر وہ طلاق نہیں دیتا، بعض دفعہ سوال آتا ہے کہ بہو کا لڑکے کے باپ سے تعلق ہو گیا، اب نتیجہ یہ ہوا کہ خاوند پر بھی حرام ہو گئی اور وہ احتیاط بھی نہیں کرتا کہ وہ ماں بھی ہوتی ہے اور بیوی بھی تو شریعت اس کو کیسے پسند کر سکتی ہے؟ ہاں! اگر دو چار برس کا تفاوت ہو تو ہو سکتا ہے، کانچہ میں ایک دیور سے زبردستی لڑکی کا نکاح کر دیا گیا، عورت اس لیے مجبور ہوتی ہے کہ اگر سرسرا کہنا نہ مانو تو روٹی نہ ملے گی، غرض ان سب واقعات سے یہ معلوم ہو گیا کہ عورت کا زیادہ بڑا تفاوت مصلحت ہے۔

(وعظہ افضل للجاہلیہ ص ۵۷)

### تراہیساواں اعتراض..... علم دین حاصل کرنے کا سہل اور آسان طریقہ!

آپ صرف اتنا کریں کہ اردو کے چھوٹے چھوٹے رسائل دینیہ جو اسی غرض سے لکھے گئے ہیں، کسی سے پڑھ لیں اور اگر پڑھنے کے لیے وقت نہ ہو، یا عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے یہ دشوار ہو تو کسی سے سن لیں، سو اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شہر میں ایک دو عالم ایسے رہیں کہ جن سے یہ دو کام، یعنی ان سے پڑھنے سننے کے لیے جاکیں اور ان دونوں کام لینے کی چار صورتیں ہوں۔

کی، اول تو یہ کہ اگر ان سے کوئی شخص پڑھنے جائیں تو پڑھا کریں۔ دوم یہ کہ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ بتلا سکیں، تیسرے ہر ہفتہ میں ایک دن ایسا نکالیں کہ لوگوں کو جمع کر کے کوئی کتاب مسکولہ کی لے کر خود اس کے مسائل پڑھا کریں، لوگ ان کو سنا کریں اور مسائل میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معاشرت، معاملات وغیرہ سب کے احکام داخل ہیں۔ سب سنائیں۔ چوتھا کام ان کا یہ ہو کہ ہر ہفتہ یا چند ہوں دن تربیب و ترغیب کا وعظ کہا کریں اور وعظ کی مجلس کو بیان مسائل کی مجلس سے علیحدہ کرانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ یہ تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ وعظ میں مسائل فقہ کا زیادہ بیان نہیں ہو سکتا، اکثر یاد میں بھی خلط ہو جاتا ہے اور بالخصوص اس لیے بھی کہ وعظ میں اکثر لوگ مزید ارضائین کہنے کی غرض سے آتے ہیں، اس لیے وعظ میں تربیب و ترغیب کے مضامین ہوں، یہ چار کام ان کے سپرد ہوں اور ان کی تنخواہ اہل شہر خود اپنے ذمہ لیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، دیکھئے! جس مقام پر طبیب نہیں ہوتا، اہل شہر چندہ کر کے ایک طبیب کو بلاتے ہیں اور تنخواہ دیتے ہیں، تو گویا باطنی امراض کا ازالہ بدنی امراض کے برابر بھی ضروری نہیں ہے؟ یہ دستور العمل تو مردوں کے لیے ہے، رہیں عورتیں ان کے لیے آسان یہ ہے کہ جو عورتیں پڑھی لکھی ہیں، وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر ہشتی زیور وغیرہ پڑھا کریں اور جو پڑھی ہوئی نہیں ہیں، وہ اپنے لڑکوں بچوں سے کسی وقت ہشتی زیور کے مسائل سن لیا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو لڑکیوں کو پڑھوا کر تیار کر لیں اور ان سے اسی سلسلہ کو جاری کریں، یہ مختصر دستور العمل ہے، اس سے ان شاء اللہ ہر شخص کو علم دین حاصل ہو جائے گا اور محبت بھی بڑھے گی اور دین کی تکمیل ہوگی۔

(وعظ آثار الحجہ صفحہ ۲۹)

چوالیسواں اعتراض..... قرآن شریف ایک متن ہے، فقہ اور حدیث

اس کی شرح ہے!

قرآن ایک متن ہے، حدیث و فقہ سب اس کی شروح ہیں، اس کو فقہاء نے کہا ہے: "القیاس مظہر لامبیت" تو حدیث و فقہ نے قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے، کوئی حکم قرآن کے خلاف بیان نہیں کیا، اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق منقل ہے اور کبھی سے اسے کھول دیا اور بہت سے جو اہرات نظر آنے لگے تو یہ جو اہرات کبھی سے پیدا تو ہوئے نہیں، بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے، مگر پوشیدہ تھے، کبھی نے ان کو ظاہر کر دیا تو حدیث و فقہ قرآن کے لیے کبھی ہیں، جتنے علوم ہیں، سب قرآن ہی سے نکلتے ہیں، اس کی تو یہ شان ہے۔

عبارتنا شنی و حسنک واحد

و کل الی ذاک الجمال بشیر

ایک محبوب ہے جس نے صبح کو دلہنی جوڑا پہنا، شام کو دوسرا جوڑا پہنا تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں  
پہچانے گا، مگر عاشق کہے گا:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من بہر انداز قدر می شام

کہ جو لباس چاہے پہن لے، میں تو چال پہچان لیتا ہوں، تو قرآن کا جو عاشق ہے، اس کو  
حدیث و فقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے، مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی رحمہ اللہ حضرت مولانا  
گنگوہی رحمہ اللہ سے فرمایا کرتے تھے کہ حدیث تو آپ کے سامنے آ کر خفی ہو جاتی ہے، ان  
حضرات کو حدیث میں فقہ نظر آتی تھی اور ان اہل نظر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ:

بسکہ در جان نگار و چشم بیدارم توئی

ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

جیسا کہ اہل اللہ کو ہر شے میں خدا نظر آتا ہے، مگر معاذ اللہ! یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہی ہیں،  
استغفر اللہ! بندہ بندہ ہے، خدا خدا ہے، جیسا کہ قرآن قرآن ہے اور حدیث حدیث مولانا جامی  
رحمہ اللہ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ حال میں فرما رہے تھے کہ:

ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

کسی منکر نے مسخرہ پن سے کہا کہ ”مولانا اگر خریدار ہو تو آپ نے کیا مزہ کا جواب دیا کہ  
”پندارم توئی“  
(وعظ الاطاعت صفحہ: ۱۲)

پینتالیسواں اعتراض ..... آج کل مستحبات کی پرواہ نہیں کی جاتی نہ

ہی ان کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے!

آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عمل کے درجے میں وہ واجبات و فرائض کے برابر  
ضروری ہیں بھی نہیں، مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے، دو وجہ سے ایک اس لیے کہ لوگوں کو ان کا  
مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا، تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا، یا فرض یا واجب نہ خیال کرے گا، یہ تو  
اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضروری ہے اور اس درجے میں مباحثات کی تعلیم بھی ضروری ہے،

دوسرے اس لیے کہ ان کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں، جن پر نہ مطلع ہونا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے، اگر ان برکات و ثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں، تو آپ خود کہیں گے کہ انفس! ہم اب تک بڑے خسارے میں تھے، جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے، یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجہ میں ہے، غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں، بلکہ تعلیم کے درجے میں ہے، ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے۔ اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو، عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے اور جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کر لوں اور وہ بھی کر لوں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے کہ اللہ اور رسول نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلادیا جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضرورت ہی کا بیان ہوتا، مستحبات کا ذکر نہ ہوتا، تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی، کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق محض ضروریات پر اکتفا نہیں کرتے، ان کو تو وہ اپنا فرض منہی سمجھتا ہے، بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منہی کے علاوہ بھی کچھ ایسا کام کروں جس سے محبوب کو مجھ سے زیادہ توجہ ہو، دیکھئے! ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لیے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے، وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منہی کو ادا کرتا رہوں، اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا، پرورش کیا ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جاں نثاری کا تعلق ہے، وہ ہرگز فرض منہی پر اکتفا نہ کرے گا، بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو بھی کام ہو وہ میرے ہاتھ سے ہو جائے وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پیرو بھی دبائے گا، پکھلا بھی بھلے گا اور آپ کے جانگنے سے پہلے تمام ضروریات کے سامان مہیا کرے گا اور یہ کبھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منہی سے زیادہ ہیں، انہیں کیوں کریں؟ نہیں! بلکہ اس کی محبت اور جاں نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیے۔

### اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق

صاحبو! ہمارا علاقہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے، اسی لیے ہم واجبات و فرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، اگر ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت اور جاں نثاری کا علاقہ ہوتا تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کر سکتے، بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود



بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حق تعالیٰ کو یہ پسند ہے، وہ اس سے محبوب ہوتے ہیں، اس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ یہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہے یا کم از کم عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے روکنے کے لیے کافی ہے یہ محبوب کو ناپسند ہے، وہ یہ بھی گفتیش نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزا میں ضرب و جس (ضرب مار، پیٹ، جس قید کرنا) کی جاتی ہے، یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو جاتا اور رخ پھیر لیتا ہے، اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں، وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اس سے کچھ کبیدہ خاطر ہو یا بے رخ ہو جائے اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزائے ضرب و جس بھی ہو تو بھلا وہ کیوں کرنے لگا؟ مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے، تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کر لیں گے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے، گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ سوال ہی تعلق کی دلیل ہے، میں ان لوگوں کی طرف داری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے، کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے۔ اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی کہ کیا بڑا گناہ ہے معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں، کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ بہت ناراض ہوتے ہیں، لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے، اس لیے تھوڑا سا ناراض کر دینا گوارا ہے، غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعیف تعلق کی بھی۔

### تعلقات میں درجہ کمال

اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا سوال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا اور یہ بات ایک درجے میں ہے بھی خوش ہونے کی کیونکہ:

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

مگر وہ یاد رکھیں کہ انفس تعلق پر قناعت نہیں ہو سکتی، آخر آپس میں جو ایک دوسرے سے ہم تارکتے ہیں، کیا ان میں انفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ ہر تعلق کا درجہ جس شخص کو مطلوب ہے، دیکھتے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے، حالانکہ وہ ایک نہایت ضعیف تعلق ہے جو صرف دخلخطوں سے جڑ جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے، مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو انفس تعلق پر قناعت کرتا ہو، بلکہ ہر شخص کی یہ تڑپ رہتی ہے کہ بیوی کو میرے

ساتھ کامل تعلق ہو، اسی لیے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے خوش کرنے کے لیے وہ کام کیے جاتے ہیں اور وہ زیور اور لباس تیار کیے جاتے ہیں، جو اس کا حق نہیں، مگر محض اپنے مصالح کی وجہ سے ان کاموں کو کیا جاتا ہے، تا کہ یہ تعلق بڑھے اور مستحکم ہو، اگر مرد بیوی کے ساتھ، یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقے رکھے اور حقوق ضروریہ سے زائد کچھ نہ کرے تو گونفس تعلق باقی رہ سکتا ہے، مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ رہتا ہے، تعلق کو بقا جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جائے، چنانچہ مرد کے ذمہ بیوی کا محض کھانا، کپڑا ضروری ہے، زیور اور ریشمی لباس ضروری نہیں، نہ اس کی وہ ادارہ لازم ہے، نہ اس کے گنپے والوں کی ضیافت و دعوت ضروری ہے، مگر محض تعلق بڑھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے اور اس کے جی خوش کرنے کو ہر کام میں ملحوظ رکھا جاتا ہے، حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے، مگر باوجود اس ضعف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے اور اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے، تو کتنا رنج ہوتا ہے؟ اور انقطاع سے بچنے ہی کے لیے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کیے جاتے ہیں، پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف تعلق میں تو نفس تعلق پر قناعت نہ ہو، بلکہ خوف انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا نہیں، حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قومی علاقہ ہے کہ اس کے برابر کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے استحکام کی ہم کو فکر نہیں؟ اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا کہ تعلق کا بقا، استحکام پر موقوف ہے، نفس تعلق بقاء کے لیے کافی نہیں، بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے، تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے؟ ہرگز نہیں! پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا؟ مولانا روم فرماتے ہیں:

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن  
صبر چوں داری ز رب ذوالعین  
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں  
صبر چوں داری ز نعم المابدون

کنز و تعلق پر افسوس نہیں

ہائے! ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے صبر نہیں ہو سکتا، مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے لوگوں کو کیسے صبر آ گیا؟ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعیف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق

رہنے پر ذرا جی نہیں دکھتا، پس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے، مگر ضعیف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے، بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں، یہ تو کفار ہیں، ان سے اس وقت خطاب نہیں، یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں، حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے، اسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحبات کی قدر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند رہا، مگر منیۃ المسلمی پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں، جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں، اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا، اس وقت تو متنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بہت بری تھی، اس کا تو سببی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں کہ ضروریات کو بجالائیں، تو کیا دنیا میں ہم اپنے مریوں کے ساتھ ہیں یہ برتاؤ کر سکتے ہیں خدمت واجبہ کے سوا کچھ نہ کریں؟ ہرگز نہیں دیکھئے! بعض اوقات کسی طمع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مریوں کی خدمت غیر واجبہ بھی بہت کرتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مریوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے؟ ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیے! پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی اطاعت میں اس قدر اکتفا کرتے ہیں، جو فرض و واجب ہے اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں سمجھتے.....!!

### ہمارا فرض کیا ہے؟

یہ ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی اطاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اس کے حق کے مقابلے میں بہت کم ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے مستحبات میں ہماری کوتاہی کا، کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہو گیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا، تو پھر کس لیے زیادہ کوشش کریں؟ مگر یہ سخت غلطی ہے، اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کر سکتے، مگر اپنے منتفی حال کے موافق تو کر سکتے ہیں، دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین کے سامنے بدایاوتھا ئف لے جاتے اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہدیہ نہیں ہو سکتا، مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہدیہ دینا موافق کر دیں، بلکہ جتنا اپنے سے بن پڑتا ہے، کوشش کر کے عمدہ سے عمدہ ہدیہ پیش ہی کرتے ہیں، اسی لیے مثل مشہور ہے کہ ہدیہ یا تو دوسرے کی شان کے موافق ہو، یا کم از کم اپنی ہی شان کے موافق ہو، پس ہم کو اپنی بہت و طاقت کے موافق عمل تو کرنا چاہیے اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ اگر راضی کرنے کے لیے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ کر سکتے ہیں آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ

کیجئے حق تعالیٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے، بلکہ اس قدر کا مکلف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لیے ترک کر دیں کہ حق تعالیٰ کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا؟

### کسی مصلحت سے ترک مستحبات

یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے، مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لیے کہ یہ فعل واجب نہیں، یا سفر میں رفتا کی رعایت کی وجہ سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں، یا کسی وقت تعب کی وجہ سے اپنی راحت کے لیے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت مستحبات پر ملامت نہیں چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لیے تو حدیث میں وارد ہے: "ان لنفسك عليك حقا ولعینك عليك حقا..... الخ او كما قال" (یعنی تجھ پر تیرے نفس کا حق ہے اور تیری آنکھوں کا حق ہے) مگر بلاوجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آئی ہے، کیونکہ یہ سستی اور کاہلی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اللہم انسی اعوذ بک من العجز والکسل" (اے اللہ! مجبوری اور کاہلی سے تیری پناہ چاہتا ہوں) خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چیز ہے اور سستی اور چیز ہے، دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے، طلب راحت کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہے اور اس کے لیے بعض صحابہ کو ترک مستحبات و تقلیل نوافل کی ترغیب دی ہے اور سستی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے، اب سمجھئے کہ طلب راحت اور سستی میں کیا فرق ہے؟ طلب راحت اس وقت ہوا کرتی ہے جب آدمی اپنی طاقت کے موافق عمل کر چکا ہو، اس کو حکم ہے کہ بس طاقت سے زیادہ نہ کرو، جا کر آرام کرو اور سستی یہ ہے کہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق بھی کام نہ کرے، بلکہ تھوڑا سا عمل کر کے چھوڑ دے اس سے پناہ آئی ہے۔

### مستحبات بھی ضروری ہیں

غرض حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا بڑا تعلق ہے، اس لحاظ سے مستحبات بھی ضروری ہیں، یہ میں اس شبہ کا جواب دے رہا ہوں جو میرے اس قول پر ہوا تھا کہ خدا تعالیٰ کے ہر کام کا ہر جز ضروری ہے چونکہ قرآن میں مستحبات کا ذکر بھی ہے اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے تو میں نے بتلادیا کہ تعلیم ان کی بھی ضروری ہے، کیونکہ اس کے برکات و ثمرات بے شمار ہیں چنانچہ ایک برکت تو یہ ہے کہ بعض اوقات معصیت سے مانع ہو جاتے ہیں، کیونکہ جو شخص تہجد و اشراق کا پابند ہوگا، وہ یہ نسبت اس شخص کے معاصی سے زیادہ بچے گا، جو شخص پانچ وقت کے فرائض ہی ادا کرتا ہے اور اس میں

علاوہ خاصیت کے ایک طبعی رازیہ ہے کہ مستحبات کی پابندی سے یہ شخص دیندار تہجد گزار مشہور ہو جاتا ہے، تو اس لقب کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب سے وہ خود بھی شرماتا لگتا ہے اور بعض اوقات کوئی فعل مستحب حق تعالیٰ کو ایسا پسند آ جاتا ہے کہ وہی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ (ذم النیان صفحہ: ۳)

چھپالیسواں اعتراض..... عوام کے لیے ترجمہ قرآن شریف دیکھنا مضر ہے!

ایک ملاجی میرے پاس مترجم قرآن لائے (جس کو عام لوگ مترجم کہتے ہیں، جیسے میرے ایک عزیز دیوان منجی کو تہمتی کہتے تھے) وہ ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ کا تھا، جس میں محاورہ کی زیادہ رعایت کی گئی ہے، اس میں ”فَاعْبَسُوا وَجُوهَكُمْ وَأَعْيُنَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ“ کا یوں ترجمہ کیا گیا ہے کہ دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو اور لمبوا اپنے سروں کو اور اپنے پیروں کو، جس میں لفظ اپنے پیروں کو، واقع میں مونہوں اور ہاتھوں کے ساتھ لگتا ہے جو کہ دور سے نہ کہ اس فقرے سے کہ ”لمبوا اپنے سروں کو“ جو کہ نزدیک ہے مگر وہ ملاجی قریب کے سبب یہی سمجھے کہ یہ قریب سے متصل ہے، تو وہ اب ترجمہ دکھلا کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ قرآن سے تو پتا ہوں کہ مسح ثابت ہوتا ہے، میں بڑا گھبرایا کہ اس جاہل کو کیونکر سمجھاؤں؟ نہ یہ عطف کو سمجھے، نہ اعراب کو، تو میں نے اس سے کہا کہ ملاجی! تم نے یہ کیونکر معلوم کیا کہ یہ قرآن ہے؟ اور خدا کا کام ہے؟ کہا علماء کے کہنے سے، میں نے کہا: ”اللہ اکبر! علماء اس میں تو ایماندار ہیں کہ وہ ایک عربی عبارت کو قرآن کہہ دیں اور اس میں ایماندار نہیں کہ وہ پاؤں دھونے کو فرض کہیں، بس علماء نے فرمایا کہ پیروں کو دھونا فرض ہے اور مسح کرنا جائز نہیں اور نیز یہ بھی کہا ہے کہ تم جیسوں کو قرآن کا ترجمہ دیکھنا جائز نہیں..... خبردار! جو تم نے کبھی آئندہ ترجمہ دیکھا، بس قرآن کی تلاوت کیا کرو، ترجمہ ہرگز نہ دیکھو۔“

ایک بڑے میاں کا واقعہ

اس بھی بڑھ کر ہمیں ایک بڑے میاں ملے جو بڑے تہجد گزار اور پابند تھے، مگر قرآن کا ترجمہ دیکھ کر گمراہ ہوئے تھے، وہ مجھ سے کہنے لگے کہ جب میں قرآن پڑھا کروں تو لفظ راعنا چھوڑ دیا کروں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَأُوا رَاعِنًا“ جس کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ اے ایمان والو! راعنا مت کہا کرو“ تو کیا تلاوت کے وقت راعنا نہ پڑھا کروں؟ میں نے ان سے کہا کہ راعنا کو تو مت چھوڑو، مگر آج سے قرآن کا ترجمہ دیکھنا چھوڑ دو، کیونکہ تم

کو سمجھنے کی قابلیت نہیں۔

صاحبو! ایسے ہی لوگوں نے شریعت کا ناس کیا ہے، جو ترجمہ قرآن وحدیث کا دیکھ کر مجتہد بن گئے ہیں، اب اگر ان کی کم لیاقتی کے سبب ان کے شہادت کا جواب نہ دیا جائے، بلکہ ان لوگوں کو ترجمہ دیکھنے سے منع کیا جائے تو بعض یوں کہتے ہیں کہ علماء کو ہمارے سوالات کا جواب نہیں آتا، میں کہتا ہوں کہ افسوس! آپ کو سمجھنا نہیں آتا، جواب تو ہر سوال کا ہے، مگر یہ بتلاؤ کہ اس کا سمجھنے والا کون ہے؟

سیوف حداد یالسوی بن غالب

مواض و لکن ابن السیف ضاء ب

صاحبو! آپ یہ اعتراض علماء پر نہیں کرتے، بلکہ خود اپنی عقل پر اعتراض کر رہے ہیں، مگر آپ کو خبر نہیں:

حملہ پر خود مدی کنی اے سادہ مرد!

بھجو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

جیسے ہمارے یہاں ایک عورت عبید کا چاند دیکھنے کھڑی ہوئی اور اس سے پہلے اس نے اپنے بچہ کا پاخانہ کپڑے سے پونچھا تھا جس سے کچھ نجاست اس کی انگلی کو لگی رہ گئی، عورتوں کی عادت سے کہ وہ ناک پر انگلی رکھا کرتی ہیں، اس نے جو ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو پاخانہ کی بد بوناک میں ٹپٹی تو وہ کہتی ہے: "اوی! اب کے چاند کیسا ستر ہوا نکلا؟ یہی حال ان جہلا، کا ہے جو علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتے بلکہ ان کو اپنی خبر نہیں کہ ان میں جواب کے سمجھنے کی اہلیت نہیں، بھلا اگر ایک سائیں کسی کالج کے پروفیسر سے کہے کہ مجھے اقلیدس کے پہلے مقابلے کی پانچویں شکل سمجھا دو اور وہ اس کی تقریر کرے اور سائیں نہ سمجھ سکے اور کہے نہ معلوم یہ کیا بکتا ہے؟ تو بتلائے! قصور کس کا ہے؟ یقیناً سائیں کی عقل کا قصور ہے، مگر جاہلوں کے نزدیک تو وہ پروفیسر ہی بکتا ہے، جیسے ہمارے یہاں ایک دفعہ زمانے میں وعظ ہوا، ایک جولاہی بھی وعظ سننے آئی، وہ کچھ دیر تو خاموش رہی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہتی ہے جانے کیا کیا بھونگے ہے؟ واقعی اس کے نزدیک تو سارا بھونکنا ہی ہوا فرمائیے! اس کے یہ اعتراض اپنے اوپر کیا یا وعظ پر کیا؟ اسی طرح اگر میں ان ملاجی کو علمی قاعدہ سے نہ سمجھاؤں گا، تو قصور کس کا ہے؟ اس کی عقل کی تو یہ حالت تھی کہ ہتھم مسجد نے ان سے یہ کہہ رکھا تھا کہ تاریکی کے وقت پاخانہ میں چراغ رکھ دیا کرو، ایک دن آپ چراغ لے کر آ گئے تو پاخانہ میں کوئی طالب علم تھا، آپ اس سے کہتے ہیں: "میاں مولوی صاحب! آنکھیں بند کر لینا میں چراغ رکھوں گا، جی ہاں! تو آپ کو کپڑے سے ہونے بھی نہ دیکھیں اور آپ اس کو بچکا دیکھ لیں،

اب ایسے کم عقل کو کوئی کس طرح سمجھائے کہ: "ارحکمکم" کا تعلق "وجوہکم وایدیکم" سے ہے، یہ منصوب پر معطوف ہے، مجرور پر معطوف نہیں ہے، جس شخص کو قواعد نحو سے کچھ بھی مس نہ ہو وہ اس جواب کو کبھی نہیں سمجھ سکتا، بس! ایسے شخص کا جواب یہی ہے کہ تم کو جس طریقہ سے قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہوا، اسی طریقہ سے اس کے احکام بھی معلوم کرو، تم کو خود معانی سمجھنے کا کوئی حق نہیں، یہ تفصیل میں نے اس لیے کی تاکہ آپ ترجمہ قرآن دیکھ کر اپنے کو ماہر نہ سمجھیں جو لوگوں میں بڑا مرض ہے۔

(تو اسی بالحق حصہ اول: ۹)

## سینتالیسواں اعتراض..... قبولیت دعا پر شبہ کا جواب!

جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں، ایک یہ ہے کہ درخواست لے لی جائے اور اس پر توجہ کی جائے، دوسرے یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کر دیا جائے۔ صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے آپ نے مقدمات میں دیکھا ہوگا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے، تو وہاں بھی دو درجے ہیں، ایک یہ کہ اپیل لے لی جائے اور اس میں غور کیا جائے اور یہ بھی بڑی کامیابی ہے، بڑی ناکامی ہے اس شخص کی جس کی اپیل لی ہی نہ جائے، اس کے بعد دوسرا درجہ کامیابی کا یہ ہے کہ اپیل منظور کر لینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کر دیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کر دیا جائے جب بات سمجھ میں آگئی، تو اب سمجھئے کہ: "أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ" منظور کی قسم اول پر محمول ہے، قسم ثانی پر محمول نہیں، جس کی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں، کیونکہ اس کو مرتب فرمایا ہے "انسی قریب" پر اور اس جملہ میں قرب تعلق کو بیان فرمایا اور قرب تعلق کا متضنا یہی ہے کہ درخواست کو لے لیا جائے، اس پر توجہ کی جائے خواہ فیصلہ دیر میں ہو یا جلدی ہو، موافق ہو یا نہ ہو کیونکہ فیصلہ یا تو قانون کے موافق ہوگا یا سائل کی مصالح پر نظر کر کے اور مقدمہ کی روداد دیکھ کر حاکم کے تعلق اور کا متفق صرف اتنا ہے کہ سائل کی درخواست واپس نہ کرے بلکہ اس کی درخواست کو توجہ کے ساتھ سنے اور اس کے فیصلے کے واسطے لے لے پس "اجیب" کے معنی ہونے کے ہم برد ما کرنے والے کی درخواست لے لیتے ہیں، اس پر توجہ کی جاتی ہے کہ بے توجہی نہیں کی جاتی، تو یہ کیا تھوڑی بات ہے؟ صاحبو! دنیا میں تو ہماری مرضی کے موافق ہوگا ورنہ نہیں۔

## دعا کی قبولیت کی شکلیں

ایسے ہی یہاں بھی دل کو سمجھانا چاہیے کہ جب درخواست لے لی گئی ہے، تو اگر اس کا پورا کرنا

ہماری مصلحت کے خلاف نہ ہوا تو ضرور پوری ہوگی، ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا، یہ اس واسطے کہا اللہ تعالیٰ دعا کے پورا کرنے میں تو کسی قانون کے پابند نہیں، ہاں بندے کی مصالحت پر ضرور نظر فرماتے ہیں کہ اس دعا کا پورا کرنا اس کے لیے مضرت نہ ہو، سو یہ عین کامیابی ہے، دیکھوں بچہ باپ سے پیسہ مانگتا ہے درجہ تو قبول کا یہ ہے کہ باپ اس کی درخواست کو سن کر محبت سے اس کو پیار کرے کہ ہاں! ہاں! ہم نے تمہاری درخواست سن لی اب کبھی تو وہ اس کو پیسہ دے دیتا ہے اور کبھی اس خیال سے کہ پیسہ لے کر بازار جائے گا اور نہ معلوم کیا خرید کر کھالے گا؟ جس سے نقصان پہنچے یا بازار جانے سے عادت خراب ہو جائے تو وہ اس کو بجائے پیسہ دینے کی کوئی چیز خود اپنے ہاتھ سے چار آنے کی خرید کر دے دیتا ہے، تو کیا اس کو یوں کہا جائے گا کہ درخواست پوری نہیں کی؟ ہرگز نہیں کہا جائے گا، بلکہ یوں کہا جائے گا کہ گو صورت پوری نہیں کی، مگر حقیقتاً درخواست پوری کر دی گئی، کیونکہ اس کو پیسہ سے بہتر چیز دے دی گئی، اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ حکیم بھی ہیں، قادر بھی ہیں، رحیم و مہربان بھی ہیں، باپ ماں سے زیادہ بندہ پر مہربان ہیں، اس کے بعد بھی جو کبھی طلب کے موافق عطا نہیں ہوتا تو دل کو سمجھانا چاہیے کہ ضرور ہماری درخواست کا بکنہ پورا کرنا حکمت کے موافق نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ بجائے اس کے ہم کو کچھ اور نعمت عطا فرمائیں گے، حکام دنیا تو درخواست منظور کرنے کے بعد فیصلہ کرنے کے وقت صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا قانون کے خلاف تو نہیں؟ اگر قانون کے خلاف ہوا تو اس کو رد کر دیتے ہیں اور اس جگہ کچھ اور نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ اس قانون کے ساتھ اس کو بھی دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا بندہ کی مصالحت کے خلاف تو نہیں؟ اور اسی صورت میں درخواست کا پورا کرنا عین کامیابی ہے۔

### اجابت دعا کا معنی

پس اجابت جس کا وعدہ ہے، اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے، یہ اجابت یقینی ہے، اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا، آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے، وہی مل جائے، اس کا وعدہ نہیں، بلکہ وہ ان شاء اللہ سے مقید ہے، اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہو جائے گا، ورنہ نہیں، چنانچہ ارشاد ہے: "بَلْ رِأْيَاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ" "بعض علماء نے اُجِيبَ دَعْوَةَ الدَّاعِ" کو بھی ان شاء سے مقید کیا ہے اور بعض لوگوں نے حذافت میں شار کیا ہے، مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ دوسری آیت میں ہے: "وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" تیرے رب نے کہا تجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا (یہاں سیاق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے، کیونکہ جواب امر کا ترتیب امر پر ضروری ہے، اس میں ان شاء اللہ کی



قید خلاف ظاہر ہے، نیز یہاں بھی ”انہی قریب“ کے بعد ”أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ“ کو بیان فرماتا، جس میں قرب کو محقق و موکد کیا گیا ہے، اس امر کی دلیل ہے کہ اجابت مشیت کے ساتھ متقید نہیں، ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا، حالانکہ حق تعالیٰ کا قرب ہونا محقق ہے، علما بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی ”لَقَوْلِهِ سَبَقَتْ رَحْمَتِي عَلٰی غَضَبِيْ، وَ هُوَ الْمُرَادُ بِالتَّعْلُقِ“ (میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی) پر میرے نزدیک اجیب بالمعنی الاول نہیں، ہاں! بالمعنی الثانی ان شاء سے مقید ہے، جب دعا اس طرح سے مقبول ہے، پھر دعائیں کوتاہی کیوں ہے؟ اگر کسی کے ذہن میں یہ تحقیق نہ ہو تو وہ دعائیں اس طرح بھی تو دل کو سمجھا سکتا ہے کہ دنیا میں تو نفع موہوم پر بھی بہت سے کام کر لیتے ہیں، گو آخر میں خسارہ بھی ہو جائے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے، جیسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے اور دعائیں تو خسارہ کا احتمال ہی نہیں، پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے؟ دعائیں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے، جس وقت آدمی دعا کرتا ہے، اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا، پس دعا کے بعد اگر مطلوب بعینہ حاصل نہ ہو تو یہ بات اسی وقت حاصل ہو جائے گی کہ دل میں قوت و اطمینان بعینہ حاصل نہ ہو تو یہ بات اسی وقت حاصل ہو جائے گی کہ دل میں قوت و اطمینان حاصل ہوگا اور یہ برکت اسی کی ہے کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو خاص تعلق ہو جاتا ہے، عاشق کو تو دعا سے یہی مطلوب ہے اور کچھ مطلوب نہیں، مولانا فرماتے ہیں:

از دعا نبود مراد عاشقان

جز سخن گفتن ہاں شیریں دہاں

اسی لیے عاشق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا، کیونکہ عاشق کے لیے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی باتیں سن لے، عاشق کے لیے یہی بات بہت کافی ہے، اس کے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے، تو چاہیے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے، جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے، بغیر اس کے خاص تعلق پیدا کیا جائے، بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت دور نظر آتا ہے، صاحبو! پھر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ ہے اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں، وہ تو قریب ہی ہیں، بس ہم دور ہو رہے ہیں۔

(النجاہ ص ۷۰)

اڑتا لیسواں اعتراض..... عمل کے بغیر کوئی دینی شمرہ مرتب نہیں ہوتا!

باب عمل میں آج کل دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تو وہ ہیں جن کو صرف اعتقاد کی درستی کا خیال

ہے، وہ عمل کو متم بائشان ہی نہیں سمجھتے، اس لیے ان کو اصلاح عمل اور کثیر الامالی کا اہتمام ہی نہیں، اگر یہ لوگ یوں کہتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے، تو ہم کو ان سے سزا غصہ (لڑائی) کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس کا ہم کو بھی انکار نہیں، واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے کم ہو کر ہو گیا ہے، مگر اس سے یہ کیوں کہ لازم آیا کہ عمل فضول و بے کار ہے؟ کیا جو چیز کسی سے مؤخر ہو وہ بے کار ہو کر رہتی ہے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے مؤخر ہے، مگر بائیں ہمہ کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا، کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بار آور نہیں ہو سکتا جس کی شاخیں نہ ہوں، اگرچہ اس کی جڑ کسی ہی مضبوط ہو، ایسے ہی یہاں سمجھنے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہوں بار آور نہ ہوگا، مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، جو مطلوب شارع ہے، گو کبھی بعض کیفیات بغیر اعمال کے حاصل ہو جائیں، مگر کیفیات خود مطلوب نہیں، باقی جو شمرہ شارع کے نزدیک مقصود ہے، وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہم کو اخبار شارع سے یہی معلوم ہوا ہے کہ بدون عقیدہ عمل دونوں کی درستی کے شرہ مقصودہ کے وصول کا یقین نہیں ہو سکتا، گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف اصل کی درستی سے بھی حاصل ہو جائے، مگر بوجہ وعدہ نہ ہونے کے اس کا یقین نہیں، ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کر لی ہے "فَلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم کافی ہے، یعنی اصلاح عقیدہ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات مصرح ہے کہ عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والے بھی برابر نہیں ہو سکتے، سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْبَاهُمْ وَمَعَابُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ" ایک مقام پر ارشاد ہے: "أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ" ایک جگہ ارشاد ہے: "أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ" بہر حال ثابت ہو گیا کہ عادت اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص شرہ مطلوب ہے وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

(الحجہ ص ۳)

### انچا سوال اعتراض..... مجاہدہ کو ضروری نہ سمجھنا غلطی ہے!

بعض لوگ اعمال کو تو ضروری سمجھتے ہیں، مگر اعمال کے ساتھ اور کسی شے کی ضرورت نہیں سمجھتے، ظاہر میں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھا، مگر اس میں بھی ایک نقص ہے، وہ یہ کہ صحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال و مواظبت (پیشگی) اعمال کے لیے صرف ارادہ کو کافی سمجھا، حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح

اعمال کی سہولت کے لیے ایک اور شے کی بھی ضرورت ہے، اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے، لیکن وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے اور نہ عادتاً اس معنی پر موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے عمل سہولت نہیں ہو سکتا، پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے، گو صدور عمل بغیر اس کے ہو سکتا ہے، اس کی مثال ریل کی سی ہے کہ مسافت طویلہ بدون ریل کے سہولت ملے نہیں ہو سکتی، اگرچہ بدقت ملے ہو سکتی ہے، ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدور عمل بہ تکلیف بدون اس خاص شے کے ہو سکتا ہے، مگر سہولت نہیں ہو سکتا، بلکہ سہولت اعمال کے لیے اس خاص شے کی ضرورت ہے، مجھے اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کے معنی معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کر رہے ہیں، حاصل اس شے کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح عقائد کے گوارادہ سے ہو سکتا ہے، لیکن اس ارادہ کے کچھ موانع مزائم ہو جاتے ہیں جس سے صدور عمل دشوار ہو جاتا ہے اور اس دشواری سے بعض اوقات عدم صدور عمل کی نوبت آ جاتی ہے، تو سہولت کے لیے اس شے کی ضرورت ہوئی، اس شے کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل سہل ہو جاتے ہیں اور میں اس کو تجربہ سے ثابت کرتا ہوں ابھی آیات سے استدلال نہیں کرتا، کیونکہ آیت میں دوسرے معنی بھی محتمل ہیں، اس لیے اول میں تجربہ سے اس کا ثبوت دیتا ہوں اور پھر بعد میں تمیراً (احسان کے طور پر) آیات سے تائید کر دوں گا، سینے! اس شے کا نام ہے ”مجاہدہ نفس“ اور ”مخالفت نفس“ یہ بات بہت قابل قدر ہے، اس کو معمولی نہ سمجھئے، اب تجربہ سے اس کی ضرورت معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے کو سب لوگوں کو جی بھی چاہتا ہے، ترک الصلوٰۃ (چھوڑ دینا) سے ان کا دل بھی برا ہوتا ہے، مگر پھر بھی بہت لوگ نماز نہیں پڑھتے باوجود کہ سب کو عقیدہ فرضیت صلوٰۃ کا حاصل ہے، اسی طرح بعض ارادہ کر کے پڑھتے ہیں، مگر وہ ارادہ بعض عواقل (رکاوٹیں) سے مضطرب ہو کر موثر نہیں رہتا اور اس وجہ سے نماز پر دوام (پابندی) نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ صدور دوام اعمال کے لیے صرف اصلاح عقائد یا ارادہ ضعیف کافی نہیں ہے، بلکہ کسی اور شے کی ضرورت ہے جس کے بعد صدور دوام و رسوخ اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس ہے، چنانچہ بے نمازی اس واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اس کو آرام دیتا ہے، اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔

(المجاہدہ صفحہ: ۴۱)

پچاسواں اعتراض..... انبیاء علیہم السلام پر تکالیف آنے کی وجہ!  
اہل حق کا تو یہ مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، گناہوں سے پاک ہیں، حشویہ (ایک

فرقہ ہے) نے انبیاء کی قدر نہیں کی، وہ ان کو معصوم نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ حشو یہ کا یہ قول نقل کے خلاف تو ہے، ہی عقل کے بھی خلاف ہے، کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں، تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں، تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لیے انتخاب نہیں! یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے شخص کو نبوت کا عہدہ دے دیا جاتا ہے کہ اوروں کو تو قانون کا پابند بناویں اور خود قانون کے خلاف کریں؟ عقل کبھی اس کو باور نہیں کر سکتی؟ بس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی، بلکہ صورت مصیبت تھی، یہ محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے، میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں، جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو، تسلیم و رضا زیادہ وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گوسورت اس کی ہے، اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اور اسی معیار کو حضرات انبیاء و اولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء و اولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی، وہ غایت انقیاد و تنویض سے یوں کہتے تھے:

اے حریفان سلطہا را بست یار  
 آہوئے نیگم واو شیر شکار  
 غیر تسلیم و رضا کو چارہ  
 در کف شیر نر خونخوارہ

اور یوں کہتے:

ناخوش تو خوش بود بر جان من  
 دل فدائے یار دل رنجان من

### فرقہ حشو یہ کی حماقت

یہ حشو یہ کی حماقت ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے اوپر قیاس کر لیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے بشر ہیں، ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں، ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے اور ان کے مصائب میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے؟ اس قیاس فاسد ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے اور یہی تو وہ بات ہے کہ جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا، کیونکہ انہوں

نے انبیاء کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا، مولانا فرماتے ہیں:

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد  
کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد  
گفتہ ایک ما بشر ایشاں شد  
ماؤ ایشاں ہشتہ خوابیم و خور  
ایں ندانستند ایشاں از عملی  
درسیان فرقی بود بے منتہا  
کار پاکاں را قیاس از خود مکیر  
گرچہ مانند در نوشتن شیر و شیر

ایک شخص نے اس پیرایہ میں اضافہ کیا ہے:

شیر آل باشد کہ آدم می خورد  
شیر آل باشد کہ آدم را خورد

صاحبو! آغوش میں لینا دو طرح ہے، ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا، گودبانے والا حسین و محبوب ہی ہو، مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے، وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا، بھاگنا چاہے گا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو لے کر بغل میں دبائے اور زور سے دبائے اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے؟ کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا؟ ہرگز نہیں! بلکہ یوں کہے گا:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک میغث  
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں، ایک تو ان کو جو چور ہیں، ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں، چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت ہے:

خوشا وقت شورید گمان عمش  
اگر تلخ بیند و گر مرہمش  
گدایان از بادشای نفور  
بامیدش اندر گدائی صبور  
دمادم شراب الم در کشند  
اگر تلخ بیند دم در کشند

اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے، ایک حقیقت مصیبت ہے۔ حقیقت مصیبت تو واقعی گناہوں سے آتی ہے، مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے۔

(کبر الاموال صفحہ: ۱۴)

اکیا ونواں اعتراض..... جہلاء کی اس غلطی کا جواب کہ خیرات کی

ہوئی چیز بعینہ مردہ کو پہنچتی ہے!

بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لیے خیرات کیا کرتے ہیں، خاص کر وہ چیزیں جن سے مرنے والوں کو رغبت تھی، اس میں پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں اور وہ بہت دور پہنچے، انہوں نے اس عمل کے لیے ”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ“ سے استدلال کیا کہ انفاق محبوب شرعاً مطلوب ہے، پھر اس میں کیا حرج ہے کہ مرنے والے کا محبوب مرغوب خیرات کیا جائے، میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ”مِمَّا تَحِبُّونَ“ فرمایا ”مِمَّا تَحِبُّونَ“ نہیں فرمایا، پس خیرات کرنے والے کو اپنا محبوب خیرات کرنا چاہیے نہ کہ مردہ کا محبوب اور راز اس میں یہ ہے کہ اصل مدار فضیلت کا اخلاص ہے اور اپنے محبوب کے انفاق میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے محبوب کے انفاق میں، یہ تو ان کے استدلال کا جواب تھا۔

خیرات ہونے والی چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے

اب وہ دلیل بیان کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ جو چیز ہم خیرات کرتے ہیں، مردوں کو وہ بعینہ نہیں پہنچتی، بلکہ اس کا ثواب پہنچتا ہے، سنئے! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”لَنْ يَنَالَهُ اللَّهُ لِحُومِهَا وَلَا دِمَاقِهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ النَّفْسُ مِنْكُمْ“ اس میں صاف تصریح ہے کہ قربانی کا گوشت و خون خدا کے یہاں نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارا خلوص و اخلاص پہنچتا ہے اور اسی ہی کا تم کو ثواب پہنچتا ہے اور وہی ثواب مردوں کو پہنچا دیا جاتا ہے جب کہ ان کی طرف سے قربانی یا اور کوئی خیرات کی جائے اور اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ حرم کے شربت میں بھی عوام کے عمل کا بنتی ایسی خیال ہے کہ شہدائے کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے، اس لیے شربت پہنچانا چاہیے کہ پیاس بجھے، سوال تو یہی سمجھنا غلط ہے کہ ان کو یہ شربت پہنچتا ہے، شربت ہرگز نہیں پہنچتا، دوسرے یہ عمل عقیدت کے بھی خلاف ہے، کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ حضرات ابھی تک پیاسے ہیں یہ اعتقاد آپ ہی کو مبارک ہو ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ ان کو شہادت کے وقت ہی انشاء اللہ تعالیٰ شراب طہور کا وہ جام مل

چکا ہے جس سے پہلے بھی پیاس جاتی رہی اور آئندہ بھی جاتی رہی اور اس اعتقاد فاسد کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ محرم کا مہینہ سردیوں میں آتا ہے تو اس وقت بھی شربت ہی پلایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بہت سے لوگ بیمار ہو جاتے ہیں، کسی کو نمونیا ہو جاتا ہے، خدا بچائے ایسی پابندی رسم سے اور غور کر کے دیکھا جائے تو رسوم کی پابندی ہمیشہ بے سمجھے ہی ہوتی ہے۔ (دارالمسعود صفحہ: ۸)

## خیرات کی جانے والی چیزیں مردہ کو نہیں پہنچتی ہیں

جس کا مہنی یہ خیال ہے جو چیز خیرات کی جاتی ہے، مردہ کو وہی پہنچتی ہے، سو یہ خیال غلط ہے اور مردہ کی محبوب چیز خیرات کرنے کا مہنی یہ حسرت ہے کہ ہائے آج وہ ہوتا تو وہ بھی کھاتا جب وہ نہیں ہے تو لاؤ خیرات ہی کر دو، تاکہ اس کو پہنچ جائے، فشاء یہ ہے کہ ہم کو نعمائے جنت کا استحضار نہیں ہے، اگر ہم کو یہ بات متحضر ہوتی کہ وہ تو نعمائے جنت سے محظوظ و مسرور ہو رہا ہے تو یہ حسرت ہرگز نہ ہوتی، کیونکہ نعمائے جنت سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو کیا نسبت؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمائے جنت میں رمان (انار) نخل (کھجور) وغیرہ کا بیان فرمایا ہے کہ ان کو دنیا کے نخل و رمان پر قیاس نہ کیا جائے نعمائے دنیا سے محض اتنی مشارکت ہے، ورنہ حقیقت میں وہ اور چیزیں ہیں، برائے نام دونوں میں کچھ مشابہت ہے، اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے راجہ محمود آباد نے وکسٹرائے کی دعوت میں ایک انار تیار کر لیا تھا، جو دوسروں نے میں تیار ہوا تھا، اس کی صورت اور نام تو انار کا تھا مگر حقیقت میں وہ اور چیز تھی، خود قرآن شریف میں ارشاد: ”قَوِّرُوا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوا هَاتِقْدِيْرًا“ کہ جنت میں چاندی کے شیشے ہوں گے یعنی جن میں آئینہ کی سی شفافی اور صفائی ہوگی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی چیزیں دنیا کی چیزوں سے صرف نام میں مشابہ ہیں، ورنہ وہاں کی چاندی آئینہ کی طرح شفاف ہوگی، جس میں نگاہ آ رہا ہو جائے گی دنیا کی چاندی میں یہ بات کہاں؟ تو اب تم اس تمنا میں ہو کہ مردے یہاں ہوتے اور مردے اس تمنا میں ہی ہیں کہ تم وہاں ہوتے خدا جانے یہاں رکھا ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں؟

زر و نقرہ چیست تا منتوں شوی

چیت صورت تا چنیں مجنوں شوی

## حوریں اور ان کے دوپٹے

وہاں کی نعمتوں کو حدیث سے معلوم کرو، حدیث میں آتا ہے کہ حوروں کے سر پر ایسی نفیس خوبصورت اوڑھنیاں ہیں کہ اگر ان کا ایک پلہ دنیا میں لٹک جائے تو آسمان کے چاندی و سورج مانند

پڑ جائیں وہاں کی حوریں ایسی حسین ہیں کہ ستر جوڑوں کے نیچے سے ان کا بدن جھلکتا ہے، جنت کی مٹی جو ہرات اور مشک کی ہے۔

### حوض کوثر کا پانی

حوض کوثر کے پانی کی تعریف یہ ہے: ”من شرب منه شربة لا يظلمها بعدها ابدا“ جس نے اس میں سے ایک دفعہ پانی پی لیا، اس کو کبھی پیاس ہی نہ لگے گی اور لطف یہ کہ بدون پیاس کے بھی اس کی رغبت ہوگی اور اس کا لطف حاصل ہوگا، دنیا کے پانی میں پیاس کے وقت تو مزہ آتا ہے، بدون پیاس کے مزہ نہیں آتا، جنت کے پانی کی یہ شان ہے کہ ایک دفعہ پی کر عمر بھر کے لیے پیاس کی کلفت دفع ہو جائے گی اور بدون پیاس کے اس کا مزد حاصل ہوگا، تلاؤ! دنیا میں ایسا پانی کہاں ہے؟ جس سے پیاس ہی نہ لگے اور بدون پیاس کے اس سے مزہ آئے، اس پر تمام نعمتوں کو قیاس کر لو کہ نعمتِ جنت کو دنیا کی لذتوں سے محض نام کی مشارکت و مشابہت ہے، اب یہ حیرت کرنا کہ ہمارے مرد عزیز دنیا میں ہوتے اور یہاں کی نعمتوں سے متلذذ ہوتے، سراسر حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ ارے ان نعمتوں کو ان کے سامنے رکھو تو شاید ان کو تے آنے لگے۔ (ایضاً صفحہ: ۱۰)

باوواں اعتراض ..... اس شبہ کا جواب کہ مشائخ بعض مرتبہ نااہل کو

### خليفة کر دیتے ہیں!

جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اجازت کے وقت اہل ہو، پھر نااہل ہو گیا ہو اور ایسا ہونا مستبعد نہیں، اسی لیے عقائد کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے، ایک تو یہی کہ ”السعيد قد يشقى“ نیک آدمی کبھی شقی بھی ہو جاتا ہے اور یہ اہل سنت کے عقائد میں داخل ہے۔ (العبدالربانی صفحہ: ۲۵)

تو یہ امر موجب اعتراض نہیں، کیونکہ ممکن ہے اجازت کے وقت وہ اہل ہی ہو، بعد میں شقی ہو گئے ہوں اور یہ ”الوصول لا یرد“ کے خلاف نہیں، کیونکہ اس مسئلہ میں واصل فی الواقع مراد ہے نہ فی زعم الشيخ، باقی الواصل لا یرد کا قاعدہ واقع کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، بخاری کی ایک حدیث میں ہرقل کا قول مذکور ہے ”و کذا لک الایمان اذا خالط بشاشة القلوب“ کہ ایمان کی حلاوت جب قلب میں بیوستہ ہو جاتی ہے تو ارتداد ممکن نہیں، اس قول کو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بلا تکثیر نقل فرمایا ہے کسی نے اس پر کلام نہیں کیا، پس تقریر صحابہ رضی اللہ علیہم اجمعین سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا دوسرا جواب اس اعتراض کا اور



ہے جو لطیف بات ہے اور اس مقام پر اسی کو ذکر کرنا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ مشائخ بعض دفعہ کسی نا اہل میں حیاء و شرم کا مادہ دیکھ کر اسے اس امید پر مجاز کر دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کی تربیت کرے گا، تو اس کی لاج اور شرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے گا، یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائے گا، پھر بعض نا اہل شیخ کی اس امید کو غلط کر دیتے ہیں، مگر ایسے کم نکلتے ہیں، غالب حالت یہی ہے کہ جس میں حیاء و شرم کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی تربیت کرتے ہوئے اپنی اصلاح بھی ضرور ہی کرتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۶)

ترپنواں اعتراض..... اس اعتقاد کی تردید کہ نجات آخرت ہمارے

### اختیار سے باہر ہے!

یہ اعتقاد بالکل غلط ہے اور صراحتاً نصوص کے خلاف ہے، گو اس مخالفت نصوص پر جو جہل کی وجہ سے ہے، میں ان لوگوں پر کفر کا فتویٰ تو نہیں دیتا، مگر جہل شدید ضرور کہا جائے گا، قرآن میں نصوص بھری ہوئی ہیں، جن سے نجات آخرت کا داخل اختیار ہونا صاف معلوم ہوتا ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ”سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ“ جس میں مسابقت الی الجنت کا امر ہے اگر جنت میں جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو حکم ”سابقوا“ کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ اختیاری امور ہی کا مکلف فرمایا کرتے ہیں، غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں فرمایا کرتے نص موجود ہے! ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ شاید یہ شبہ ہو کہ جنت و دوزخ ہم کو تو نظر نہیں آتی جو اس میں کوہ کر پہنچیں، یا کوہ کر باہر نکل جائیں، یا دور بھاگ جائیں، پھر اس کی طرف سبقت کس طرح کی جائے؟ یا دوزخ سے کیونکر بچا جائے۔

### فعل اختیار کے دو معنی ہیں

تو سمجھ لیجئے کہ کسی فعل کے اختیاری ہونے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ بلا واسطہ اختیاری ہو، جیسے کھانا کھانا اختیاری ہے، پانی پینا اختیاری ہے، دوسرے یہ کہ بواسطہ اختیاری ہو، یعنی اس کے اسباب اختیاری ہوں، جیسا کہ خورجہ سے دہلی پہنچ جانا اور کلکتہ سے ممبئی پہنچ جانا، اس معنی پر اختیاری ہے، کیونکہ یہاں سے ممبئی کوہ کر کون پہنچ سکتا ہے؟ لیکن پھر بھی اس کو اختیاری کہا جاتا ہے جس کے یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں، یعنی مسافت قطع کرنا اور غور کر کے دیکھا جائے تو

زیادہ انعام اختیار یہی اسی دوسری قسم کے ہیں، مثلاً نکاح کر کے بچہ، جوانا، زراعت سے غلہ حاصل کرنا تجارت سے نفع حاصل کرنا اختیار ہی ہے، تو کیا ایسا اختیار ہی ہے کہ آپ بلا واسطہ جب چاہیں حاصل کر لیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس معنی کو اختیار ہی ہے کہ اسباب اختیار میں ہیں، اسباب کو اختیار کرو، امید ہے کہ مسبب حاصل ہو جائے گا۔

### جنت میں جانا اختیار ہی ہے

پس جنت میں جانا بھی اس معنی پر اختیار ہی ہے کہ اس کے اسباب آپ کے اختیار میں ہیں، قرآن وحدیث کو دیکھو! معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ نے دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کے لیے اسباب و تدابیر بتلائی ہیں، ان کو اختیار کرو پس خدا تعالیٰ تم کو جنت میں پہنچائیں گے اور دوزخ سے بچا دیں گے، چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے: "وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ" اس سے معلوم ہوا کہ کفر موجب دخول نار ہے اور "وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَحَنَّةٍ غَرَضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ" کے بعد ارشاد ہے: "أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ" اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ موجب دخول جنت ہے، پھر تقویٰ کی تفصیل قرآن پاک میں جا بجا مذکور ہے، چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے: "الَّذِينَ يُتَّقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" اس میں انفاق و تطہیم غیظ (غصہ لی جانا) وغنموا احسان کا بیان ہے۔

### تقویٰ کا بیان

دوسری جگہ مذکور ہے:

"لَيْسَ الْبِرَّان تَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مِنْ اَمْنٍ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَالْاَمَلِ اِيْمَةً وَالْكِتَابِ وَالسَّبِيْحِ وَاَتَى الْعَمَالَ عَلٰى حُبِّهِ ذَوٰى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى  
وَالْمَسْكِيْنِ وَاِنَّ السَّبِيْلَ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاَتَى الزَّكٰوةَ  
وَالْمَوْفُوْنَ بَعْدَهُمْ اِذَا عَاهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبٰسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبٰسِ اُولٰٓئِكَ  
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ"

اس میں تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے، جس میں اول محض صورت بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے "دل علیہ قولہ" لیس البر ان تولوا ووجوهکم" الیٰ احدہ جیسا کہ منافقین و یہود نے تجویل قبلہ کی گفتگو کا شغل بنا لیا تھا، اس کے بعد ایمان باللہ و ایمان بالمعاد اور

ایمان بالمالائکہ اور ایمان بکتاب سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے تو یہ اعتقاد دیات کے متعلق ہے۔ پھر جب مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے (یا محبت البیہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے) یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے، پھر اقامت صلوٰۃ کا امر ہے، یہ طاعت دنیہ ہے، پھر ایثار و زکوٰۃ، یہ طاعت مالیہ ہے اور اوپر جو ایثار مال کا ذکر ہوا ہے، وہ انفاق تطوع ہے، جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے: "ان فی المال لحقاً سوسى الزکوٰۃ، ثم تلا الاية" (اور علیؑ جب اس کا قرینہ بھی ہے، کیونکہ اگر اس کا مربع مال ہے تو مال کے ازالہ کے لیے فقط ایثار و زکوٰۃ کافی نہیں، کچھ زائد انفاق کرنا چاہیے اور اگر اللہ مربع میں تو جب الہی کا مقتضی بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے) اس کے بعد ایفاء عہد کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے، پھر صبر کا امر ہے، جو سلوک کے متعلق ہے، غرض اس میں تمام شعبہ تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا گیا ہے، اس لیے "اولئک ہم المتقون" پر اس کو ختم فرمایا ہے، تو اب بتلائے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تدابیر بتلائی ہیں یا نہیں؟ اور یہ تدابیر اختیار ہی ہیں یا نہیں؟ تو اب جنت میں جانا اختیاری ہوا یا نہیں؟ رہا یہ کہ تدابیر تو حق تعالیٰ نے بتلائی ہیں، مگر ان پر عمل کرنا اور اس کا بجالانا مشیت پر موقوف ہے، بدون مشیت کے کچھ نہیں ہو سکتا، تو بے شک یہ ہمارا عقیدہ ہے، مگر اس میں جنت و دوزخ ہی کی کیا تخصیص ہے؟ دنیا کے بھی سب کام مشیت ہی پر موقوف ہیں، کبھی کرنا، ملازمت کرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے! پھر ان کے لیے کیوں سعی کی جاتی ہے؟ وہاں تو یہ کہا جاتا ہے:

رزق ہر چند یگماں برسد

لیک شرط است جتن ازدا

اور مرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے، پھر سانپ بچھو وغیرہ سے کیوں حفاظت کی جاتی ہے؟ اس کے متعلق یوں کہتے ہیں:

اگرچہ کس بے اجل نہ خواہد مرد

تو مرد در دہان ازدا

توکل اور اس کی حقیقت

یہ کیا کہ سارا توکل امور آخرت ہی میں صرف کیا جاتا ہے؟ اگر بڑا توکل کا دعویٰ ہے تو پہلے دنیاوی امور میں بھی کیا ہوتا! میں توکل کو منع نہیں کرتا، بلکہ آپ کی غلطی ظاہر کرتا ہوں کہ جس کو آپ نے توکل سمجھا ہے، وہ توکل نہیں ہے، توکل کے یہ معنی نہیں کہ اسباب و تدبیر کو قطعاً ترک کر دیا

جائے، بلکہ طریقہ حقیقی یہ ہے کہ تدبیر و تقدیر دونوں کو ملایا جائے، یعنی کام کر کے توکل کرنا چاہیے:

گر توکل می کنی دو کارکن

کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

دنیا میں ہم یہی کہتے ہیں کہ کھتی کر کے شرہ کے متعلق خدا تعالیٰ پر نظر رکھو، خلاصہ یہ ہے کہ عمل میں تو اسباب کو اختیار کرو اور شرہ میں توکل کرو، چنانچہ دنیوی معاملات میں سب کا یہی طرز ہے، مگر نہ معلوم یہ تجربہ کیسا ہے کہ امور اخرویہ میں عمل اور شرہ دونوں میں توکل سے کام لیتے ہیں؟ حالانکہ وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جو معاملات دنیا میں اختیار کر رکھا ہے، ورنہ دونوں میں فرق بتلانا چاہیے! بلکہ اگر غور کیا جائے تو دنیا و آخرت کا فرق اس کو متفقہی ہے کہ مقاصد دنیویہ میں تو ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی گنجائش ہے اور مقاصد اخرویہ میں ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی مطلقاً گنجائش نہیں، کیونکہ توکل یعنی ترک اسباب کی حقیقت ہے، ترک اسباب منظور نہ غیر مامور بہا یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترک عادت یقینی و قطعی نہ ہو اور شرعاً وہ واجب بھی نہ ہوں، ان کو ترک کر دیا جائے، باقی جن اسباب پر عادتاً مسببات کا ترک یقینی ہے، ان کا ترک جائز نہیں اور نہ اس کو توکل کہا جائے گا کہ بھوک کی حالت میں آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں کہ اللہ میاں منظور ہوگا تو جھٹ خود بخود ہو جائے گا، اگر یہ شخص بھوکا مر گیا تو عاصی ہوگا اور اسباب منظور نہ کا ترک بھی اس کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو اور اس کے اہل و عیال بھی، یا اس کے اہل و عیال ہی نہ ہوں اور ضعیف الہمت ہو یا جس کے عیال ضعیف ہوں، اس کو ان کا بھی ترک جائز نہیں، اسی طرح اسباب مامور بہا کا ترک توکل نہیں۔

## آخرت کے لیے سعی کرنا

جب توکل کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اب سوچئے کہ ثمرات آخرت کے لیے جو اسباب شریعت نے بیان کیے ہیں، وہ کیسے ہیں؟ آیا مامور بہا ہیں، یا نہیں؟ سوظاہر ہے کہ مامور بہا ہیں اور نیز آیا ان پر مسبب کا ترتب کا شرعاً ضروری ہے یا مظنون (خیال)؟ تو نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب آخرت پر ترتب مسبب لازم ہے، چنانچہ ارشاد: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنْ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْهَى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَاؤُ لَيْكَ بِدُخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يَبْظَلُمُونَ نَفْسًا

اور ارشاد ہے:

”فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ“

اور بہت سے نصوص ہیں جن میں اعمال آخرت کے متعلق صریح وعدہ ہے کہ جزا ضرور مرتب

ہوگی اور دنیا کے متعلق نہ وعدہ ہے، نہ اکثر اسباب میں ترتب ضروری ہے، گو ہر چیز کے لیے اسباب موجود ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے: ”مَا جَعَلَ اللَّهُ دَاءَ إِلَّا جَعَلَ لَهُ دَوَاءً“ اور اسی واسطے تدبیر مشرور ہے، مگر ان پر شرہ مرتب ہونے کا حق تعالیٰ کی طرف سے وعدہ نہیں ہے، اس لیے کبھی تخلف بھی ہو جاتا ہے کہ کبھی کرتے ہیں اور پیدا نہیں ہوتی، دوا کرتے ہیں اور شفاء نہیں ہوتی اور نہ اس پر عادت ترتب اثر ضروری ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ بدون دوا کے صحت نہ ہو سکے، یا جب دوا کی جائے تو صحت ضروری ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ بدون دوا کے صحت نہ ہو سکے، یا جب دوا کی جائے تو صحت ضرور ہو جائے، بخلاف اعمال آخرت کے کہ ان کو ثمرات کے ساتھ علیت و شرطیت دونوں کا علاقہ ہے، گو یہ علیت و شرطیت عقلی نہ ہو، شرعی ہی ہو تو لزوم ترتب میں اعمال آخرت کی سبب کی وہ حالت ہے جو دنیا میں اسباب قطعہ یقینیہ کی حالت ہے، جن پر عادت ترتب اثر ضروری ہے، جیسے اکل پر شبع (آسودگی) کا اور شرب پر ری (سیرابی) کا مرتب ہونا، بلکہ وعدہ وعدم وعدہ کے تقاضا سے اعمال آخرت ان اسباب سے بھی الصق (زیادہ چپکنے والے) ہیں، پس جیسے ان اسباب کو دنیا میں ترک کرنا جائز نہیں، یہی حکم جملہ اسباب آخرت کا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ترک جائز نہیں، کیونکہ وہ سب اسباب قطعہ یقینیہ ہیں، جن پر ترتب اثر کا بعض میں وعدہ بھی ہے، پھر حیرت ہے کہ جن اسباب پر ترتب اثر کا وعدہ بھی نہیں، وہاں تو چھوٹی سے چھوٹی تدبیر سے بھی دریغ نہیں اور جہاں ترتب شرہ کا وعدہ ہے کہ تخلف کا احتمال ہی نہیں، وہاں تو کل اختیار کر لیا ہے، پس دنیا و آخرت کے فرق پر نظر کی جائے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ دنیا کے تو بعض اسباب میں توکل جائز پھر اور آخرت کے کسی سبب میں بھی جائز نہ ہو یہ تو اسباب کا حکم تھا، رہے مسببات اور ثمرات تو ان میں مطلقاً توکل واجب ہے، خواہ ثمرہ دنیا میں یا ثمرہ آخرت میں، یعنی ثمرات کو اسباب کا نتیجہ نہ سمجھے، خدا تعالیٰ کی عطا سمجھے خوب سمجھ لو.....!!

(دواء الغفار صفحہ ۱۰)

چونواں اعتراض..... اختلاف رویت کی صورت میں روزہ کونسی

تاریخ کا افضل ہوگا؟

خوب سمجھ لو کہ تمہارا یہی خیال غلط ہے کہ ثواب کے اعتبار سے بھی پندرہ ایک ہی ہوگی، گو حساب میں پندرہ ایک ہو، مگر حق تعالیٰ کسی خاص مکان یا زمانہ میں ایک فضیلت پیدا کر کے اس کے پابند نہیں ہو جاتے کہ دوسرے مکان میں یا زمانہ میں اس کی فضیلت کو پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ ہر جگہ

ہر رات اور ہر دن میں اس کی فضیلت کو پیدا کر سکتے ہیں، رہا یہ کہ امکان سے وقوع تو لازم نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری نصوص سے اس کا وقوع بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ ایسا ہی کرتے ہیں کہ جو برکت ایک تاریخ میں تمہارے واسطے ہے، وہی برکت دوسروں کے لیے دوسری تاریخ میں پیدا کر دیتے ہیں، جس کو وہ اپنی تحقیق کے موافق پندرہ سمجھتے ہیں خدا تعالیٰ کو برکت کا ایک رات سے دوسری رات میں منتقل کر دینا کیا مشکل ہے؟ ان کی شان تو یہ ہے کہ ”وَلَوْلَا الَّذِي سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٌ“ کہ حق تعالیٰ گناہوں کو حسن بنا دیتے ہیں اور جرم کو طاعت کر دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے دریافت فرمائیں گے کہ کیوں تو نے ایسا کیا تھا؟ تو نے فلاں گناہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ اول چھوٹے چھوٹے گناہوں کو گناہوں میں گنوا لیں گے، بندہ سب کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگیں گناہوں کا تو ذکر ہی نہیں ہوا، دیکھئے! ان پر کیسی گرفت ہو؟ مگر حق تعالیٰ کبائر کے ذکر سے پہلے ہی فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دے اب بندہ خود اپنے گناہ گنوائے گا کہ الہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کیے ہیں، ان کا یہاں ذکر ہی نہیں آیا، مجھے اس کے عوض بھی نیکیاں دلوائیے، یہ آخرت میں ہوگا اور دنیا میں ”يُبدل اللہ سيئاتهم حسنات“ کا مصداق یہ ہے کہ ملکات سینات کو مبدل بہ ملکات حسنات کر دیتے ہیں، بخل کو سخاوت سے اور جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں اور حسنات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو خون کر دیتے ہیں جیسا کہ قوم فرعون پر عذاب دم مسلط ہوا تھا اور خون کو دودھ بنا دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے کبریٰ کے پستان میں مشاہدہ ہے تو اگر وہ ایک تاریخ کی برکت دوسری تاریخ میں بھی رکھ دیں تو کیا بعید ہے؟ مولا نا فرماتے ہیں:

گر بنواہد عین غم شادی شود

عین بند پائے آزادی شود

کیما داری کہ تبدیلیش کنی

گرچہ جوئے خون بود تبدیلیش کنی

واقعی حق تعالیٰ سے زیادہ کیما بنانے والا کون ہوگا؟ جب تم کو کیما وی تدابیر سے تانے کو سونا اور رنگ کو چاندی بنا دیتے ہو تو وہ پتھر کو سونا بنا دیں تو کیا بعید ہے؟ اور واقعی بھی یہی ہے، کیونکہ سونا چاندی اور سب دھاتیں زمین ہی سے نکلتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس مٹی ہی سے کیا کیا بنا دیا.....!!!

جس کے یہاں جو تاریخ ثابت ہو، وہی برکت ہے

رہا یہ کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ اس کے لیے دوسری نصوص موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بہتی اور ہر شہر کے لیے اسی تاریخ میں برکت ہے، جو ان کے حساب سے پندرہ تاریخ ہے، حدیث میں ہے:

”الصوم يوم تصومون، و الفطر يوم تفطرون و الاضحى يوم تضحون“

”روزہ اسی دن کا ہے جس دن تم روزہ رکھو اور عید الفطر کا وہی دن ہے، جس دن تم عید الفطر مناؤ“

اور عید الاضحیٰ اسی تاریخ کو ہے جس دن تم قربانی کرو۔“

اس کا مطلب حضرت استاد نے یہ فرمایا کہ جس تاریخ میں تم اپنی تحقیق کے موافق روزہ شروع کرو، یا تحقیق کر کے روزہ ختم کرو، تو خدا کے نزدیک وہی روزہ اور افطار کی تاریخ ہے، یعنی جو ثواب اور برکت ماہ رمضان و عید الفطر و عید الاضحیٰ کے دن میں رکھی گئی ہے، ہر شہر کے مسلمانوں کو ان ایام میں حاصل ہوگی جو ان کے نزدیک رمضان وغیرہ کی تاریخیں ہیں، لہذا تم اپنی تحقیق کے موافق جس دن کو پندرہ شعبان سمجھ کر روزہ رکھو گے، وہی معتبر ہے اور اس دن سے پہلے رات تمہارے لیے پندرہویں رات ہے، اختلاف تاریخ سے شبہ میں نہ پڑو۔ (الیسر مع الیسر صفحہ: ۳۷)

چھپنواں اعتراض..... عورتوں کے اس عمل کی تردید کہ گھر میں میلی

کچیلی رہتی ہیں اور باہر زیب و زینت کے ساتھ!

جو عورتیں اپنی راحت کے لیے یا اپنے خاوند کا جی خوش کرنے کے لیے قیمتی کپڑا یا زیور پہنتی ہیں، ان کو تو گناہ نہیں ہوتا اور جو محض دکھاوے کے لیے پہنتی ہیں، وہ گنہگار ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ذلیل و خوار بھنگنوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں تقریب میں نکلیں گی، نواب کی بچی بن کر جائیں گی، جیسے لکھنؤ کے مزدور دن بھر تو لنگوٹا باندھ کر مزدوری کریں گے اور شام کو کرائے کے کپڑے پہن کر جیب میں دو پیسہ ڈال کر نکلتے ہیں جن میں سے ایک پیسہ کا تو پان کا بیڑا لیں گے اور ایک پیسہ کا پھولوں کا گچرا گلے میں ڈالیں گے جیسے کسی نواب کے بیٹے ہوں، اب عورتیں دیکھ لیں کہ یہ جوڑے بدل بدل کر جاتی ہیں، اس میں ان کی نیت کیا ہے؟ اگر اپنی راحت اور دل کی خوشی ہے تو گھر میں اس ٹھاٹھ سے کیوں نہیں رہتیں؟ بعض کہتی ہیں کہ ہم تو اپنے

خاندان کی عزت کے لیے عمدہ جوڑا پہن کر نکلتی ہیں اگر اس تاویل کو مان لیا جائے تو پہلی دفعہ ایک چھوٹا تم نے تقریب کے لیے نکالا تھا، خاندان کی عزت کے لیے تمہارے خیال میں وہی کافی تھا۔

اب دیکھو کہ اگر تقریب میں پے در پے دو تین دن جانا ہو جائے تو تم تینوں دن اسی ایک جوڑے میں جاؤ گی، یا ہر دن نیا جوڑا بدلو گی؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر دن جوڑا بدلا جاتا ہے، آخر کیوں؟ خاندان کی عزت کے لیے ایک ہی کافی تھا، مگر نہیں! ہر دن نیا جوڑا بدلتی ہیں، اس لیے کہ ایک جوڑے میں ہر دن نہیں جاسکتیں اور اگر کچھ نہ بدلیں گی تو دوپٹہ ضرور ہی بدل لیں گی، تاکہ ہر دن نیا جوڑا معلوم ہو، پھر محفل میں بیٹھ کر ان کو زیور دکھلانے کی حرص ہوتی ہے، بعض تو اسی غرض کے لیے ننگے سر رہتی ہیں تاکہ سب کو سر سے پیر تک کا زیور نظر آ جائے اور جوان میں سے مولوں ہیں، وہ ننگے سر تو نہیں رہتیں، مگر کسی نہ کسی بہانے سے وہ بھی اپنا زیور دکھلا دیتی ہیں کہیں سر کھلاتی ہیں، کہیں کان کھلاتی ہیں، یہ ریا ہے اور اس غرض سے قیمتی کپڑا یا زیور پہننا حرام ہے، ایک مرض تو عورتوں میں یہ ہے کہ جب یہ کہیں محفل میں جاتی ہیں تو سب کے لباس اور زیور کو سر سے پیر تک تاک لیتی ہیں، تاکہ دیکھیں کہ ہم سے تو کوئی زیادہ زیور نہیں رکھتی ہے اور ہم کسی سے گھٹے ہوئے تو نہیں ہیں، یہ بھی اس ریا اور تکبر کا شعبہ ہے، یہ مرض مردوں میں کم ہے اور اگر دس آدمی ایک جگہ مجتمع ہوں تو مردوں میں سے ایک کسی کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کس کا لباس کیسا ہے؟ اس لیے مجلس سے اٹھ کر وہ کسی کے لباس کا حال بیان نہیں کر سکتے اور عورتوں میں سے ہر ایک کو یاد رہتا ہے کہ کس عورت کے پاس کتنا زیور تھا؟ اور لباس کیسا تھا؟ یاد رکھو! اس غرض سے قیمتی لباس پہننا جائز نہیں۔

(غریب الدین صفحہ: ۲۹)

چھپنواں اعتراض..... مردوں کی کوتاہی کہ عورتوں کے دینی امور

اپنے ذمہ نہیں سمجھتے!

وہ اپنے ذمہ صرف دنیوی حقوق سمجھتے ہیں، دینی حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہمارے ذمہ ان کے دین کا بھی کوئی حق ہے، مثلاً گھر میں آ کر یہ تو پوچھتے ہیں کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں؟ مگر یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ تم نے نماز بھی پڑھی یا نہیں اگر کھانے کے لیے گھر میں آئے اور معلوم ہوا کہ ابھی تیار نہیں، تو خفا ہوتے ہیں یا تیار تو ہو گیا، مگر مرضی کے موافق تیار نہیں ہوا، تب بھی خفا ہوتے ہیں، اگر کبھی یہ معلوم ہوا کہ بیوی نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی، تو ان کو ذرا بھی ناگواری نہیں ہوتی، نہ بیوی پر خفا ہوتے ہیں بلکہ اگر کسی کی بیوی عمر بھر بھی نماز نہ پڑھے، تو بہت سے مردوں کو اس کی بھی پرواہ



نہیں ہوتی اور جو کبھی کسی کو خیال بھی ہوتا ہے تو یہ وہ ہیں جو دیندار کہلاتے ہیں اور وہ بھی یوں ہی چلتی سی بات کہہ دیتے ہیں کہ بی بی نماز پڑھا کرو، نماز کا ترک کرنا بڑا گناہ ہے، بس اتنا کہہ کر اپنے نزدیک سبکدوش ہو گئے اور جب کسی نے ان سے کہا کہ تم اپنی بیوی کو نماز کے لیے تنبیہ کیوں نہیں کرتے؟ تو یہ جواب دیتے ہیں کہ کہہ تو دیا تھا، اب وہ نہیں پڑھتی تو میں کیا کروں؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ انصاف سے بتلائیے! کیا آپ نے نماز کے لیے اسی طرح کہا تھا جیسے نمک تیز ہونے پر کہا تھا؟ اور اگر ایک دو دفعہ کے کہنے سے اس نے نمک کی درستی کا اہتمام نہ کیا ہو تو کیا وہاں بھی آپ ایسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں، جیسے نماز کے لیے ایک دو دفعہ کہہ کر خاموش ہو گئے؟ ہرگز نہیں! نمک تیز ہونے پر تو آپ سر توڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں، ایسی بری طرح خفگی ظاہر کرتے ہیں کہ بی بی سمجھ جاتی ہے کہ میاں بہت ناراض ہیں، اس لیے وہ بہت جلد نمک کی اصلاح کا اہتمام کرتی ہے، صاحبو! نماز کے لیے آپ نے اس طرح کبھی نہیں کہا، جس سے بی بی سمجھ جائے کہ میاں ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر یہاں بھی اسی طرح خفگی ظاہر کرتے تو وہ اس کا بھی ضرور اہتمام کرتی اور اگر ایک دفعہ کے کہنے سے نہ پڑھتی تو دوسرے وقت پھر خفا ہوتے، پھر نہ پڑھتی تو تیسرے وقت پھر کہتے اور جب تک وہ نماز نہ پڑھتی برابر کہتے رہتے اور مختلف طریقوں سے اپنی خفگی ظاہر کرتے مثلاً پاس لیٹنا ترک کر دیتے، اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا دکھاتے، جیسا کہ نمک کی تیزی پر اگر ایک بار خفا ہونے سے اثر نہ ہوا تو آپ خاموش نہیں ہو جاتے، بلکہ برابر کہتے رہتے ہیں اور وہاں کتنی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اتنی دفعہ تو کہہ دیا ہے، اب بھی وہ نہیں مانتی تو میں کیا کروں؟ بس خاموش ہو جاؤں! صاحبو! انصاف سے بتلائیے! کہ ہم نے کبھی کھانے پینے کے باب میں اپنے جی کو اسی طرح سمجھا لیا ہے، جیسا نماز کے باب میں سمجھا لیا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ تو سراسر کوتاہی ہے۔ اگر آپ بی بی کو نمازی بنانا چاہیں تو کچھ دشوار بات نہیں، کیونکہ عورت حاکم نہیں محکوم ہے، چنانچہ اپنی غرض کے لیے ان پر حکومت کی بھی جاتی ہے، مگر دین کے لیے اس حکومت سے ذرا کام نہیں لیا جاتا۔

(حقوق البیت صفحہ: ۶)

ستا و نواں اعتراض..... زنانہ اسکول کا قیام عورتوں کے لیے زہر قاتل ہے!

بعض آدمی اپنی لڑکیوں کو آزاد بے باک عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں، یہ تجربہ ہے کہ ہم صحبت کے اخلاق و جذبات کا آدمی میں ضرور اثر آتا ہے، خاص کر جب وہ شخص ہم صحبت ایسا ہو کہ متبوع و معظم بھی ہو اور ظاہر ہے کہ استاد سے زیادہ ان خصوصیات کا کون جامع ہوگا؟ تو اس صورت میں وہ آزادی و بے باکی ان لڑکیوں میں بھی آئے گی اور میری رائے میں سب سے بڑھ کر عورت کا حیا

اور انقباض طبعی ہے اور یہی مفتاح (کنجی) ہے تمام خیر کی جب یہ نہ رہا تو اس سے پھر نہ کوئی خیر متوقع ہے، نہ کوئی شر مستبعد ہے، ہرچند کہ ”اذا فسانك الحيا فافعل ما شئت“، یعنی جب تجھ سے حیا جاتی رہے تو کر جو جی چاہے! حکم عام ہے، لیکن میرے نزدیک ”ما شئت“ کا عموم نساء کے لیے یہ نسبت رجال کے زیادہ ہے، اس لیے مردوں میں پھر بھی عقل کس قدر مانع ہے اور عورتوں میں اس کی بھی کمی ہوتی ہے، اس لیے کوئی مانع ہی نہ رہے گا، اسی طرح اگر استانی ایسی نہ ہو، لیکن ہم سبق اور ہم مکتب لڑکیاں ایسی ہوں، تب بھی اس کے قریب مضرتیں واقع ہوں گی۔

### موجودہ زمانہ میں اسکول کا حال

اس تقریر سے دو جزئیوں کا حال بھی معلوم ہو گیا ہوگا، جن کا اس وقت بے تکلف شیوع ہے، ایک لڑکیوں کا عام زمانہ اسکول بنانا اور مدارس عامہ کی طرح اس میں مختلف طبقات اور مختلف خیالات کی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا، گو مغلہ مسلمان ہی ہو اور یہ آنا ڈولیوں ہی میں ہو اور گویہاں آ کر پردہ ہی کے مکان میں رہنا ہو، تاہم واقعات نے دکھلایا ہے اور تجربہ کر دیا ہے کہ یہاں ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ جن کا ان کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ صحبت اکثر عفت سوز ثابت ہوتی ہے اور اگر استانی بھی کوئی آزاد یا مکار مل گئی تو کریلہ اور یشم پڑھا کی مثال صادق آ جاتی ہے اور دوسری جزئی یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم سے بھی روزانہ یا ہفتہ وار انگریزی تعلیم یا سکھلانے کے بہانے سے اختلاط ہونے لگا، تب تو نہ آبرو کی خیر ہے، نہ ایمان کی، مگر افسوس ہے کہ بعض لوگ ان آفات کو مایہ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں، میرے نزدیک تو آفات مجسمہ سے بچی تو بچی اور تابع ہو کر تو کیا ذکر کسی بڑی بڑھی مسلمان عورت کا متبوع ہو کر بھی عمر بھر میں ایک بار ہم کلام ہونا بھی خطرناک ہے، جن مضرتوں کے ذکر کا اوپر وعدہ تھا ان میں سے بعض یہی ہیں۔

### لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ

اسلم طریق لڑکیوں کے لیے یہی ہے جو زمانہ دراز سے چلا آتا ہے کہ دو، چار، چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آئیں اور پڑھیں اور حتی الامکان اگر ایسی استانی مل جائے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت اور بااثر ثابت ہوئی ہے اور بدرجہ مجبوری اس کا بھی مضائقہ نہیں کہ استانی تنخواہ سے ملے اور جہاں کوئی ایسی استانی نہ ملے، اپنے گھر کے مرد پڑھادیا کریں تو پڑھانے کا تو یہ طرز ہو اور نصاب تعلیم یہ ہو کہ اول قرآن مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جائے پھر کتب دینیہ سہل زبان کی جن میں تمام اہواز دین کی مکمل تعلیم ہو، میرے نزدیک اس وقت بہشتی زیور کے دسوں حصے

ضرورت کے لیے کافی ہیں اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرمناک ہوں ان کو چھپوراز ہے اور اپنی بی بی کے ذریعہ سے سمجھا دے اور اگر یہ نظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کر دے تاکہ ان کو یہ مقامات محفوظ رہیں، پھر وہ سیانی ہو کر خود سمجھ لیں گی، یا اگر عالم شوہر میسر ہو تو اس سے پوچھ لیں گی، یا شوہر کے ذریعہ سے کسی عالم سے تحقیق کرائیں گی، چنانچہ بندہ نے بہشتی زیور کے دستور العمل میں جو مسائل پر مطبوع ہوا ہے، اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔

### خصوصی مسائل

مگر بعض لوگ اس کو دیکھتے نہیں اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد پڑھانے لگے تو ایسے مسائل کس طرح پڑھائے؟ اس لیے ان کا لکھنا ہی کتاب میں مناسب نہ تھا، کیسی کیسی سمجھ ہے؟ بہشتی زیور کے اخیر میں مفید رسالوں کا نام بھی لکھ دیا ہے، جن کا پڑھنا پڑھانا اور مطالعہ عورتوں کو مفید ہے۔ اگر سب نہ پڑھیں تو ضروری مقدار پڑھ کر باتوں کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں اور تعلیم کے ساتھ ان کے عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا بھی انتظام رکھیں کہ ان کو تدریس کا شوق ہوتا کہ عمر بھر علمی شغل رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تخریب ہوتی رہتی ہے اور اس کی ترغیب دیں کہ مطالعہ کتب مفیدہ سے کبھی غافل نہ ہوں، ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں قابلیت دیکھیں تو عربی کی طرف متوجہ کریں تاکہ قرآن و حدیث و فقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں، میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطی کرتی ہیں، اس لیے اکثر کے لیے مناسب نہیں یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی۔

### لکھنا بھی سکھایا جائے

رہا لکھنا تو اگر قرآن سے طبیعت میں بے باکی معلوم نہ ہو تو کچھ مضامین ضرورت خانگی کے لیے اس کی بھی حاجت ہوتی ہے اور اگر اندیشہ خرابی کا ہو تو مناسد سے پچنا جلب مصالح غیر واجب سے اہم ہے، ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھائیں اور نہ خود لکھنے دیں اور یہی فیصلہ ہے عقلاء کے اس اختلاف کا کہ لکھنا عورت کے لیے کیسا ہے؟ (حقوق البیت صفحہ: ۲۸)

### اٹھانوواں اعتراض..... ماں باپ کا حق پیر سے زیادہ ہے!

مجھ سے ایک سوال کیا گیا کہ ماں باپ کا حق زیادہ ہے، یا پیر کا؟ تو میں نے یہی جواب دیا کہ ماں باپ کا زیادہ حق ہے، البتہ: "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق" یعنی اگر پیر شریعت

کے موافق حکم کرے اور ماں باپ اس کے خلاف کہیں تو اس وقت پیر کی اطاعت ہوگی والدین کی نہ ہوگی، سو پیر کی اس لیے وقعت ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر چلاتا ہے، حق کے اعتبار سے نہیں حق کے اعتبار سے والدین کا مرتبہ خدا کے بعد ہے اور پیر بھی آج کل اپنے کو مالک سمجھتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نواح میں تو موروثی پیر بھی کچھ بہت زیادہ برے نہیں۔

## پیروں کا حال

یورپ میں ایک پیر تھے، وہ عورتوں کے پاس جا کر ٹھہر جاتے تھے، خدا ایسے پیروں کو عارت کرے اس کے ساتھ وہ بڑے بزرگ اور قطب اعظم مشہور تھے اور کئی لاکھ آدمی ان سے مرید ہیں، ہندو بھی ان سے مرید ہیں، اسلام اور درویشی میں پہلے عموم خصوص مطلق کی نسبت تھی، مگر اب اس زمانہ میں من وجہ کی نسبت ہو گئی، یعنی پہلے درویشی کے لیے مسلمان ہونا ضروری تھا، اب کافر بھی صوفی اور درویش ہو سکتے ہیں، یہ ان رہنماؤں کی بدولت ہے، ان کے نزدیک کافر بھی مرید ہو سکتا ہے، یہ لوگ دجال پر ضرور ایمان لے آئیں گے، کیونکہ وہ تو بڑا صاحب تصرف ہوگا اور چونکہ ان کے نزدیک صوفی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں، اس لیے دجال کو تو بے تکلف پیشوا بنا لیں گے اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ جہاں شریعت نہیں، وہاں کچھ نہیں، اس کے نزدیک کرامات وغیرہ کی کوئی وقعت نہیں، وہ سب سے پہلے اتباع شریعت کو دیکھے گا اور چونکہ دجال کافر ہوگا، اس لیے یہ شخص اس کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔

صاحبو! دجال قریب ہی نکلنے والا ہے، اس لیے جلد اپنے عقیدہ کی درستی کر لو! اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے الہام ہوا ہے، بلکہ علامات و آثار بتلاتے ہیں کہ دجال کا زمانہ خروج قریب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ احتمال تھا کہ کہیں میرے ہی زمانے میں نہ نکل آئے، اس لیے ممکن ہے کہ ہمارے زمانے میں نکل آئے، اس لیے اپنے عقائد درست کر لو، جس کو خلاف شریعت دیکھو، اس کے ہرگز معتقد نہ بنو، آگے آپ کو اختیار ہے۔

## آج کل کے پیر مریدوں کو غلام سمجھتے ہیں

غرض آج کل پیر سمجھتے ہیں کہ مرید ہماری مملوک ہیں، ماں باپ اور بیوی سب سے چھڑا دیتے ہیں، یاد رکھو! اگر پیر کہے رات کو نفلیں پڑھو اور باپ کہے سوتے رہو، تو باپ کی اطاعت مقدم ہے، ہاں! اگر باپ شریعت کے خلاف کوئی حکم کرنے تو اس وقت باپ کی اطاعت جائز نہیں، شریعت کا لحاظ مقدم ہے اور ماں باپ کا اتنا حق ہے کہ جرتج ایک درویش تھے۔ بنی اسرائیل میں، وہ جنگل

میں رہتے تھے، پہلی شرائع میں رہبانیت کا حکم تھا، ہماری شریعت میں یہ مطلوب نہیں، اس کے متعلق آج کل کے اعتبار سے ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ تنہائی سے جو غرض ہوتی ہے جس میں رہنے سے، آج کل وہ حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ ایسے شخص کو لوگ بہت ستاتے ہیں، برخلاف اس کے اگر کوئی مسجد کے حجرہ میں رہے، اسے کوئی نہیں پوچھتا، دوسرے سب کو چھوڑ کر تنہا عبادت کرنا کمزوری کی بات ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

زاهد نہ دشت تاب جمال پری رھاں

سنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

ہمت کی بات یہ ہے کہ سب میں ملے جلے رہو اور پھر اپنے کام میں لگے رہو، حدیث میں: ”الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ“ اور اگر جنگل میں کوئی نہ سناوے تو بہتر ہے، کچھ مضائقہ نہیں، مگر حد و شرعیہ سے تعدی کرنا حرام ہے۔  
خوب کہا ہے:

بزد و ورع کوش و صدق و صفا

ولیکن میفرمائے بر مصطفیٰ

خلاف پیہر کسے رہ گزید

مپندار سعدی کہ راہ صفا

تو ان یافت جز بڑ پئے مصطفیٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر کے حاصل کرو جو حاصل کرنا ہو، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر پوری نظر نہ ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھو وہ آئینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمایاں۔

### حضرت جرتج صوفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

غرض جرتج ایک عابد تھے، وہ ایک مرتبہ اپنی عبادت گاہ میں نماز نفل پڑھ رہے تھے کہ ان کی ماں نے آکر پکارا یہ سخت پریشان ہوئے کہ جواب دوں یا نہ دوں؟ جواب دوں تو نماز جاتی ہے، نہ دوں تو ماں کی فحشی کا اندیشہ ہے، آخر انہوں نے جواب نہیں دیا، اس نے دو تین آوازیں دیں اور بدعادے کے چلی گئی کہ ”اللہم لا تمتہ حتی ترہہ وجہ المومسات“ کہ اے اللہ! جب تک یہ کسی زانیہ کا منہ نہ دیکھ لے، اس کی موت نہ آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکایت بیان فرما کر ارشاد فرمایا: ”لو کان فقیہا لا حجاب امہ“ یعنی اگر فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتا

اور یہ قول اس کا قرینہ ہے کہ نماز نفل تھی، کیونکہ فرض کو بلا جماع توڑنے کی اجازت نہیں، البتہ اگر کسی پر مصیبت آئے، مثلاً جلنے لگے، یا گرنے لگے تو اس وقت اس کے پجانے کے لیے نماز فرض بھی توڑنا واجب ہے، خواہ ماں ہو یا کوئی غیر ہو۔

صاحبو! آپ نے شریعت کی تعلیم کو دیکھا، اللہ اکبر! کس قدر رحمت کا قانون ہے؟ آپ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا نہیں، اس لیے کچھ قدر نہیں کرتے، اس کی تو یہ حالت ہے:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ سے نہ گرم  
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

### شریعت کا حسن و جمال

شریعت تو ایسی حسین و خوبصورت ہے کہ اس کی جس چیز کو دیکھو دل رہا ہے جس ادا کو دیکھو دلکش ہے، آپ نے ملاحظہ کیا کہ کس قدر ضرورت کے قوانین ہیں کہ جب کسی کو گرفتار مصیبت دیکھو تو نماز فرض بھی توڑ دو اور ایسے موقع پر پہنچو اور نفل میں تو اگر بلا ضرورت بھی ماں باپ پکاریں تو نیت توڑ دینا چاہیے، بشرطیکہ ماں باپ کو اطلاع نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے، مگر جرتج چونکہ فقیہ نہ تھے اس لیے جواب نہ دیا اور ماں کی بددعا لگ گئی اور یہ واقعہ ہوا کہ قریب ایک آوارہ عورت تھی، اس کو کسی کا حمل رہ گیا، کچھ لوگ جرتج کے دشمن تھے، انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ تو جرتج کا نام لے دینا کہ اس کا بچہ ہے، اس کم بخت نے ایسا ہی کیا، لوگ اس کے عبادت خانے پر چڑھ آئے اور اس کو توڑنے لگے اور جرتج کو پیٹنا چاہا، اس نے پوچھا کہ اس حرکت کا آخر کچھ سبب بھی ہے یا نہیں؟ کہنے لگے تو ریاکار ہے، عبادت خانہ بنا کر زنا کرتا ہے، فلاں عورت سے تونے زنا کیا ہے، اس کے بچہ پیدا ہوا ہے۔

### عبادت کا اثر

یہ عبادت خانے سے اترے، آخر اللہ کے مقبول بندے تھے، رحمت خدا کو جوش ہوا اور ان کی ایک گرامت ظاہر ہوئی، حضرت جرتج نے اس لڑکے سے پوچھا کہ بتلا تو کس کا بچہ ہے؟ اس نے کہا: ”میں فلاں چرواہے کا بچہ ہوں، یہ قصہ حدیث میں مذکور ہے۔ اس سے ماں کا کتنا بڑا حق معلوم ہوا، مگر اس پر اجماع ہے کہ اگر پیر پکارے تو نماز نفل کا توڑنا بھی جائز نہیں، تو پیر کا حق ماں باپ سے زیادہ نہیں اور یہ اتنے پیر صاحب ہیں کہ دوسرے کے پالے پلائے پر قبضہ کر لیا، کیا پیری مرید کے یہی معنی ہیں.....؟؟؟ (وعظ عضل الجالبیہ ص: ۵۹)

## انسٹھواں اعتراض..... چھوٹے بچے کو روزہ پر مجبور کرنا درست نہیں!

ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لڑکیوں نے ایک ذرا سی لڑکی کو روزہ رکھوایا اور وہ جب پاخانہ گئی تو ایک ساتھ گی غرض چاہے بچے کی جان پر بن جائے، مگر روزہ ضرور ہو، مگر بعض دفعہ یہ روزہ روضہ میں بھی لے جاتا ہے، ایک مرتبہ ایک رئیس زادہ سے روزہ رکھوایا گیا، گرمی کے دن تھے، دوپہر تک تو بے چارہ نے برداشت کیا، مگر عصر کے وقت پیاس سے سخت پریشان ہوا، رئیس نے روزہ کشائی کا بہت اہتمام کیا تھا، تمام خاندان کی اور دوستوں کی دعوت کی تھی، آخر پہلایا کہ تھوڑی دیر اور صبر کرو، مگر اس بے چارہ کو تاب کہاں تھی؟ اول تو اس نے لوگوں کی منتیں خوشامدیں کیں، مگر کسی ظالم نے اس کی جان پر رحم نہ کیا اور کسی نے ایک گھونٹ بھی پانی نہ دیا، آخر وہ خود اٹھا، رئیس نے اتنا سامان کیا تھا کہ منکلوں میں برف بھری گئی تھی، وہ منکے سے لپٹا کہ کچھ تو پانی سے قرب ہو اور لپٹتے ہی جان نکل گئی، اس کا وبال بے رحم ماں باپ پر ہوا۔

صاحبو! شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ اگر جوان کی بھی جان نکلنے لگے تو روزہ توڑ دینا واجب ہے، مگر اہل رسوم کے نزدیک معصوم بچے کو بھی اجازت نہیں۔ افسوس! خدا کو ایسے روزہ کی ضرورت نہیں، خدا تو تم سے زیادہ تم پر رحمت کرنے والا ہے، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تم سے زیادہ شفقت ہے "اَللّٰہُ اَوْفٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ" تو جب مکلف کو یہ حکم ہے کہ ایسے وقت روزہ توڑ دے تو چار پانچ برس کا بچہ کس شمار میں ہے؟ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ شریعت میں اتنی شفقت و سہولت ہے کہ تم بھی اپنے ساتھ اتنی نہیں کر سکتے۔

(فضل الجالیدی ص: ۵۱)

## ساتھواں اعتراض..... فرشتے کو پیغمبر بنا کر کیوں نہ بھیجا گیا؟

### حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا اعلیٰ وارفع نمونہ ہیں!

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں ایک اچھا نمونہ دیا ہے، نمونہ دینے سے کیا غرض ہوتی ہے؟ یہی کہ اس کے موافق دوسری چیز تیار ہو، میں نے ایک بزرگ محقق کا اس کے متعلق ایک لطیف مضمون سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہماری مثال ایسی ہے، جیسے کسی نے درزی کو ایک اچھا نمونہ دیا، سنے کو دی اور نمونہ کے لیے ایک سلی ہوئی اپکن بھی دی کہ اس ناپ اور نمونہ کی

اچکن ہی لاؤ، درزی نے ساری اچکن نمونہ کے موافق تیار کی عرض و طول بھی برابر، سلائی یکساں، غرض کہیں قصور نہیں کیا، فرق کیا تو صرف یہ کیا کہ ایک آستین ایک بالشت چھوٹی بنا دی جب وہ اچکن لے کر مالک کے پاس پہنچے تو مالک اسے کیا کہے گا؟ وہ اچکن خوش ہو کر لے لے گا، یا اس کے سر پر مار دے گا؟ اگر درزی جواب میں یہ کہے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے، صرف ایک آستین میں ذرا سی کمی ہے تو کیا آپ کہہ سکتے کہ مالک اس کو پسند کرے گا؟ ہرگز! نہیں اس سارے کپڑے کی قیمت رکھو لے گا؟

### احکام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی موافقت ضروری ہے

خوب یاد رکھو کہ حق تعالیٰ نے احکام نازل کیے جو بالکل مکمل قانون ہیں اور ان کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا، سو اگر آپ کے اعمال نمونہ کے موافق ہیں تو صحیح ہیں، ورنہ غلط ہیں، اگر نماز آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے موافق ہے تو نماز ہے ورنہ کچھ بھی نہیں، اگر ذکر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے موافق ہے تو ذکر ہے ورنہ انہی معصیت ہے، دیکھئے! نماز میں بجائے دو کے ایک سجدہ کر لے تو وہ نماز نہ رہی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے، کوئی قرآن شریف بحالت جنابت پڑھے تو بجائے ثواب کے الٹا گناہ ہوتا ہے، اسی قبیل سے یہ بھی ہے اسما، الہیہ توقیفی ہیں، اپنی طرف سے کوئی نام رکھنا جائز نہیں، اگر آپ روزہ رکھیں تو وہی روزہ صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو، علی بذاتہ جی وہی صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو، اگر حج میں کوئی احرام نہ باندھے تو وہ حج نہیں اسی طرح زکوٰۃ وہی صحیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ہو اور کوئی سارا مال خلاف تعلیم خرچ کر دے تو زکوٰۃ سے فارغ نہیں ہو سکتا، یہ ارکان اسلام ظاہری ہوئے، اسی طرح اعمال باطنی کو سمجھ لیجئے! اور طرز معاشرت سب میں یہی حکم ہے۔

### فرشتے رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجے گئے؟

حق تعالیٰ نے ہمارے پاس کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہیں بھیجا، اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر فرشتہ آتا تو وہ ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتا تھا، اس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی نہ پہننے کی، نہ ازدواج کی، نہ معاشرت کی، ان چیزوں کے احکام میں صرف یہ کرتا کہ ہم کو بڑھ کر سنا دیتا، یہ کام صرف کتاب کے بھیج دینے سے بھی نکل سکتا تھا، کہ ایک کتاب ہمارے اوپر اتر آتی، اس میں سب



احکام لکھے ہوتے، اس کو ہم آپ پڑھ لیتے اور عمل کر لیتے فرشتے کے اترنے سے اس کے زیادہ کوئی بات نہ پیدا ہوتی جو کتاب سے ہو سکتی تھی، حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ہماری جنس میں سے پیغمبر بنائے کہ وہ ہماری طرح کھاتے پیتے بھی ہیں، ازدواج اور تعلقات بھی رکھتے ہیں، تمدن اور معاشرت کے بھی خوگر ہیں اور ان کے ساتھ کتابیں بھی بھیجیں تاکہ کتاب میں احکام ہوں اور خود یہ نفس ان کی تعمیل کر کے دکھلا دیں، تاکہ ہم کو ہولت ہو، اسی واسطے فرمایا: ”وَمَا أَرْسَلْنَا قَدْرًا مِّنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنَّهُمْ لِيَأْكُلُوا الطَّعَامَ وَيَشْرَبُوا“ یعنی ہم نے جس قدر تیرے سے پہلے پیغمبر بھیجے وہ اور آدمیوں کی طرح کھانے پینے والے اور معاشرت رکھنے والے بھیجے، دوسری جگہ فرماتا ہے: ”وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا“، یعنی اگر ہم فرشتے کو احکام دے کر بھیجتے، تب بھی یہ ہوتا کہ وہ انسان کی صورت میں آتا اور نہ انسان کو اس سے ہدایت نہ ہو سکتی، کیونکہ وہ نمونہ بن سکتا۔

### سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب

حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات فرشتوں سے بھی زیادہ ہیں، لیکن حکمت الہی اس کی منتقصی ہوئی کہ آپ نسل انسانی سے پیدا ہوں، تاکہ تمام افعال انسانی میں نمونہ بن سکیں، دیکھ لیجئے کہ جتنی باتیں انسان کو پیش آتی ہیں، سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی باتیں انسان کو پیش رکھیں، اپنی اولاد کا نکاح کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غمی کی تقریبیں بھی ہوئیں، کئی صاحبزادیوں نے انتقال کیا۔ جو حالات ہم کو پیش آتے ہیں، وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے، تاکہ ہمارے لیے پورا ایک دستور العمل بن جائے اب آپ دیکھ لیجئے کہ کون سا فضل ہمارا نمونہ کے موافق ہے؟ کوئی تقریب خوشی کی ہوتی ہے تو ہم نہیں دیکھتے اور کوئی تقریب غمی کی ہوتی ہے تب بھی ہم نہیں دیکھتے کہ دستور العمل کیا ہے؟ اس درزی کی مثال کو یاد رکھیے کہ ایک بالشت کپڑا کم کر دینے سے اچکن منہ پر ماردی جاتی ہے اور اگر وہ بجائے سینے کے کپڑے کی دھیان کر کے مالک کے سامنے جارکے، تو وہ کس سزا کا مستوجب ہے؟ جب کہ مالک قادر بھی ہو واللہ! باللہ! ہمارے اعمال کی حالت یہی ہو گئی ہے کہ جو طرہ بقدان کا بتلایا گیا تھا، تو کوسوں دور، ان اعمال کو تباہ کر کے اور دھیان اڑا کے ہم ان کو حق تعالیٰ کے سامنے رکھ دیتے ہیں، یہ کچھ مبالغہ آمیز الفاظ نہیں ہیں، دیکھ لیجئے کہ جیسے اچکن سینے کے واسطے کپڑے کا اپنی اصل پر رہنا شرط ہے اور دھیان کرنے والا اس کو اس اصل سے نکال دیتا ہے کہ جس سے اچکن تو کسی کپڑے کی کوئی

غرض بھی حاصل نہیں ہو سکتی، اسی طرح تمام اعمال کے صحیح ہونے کے واسطے ایمان کا ہونا شرط ہے، کوئی چاہے کہ ایمان کھو کر کوئی عمل کرے تو وہ ایسے ہی بیکار ہوگا، جیسے کوئی کپڑا کی دوھیان کر کے اچکن بیٹنا چاہے۔  
(دعوظ منازعہ الہوی صفحہ ۶۳)

## آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

(ب) یہ بڑی غلطی ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو اپنے حالات پر، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ ”بشر لا کا لبشر و لکن کا لیا قوت بین حجر“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تو ہیں، مگر اور انسانوں کے مانند نہیں ہیں، بلکہ آپ انسانوں میں ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یا قوت ہوا کرتا ہے کہ جنس کے اعتبار سے تو وہ بھی پتھر ہی ہے، مگر زمین و آسمان کا فرق یا قوت میں اور دوسرے پتھروں میں، اب اگر کوئی محض اشتراک جنس کی وجہ سے یا قوت کو اور پتھروں پر قیاس کرنے لگے تو اس سے یوں ہی کہا جائے گا کہ عقل پر پڑیں پتھر، لہذا محض انسان سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس نہ کیا کرو، کیا انسان سارے یکساں ہی ہوا کرتے ہیں؟ دیکھو ایک آدمی تو جشی کالا بھجگا ہے، آدمی تو وہ بھی ہے، ایک حسین یوسف ثانی ہے، وہ بھی آدمی ہی ہے، مگر کیا دونوں برابر ہیں؟ کیا ایک دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ اگر کسی نے آدمیوں میں صرف اس یوسف ثانی کو دیکھا ہو، اس کے بعد پھر جشی کو دیکھے تو وہ ہرگز یقین نہ کرے گا کہ یہ بھی آدمی ہے، بلکہ اس کو جن یاد پوچھے گا، کیونکہ اس کے نزدیک تو آدمی اسے کہتے ہیں جو اس حسین کے مشابہ ہو، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے انسان ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم تم بھی آدمی ہیں، وہ تو نہ معلوم ہم کو کیا سمجھے گا کہ یہ گدھے ہیں یا بیل ہیں؟ اب یہاں تین فرقے ہوں گے، بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ہی نہ سمجھا، وہ تو خواص الوہیت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت کرنے لگے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل ہی اپنے جیسا بشر سمجھا، یہ دونوں غلطی پر ہیں اور ایک فرقہ متوسط ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر تو سمجھتا ہے، مگر سب سے اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے اور وہی بات کہتا ہے ”بشر لا کا لبشر بل کا لیا قوت بین الحجر“ (بشر ہیں، مگر عام بشر کی طرح نہیں، بلکہ جیسے پتھروں میں یا قوت ہوتا ہے) واقعی سچی بات ہے:

گفت ایک ما بشر ایشاں بشر  
ماؤ ایشاں بستہ خوائیم و خور

ایں ندانستند ایٹیاں از عمی  
درمیاں فرقی بود بے منتہا

(وعظ الیوم، الیتامی صفحہ ۲۶)

اکٹھواں اعتراض..... بعض جدید تعلیم یافتوں کا حال، ان سے

مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا!

افسوس ہے کہ آج جن لڑکوں کو بیٹیاں دی جاتی ہیں، بعض ان میں سے جدید تعلیم کے اثر سے ایسے آزاد منش ہوتے ہیں کہ ان کو دین ایمان سے بھی کچھ علاقہ نہیں رہتا زبان سے کلمات کفر تک جاتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں ہوتی، پھر انہیں میں سے ایک سے مسلمان لڑکی کا نکاح پڑھوایا جاتا ہے اور سب گھر والے خوش ہوتے ہیں کہ ایک مسنون طریقہ ادا کیا جاتا ہے، اس سنت کی صحبت کے لیے موقوف علیہ ایمان، افسوس ہے کہ نوشہ صاحب نہ جانے کتنی دفعہ اس سے خارج ہو چکے ہیں، اب وہ مثال صادق آتی ہے یا نہیں کہ کپڑے کے پرزے پرزے کر کے بلکہ جلا کر اچکن سینے کا ارادہ کیا جاتا ہے، ہم کو تو اسی کا رونا تھا کہ اچکن نمونہ کے موافق نہیں سی جاتی، ایک آستین بالشت بھر کی کم کی جاتی ہے، یہاں نہ آستین رہی، نہ دامن اور خیال یہ ہے کہ اچکن تیار ہے، ایک نیک بد بخت لڑکی ایک انگریزی خواں سے بیاہی گئی جو ایک جمع میں یہ لفظ کہہ رہی تھی ”محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم واقعی بہت بڑے ریفاں مرتھے اور مجھ کو آپ سے بہت تعلق ہے، لیکن رسالت ایک مذہبی خیال ہے۔“ نعوذ باللہ من ذلک ایہ کلمہ کفر ہے، نکاح اس سے ٹوٹ جاتا ہے، یہ مسئلہ اگر لڑکی والوں کو بتایا جاتا ہے تو الٹے لڑنے کو سیدھے ہوتے ہیں کہ ہمارے خاندان کی ناک کٹواتے ہیں، اب وہ زمانہ ہے کہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ دیکھ لیا جائے کہ داماد مسلمان ہے، یا کافر؟ بجائے اس کے پہلے دیکھا جاتا تھا نیوکار ہے یا بدکار؟ اس قصہ سے میرے قول کی تصدیق ہوگی کہ ہمارے اعمال خراب ہی نہیں بلکہ باطل ہیں، پھر لطف یہ ہے کہ ہم ان کو اچھے سمجھ کر اجر کے امیدوار بیٹھے ہیں۔

وسوف تری اذا الکشف العبار

افرس تحت و جلدک ام حمار؟

”غبار چھٹ جانے کے بعد ظاہر ہوگا کہ تم گھوڑے پر نہ یا گدھے پر۔“

## باسٹھواں اعتراض..... حضور ﷺ کے زمانے میں پیدا ہونے کی تمنا!

فرمایا کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتے تو اچھا ہوتا، میں کہتا ہوں کہ ایک اعتبار سے ہم لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ ہونا ہی اچھا ہوا، کیونکہ ہم لوگوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے، خدا کی راہ میں مال دینا مشکل معلوم ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شب و روز امتحان درپیش تھا، کبھی زکوٰۃ کا حکم ہوتا تھا، کبھی جہاد میں جان دینے کا عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑتا تھا سو ہماری ایسی طبیعت والے اگر احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجالانے میں گوتا ہی کرتے تعجب نہ تھا کہ انکار نبوت تک نوبت آجاتی، جس کا انجام کفر و شران دارین تھا، دوسرے خدا جانے معاشرت کہیں اپنا رنگ نہ لاتی اور اب توجع کی کرائی شریعت ہم کو بھی مل گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات ہم نے سن لیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بھی قلب میں بلا مزاحم موجود ہے، اگر خدا نکر وہ خلاف بھی کریں گے تو کسی خطاب جزئی کا تو خلاف نہیں ہے، ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء سے عمر سے ہر حالت میں دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معبودوں کو برا کہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت تھی، لوگوں سے تعلقات تھے، بہت سے امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسے پیش آتے تھے، جو لوگوں کے خلاف جمع ہوتے تھے، لیکن پھر بھی وہ لوگ اطاعت کرتے تھے، کمال ان کا تھا کہ ہم لوگوں کا۔ (مقالات حکمت، دعوات و عبدیت حصہ ہفتم)

## تریسٹھواں اعتراض..... لوگوں نے غفور رحیم کے معنی غلط سمجھے!

خدا غفور و رحیم ہے، تو بہ استغفار کر لیں گے گناہ معاف ہو جائیں گے، مگر دنیا کا نفع یعنی مکان بنانا بغیر رشوت کے نہیں ہو سکتا، اگر رشوت نہ لی تو منافع حاصل نہ ہوں گے اور اس نقصان کی بظاہر کوئی تلافی نہیں معلوم ہوتی، پس جس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے اس کو گوارا کر کے رشوت لینا چاہیے، پھر خدا سے معافی کرالیں گے تو صاحبو! آپ نے دیکھ لیا کہ نفس بد خواہی کو کس رنگ آمیزی کے ساتھ خیر خواہی کی صورت میں لاتا ہے؟

## طوطے کی مثال

مگر شیطان کے اس سبق کی وہی مثال ہے، جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے اپنے طوطے کو لفظ ”دیں“ چہ ”شک“ سکھلا دیا تھا، وہ ہر بات کے جواب میں یہی لفظ کہہ دیا کرتا تھا، مگر یہ لفظ ایسا

ہے کہ اکثر باتوں کا جواب بن بھی جاتا ہے، چنانچہ اس شخص نے طوطے کو یہ لفظ یاد کرا دیا اور پھر سر بازار لا کر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے، ایک شخص نے اس کا امتحان لیا، کئی باتیں اس سے کہیں، سب کے جواب میں اس نے ”دریں چہ شک“ ہی کہا مگر ان باتوں پر یہ جواب چسپا تھا، اس نے خوش ہو کر اس کو خرید لیا اور گھر پر لایا، اب اس سے ادھر ادھر کی باتیں ہیں، اس نے سب کے جواب میں ”دریں چہ شک“ ہی کہا جا ہے جوڑ لگے یا نہ لگے، آخر اس نے جھلا کر کہا افسوس میں نے تیرے خریدنے میں بڑی بیوقوفی کی، اس نے اس کے جواب میں بھی کہا ”دریں چہ شک“ کہ اس میں کیا شک ہے؟ ایسے ہی ہمارے نفس کو بھی ایک سبق یاد ہے، ہر جگہ اس کا استعمال کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے، خواہ وہ کیسا ہی گناہ ہو، حق اللہ ہو یا حق العبد۔

### غفور و رحیم کا حاصل

دوسرے یہ احمق نہیں جانتا کہ غفور و رحیم ہونے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ گناہ کا ضرر نہ ہوگا؟ اگر غفور و رحیم ہونے کے لیے یہ ضروری ہے تو جیسے خدا تعالیٰ آخرت میں غفور و رحیم ہیں، دنیا میں بھی تو ہیں، کیونکہ صفات باری تعالیٰ سب قدیم ہیں، پھر سٹکھیا کھانے سے ضرر کیوں ہوتا ہے؟ اگر غفور و رحیم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ چاہو کہو کچھ ضرر نہ ہوگا، تو سٹکھیا کھانے سے بھی کوئی نقصان نہ ہونا چاہیے، مگر ضرر یقینی ہوتا ہے اور باوجود ضرر ہونے کے خدا کے غفور و رحیم ہونے میں فرق نہیں آتا تو ایسے ہی آخرت میں بھی غفور و رحیم ہوں گے اور گناہ کا بھی ضرر ہوگا کیونکہ غفور و رحیم ہونے کے لیے ضرر نہ ہونا لازم نہیں، خداوند تعالیٰ رحیم اس طرح ہیں کہ تم کو بتلا دیا کہ: ”لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ“ ”وَلَا تَقْرُبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً“ یہ کتنے بڑے رحم کی بات ہے کہ خود بخود ایک قانون مفید تجویز فرما کر سب کو بتلا دیا کہ طریق و فلاح رضاء الہی یہ ہے ورنہ کام تو خود ہمارے ذمہ تھا کہ رضائے مولا کا طریقہ معلوم کرتے دوسرے حق تعالیٰ نے جہاں اپنی رضا حاصل کرنے کے طریقے بیان فرمائے ہیں، وہاں ایسے امور کی بھی تعلیم دی ہے جن سے امن عام قائم رہے، اس کے سوا اور بھی رحیم ہونے کے معنی ہیں جو میں آئندہ بتلاؤں گا اور غفور ہونے کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بعد سزا کے بخش دیں اگر کہیں کیسی معفرت ہے کہ سزا بھی ہو اور بخشش بھی ان دونوں میں تو منافات ہے؟ تو صاف جواب آپ نے نہ خدا کی عظمت سمجھی نہ گناہ کی حقیقت معلوم کی، تو سمجھو کہ گناہ کہتے ہیں حاکم کی سرکشی کو اور جس قدر حاکم بڑا ہوتا ہے، اسی قدر اس کی سرکشی بھی جرم عظیم ہوتی ہے، مثلاً ایک سرکشی تو یہ ہے کہ حاکم ضلع کا کہنا نہ مانا، مگر اس سے بڑھ کر وائسرائے کا کہنا

نہ ماننا اور بادشاہ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے، ایسے ہی بڑے بھائی کا کہنا نہ ماننا ایک جرم ہے، مگر باپ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے، غرض سرکشی کی شدت کا مدار اس شخص کی عظمت پر ہوتا ہے جس کی سرکشی کی گئی، ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لیجئے، دوسرا مقدمہ سب سے پہلے مسلم ہے کہ خدا سے بڑا کوئی حاکم نہیں، کیونکہ اور سب کی تو عظمت محدود ہے اور عظمت الہی غیر محدود خارج از وہم و قیاس ہے، تیسرا مقدمہ یہ بھی سب کے نزدیک بدیہی اور مسلم ہے کہ سزا بقدر گناہ ہوا کرتی ہے۔

## خدا کی مخالفت

بس اب سمجھئے کہ جب خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں تو اس کی مخالفت سے بڑھ کر کوئی مخالفت نہیں اور اس کی مخالفت کی سزا سے بڑھ کر کسی کی مخالفت کی سزا نہیں ہو سکتی تو جیسا کہ عظمت غیر اللہ محدود ہے، اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہوتی ہے اور چونکہ عظمت الہی لامحدود ہے، اس لیے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہونی چاہیے، پس اس عقلی قاعدہ کا متقضا تو یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی صغیرہ گناہ بھی ہو جائے تو چونکہ خدا کی نافرمانی ہے، اس لیے اس کی سزا بھی ابد الابد جہنم ہونی چاہئے اور اس کے لیے کبھی مغفرت نہ ہونی چاہیے، مگر خدا تعالیٰ نے ابد الابد جہنم سوائے مشرکین و کافرین کے کسی کے واسطے مقرر نہیں فرمائی، پس اگر حق تعالیٰ کسی گناہ میں دس ہزار یا دس لاکھ برس کے بعد بھی چھوڑ دیں تو یہ ان کی مغفرت اور بخشش ہے، یا نہیں؟ یقینی ہے! اور ضرور ہے! اور دنیا کے قصوں میں ہم اس کو رات دن جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس سال کی جیل کا مستحق ہو اور حاکم اس کو دو برس کے بعد چھوڑ دے، یہ اس کا انعام سمجھا جاتا ہے، یا نہیں؟ پس لامحدود عذاب کے بجائے اگر حق تعالیٰ محدود عذاب دے کر دس ہزار یا دس لاکھ برس کے بعد بھی نجات عطا فرمادیں تو یہ بھی یقیناً مغفرت ہوگی، اب آپ کی سمجھ آ گیا کہ غفور ہونے کے لیے سزا نہ دینا ضروری نہیں، اور غفور ہونے کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک محدود زمانہ تک سزا دے کر رہا کر دیا جائے ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ گناہ کرتے ہی فوراً سزا نہ دی جائے جس کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے اور اس کی رحمت بھی کہہ سکتے ہیں اور رحیم کے دوسرے معنی سنئے! وہ یہ کہ عرفاً یہ بات ہوتی ہے کہ جیل سے رہا کر دیا جائے اس کے لیے انعام کا کوئی قاعدہ نہیں، نہ کوئی مستحق انعام و اکرام سمجھے، تو حق تعالیٰ کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ جہنم سے نکال کر چھوڑ دیتے جس حال میں چاہے رہے، خواہ مرے یا جیئے، خواہ راحت میں رہے یا تکلیف میں، مگر وہ رحیم بھی ہیں، ان کی رحمت کا متقضا یہ ہے کہ وہ جہنم سے نکال کر وہ جگہ دیتے ہیں جو جنت کے نام سے مشہور ہے جس میں وہ چیزیں ہیں کہ جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سنا، نہ کسی دل پر ان کا خطرہ گزرا۔

”فيهما ما لاعين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر“

### خطا معاف کر کے مقرب بنانا

پھر یہ خطا معاف کر کے اس کو اپنا مقرب بناتے ہیں، کسی سے ہفتہ وار ملاقات ہوا کرے گی، کسی سے ماہوار، کسی سے سالانہ اور سب سے مقرب وہ شخص ہوگا جس سے دن میں دو مرتبہ، صبح و شام ملاقات ہوا کرے گی، پھر یہ نہیں کہ آنے والوں کو حکم ہو کہ خود سلام کریں، بلکہ حدیث میں ہے کہ سب لوگوں کو ایک باغ میں جمع کیا جائے گا اور حق تعالیٰ ان پر مبتلی ہوں گے اور پہلے خود فرمائیں گے: ”السلام علیکم“، پس اس کی نظیر کوئی پیش کر سکتا ہے کہ خطا وار اور گنہگار کے ساتھ اس قدر انعام کیا جاتا ہو؟ تو آپ نے دیکھا کہ حق تعالیٰ کیسے کیسے انعامات فرمائیں گے، خود اپنے بندوں کو سلام فرمائیں گے پھر یہ نہیں کہ ان کو بلا دیں گے بلکہ خود ان کے پاس تشریف لے جا کر مجلسی ہوں گے اس وقت وہ حال ہوگا کہ سب زبان حال سے کہتے ہوں گے:

امروز شاہ شاہاں مہماں شدت مارا

تو دیکھئے! خدا کی رحمت کے معنی سمجھ میں آ گئے، اب اس تفسیر کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ رحمت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہو، یہ نفس کا بڑا اڑھو کہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نفور و رحیم ہونے سے یہ سمجھتا ہے کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہوگی، اسی کو کہتے ہیں: ”کلمة حق ارید بها الباطل“ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ نفس خیر خواہی کے پردے میں بد خواہی کرتا ہے۔

(وعظ وحدة الحب ص: ۵۰ پانچویں وعظ عبدیت حصہ ہشتم)

### چوسٹھواں اعتراض..... جاہل واعظوں کے وعظ کی خرابیاں!

غیر عالم کبھی وعظ نہ کہے اس میں چند مفاسد ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”اذا وصل الامر الی غیر اہله فانظر الساعۃ“ کہ جب کام نااہلوں کے سپرد کیے جائے لگیں تو قیامت کے منتظر ہو گویا نااہل کو کام سپرد کرتا اتنی سخت بات ہے کہ ان کا ظہور قیامت کے علامت سے ہے اور یہ امر مصرح و ثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامت قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں، یہ منصب صرف علماء کا ملین کا ہے، اس لیے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ

بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے کبھی نہیں ہوتی، گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیں، مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق احتیاط کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔

### جاہل و اعظیٰ کی خرابیاں

علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا کہ تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے، پھر آج کل ایسے نفوس کہاں ہیں جو صاف کہہ دیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں، ضرور کچھ گھڑمڑ مکر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچالیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑ جائیں، بعض جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا، اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو اور نہ جہل ظاہر ہووے۔

گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا، مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اپنے نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے؟ کہا: ایسا ہے جیسے گھیرا دینا، اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا، مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے؟ یقیناً غلطی میں پڑیں گے، شاید کوئی جاہل و اعظیٰ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آج کل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے، تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے، ایک باب میں تو اس میں اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مفید ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسی ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی، بعض دفعہ نا تمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالے گا، چنانچہ بعض غیر محقق مولوی و اعظیٰ میں کہا کرتے ہیں کہ روزی پہنچانے کا خدا کا وعدہ ہے اور مسلمانوں کو بھروسہ نہیں، گھبراتے ہیں، یہ ان کا عام مضمون ہے اور اس پر وہ ضعیف ایمان کا حکم لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی مخلوق دعوت کر دے تو اس پر پکا اعتماد ہوتا ہے اور اس وقت کے رزق سے بے فکری ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے وعدہ پر بھروسہ نہیں، سو یہ غیر محقق خوب سمجھ لیں یہ ضعیف ایمان نہیں بلکہ ضعف طبیعت ہے۔

### ضعف ایمان اور ضعف طبیعت

ضعف ایمان اور ہے اور ضعف طبیعت اور، اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو خدا کے وعدہ پر بھروسہ نہ ہو اور تفسیر کے لیے جو مثال بیان کی جاتی ہے، وہ محض غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا



قیاس مخلوق کے وعدہ پر صحیح نہیں، کیونکہ جو شخص وعدہ کرتا ہے وہ یہ بتلا دیتا ہے کہ فلاں وقت کی دعوت ہے، جس سے پورے طور پر یہ حال معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے کھانے کا اس وقت پورا بندوبست ہوگا، اگر ایسا ہی تفصیلی وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہوتا تو مسلمانوں کو مخلوق سے زیادہ اس پر اعتماد ہوگا، مگر خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ دونوں وقت دیں گے، پاؤ پھر دیں گے، ناعدتہ کریں گے، بلکہ ہم وعدہ ہے کہ روزی دیں گے اس کی کیفیت اور کیت نہیں بتلائی ممکن ہے کہ تیسرے روز طے غرض ابہام ہے اور اس شخص کا وعدہ ہے کہ شام کا وقت بتلا دیا ہے، تو ضعف ایمان کی وجہ سے یہ تردد نہیں بلکہ اس کی کیفیت اور مقدار معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تردد ہے چاباعت طبعی ضعف ہے اگر دعویٰ کا بھی ایسا ہی وعدہ ہو تو اس سے زیادہ تردد ہو جائے گا تو کیا ظلم ہے، الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ضعف ایمان کا۔ (دعوت شعبان میں صفحہ: ۱۲۸ دعوات عبودیت حصہ ہشتم)

### سوننا چاندی خریدنے کا مسئلہ

مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے، مثلاً چاندی کے بدلے چاندی، یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے، تفاضل کی کمی بیشی حرام ہے اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کر دے گا اور ممکن ہے کہ ایک وقت چاندی کا بھاؤ روپے کے برابر نہ ہو، بلکہ چاندی دس آنے تو لہ جو ایک روپے کے مقابلے میں روپے کے وزن سے زیادہ آئے گی اور ان حضرات کو صرف اتنا ہی مسئلہ معلوم ہو کہ اتحادی جنسین کے وقت تفاضل حرام ہے، تو یہ حضرات یا خود روپے کے برابر ہی لائیں گے، پھر گھر والے ان کو بے وقوف بنا دیں گے، یاد مروتوں کو اس پر مجبور کریں گے اور دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپے میں روپے سے زیادہ آسکتی ہے، مگر شریعت کہتی ہے کہ انہیں برابر ہی تو لو، زائد مت تو لو، تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی، محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کرے گا تو ساتھ ساتھ یہ کہے دے گا کہ اگر چاندی ایک روپے کے بدلے میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت روپے سے چاندی نہ خریدو، بلکہ روپے کو بھنا کر کچھ دونیاں چوینیاں اور ان کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو، کیونکہ ریز گاری میں ضمنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آئے گی، باقی چاندی پیسوں کے مقابلے میں ہو جائے گی اور پیسہ اور چاندی میں، جنس بدل گئی اس میں کمی بیشی جائز ہے، یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی۔

## طلاق کا مسئلہ

اب مسئلہ طلاق و تقییدی کی مثال سنئے! مثلاً باب الکنایات میں فقہاء نے لفظ اختیاری کو کنایات طلاق میں بیان کیا ہے اور اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے، تو اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق ہو جائے، لیکن اس اختیاری سے وقوع طلاق کی ایک شرط اور بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے، وہ یہ کہ اختیار میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار کرے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہاء نے باب الکنایات میں نہیں بیان کی، بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے، پس اگر کوئی لفظ اختیاری کو صرف باب الکنایات میں دیکھ کر حکم بیان کر دے گا وہ ضرور غلطی کرے گا اور نیت زوج کے بعد فوراً وقوع کا فتویٰ دے دے گا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی کر چکے ہیں، چنانچہ علامی شامی رحمہ اللہ نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں غلط فتویٰ دیا ہے۔

## مطلق و مقید کا فرق

نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق ہے، دوسری کتاب میں مقید ہے، اس لیے مسائل فقہ میں مفتی کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب کو دیکھ کر فتویٰ نہ دے، بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب دے، غرض فقہ کافن بہت دقیق ہے، جاہل و اعجاز ضرور غلطی کرے گا اور اس کے امتحان کی آسان صورت یہ ہے کہ کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دو چار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ، دو چار دفعہ کی اس لیے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے، مگر ہمیشہ محفوظ رہ جانا جاہل سے دشوار ہے، دو چار دفعہ کے بعد ان صاحب سے پوچھ لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں؟ ان شاء اللہ حقیقت معلوم ہو جائے گی، اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیے، میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی، عالم بھی بشر ہے اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا، شدید اور بکثرت غلطی نہ کرے گا، یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بار میں ایک غلطی ہوگی اور جاہل کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہوں گی، پھر عالم دوسرے وقت اپنی غلطی پر متنبہ ہو سکتا ہے اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا اور جاہل کو تنبیہ بھی نہیں ہوگی کہ میں نے کیا غلطی کی ہے؟ اس لیے یہ اس سے اشد ہے، خوب سمجھ لو۔

صاحب! آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے، جس کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ نااہل کو وہ خطبہ کی اجازت نہ دینا چاہیے۔ واللہ! جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں، کانپور میں ایک شخص نے ایک ایسے بکری کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا، لوگوں نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں، تو وہ کہتا ہے: ”واہ! ہماری بیوی صاحبہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے، پھر اس نے بیوی سے جا کر کہا کہ لوگ تمہارے فتویٰ میں غلطی نکالتے ہیں اس نے شرح و قایہ کا ترجمہ پڑھا تھا، اس میں مسئلہ کا موقع نکال کر باہر بھیج دیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہو تو جائز ہے اور اس بکرے کا کوئی عضو تہائی سے زائد نہیں کٹا، بلکہ کم ہی ہے، گو مجموعہ عدل کر بہت زیادہ تھا، کچھ ٹھکانہ ہے اس نامعقول حرکت کا؟ کہ ایک عورت بھی شرح و قایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی۔“

پینسٹھواں اعتراض..... عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش کرنا بڑی

غلطی ہے!

فرمایا کہ ہر عمل کا مدار اعتقاد پر ہوتا ہے، مثلاً باورچی نے کھانا سامنے لا کر رکھ دیا، اب صرف اس کے اعتقاد پر کھانا کھایا جاتا ہے، حالانکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کہیں زہر نہ ملا دیا ہو؟ چنانچہ بعض وقت ایسا ہوتا بھی ہے، اب دیکھئے! یہاں پر زہر ملانے کا احتمال نہیں کیا جاتا، علیٰ ہذا تا جر لوگ کروڑوں روپے کی تجارت صرف ملازمین کے اعتقاد پر کرتے ہیں، حالانکہ بعض اوقات ملازم لوگ بہت سامان غبن کر ڈالتے ہیں، اسی طرح بادشاہوں کا بھی سارا کام نوکر چاکر ہی کے ذریعہ چلتا ہے، اسی طرح دین کا بھی کل کام اعتقاد پر ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید کو قرآن مجید ماننا علماء کے اعتقاد پر ہے اور اس زمانہ کے علماء کو اپنے سے اگلے علماء پر پھر ان کو صحابہ کرام پر، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، پس ثابت ہوا کہ کل کام خواہ دین کا ہو یا دنیا کا سب کا دار و مدار اعتقاد ہی پر ہے، اب عوام کو ہر امر دین میں دلیل تلاش کرنا غلطی ہے۔

(مقالات حکمت: نمبر ادعوات عبدیت ہشتم)

چھیا سٹھواں اعتراض..... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں جانا

رحمت سے ہوگا نہ کہ عمل سے اس پر ایک شبہ کا جواب!

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں نہ جائیں گے، یہ نہ سمجھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں کچھ نقصان تھا، بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے، بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہ ہی اعلیٰ درجہ ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ شمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے، اگر سبب ناقص ہے تو شمرہ بھی ناقص ہوگا اور اگر سبب کامل ہے تو شمرہ بھی کامل ہوگا، ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جائے، وہ غیر محدود ہی ہوگا، غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود ہی ہوگا، رحمت حق کا اول تو تجزیہ نہیں ہو سکتا، لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں، کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ غیر متناہی ہوگا، کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جائے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا، کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے بمبرات متناہی متناہی ہوتا ہے، بہر حال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے، یعنی سبب ناقص تو شمرہ بھی ناقص اور سبب کامل تو شمرہ بھی کامل۔

سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا تو متناہی ہوگا کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا تو غیر متناہی ہوگا، کیونکہ رحمت غیر متناہی ہے، اس لیے رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے، غرض آپ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں، پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے، خوب سمجھ لیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہر طرح کامل ہیں، مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے، چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے، پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا شمرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے؟ خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ یوں فرما رہے ہیں کہ میں جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا، تو پھر ہمارا کیا منہ ہے؟

سرستھواں اعتراض..... حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت اسماعیل علیہ

السلام سے بوقت ذبح رائے دریافت کرنے پر ایک شبہ کا جواب!

بعض لوگ یہ سمجھ کر رائے دریافت کرنے کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ تو انہوں نے کہا: ”يَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ“ اے باپ! آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے اور یہ سمجھ کر ان کو شبہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو نعوذ باللہ! ترود تھا:

کار پا کاں را قیاس از خود مکیر

گرچہ مانند در نوشتن شیر و شیر

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو ترود نہ تھا کہ انبیاء میں اس کا احتمال ہی نہیں بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ گو ترود نہ تھا، مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ استقلال تھا جیسا کہ ان کے سوال: ”ماذا ترئی“ میں اور ان کے جواب میں ”افعل ما تؤمر“ میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، پھر اس تفاوت کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی آئے گا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس میں صریح تنقیص ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا، اس کی وہ برکت تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے، جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نور ان میں منتقل ہو گیا، اس واسطے وہ اس درجہ مستقل المزاج ہوئے گئے تھے، مگر اس توجیہ سے میرے روکتے کھڑے ہوتے ہیں، کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی، بس ایسی توجیہ رہنے دیجئے۔

زعشق ناتمام باجمال یار مستغنی است

باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

ناتمام اس معنی سے اس میں تنقیص ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی، نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جدا ہونے کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزاء ہے اور رجم بالغیب ہے، غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی گستاخی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جائے، آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اس کے اثر سے گرم رہتا ہے،

تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہوگا کہ اس کے منتقل ہونے کے بعد ابداً باتک اس کا اثر ہے؟ یہ تفاوت ہی نہیں جو ان خرافات کے ماننے کی ضرورت پڑے، اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی شفیق ہی نہ تھے، بلکہ وہ شیخ بھی تھے، سنو! شیخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا، اس واسطے فرمایا: "فانظر ما ذاتری" مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں: "يَا بَتِ افْعَلْ مَا تُوْمَرُ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ" اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا؟ اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت پر نظر نہیں، یہاں بھی کہتے ہیں: "ان شاء الله" کہ اگر خدا کو منظور ہو، پس یہی تو کمال ہے، ایسے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں:

شبابش آں صدف کہ چناں پرورد گہر

آبا از و مکرم و ابنا عزیز تر

تو یہ تھی اس کی اصل، چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام راضی ہو گئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری ہاتھ میں لے کر ذبح کے لیے لٹایا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ استقلال کمال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نہیں، بڑا کمال تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے، کیونکہ خود کشی کرتے تو بہتوں کو دیکھا ہوگا، یا کم از کم سنا ہوگا، مگر فرزند کشی کون کر سکتا ہے؟ بھلا باپ سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلا دے؟ "و النادر كالمعدوم" اب بتلائے استقلال کس کا بڑا ہوا ہے ایک مختل عبارت فَا نَظَرُ مَاذَا تَرَى سے یہ سمجھ لینا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں استقلال کم تھا، کتنی بڑی غلطی ہے؟ اگر نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جدا ہو جانے سے وہ غیر مستقل ہو گئے تھے، تو اچھا پھر چھری چلانے کے وقت مستقل کیونکر ہو گئے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی برکات تو اس قدر غیر محدود ہیں کہ وہ مفارقت بدن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ویسا ہی نور بخش تھا، جیسا کہ مفارقت ناسوت کے ناسوت کے لیے نور بخش ہو رہا ہے، جن انوار کا آپ مشاہدہ کر رہے ہیں۔

(روح الباقی و اشح صفحہ: ۱۸)

اڑ سٹھواں اعتراض..... مقتداء بنانے کے لیے عوام کا غلط معیار!

"وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ" سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے، کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور "سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ" سے علاج ہے، اس جماعت کا جوہر کس و ناکس کے معتقد ہو جانے والے ہیں اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے، کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا صحیح معیار بتلادیا اور معیار سے مراد ہے، معیار صحیح ورنہ یوں تو معیار

آج کل بہت ہیں، جیسے کشف کہ بعض نے اسی کو اتباع کا معیار بنایا اور ہر صاحب کشف کو بزرگ قابل اتباع سمجھا، بعض نے معیار بنایا کر امت کو، بعض نے وجد و سماع کو، بعض نے حرارت کو کہ جس کے اندر حرارت زیادہ ہو اور بہت روتا ہو، وہ بزرگ ہے، بعض نے معیار بنایا تصرفات کو کہ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور مدہوش ہو گیا، تو سمجھے کہ یہ بڑا بزرگ ہے اور بعض نے معیار بنایا، تجربہ کو، بعض حالتوں میں اس کی اجازت ہے، مگر یہ معیار تو نہیں، بعض نے معیار بنایا تمدنِ مروجہ کو چنانچہ سب سے زیادہ اس کے معتقد ہوتے ہیں جو پتھر ڈھیلے مارے وہ تو اس پر ظلم کرتے ہیں اور ان کے معتقد ہوتے ہیں اور جو گالیاں دیتے ہیں یہ ان کو بھی کہتے ہیں مجذوب ہیں، کیونکہ صاحب کشف ہیں، سو کشف ان کے نزدیک بڑا کمال ہے، حالانکہ کشف مجنونوں کو بھی ہوتا ہے، چنانچہ میرے یہاں ایک عورت کو جنون ہوا تو اس کو کشف ہوتا تھا، مگر جب مہبل دیا گیا تو اس کے ساتھ کشف بھی ختم ہو گیا، شرح اسباب میں لکھا ہے کہ بالجو لیا کہ مرض میں کشف ہونے لگتا ہے، پس کشف کوئی کمال کی بات نہیں۔

### بزرگی کیا ہے؟

غرض بزرگی کے معیار عجیب و غریب مقرر کر رکھے ہیں اور بجز یہ ہے کہ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ اور یہ لوگ تو کیا اکثر اہل علم بھی نہیں جانتے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ میں نے اہل علم کو بھی دیکھا کہ اکثر ایسوں کے معتقد ہو جاتے ہیں اور بعضوں کے نزدیک بزرگی کا معیار یہ ہے کہ وہ من گھڑت باتیں کہیں، ہمارے یہاں ایک شخص تھا، اس سے اکثر سنے والے پوچھتے جاتے تھے کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے؟ وہ اس کے جواب میں بڑ بڑانے لگتا، ان لوگوں نے کچھ اصطلاح مقرر کر رکھی تھی، اس اصطلاح کے موافق اس کی بکو اس سے اپنا جواب سمجھ لیتے تھے، یہ حال ہے لوگوں کے اعتقاد کا کوئی شخص صوفی بن جائے، پھر اس کی ہر بات بزرگی ہو جاتی ہے، خاموش رہیں تو خاموش شاہ کہلائیں! گالیاں اور خلاف شریعت کریں تو مجذوب کہلائیں!

### بی بی تمیزہ کا وضو

ایک دفعہ بزرگی رجسٹری ہونی چاہئے، پھر وہ ایسی پختہ ہو جاتی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو، مشہور ہے کہ بی بی تمیزہ نامی ایک فاحشہ عورت تھی، ایک بزرگ نے اسے نصیحت کی اور وضو کروا کے نماز پڑھوائی اور تاکید کر دی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا، یہ کہہ کر وہ چلے گئے، ایک مدت کے بعد وہ پھر ان کو کہیں ملی، تو انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! پڑھا کرتی ہوں، انہوں نے کہا اور وضو بھی کیا کرتی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ وضو اس روز آپ

نے کروا نہیں دیا تھا! سو جیسا اس کا وضو پکا تھا کہ نہ بدکاری سے ٹوٹا، نہ بگنے سے، نہ موتے سے آج کل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اس میں کسی طرح خلل نہیں آتا، حتیٰ کہ اگر نماز بھی نہ پڑھیں تب بھی بزرگ ہی ہیں۔

## بزرگی کیا ختم نہیں ہوتی ہے؟

غرض ایک مرتبہ جس سے اعتقاد ہو گیا، پھر خلل نہیں پڑتا، ہاں ایک صورت سے خلل پڑتا ہے، شریعت کی بات بتلانے لگے، ایسا کرے تو کہتے ہیں کہ میاں یہ تو زاملا ہے اور جو شریعت کے خلاف کرے تو اس کو سمندر کہتے ہیں کہ اس کو کوئی مصیبت گندہ نہیں کر سکتی، یہ تو سمندر ہے، سمندر میں چاہے کتنی ہی نجاست پڑ جائے اس کو ناپاک تھوڑا ہی کر سکتی ہے، لیکن اگر سمندر پیشاب ہی کا ہو تو کیا تب بھی پاک ہوگا؟ سو یہ حضرت تو سر سے بیر تک گوہی میں بھرے ہوئے ہیں، ایک پیر صاحب اپنے مریدنی کا گانا سن رہے تھے، گانا سنتے ہی آپ کو مستی سوار ہوئی اور تخیلہ میں لے جا کر اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور ہاں سے باہر آ کر فرماتے ہیں کہ جب آ گیا جوش! نہ رہا ہوش! مگر مریدوں کے نزدیک پھر بھی بزرگ ہی رہے، سبحان اللہ! کیا اچھی بزرگی ہے؟ چاہے کیسا ہی کام کر لیں، مگر پھر بھی بزرگ کے بزرگ ہی رہے، خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے وہ درگت بنائی کہ یا تو اتباع ہی نہ تھا، اگر ہوا تو بلا معیار ہوا اور اتباع کی شکایت تھی جب اتباع ہوا تو ایسا کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں، سو یہ وہ قصہ ہوا کہ:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی!  
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

## اہتر وال اعتراض..... پیشوا بنانے کا صحیح معیار!

”سِبِيلَ مَنْ أَنَابَ“ کا اتباع کرو، اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھنے کہ ”وَأَتَّبِعْ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ“ نہیں فرمایا، کیونکہ اس میں ابہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں، اس لیے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا: ”وَأَتَّبِعْ سِبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ“، کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں، بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے، وہ ہے متبوع، یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو، اس کو دیکھو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو، سبحان اللہ! کیا عجیب معیار ہے؟ بس اتباع اس معیار کے موافق کرنا چاہیے اور سب معیار چھوڑ دینے جائیں۔



خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ کو معیار بنایا اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو ماننے، چنانچہ فرماتے ہیں: "وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ" وہ اس کو اپنی طرف راہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے، کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں، پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لیے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں، پس اب "مَنْ اَنَابَ اِلَيْهِ" سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہوا اور عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا، تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہے، بس دو چیزیں اصلی ٹھہریں، ایک علم دین دوسرے عمل دین اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں، ان میں نہ عمل ہے، نہ علم اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے، وہ توجہ الی اللہ ہے پس سب سے اول تو علم ہونا چاہیے اور پھر اس پر مرتب ہونا چاہیے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو، سبحان اللہ! کیا جامع کلام ہے کہ ایک اناب کے لفظ میں تینوں امور علم و عمل اور توجہ الی اللہ کی طرف اشارہ فرمادیا، بس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے قابل وہ ہوگا کہ جس میں یہ تینوں باتیں ہوں۔  
(اتباع المنیب صفحہ: ۲۸)

ستر وال اعتراض..... بعض لوگ حج کے بعد بد عمل کیوں ہو جاتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے، اس کو چھونے کے بعد انسان کا اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے جو حالت پہلے سے مخفی تھی وہ اب کھل جاتی ہے، اگر طبیعت میں نیکی تھی تو پہلے سے زیادہ نیک ہو جاتا ہے اور اگر بدی تھی تو وہ بدی اب نکل جاتی ہے، بہت لوگ ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں، مگر کسوٹی پر لگانے سے کھرا کھونا معلوم ہو جاتا ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بے غش باشد

اے بسا خرقتہ کہ مستوجب آتش باشد

خوش بود گر مہک تجزیہ آید بہ میاں

تاسیہ روئی شود ہر کہ در و غش باشد

شاید تم کہو کہ اچھا ہوا تم نے یہ بات ظاہر کر دی، اب تو ہم حج ہی کو نہ جانیں گے، نہیں صاحب! حج کو جاؤ، مگر اکسیر بن کر جاؤ اور لو میں تم کو اکسیر بننے کا طریقہ بھی بتلاتا ہوں، وہ یہ ہے کہ کسی کی بیباگری سے تعلق پیدا کر لو۔

کیمیائیت عجیب بندگی پیر مغاں  
خاک او گشتم و چندیں درجا تم دادند  
کیمیاگر سے میری مراد یہ لنگوٹی باندھنے والے نہیں ہیں، بلکہ باطن کے کیمیاگر مراد ہیں، جن کو  
اہل اللہ کہتے ہیں، ان کی شان یہ ہوتی ہے:

آہن کہ پارس آشنا شد  
فی الحال بصورت طلا باشد

پارس ایک پتھر ہوتا ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں لوہے کو اس سے مس کیا فوراً سونا بن  
جاتا ہے، اہل اللہ کی تو یہ خاصیت مشاہد ہے، پارس میں یہ بات ہو، یا نہ ہو، اہل اللہ کی صحبت سے تو  
یہ نصح حاصل ہو جاتی ہے جس سے پہلی تمام کنگدگیاں دھل جاتی ہیں، پس تم کو چاہیے کہ کسی اللہ  
والے سے تعلق پیدا کر کے حج کو جاؤ، اس کی صحبت سے تم کو توبہ خالص عطا ہوگی، توبہ کر کے جاؤ گے  
تو پھر حج کا یہ اثر ہوگا کہ پہلے سے زیادہ تم کو اعمال صالحہ کی توفیق ہوگی، میرا یہ مطلب نہیں کہ مرید  
ہو کر جاؤ، اس کی ضرورت نہیں، صرف تعلق محبت اور چند روزہ صحبت کی ضرورت ہے۔

(محاسن الاسلام صفحہ: ۳۷۷)

اکہتر واں اعتراض..... جب بری باتوں سے بچانا نماز کا خاصہ ہے تو پھر اس

کے خلاف کیوں ہوتا ہے!

اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نماز کس شان کی پڑھتے ہیں؟ اے صاحب! آپ کی نماز کی ایسی مثال  
ہے جیسے کوئی کہے کہ مجھے آدمی کی ضرورت ہے اور آپ اس کے سامنے ایک اپانچ مضعہ گوشت  
(گوشت کا لوتھڑا) کولا کر پیش کر دیں اور جب وہ کہے کہ میں اپانچ کولے کر کیا کروں؟ یہ بھی کوئی  
آدمی ہے؟ آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ صاحب! تم نے آدمی کا کہا تھا، میں نے آدمی  
لا دیا، دیکھ لو یہ حیوان ناطق ہے، نہیں؟ تو بے شک وہ معقولی آدمی تو ہے، مگر آدمی نہیں، وہ اس  
قابل نہیں جس سے آدمیوں کے کام لیے جائیں۔

ہماری نمازیں

بس یہی حال ہماری نماز کا ہے کہ نماز کو تو نماز ہے، مگر اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نہ ہاتھ ہیں،  
نہ پیر ہے، نہ منہ، نہ سر ہے، نہ آنکھیں، اگر ہاتھ ہے تو سر کٹا ہوا ہے، سر ہے تو آنکھیں اندھی ہیں،

اہل حقیقت تو ایسی نماز کو کا عدم سمجھتے ہیں، جیسے پانچ مضافہ گوشت کا عدم سمجھا گیا تھا، مگر فقہاء نے اسے دیکھ کر کہ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے، اگر نہ ہونے کا حکم لگا یا جائے تو لوگ اسے بھی چھوڑ بیٹھیں گے، اس پر صحت کا حکم لگا دیا، مگر یہ حکم صحت و یا یہی ہے جیسے آپ نے پانچ کو انسان ناطق ہونے کی وجہ سے آدی کہا تھا، پس ایسے ہی آپ کی نماز اصطلاحی نماز تو ہے، مگر حقیقی نماز نہیں ہے۔

### صورت نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیں، نہیں صاحب! ہاں بیکار یہ بھی نہیں، نہ ہونے سے اس کا ہونا پھر بھی بہتر ہے، کیونکہ بعض دفعہ اگر نظر عنایت ہو جائے تو حق تعالیٰ کے یہاں صورت بھی قبول ہو جاتی ہے، مولانا نے ایسی نماز کے قبول ہونے کی عجیب مثال دی ہے فرماتے ہیں:

این قبول ذکر تو از رحمت است

چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یعنی جس طرح عورت مستحاضہ (وہ عورت جس کو حیض کے علاوہ بیماری کا خون آ رہا ہو) کی نماز شرعاً صحیح مانی گئی ہے، حالانکہ نماز کے اندر بھی اس کا خون جاری ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ناپاک ہے، مگر محض رحمت کی بناء پر اس کو قبول کر لیا جاتا ہے، یہی حالت ہماری تمام نمازوں کی ہے کہ گو حقیقت کے لحاظ سے وہ کا عدم ہیں، مگر حق تعالیٰ کی نظر عنایت سے کبھی یہ بھی قبول ہو جاتی ہیں، نیز بعض دفعہ شدہ شدہ یہ نماز حقیقی کی طرف وسیلہ ہو جاتی ہیں، جیسے بعض طلبہ بد شوق ہوتے ہیں، نہ مطالعہ کر کے پڑھتے ہیں، نہ پڑھ کر دیکھتے ہیں تو ان کا اس وقت پڑھنا، نہ پڑھنے کے مشمل ہے، مگر شفیق استاد اس کو مکتب سے نہیں نکالتا اور یہ کہتا ہے کہ گو یہ اس وقت شوقین طالب علم کے برابر نہیں، مگر شدہ شدہ شوق کی امید ہے، چنانچہ اکثر ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ جن طالب علموں کو ابتداء میں شوق نہ تھا، جب وہ عرصہ تک کام میں لگے رہے تو ایک وقت خود بخود ان کو شوق پیدا ہو گیا، انہیں اسباب پر نظر کر کے حضرات فقہاء نے ایسی نمازوں پر صحت کا حکم لگا دیا اور واقعی فقہاء کا وجود بھی امت کے لیے رحمت ہے، پس آپ اپنی نماز کو بیکار تو نہ سمجھیں، مگر کامل بھی نہ سمجھیں۔

### اعتراض کا جواب

اب اعتراض کا جواب ہو گیا کہ نماز کی تاثیر تو حق تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے کہ: ”تسبھن عن الفحشاء والمنکر“ اور ہم اپنے اندر یہ اثر نہیں پاتے، تو بات یہ ہے کہ یہ شان کامل نماز کی ہے

اور آپ کی نماز کامل نہیں، اس لیے اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، ہم نماز کو بری طرح ادا کرتے ہیں جیسے کوئی جو شانہ کو سونف بنا کر پھاٹک لے، تو بتلائیے! نفع کیونکر ہو؟ دوسرے یہ کہ جیسی ہماری نماز ہے ویسی اس کی ”نہی عن الفحشاء“ بھی ہے، اگر کامل نماز ہوتی تو وہ ہم کو تمام فحشاء سے روک دیتی ہے، اب ناقص نہ تو کسی قدر فحشاء سے روک دیتی ہے اور اس کا انکار نہیں ہو سکتا، تجربہ ہے کہ نمازی آدمی عموماً بے نمازیوں سے کم گناہ کرتے ہیں اور ادنیٰ نفع تو یہی ہے کہ نمازی آدمی کے پاس کوئی کافر بہکانے کے واسطے نہیں آتا، کفار جس کو نمازی دیکھتے ہیں، اس کو دین کا پابند اور پختہ سمجھ کر کچھ نہیں کہتے، اس سے وہ ناامید ہو جاتے ہیں کہ یہ ہمارے بہکانے میں نہیں آ سکتا۔

(ابواب الیتامی صفحہ: ۶۱)

## بہتر وال اعتراض..... معراج میں دیدار باری تعالیٰ!

دنیا میں خدا کو دیکھنا محال عادی و شرعی ہے، محال عقلی تو نہیں! کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا، جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے اور دنیا میں بھی وجہ احتمالہ رویت ادھر سے نہیں، بلکہ ہماری طرف سے ہے، ہم اس کے تحمل نہیں، ورنہ حق تعالیٰ میں خفاء نہیں، وہ تو یہاں بھی ظاہر ہیں، اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حق تعالیٰ کی صفت باطن بھی تو ہے چنانچہ نص میں ہے ”ہو الظاهر والباطن“ پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفاء نہیں؟ صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں خفاء ہے، اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفاء ہے، بلکہ غایت ظہور سے بطون (پوشیدگی) ہو گیا، رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہو گیا؟ اس سے تو ظہور ہونا چاہیے تھا، تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لیے غیبت و خفاء کی بھی ضرورت ہے، اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو تو اس کا ادراک نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک التفات سے ہوتا ہے اور التفات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے، جو چیزیں کل وجہ حاضر ہو، اس کی طرف التفات (توجہ) نہیں ہوگا، یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں، پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا، کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں، اس لیے اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو؟ اسی طرح بلا تشبیہ بھی ناقص ہے، حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت و خفاء کا نہیں، اس لیے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں، ہم

کو دھوپ کا ادراک اس لیے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہو جاتی ہے، اگر نہ ہوتی تو آپ اس کو دیکھتے مگر ادراک نہ ہوتا، دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفاءِ ضوء ہی کا نام ہے، نیز اگر غیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی، دن میں جو لذت ہے وہ اسی لیے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔

از دست جگر یار شکایت نمی کنم  
گر نیست غیبتی نہ دہد لذت حضور

### دیدار الہی

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں، اسی لیے خفاء ہو گیا، کیونکہ ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے، ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا، ہاں! آخرت میں یہ ادراک قوی ہو جائے گا، تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہوگا، وہاں روح کا بھی انکشاف ہوگا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہوگا اور معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے، حجاب ہماری طرف سے تھا، ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں، جیسے خفاش میں آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے:

شد ہفت پردہ بر چشم این ہفت پردہ چشم  
بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

یعنی آنکھ کے ساتھ پردے ہی دیدار سے مانع ہو گئے، تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے، ادھر سے مانع کوئی نہیں، اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھ پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہوگا، آفتاب کو مخفی نہ کہا جائے گا اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر آتا ہے: ”لا یبقی علی وجہہ الارداء الکبریٰ“ (اس کے چہرہ پر کبریائی کی چادر کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہے گی) وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں، آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے تو مگر کنہ کا ادراک نہ ہوگا اور رویت کے لیے ادراک کنہ لازم نہیں، ہم یہاں بھی بہت سی چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا، بہر حال دنیا میں رویت الہی محال عادی ہے، چنانچہ حدیث مسلم ہے: ”انکم لم تروا ربکم حتی تموتوا“ (تم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکو گے یہاں تک کہ تم کو موت آجائے) اور نص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے: ”لئن ترانی“ (تو ہرگز مجھے نہ دیکھ سکتا گا) یہ

جواب قابل دید ہے، حق تعالیٰ نے ”لن ترانی“ فرمایا، ”لن ارى“ نہیں فرمایا، بتلادیا کہ میں تو اب بھی قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں، میری طرف سے کوئی حجاب نہیں، مگر تم میں قوت دیدار نہیں، تم مجھے اس وقت نہیں دیکھ سکتے، محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے، ہاں! تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے حجابات اٹھادیئے تھے، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئے۔

## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الہی معراج میں ہوئی ہے

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اختلاف ہے کہ معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں؟ اس میں اکثر علماء اور صوفیہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا ہے، مگر اسی کے ساتھ محققین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ آیت سورہ نجم کی تفسیر اس حدیث سے صحیح نہیں ہے، کیونکہ ”عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ“ یقیناً جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں، ان صفات کا عنوان بیان اس کو مقتضی ہے، کیونکہ حق تعالیٰ پر ”شديد القوى“ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب آگے چلیے ”فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ“ بھی انہیں کی صفت ہو سکتی ہے اس کا مرجع جبرائیل علیہ السلام ہیں، کیونکہ ”استوی بالافق“ بھی انہیں کی صفت ہو سکتی ہے، اس کے بعد ”ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ“ میں سب ضمیریں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف راجع ہیں، حق تعالیٰ کی طرف راجع نہیں، ورنہ انتشار ضماں لازم آئے گا، یہ روایت حضرت جبرائیل علیہ السلام تو دنیا میں ہوئی تھی، آگے فرماتے ہیں: ”وَلَقَدْ رَأَوْهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ“ یہ دوبارہ روایت سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بہت دفعہ دیکھا ہے، مگر یہاں اصلی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے، وہ دوسرے ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہو جبرئیل“، یعنی یہ روایت حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تھی، باقی جو علماء معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس روایت کے قائل ہیں، وہ دوسرے دلائل سے استدلال کرتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہے اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ان کی سند صحیح ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول تو مسلم میں ہے اور سیوطی رحمہ اللہ نے متدرک حاکم سے اس باب میں

حدیث مرفوع نقل کی ہے، پس قرآن میں گواہی روایت کا ذکر نہیں، مگر جب یہ حضرات حکما جیسے نبی اللہ عنہم اس کا اثبات کرتے ہیں، تو یقیناً انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

## آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ

اب ان علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں روایت مجال عادی ہے، مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ دلیل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا ثابت ہو چکا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استعمال روایت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی، ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہی نہیں مگر شیخ ابن عربی نے عجیب تحقیق لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ میں استثناء کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ اپنے عموم پر بحالہ باقی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت سے اس پر نقض وارد نہیں، کیونکہ ہم تو معراج میں روایت کے قائل ہیں اور معراج عرش تک ہوئی ہے اور سماوات و عرش مکان آخرت ہیں، وہ دنیا میں داخل نہیں، بلکہ اس سے خارج ہیں تو ممکن ہے کہ اس مکان کی یہ خاصیت ہو کہ جو شخص وہاں پہنچ جائے خواہ مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے، اس میں قوت تحمل (برداشت) روایت پیدا ہو جائے، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر موجود ہیں اور وہاں کھانے پینے اور بول و براز (پاخانا، پیشاب) سے منزہ ہیں، صرف ذکر اللہ سے ان کی حیات ہے، کیوں؟ اس لیے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں ہیں، بلکہ مکان آخرت میں ہے اور مکان آخرت کی خاصیت مکان دنیا سے الگ ہے، اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ غذا سے فضلات پیدا ہوں تو ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت ہو کہ فضلات پیدا نہ ہوں، اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ حرکت سے حرارت بدن تحلیل ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ وہاں کی یہ خاصیت نہ ہو، اسی طرح یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن نہ ہو اور وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن ہو، یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک دن موت ضرور آتی ہے، وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے، اسے کبھی موت نہ آئے جیسے کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے۔

ہر سوختہ جانے کہ یہ کشمیر در آید  
گر مرغ کباب است کہ بالبال و پر آید

## دنیا و آخرت میں فرق!

خیر یہ تو شاعرانہ مبالغہ ہے، مگر اتنی بات تو مشاہدہ ہے کہ دنیا میں بھی ہر جگہ یکساں خاصیت نہیں، بلکہ بعض جگہ کی کچھ خاصیت ہے، بعض شہروں کی کچھ خاصیت ہے، بعض ملکوں میں عمریں کم ہوتی

ہیں اور بعض ملکوں میں لمبی لمبی ہوتی ہیں، بعض مقامات کے آدمی کمزور ہوتے ہیں اور بعض مقامات کے بہت قوی اور توانا و تندرست ہوتے ہیں، بعض ملکوں میں بیماریوں کی کثرت ہے، آئے دن طاعون و ہینہ پھیلا رہتا ہے اور بعض ملکوں میں کوئی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں جانتا جب ایسا اختلاف خاص دنیا کے مکانات میں بھی مشاہد ہے تو اس میں کیا اشکال ہے کہ مکان آخرت کی خاصیت دنیا سے بالکل الگ ہو؟ ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس تحقیق سے سب معادیات کھل ہو جائیں گی اب نہ وزن اعمال میں اشکال ہے، نہ رویت خداوند تعالیٰ میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے، معتزلہ کی عقل ماری گئی جو انہوں نے خواہ مخواہ ان امور کا انکار کیا جس کا منشاء بجز قیاس الغائب علی الشاہد کے کچھ نہیں اور قیاس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

غرض شیخ ابن عربی کا تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے، زمان آخرت تو مرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے۔

چنانچہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جملہ اہل سنت کا قول ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں، تو کیا وہ دنیا میں ہیں؟ اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہو جائے گا جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا، جنت و دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں اس کا جواب اہل حق کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا ہے اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے، تم نے وہ نہیں پڑھا، وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے، اس لیے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب ان کا پتہ چلتا بس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ ان کو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں، معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے اور جس طرح زمان آخرت میں رویت ممکن ہے، اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے، گودیکھنے والا بھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو، پس قاعدہ مذکورہ مشفق (ٹوٹا) نہیں ہوا جس رویت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں نہ تھی، بلکہ مکان آخرت میں تھی اور دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بھی رویت ممکن نہیں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام گو قوی بشریہ میں سب سے اکمل ہیں مگر پھر بھی بشر ہیں۔ (تحصیل المرام صفحہ: ۵)

تہتر واں اعتراض..... درود پڑھ کر حضور ﷺ پر کوئی احسان سمجھنا غلط ہے!

اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نفع نہیں ہوتا، جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے، ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا“ اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپے



ہیں، ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دے دیں، تو اس نوکر کو مقبول بنانے کو اس کی عزت بڑھانے کی ایسی صورت تجویز کی ہے، نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے، اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لیے تجویز کر لیا گیا ہے صرف نوکر کی عزت افزائی کے لیے ایسا کیا ہے، یہی حال درود شریف کا ہے حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ رحمت کی دعا کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رحمت بھیجنا تو منظوری ہی ہے، خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں، چنانچہ اسے قبل: "إِنَّ السَّلَامَ وَمَلَكُوتَهُ يُصَلُّونَ عَلَيَّ النَّبِيِّ" موجود ہے، مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہہ دیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا، کوئی شخص کیا مینا لے کر کہہ سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت ہوگی، یہ شبہ شاید کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لیے رفع کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں، اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود، لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا ہے، سو اگر ہمارے عمل کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا ہے تو جیسے اور اعمال ہیں، یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ کبھی مقبول اور کبھی مردود ہوتا، سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے، اس کی کہ معلوم ہو کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں، حق تعالیٰ ضرور رحمت بھیجتے ہی ہیں، ہم درود بھیجیں، یا نہ بھیجیں، اس لیے درود شریف کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا۔

### درود شریف کا فائدہ

بس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجتا ہے ہی، ہم کو جو حکم دیا تو صرف ہماری عزت بڑھانے کے لیے، نیز ہمارے اعمال ظاہر ہیں کہ مقبول ہونے کے قابل ہیں نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے، پھر ہمارا درود پڑھنا کالعدم ہوا، مگر پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت ہوتی ہے، کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درود بھیجتا ہوں، تب ہی رحمت ہوتی ہے، اگر ہم آفتاب کے سامنے ہو گئے تو آفتاب نے ہم کو منور کر دیا، آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں، پس علماء کے قول سے بھی اس کی تائید ہو گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں۔ البتہ اس مقام پر ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ثواب پہنچتا ہے، تو اگر ہم عمل نہ کریں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا؟ پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا، جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تعلیم فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں ماجور تو ہو گئے، اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل

کرنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جی خوش ہوتا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں امتی نے یہ عمل کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوتے ہیں، بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں۔ (ذکر الرسول صفحہ: ۳۰)

## چوتھوں اور اعتراض..... مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے!

اس وقت عام طور پر مسجد آراستہ کیا جاتا ہے مجالس اسلام کو آرائش و زیبائش سے بالکل تھیز بنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہئے۔ اے حضرات! غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں، آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ان کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے؟ اگر وہ بھی ضد باندھ لیں تو یقیناً آپ ان کے مقابلہ میں شرمندہ ہوں گے، اس لیے آپ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیروی کیجئے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑیئے، بس ایک سچے مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیے:

دل فریبیاں بناتی ہمہ زیور بستند

دلبر ماست کہ حسن خداداد آمد

یہود اپنی زینتیں دکھلائیں، نصاریٰ اپنی زینتیں دکھلائیں، ہنود اپنی زینتیں دکھائیں اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کرتا پہن کر نکلے گا، تو خدا کی قسم! سب کی رونقوں کو ماند کر دے گا، ارے صاحب! خدا نے وہ حسن آپ کو دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت ہی نہیں، اے حسین! خدا نے تجھے وہ حسن دیا ہے کہ تیرے حسن کے آگے آفتاب، ماہتاب شرماتے ہیں، ارے! تو پوڈرل کے کاہے کو اپنے قدرتی حسن کو پوشیدہ کرتا ہے؟ تجھے اپنے حسن کی خبر نہیں، یہ عارضی حسن تیرے اصلی حسن کو پوشیدہ کیے دیتا ہے متنبی کہتا ہے:

حسن الحضارة مجلوب بطرية

و فی البداوة حسن غير مجلوب

یعنی شہر کی عورتوں کا حسن تو بناؤ سنگھار سے ہے اور دیہاتی عورتوں کا حسن خداداد ہے، واقعی ایک دیہاتی عورت اگر حسین ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کے قومی بھی اچھے ہوتے ہیں اور محنت کی عادت کی وجہ سے صحت عمدہ اور جسم توانا ہوتا ہے، شہر کی حسین عورت سے جو بیسیوں تکلفات سے اپنے حسن کو بڑھالیتی ہے، بہت اچھی معلوم ہوتی ہے، ارے صاحب! مجلس اسلامی کے لیے یہ

حسن اور شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے، تم نے اسلامی مجلس منعقد کی، اس کو شہنشاہِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربارِ ظہر آیا اور اس کو اتنا بھی آراستہ نہ کر سکے جتنا کہ ولی کا دربار اور سلطین یورپ کے دربار یا یورپ کے بڑے بڑے تھیٹر، تو تم نے گویا ایک نقل کی اور کوئے کی طرح ہنس کے مقابلہ میں ذلیل ہوئے۔

## مجلسِ اسلامی کی شان

ارے صاحب! مجلسِ اسلامی ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خیر ہو جائے کہ یہ مجلسِ اسلامی ہے، یہ کسی ناچ رنگ یا تھیٹر یا سرکس کا اسٹیج نہیں ہے، باہر سے مجلس بالکل سادہ ہو اور اس کے بعد اندر پہنچیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کا رنگ جھلکتا ہو یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے، لباس نہایت پر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر برادار سے روساء کا سا تکبر نمایاں ہو اور حقیقت کا پتہ نہیں اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زیب و زینت وہ شخص کرتا ہے، جس کے پاس مال ہے، کمال نہیں ہے، ورنہ بجائے مال کے اپنے کمال کا اظہار کرتا اور اب کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے، مولانا رومی رحمہ اللہ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ گنجا آدمی اپنے سر کا عیب چھپانے کے لیے خوب صورت ٹوپی کا اہتمام کرتا ہے اور جس کا سر اور بال درست ہوں تو وہ یہ چاہے گا کہ ٹوپی ہی نہ ہو تو بہتر ہے، تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسی خوبصورت مانگ اور کتنے اچھے بال ہیں، حضرات! میں بقتسم کہتا ہوں کہ اگر قلب میں حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہوگی اور اگر حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان و شوکت سے اس کی لپ پوت کریں گے، مجالسِ اسلامیہ میں کیسا بناؤ؟ اسلام کی طرح مجالسِ اسلامیہ میں بھی سادگی ہونی چاہئے۔

غرض انجمنوں میں بہت سے واعظین کا جمع کرنا یہ سب اسی افتخار اور زموود و اظہار کے لیے ہوتا ہے اور اس میں ایک غرض اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے کوئی کسی کو سب کو جمع کر لو، تا کہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو، میں کہتا ہوں کہ اگر آپ صحیح غرض کے لیے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے مذاق کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کوئی روپیہ تقسیم کر رہا ہو تو سائل خود بجمع ہو جائیں گے، اس اشتہار کی کیا ضرورت ہے؟ جو سائل روپیہ لینے آئے گا اسے مشائی بھی ملے گی، معلوم ہوتا ہے روپیہ جعلی ہے، اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور جمع ملانے بک جائے گا ورنہ متقی اور متبع عبارت بولنا پڑے گا، حضرت! اپنا متاع خالص رکھیے، دیکھئے خود بخود خریدار آئیں گے، اسی طرح حق ایسی چیز نہیں کہ اس کی طرف کشش نہ ہو، اہل حق اور طمع سازوں کے کلام

میں بھی فرق ہے کہ طمع سازوں کی آمد بڑی رنگیں ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور و زخم ہوتا ہے مگر حاصل سوائے قافیہ بندی کے کچھ نہیں۔

### اہل حق کا کلام

اہل حق کے کلام میں ابتداء تو بہت دھیمی ہوتی ہے، مگر انتہاء میں زور اور قوت اور خاص اثر ہوتا ہے، ابتداء ان کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں آہستہ آہستہ ایسی بارش کی طرح جذب ہو جاتی ہے، مگر اس کا انتہائی اثر گلزار اور گل بار ہوتا ہے۔  
بقول مولانا رومی رحمہ اللہ:

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ  
خاک شو تا گل بروید رنگ برنگ

اور طمع ساز اپنا رنگ جمانے کے لیے ابتداء میں خوب مثنوی کے اشعار پڑھتے ہیں اور کہیں کہیں اب تو ڈھولک، ستار اور ہارمونیم سے بھی مجلس کو گرم کیا جاتا ہے، مضامین کے الفاظ دل گزار ہوتے ہیں کہ اس وقت تو ذرا سا جوش پیدا ہو جاتا ہے، پھر جہاں مجلس برخواست ہوئی، اثر بھی تشریف لے گیا اور جو ذرا سا باقی رہ گیا وہ دو چار روز کا مہمان ہوتا ہے اور اہل حق کا اثر پائیدار ہوتا ہے، مگر کلام ان کا رنگین نہیں ہوتا، پس ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسا ایک چمکدار گلت کے چمچے اور رنگ آلود روپے میں، روپیہ کا رنگ اگر نہ بھی چڑھاؤ وہ تب بھی سولہ ہی آنے کو چلتا ہے اور گلت کے چمچے پر اگر گلت بھی چڑھا رہے تو پھر بھی اسے کوئی نہیں پوچھتا اور اگر وہ بھی اتر جائے تو پھر وہ کچھ بھی نہیں، غرض روپے کو سفیدی اور چمک کی حاجت نہیں اور وہ گلت کا چمچے اپنے سفید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور بظاہر روپے سے بھی زیادہ چمکدار ہے، اس کی سفیدی اور چمک تھوڑے دنوں کی ہے کہ اس کے بعد دو کوڑی کا بھی نہ ملے گا۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بے غش باشد

اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

جب یہ کسوٹی آئے گی تو روپیہ تو سامنے آکھڑا ہوگا اور گلت کا چمچے منہ چھپاتا پھرے گا۔

نہ باشد اہل باطن در پئے آرائش ظاہر

بہ نقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت سادہ زندگی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم

میں تکلف اور ظاہری وجہ میں کوئی شان و شوکت نہ تھی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے باوجود  
یکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کے قادر اور انتہاء درجہ کے متین تھے، مگر ساتھ ہی اس کے نمایاں  
بے تکلف تھے۔ (اصلاح الیتامی صفحہ: ۱۲)

چکھڑ وال اعتراض..... حضرات انبیاء علیہم السلام واولیائے کرام کی

### حیات برزحیہ کا اثبات!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لیے بہت کچھ شرف حاصل ہے، کیونکہ جسداظہر اس  
کے اندر موجود ہے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود یعنی جسدمع تلبس الروح اس کے اندر تشریف  
رکھتے ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں زندہ ہیں قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق  
ہیں، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی یہی اعتقاد ہے، حدیث میں بھی نص ہے:  
”ان نبی اللہ حی فی قبرہ یرزق“ (اللہ کے نبی اپنی قبر میں بلاشبہ زندہ ہیں، رزق پاتے  
ہیں) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رزق پہنچتا  
ہے، مگر یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے، وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو  
حیات برزحیہ کہتے ہیں۔

### حیات برزحیہ کے مراتب

باقی یہ ہے کہ حیات برزحیہ تو سب کو حاصل ہے، پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص ہے؟ تو اس کی  
تحقیق یہ ہے کہ اس کے مختلف مراتب ہیں، ایک مرتبہ تو تمام مؤمنین کو حاصل ہے جس کے ذریعے  
سے تعلیم قبر کی ہر مسلمان کو حس ہوگی، دوسری حیات شہداء کی ہوگی، تمام مؤمنین کی حیات برزحیہ  
سے اتوی ہوگی، عام مؤمنین کی حیات برزحیہ بہ نسبت شہداء کے کمزور ہوتی ہے، اگرچہ اس حیات  
ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلیٰ ہو، پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ عام مؤمنین کی حیات برزحیہ اس حیات دنیویہ  
سے کمزور ہوگی اور حیات شہید کے اتوی ہونے کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھا سکتی  
ہے اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیات کا۔

## شہید کی حیات

پس شہید میں اس کا اثر ظاہر ہوتا اور عام مؤمنین میں نہ ہونا، یہ دلیل ہے شہید کے حیات کے قوی ہونے کی بد نسبت عام لوگوں کی حیات کے، بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے، کہتے ہیں مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے، مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی، کیونکہ جس طرح اس کے خلاف مشاہدہ ہوا ہے، اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے، جب دونوں طرح مشاہدے موجود ہیں تو سرے سے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ بہت سے بہت یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلی نہیں، اکثری ہے اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا جائے گا، باقی مطلقاً انکار تو صحیح نہیں ہو سکتا، یہ تو جواب تسلیمی ہے، اس تقدیر پر جب کہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف کیا ہے وہ شہید ہی تھا، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو، کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں کہ معرکہ میں قتل ہو جائے بلکہ حقیقی شہادت کے لیے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں، مثلاً نیت کا خالص لوجہ اللہ ہونا، جس کی خبر سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتی، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس کو آپ نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے، وہ شہید حقیقی نہ تھا، صرف شہید احکام تھا اور یہ حیات کا قوی درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہوگا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارضی کی وجہ سے ایسا ہوا ہوگا کہ اس کی لاش گل گئی، مثلاً اس جگہ کی مٹی تیز ہو، ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی تو اس لازماً نہ جلے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کر دیا جائے، جیسا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ مثل شوریت زمین وغیرہ کے نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گٹے گی، بعینہ محفوظ رہے گی۔

## انبیاء علیہم السلام کی حیات

تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخہ کا ہے، وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کے لیے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھا سکتی، حدیث میں ہے:

”حرم اللہ احساد الانبیاء علی الارض“ اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے جسموں کو زمین پر حرم کر دیا ہے۔“

اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں، مگر مخصوص ہے اور وہ حرمت نکاح ازواج انبیاء علیہم السلام ہے کہ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں، نیز انبیاء

علیہم السلام کی میراث وراثہ میں تقسیم نہیں ہوتی: ”نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما خلفنا“ صدقہ انبیاء علیہم السلام کا تمام ترکہ صدقہ ہوتا ہے، یہ باتیں شہید کے لیے شریعت نے مشروع نہیں کیں، تو اگرچہ شریعت نے اس کا کوئی خاص راز نہیں بیان کیا، مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں کہ اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے، ان دونوں امر سے اور گواہان نبی سے بعد وفات نبی کے نکاح حرام ہونا تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں منقول نہیں ہوا۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے، مگر علماء میراث پر قیاس کر کے اس حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لیے سمجھتے ہیں اور میراث کا تقسیم ہونا حدیث سے جملہ انبیاء علیہم السلام کے لیے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے، تو اس امتیازات سے حیات برزخہ انبیاء علیہم السلام کا شہداء اور عام مؤمنین سے اقویٰ ہونا ثابت ہوا، بہر حال یہ بات باتفاق امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں۔

### نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات

اور خاص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں، ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا اقرار ہے، چنانچہ ایک واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہو جائے گا: تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند صدی بعد (یاد نہیں رہا کہ کس بادشاہ کے وقت میں) وہ شخص مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اطہر کے نکالنے کے لیے آئے تھے، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور دن بھر نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے، لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے تھے، وہ کم بخت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے اور جس قدر سرنگ کھود لیتے راتوں رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے اور جگہ برابر کر دیتے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے، کئی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے، جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا، حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب متنبہ کر دیا۔

(اس سلطان کا نام نور الدین زنگی رحمہ اللہ تھا۔ یہ واقعہ علامہ سمودی رحمہ اللہ نے وفاء الوفاء فی اخبار دار المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں نقل کیا ہے۔ محمد عرفان الحسن خالد)

### سلطان مدینہ کا خواب

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر حزن و غم

کے آثار ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بادشاہ کا نام لے کر فرما رہے ہیں: ”مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذا دے رکھی ہے، جلد مجھے ان سے نجات دو۔“ خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلا دی گئی، خواب سے بیدار ہو کر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا، وزیر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے، آپ جلد مدینہ تشریف لے جائیں، بادشاہ نے فوراً فوج کے ساتھ بہت تیزی کے ساتھ مدینہ کی طرف سفر کیا اور بہت جلد مدینہ پہنچ گیا، اس عرصہ میں وہ ایک بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہنچ گئے تھے، ایک دن کی بادشاہ کو اور تاخیر ہو جاتی تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے۔ بادشاہ نے مدینہ پہنچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازے سے باہر نکلنے کا حکم کیا اور خود دروازے پر کھڑے ہو کر ہر شخص کا چہرہ خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ مدینہ کے سب مرد و شہر سے باہر نکلے آئے، مگر ان دو شخصوں کی صورت پر نظر نہ بڑی، جن کو خواب میں دیکھا تھا، اس لیے بادشاہ کو سخت حیرت ہوئی اور لوگوں سے کہا کیا سب لوگ باہر آ گئے؟ لوگوں نے کہا اب کوئی اندر نہیں رہا، بادشاہ نے کہا: یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، ضرور کوئی اندر رہا ہے۔

### سرنگ کھودنے والے پکڑے گئے

لوگوں نے کہا کہ دو زاہد اندر رہ گئے ہیں، وہ کسی کی دعوت میں جایا نہیں کرتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں، بادشاہ نے کہا مجھے ان ہی سے کام ہے، چنانچہ وہ پکڑ لائے گئے تو بعینہ وہ دو صورتیں نظر پڑیں، جو خواب میں دکھلائی گئی تھیں، ان کو فوراً قید کر لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ایذا دی ہے؟ چنانچہ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر نکالنے کے لیے سرنگ کھودی ہے، چنانچہ خود بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم مبارک تک پہنچ چکی ہے، بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسہ دے کر سرنگ بند کروادی اور زمین کو پانی کی تہہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلا دیا تاکہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح سالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کئی سو برسوں بعد بھی اس کے نکالنے کی کوشش کی، اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ سرنگ کیوں لگاتے؟ محض وہم و شبہ پر اتنا برا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتا، وہ لوگ اہل کتاب ہیں، وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی، وہ خوب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق تھے، بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے، غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے۔ (الحجہ رصفی: ۱۴۰)



## چہتر واں اعتراض..... علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک نہیں!

تجوید کی یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا، جب نماز میں قرآن نہ پڑھا گیا تو نماز کیسے صحیح ہوگی؟ شاید یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے عربیت نہیں رہتی، مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں، سب کو معلوم ہے کہ عربی، فارسی، اردو جدا جدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں، پس جس طرح کسی لفظ کے فارسی یا اردو ہونے کے لیے تلفظ کی صحت شرط ہے، اسی طرح لفظ کے ہونے کے لیے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے، مثلاً آپ ایک کپڑے کو ”گاڑھا“ کہتے ہیں اس میں ”ز“ کا ہونا اور ہائے معنی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے بجائے ”گارا“ کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے، کیونکہ ”گارا“ تو مٹی کا ہوا کرتا ہے، کپڑے کی کوئی قسم ”گارا“ نہیں، اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ ”ٹا“ سے مرکب ہے، وہاں ”سین“ یا ”صاد“ پڑھ دینے سے یا ”حا“ کی جگہ ”ھا“ پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جائیں گے، اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوئی اب صفات کی بابت میں لکھتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ ”پنکھا“ ہے جس میں ”نون“ کے اخفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے، اسی طرح ”رنگ“ اور ”جنگ“ میں جو فارسی الفاظ ہیں، ”نون“ کو ظاہر کر کے نہیں پڑھا جاتا، اب اگر کوئی پنکھا کو باظہار نون ”پن کھا“ کہے، یا ”رنگ کو ”رن گ“ کہے تو آپ کہیں گے کہ اردو، فارسی نہیں رہی مہمل لفظ ہو گیا، لیکن اس کے کہنے سے آپ بندھ گئے اس طرح کہ جب اس لفظ میں اظہار نون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفاء ہے، وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار نون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا، تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟

## تجوید سیکھنا فرض ہے

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے، کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے، جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدون تجوید کے نہیں آ سکتا، تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا، صاف جوا چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں، مگر تجوید کی فی نفسہ بہت ضرورت ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لیے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں، اگر آج ملازمت کے لیے یہ قانون ہو جائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہوگا اس کو ملازمت دی جائے گی،

تو آج یہ سارے بی اے، ایم اے قاری ہو جائیں، ہم لوگ متاع دنیا کے لیے سب کچھ کر لیتے ہیں، اس لیے یہ سارے عذر جو بیان کیے جاتے ہیں، محض بہانے ہیں۔

(اسباب الفتنہ صفحہ: ۲۶)

## ستتر واں اعتراض..... علماء کا باہمی اختلاف اور ہمارا فرض!

یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ علماء میں باہم سخت اختلاف ہے، کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے، تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے، کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اسے بدعت بتلاتا ہے، اب کس کی مانیں؟ اور کس کی نہ مانیں؟ یا سب پر عمل کریں، یہ غیر ممکن ہے، یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں تو ترجیح کی وجہ کیا؟ لہذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں، مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورت اختلاف فنون دنیا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا؟ وہاں کسی ایک کو ترجیح دے کر کیوں پکڑا؟ یعنی بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے، کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے، کوئی کچھ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لیے مہلک بتلاتا ہے، وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا؟ اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس! اطباء میں اتفاق ہی نہیں، اب ہم کس کا علاج کریں؟ بس جاؤ مریض کو مرنے دو، ہم کسی کا بھی علاج نہیں کرتے، وہاں ایک حکیم کو ترجیح دے کر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں؟ علی ہذا اپنے وکلاء کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے؟ کیا وکلاء میں باہم اختلاف نہیں ہوتا ہے؟ اور یقیناً ہوتا ہے، پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ اور سب کو کیوں نہیں چھوڑا جاتا؟ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟

## ضروری سمجھنے کے بعد!

لیجئے میں ہی اس کا جواب دیے دیتا ہوں جو ایک گہری بات ہے، وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں، ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے، دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے، جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے، ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتا ہے اور جن باتوں کی

ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے، وہاں تدبیر و تامل کے ساتھ ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی، یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیکہ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں، جان اور ایمان جان چونکہ عزیز ہے، اس لیے اس کی صحت و حفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے، اس سے گھبرانا نہیں چاہیے، ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہیوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ذاکروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے؟ بس اس کا علاج اختیار کر لیں گے اور ایمان عزیز نہیں، اس لیے علماء کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور و تامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں، تو اسے صاحبوا! اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے ہیں تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے، جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے، مگر افسوس! آپ کو ایمان عزیز نہیں ہے اس لیے صاف سب کو چھوڑ دیا میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلا دوں گا کہ ان میں سے خطا کس کی ہے؟ مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے، بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہو جانا چاہیے، نا اتفاقی بری چیز ہے، تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے؟ یا اس کے لیے کوئی قید بھی ہے؟ اگر نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہو جاتا ہے، تو عدالت کو چاہیے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعویٰ پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے، کیونکہ دعویٰ اور انکار سے دونوں میں نا اتفاقی کا ہونا ثابت ہو گیا اور نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے، تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں مجرم ہوئے، اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور و غل مچا دیں گے اور یہ کونسا انصاف ہے کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہیے تھا؟ تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہیے تھا کہ مدعی اور مدعا علیہ میں جو باہم مخالفت و نا اتفاقی ہے، ان میں سے حق پر کون ہے؟ اور ناحق پر کون ہے؟ جو حق پر ہوگا اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی، لیکن! آپ ہی کے فیصلے سے ثابت ہو گیا کہ نا اتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نا اتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو اور جو نا اتفاقی بحق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہو جائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جاسکتا، بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے اور جو بحق ہو وہ مجرم نہیں۔

## علماء کی نا اتفاقی

پس علماء کی باہم نا اتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا دوسرے سے اتفاق کرلو، غلط رائے ہے، بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہیے کہ حق پر کون ہے؟ پھر جو ناحق پر ہوا سے مجرم بنائیے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کرنا چاہیے ورنہ اہل حق کو دوسروں کے ساتھ اتفاق پر مجبور کرنے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کر لیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا، تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہو جانے کی رائے دیتے ہیں اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے، مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب! دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیونکہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا، وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا ہے تو جناب! ایسا اختلاف رحمت ہے، اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی، دیکھئے! ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا تو اختلاف ہے، مگر اس کے ساتھ پھر بھی سب متفق ہیں، کوئی ایک دوسرے پر ملامت و طعن نہیں کرتا، بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اور ایسا اختلاف ہوتا تو مسلمانوں کو آج یہ پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آ رہی ہے، بلکہ یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے۔

## اختلاف کی بنیادی وجہ

میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی روپیہ ہو اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہیں مقرر کر دیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے یہ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے، کوئی فاتحہ پر، کوئی تیجے، دسویں پر، ایک عالم صاحب سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں، کسی نے سوال کیا کہ تم مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو ان سے منع کرے اس کو برا بھلا کہتے ہو، پھر یہ کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پر ہستی ہیں؟ (اللہ کی شان ہے کہ اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لیے تجویز کرتے ہیں خواہ وہ کسی خیال کے ہوں چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پر ہستی تھیں) تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے، ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر لگ لگ فاتحہ دی جا رہی ہے، پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و درود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں، یا فاتحہ

دیں ان کو کچھ نہ دیا جائے، ان سے خوب مولود پڑھو اور الگ الگ ہر کتابی پر فاتحہ دلو اور، نذرانہ کچھ نہ دو، نہ مٹھائی کا دو ہر حصہ دو، پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے لگیں گے، چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اسی روز شام کو آ کر فاتحہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول ساقضہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو، ایک ہی کافی ہے، میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہوگا ہی صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کرادو، تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ یہ سب فضول قضہ ہے، یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں، جب ایک سال طاعون کا بہت زور ہوا تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا، فاتحہ دلانا اور تیجہ، دسواں سب موقوف ہے، میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہو گیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب! وہ چنے اور فاتحہ کہاں گئے؟ اور وہ اب تیجہ، دسویں کیوں نہیں ہوتے؟ کہنے لگے: اجی ان باتوں کی کیسے فرصت تھی؟ میں نے کہا: چھوڑ دیا؟ کہا: نہیں! میں نے کہا: بس سمجھ لو جو کام حذف ہو گئے وہ دین کے کام نہ تھے، بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لیے کم فرصتی میں بھی ترک نہ ہوئے، بس خاموش ہی تو ہو گئے۔

### فاتحہ مروجہ کا نقصان

اس طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے؟ بلکہ فائدہ ہے کہ اس میں سورتوں کا ثواب بھی مردہ کو پہنچ جاتا ہے، میں نے کہا: یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں، روپے پیسے اور کپڑے میں بھی ہو سکتا ہے، پھر کبھی اللہ کے نام کے روپے پیسے اور کپڑے پر فاتحہ پڑھی؟ کہا کبھی نہیں! میں نے کہا: کیوں نہیں پڑھی؟ مردہ کو فائدہ ہی ہوتا، سورتوں کا ثواب پہنچ جاتا، کہنے لگے: اجی بس سمجھ میں آ گیا، تم سچ کہتے ہو، صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے مٹھنی آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں، اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بند کر دی جائے تو پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہیں گے جو ہم کہتے ہیں، اس مجلس میں میں نے سنت و بدعت کی تحقیق بیان نہیں کی، بلکہ وہ باتیں بیان کر دی ہیں جو بہت موٹی ہیں، جن سے ہر شخص کو باسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے اور اگرچہ بحمد اللہ سنت و اطاعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبر نیست کہ نیست

ہاں! اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آ کر رہے تو اس کو وہ اصول بھی بتلا دیں گے۔

## اختلاف محل شکایت نہیں!

غرض میں کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں ہو سکتا، بلکہ پہلے آپ حق متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں سے حق پر کون ہیں؟ اور ناحق پر کون؟ اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہو جائے گی، جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں، بعض تو لکھے پڑے ہیں خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھ ہیں، پہلے طبقہ کے لیے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں، مگر دونوں طرف کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف سے دیکھیں، پہلے سے کسی کی طرف داری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں، کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا، سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ خالی الذہن ہو کر دونوں طرف کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے، خدا کے ساتھ معاملہ ہے، اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے، ان شاء اللہ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا، جب ایک کا حق ہونا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو، مگر دوسرے کو بھی برانہ کہو، کیونکہ کسی کو برا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائے گا؟ بس تم اپنی یہ حالت رکھو:

ہمہ شہر پر زخواہاں منم و خیال ما ہے  
 چہ کنم کہ چشم بد خو نہ کند بکس نگا ہے  
 دل آرامیکہ داری دل درد بند  
 وگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر کوئی برا بھی ہو تو تم اس کو برانہ کہو وہ اگر برا ہے، تو تم کو کیا؟ اور اگر دوسرا تم کو برا کہے جب بھی تم اسے برانہ کہو، ذوق نے خوب کہا ہے:

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق!  
 ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے!  
 اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے!  
 پھر برا کہنے سے کیوں اس کے برا مانتا ہے؟

## مولویوں کی صحبت میں رہ کر دیکھیں!

یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں، وہ یہ کریں کہ وہ مولویوں کے پاس جا کر ایک ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا ہو، دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا، اس میں ان کے پاس بیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں اور دیکھیں جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے؟ اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے؟ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی رغبت پیدا ہو، عبادت الہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو بس اس کو اختیار کر لیں، اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جانا کریں اور یہ طریقہ پڑھے لکھوں کو بھی بہت مفید ہے، محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی، جیسے پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے، اس لیے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے۔

اٹھتر واں اعتراض..... بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی

## ہونے چاہئیں اس کی تردید!

ایک اشتہار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں، یعنی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں اور اس پر دلیل کیا خوب صورت لائے، اس کو بھی سنئے! آپ نے یوں استدلال کیا کہ روزے کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: "اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" یعنی چند روز، جس کا اصلی مطلب تو یہ ہے کہ ہماری ہمت بڑھانے کے لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزے کے تھوڑے ہی دن ہیں، گھبراؤ نہیں، مگر آپ نے اس میں یہ اجتہاد کیا کہ حج کے بارے میں بھی یہی لفظ آیا ہے "اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" اور وہاں "اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" سے یہی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں تاریخ مراد ہیں، جب وہاں حج میں "اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ" سے یہ مراد ہیں تو یہاں صوم میں بھی وہی مراد ہیں، کیونکہ "القرآن بفسر بعضہ بعضاً" حالانکہ "القرآن بفسر بعضہ بعضاً" کے قاعدہ سے وہاں کام لیا جاتا ہے جہاں ایک آیت کی تفسیر معلوم اور دوسرے کی تفسیر معلوم نہ ہو اور یہاں تو دونوں کی تفسیر الگ الگ معلوم ہے، مگر اس انداز سے۔ نے تو اب تک جگہ کی تفسیر لی اور دوسری جگہ کی

تفسیر نظر انداز کر دی، میں کہتا ہوں کہ اگر ”ایسا معدوہ دات“ بقریہ دوسری آیت کے گیارہواں ہے، بارہویں، تیرہویں مراد ہوں تو یہ تاریخیں تو ذی الحجہ کی ہوں گی، پس گیارہویں، بارہویں، تیرہویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا فرض ہوگا اور یہ ہیں ایام تشریق ان میں روزہ رکھنا اجتماعاً بالکل حرام ہے، تو قرآن سے ایسے ایام کا روزہ رکھنا فرض ہوگا جس کا روزہ رکھنا اجتماعاً بالکل حرام ہے۔ اچھا اجتہاد کیا! اور نیز میں کہتا ہوں کہ اگر ہر جگہ ”ایسا معدوہ دات“ سے بھی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں مراد ہیں تو ہونے جو کہا ہے ”لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ“ کہ ہم کو دوزخ میں تھوڑے دن رہنا پڑے گا تو کیا وہاں بھی تین وہی دن مراد ہیں؟ ایمان سے کوئی بتلاوے کہ کیا یہودی کی یہی مراد تھی کہ فقط گیارہویں، بارہویں کو دوزخ میں جانا پڑے گا اور وہ بھی ذی الحجہ ہی میں؟ اگر یہاں بھی یہی مراد ہے تو ایسا ہوا کہ ”جو کالا وہی میرے باپ کا سال“ غرض اسی طرح لوگوں نے فتنے ایجاد کیے ہیں، کوئی کہاں تک انداز کرے، بغیر حکومت کے ہو نہیں سکتا، کوئی سلطنت اسلام کی ہوتی وہ ان کو بند کرتی۔

(اجرام الصیام من غیر الفرام حصہ اول صفحہ: ۹۰)

اناسیواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ تبلیغ عذر سے ساقط ہوتی

ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے آپ امر بالمعروف شروع کر دیں، جب کام شروع کر کے کہیں گاڑی اٹکے گی، اس وقت استفتاء کر لینا، ابھی سے عذار کے حکم دریافت کرنے کا آپ کو حق نہیں، بلکہ اس وقت عذار کا حکم دریافت کرنا گویا جان بچانے کی تدبیریں ڈھونڈنا ہے، سب مسلمان جانتے ہیں کہ شریعت نے طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا، مگر پھر بھی اس قسم کے عذر کو دوسرے کاموں کی بابت کوئی پیش نہیں کرتا، مثلاً وضو بعض دفعہ عذر سے ساقط ہو جاتا ہے اور نماز میں قیام عذر سے ساقط ہو جاتا، مگر جس وقت نماز کے لیے کسی کو کہا جاتا ہے، وہ کبھی یہ نہیں کہتا ہے کہ پہلے مجھے یہ بتلا دو کہ وضو اور قیام کن کن عذروں سے ساقط ہو جاتا ہے؟ کیونکہ وہاں آپ نماز کے پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور عذر کو عارضی، اسی طرح کھانے میں بھی کسی نے طیب سے یہ نہیں پوچھا کہ حکیم جی! کھانے کے شرائط بتلا دو اور یہ بھی سمجھا دو کہ کس وقت چھوڑ دیا جائے؟ کیونکہ یہاں بھی کھانے کو ضروری اور نہ کھانے کو عارضی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح رمضان میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں، وہ کبھی پہلے یہ نہیں پوچھتے کہ مولوی صاحب! روزہ کن کن وجوہ سے ساقط ہو جاتا ہے؟



بلکہ کوئی ایسا سوال کرے تو اس کی نسبت عام طور پر بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید روزہ نہ رکھنے کے ارادے ہیں، صاحب! آپ کو چاہیے تھا کہ آپ امر بالمعروف شروع کرتے، پھر کسی وقت باوجاہت آدمی کو خلاف شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اکتی، اس وقت مولوی صاحب سے پوچھتے کہ اس موقع پر کیا کروں؟ یہ کیا کہ آپ نہ حاکم کو امر بالمعروف کریں، نہ محکوم کو، نہ مسلم کو، نہ کافر کو، نہ بیوی کو، نہ اولاد کو اور پہلے ہی سے گلے عذر کا حکم دریافت کرنے، شاید آپ یہ کہیں کہ نماز روزہ میں تو عذر کم پیش آتے ہیں اور امر بالمعروف میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے، اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے میں کون سا عذر مانع ہے؟ بیوی نے نماز نہ پڑھی تھی، اس کو نصیحت کرنے میں کیا خوف تھا؟ کیا وہ آپ کو مار ڈالے گی؟ یا لڑکا نماز نہیں پڑھتا تو وہ آپ کا کیا کرے گا؟ اگر آپ کہیں کہ وہ سنتا نہیں ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر وہ کبھی امتحان میں فیل ہو جائے تو اس وقت اس کو کیوں مارتے ہیں؟ اور کیوں سزا دیتے ہیں؟ اس وقت وہ آپ کی بات کیونکر سننے لگتا ہے؟ پس یہ سب بہانے لغو ہیں۔ اصل بات وہی ہے کہ آپ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے، جیسا اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے سامنے زہر کھانے لگے تو کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے؟ یقیناً ہاتھ پکڑ کر زور سے جھکادے کر زہر کو اس کے ہاتھ سے لے لیں گے۔ اگر تنہا قادر نہ ہوں تو دوسروں کو امداد کے واسطے بلائیں گے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مضر ہیں ان کے روکنے میں اس اہتمام سے کام نہیں لیا جاتا؟ معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر نہیں سمجھتے اور یہ سخت مرض ہے، جس کا علاج بالضعف ہے، مگر افسوس اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی پناہ! کسی کو بھی اس مرض کے علاج کی طرف توجہ نہیں، الا ماشاء اللہ

(نواسی بالحق حصہ اول)

## اسیو ال اعتراض ..... تبلیغ اسلام کا اسلم طریقہ!

ہر ضلع میں ایک مجلس تبلیغ قائم کر دی جائے، جس کا نام وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، نہ عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ آج کل انجمن کے قوانین اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹریا کیے جاتے ہیں، مگر کام نہیں ہوتا، ہم کو کام کرنا چاہیے جتنا جس سے ہو سکے، بڑے پیمانہ کی بھی فکر نہ کرو، چھوٹے ہی پیمانہ پر کام شروع کر دو، ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو کام کرتے ہیں، نیپ ٹاپ سے، ورنہ کچھ نہیں کرتے، وہی مثل ہے ”کھاؤں گا تو گھی سے ورنہ جاؤں گا تو جی سے“ یہ بڑی حماقت اور غلطی ہے، یاد رکھو! ابتداء ہر کام کی کمزور اور معمولی ہوتی ہے، ترقی

تدریجاً ہی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس عالم میں اپنے افعال کو بھی تدریجاً ہی ظاہر کیا ہے کہ اولاً نطفہ قرار پاتا ہے، پھر نو ماہ کے بعد پیدا ہوتا ہے، پھر رفتہ رفتہ نشوونما ہو کر پندرہ برس کا لڑکا بالغ ہو جاتا ہے، حالانکہ حق تعالیٰ قادر ہیں کہ ایک ہی منٹ میں سب کچھ کر دیں، جیسا کہ جنت میں ہوگا کہ جس شخص کو وہاں اولاد کی تمنا ہوگی تو بیوی کے پاس جاتے ہی حمل قرار پا کر فوراً بچہ پیدا ہوگا اور اسی وقت باپ کے برابر ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ کا اس عالم میں یہ نمونہ ظاہر نہ کرنا اور تدریجاً افعال ظاہر کرنا، ہماری تعلیم ہی کے لیے تو ہے کہ تم دنیا میں ابتداء عمل کے ساتھ ہی ترقی و عروج کے طالب نہ بنو، بلکہ چھوٹے پیمانے پر ہی کام شروع کرو اور اس میں لگے رہو، رفتہ رفتہ ایک دن عروج و کمال بھی حاصل ہو جائے گا تم سے جتنا کام ہو سکتا ہے، اتنا ہی کرنے لگو، تم اسی کے مکلف ہو اس سے زیادہ کے مکلف نہیں، حق تعالیٰ اسی میں برکت دیں گے، انجمن کا نام کرنے اور عہدہ داروں کے مقرر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، نہ اشتہاروں اور اخباروں میں چھپانے سے کچھ ہوتا ہے، فائدہ کام کرنے سے ہوتا ہے چاہے ٹھوڑا ہی ہو دو چار آدمی ہی ملک کو تبلیغ شروع کرو اور اپنی قلت پر نظر نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے ایک ذات پاک کے ذریعہ سے اسلام کو عرب سے تمام دنیا میں پھیلایا، سو خدا اب بھی موجود ہے، تم اسی پر بھروسہ کر کے کام شروع کرو۔

### حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثال

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثال قرآن میں یوں بیان فرمائی:

”كَوْنُوعٍ اَخْرَجَ شَطَاةً فَارَزَهُ فَاَسْتَعْلَظَ فَاَسْتَوَى عَلٰى سُوْقِهِ يُعْجِبُ الدَّرَاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفْرَانَ“ کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بیج زمین میں بودیا جاتا ہے تو اول وہ اپنی سوئی کو نکالتا ہے، پھر خدا اس کو پانی، ہوا، مٹی وغیرہ سے قوت دیتا ہے تو قومی اور مضبوط ہو کر تندرست اور سیدھا درخت ہو جاتا ہے، سو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ذرا سے بیج سے کتنا بڑا درخت پھیلتا ہے، جو سارے محلے پر سایہ لگن ہوتا ہے جب ہمدادت میں ادنیٰ انجم کی یہ حالت ہے، تو انسانوں میں ایک دو آدمی اللہ کے بھروسہ پر کام کریں اور ان کے کام کو قوت و ترقی حاصل ہو جائے تو کیا بعید ہے؟ مگر آج کل مشکل یہ ہے کہ کام تو شروع نہیں ہوتا اور پہلے ہی سے گیدری دوڑتی ہے کہ اس تجویز کو اخباروں میں شائع کرادیں۔ اشتہار چھپوادیں، صاحبو! کیا یہ یا نہیں؟ اور کیا یاد وغیرہ سے ممانعت نہیں؟ اور وہ ممانعت کس کے لیے ہے؟ کیا یہ احکام کفار کے واسطے ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ مسلمانوں ہی کو یاد وغیرہ سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ کفار مخاطب بالفروع نہیں ہیں، بعض اس پر یہ کہا کرتے

ہیں کہ ہم اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے اظہار اس لیے کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس سے ترغیب ہوگی۔

میاں! بس رہنے دو، یہ تو تاویل ہی تاویل ہے، ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بجز شہرت اور نام کے کچھ مقصود نہیں، اگر کسی کی واقعی غرض ترغیب ہی کی ہو، جب بھی اس کو چاہیے کہ اس اشاعت کے اشتہار کے متعلق اول کسی عالم محقق بے غرض سے مشورہ کر لے۔

(تواصی بالحق حصہ اول صفحہ ۴۰)

## اکا سیواں اعتراض..... مجتہدین کے اختلاف کا راز!

سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے؟ اور غیر مقصود کون ہے؟ یہ کام مجتہدین کا ہے، ہر شخص کا کام نہیں اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے اور عدم رفع بھی ثابت ہے، اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا، ایک مجتہد سمجھے کہ رفع یدین مقصود ہے اور ترک رفع آپ نے جو فرمایا تو بیان جواز کے لیے ہے، مقصود نہیں اور ایک مجتہد جو عدم رفع کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہیے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو۔ (یعنی نماز کے وقت) نماز میں سکون اختیار کرو، پس مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لیے فرمایا، یہ وہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت کیا جاتا ہے، بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا ہے، جیسا کہ بعض حدیثوں میں اس کی تشریح ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب نماز کا سلام پھیرتے تو ہاتھ اٹھا کر کہتے: ”السلام علیکم ورحمة اللہ“ یہ ممانعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمائی، ہم اس بارے میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس رفع سے وہی رفع مراد ہے، مگر اس سے بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے، پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا، کیونکہ وہ نماز کی حالت میں اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے اس لیے وہ مقصود ہوگا، اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے، اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

## آمین میں اختلاف

مثلاً آمین کہنا، ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آمین پکار کر کہنا ہے اور انشاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جواز کے لیے ہے اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود انشاء ہے کیونکہ یہ دعاء ہے اور دعا میں انشاء مقصود ہے، اگر پکار کر بھی کہہ دیا ہے تو وہ اس لیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ آمین بھی کہا کرتے تھے، اگر کبھی بھی پکار کر نہ کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آمین بھی آپ کہا کرتے تھے جیسے کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لیے سری نماز میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے ہے، یہ اختلاف کا ہے سے ہوا؟ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے، بس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا اسی بناء پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔ (احکام المال صفحہ: ۳۳)

بیسیا سیواں اعتراض..... دو رد ابراہیمی کے افضل ہونے کا شبہ اور اس کا

## جواب!

ایک مشہور سوال کا حل یہ ہے کہ: "اللہم صل علی محمد و علی ال محمد کما صلیت علی ابراہیم و علی ال ابراہیم" میں جو صلوة علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوة علی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے صلوة ابراہیمیہ کے افضل و اکمل ہونے کا صلوة محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور منشاء اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ و اکمل ہونا شرط ہے، حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے، بلکہ صرف اوضح اور اشہر ہونا ضروری ہے، افضل و اکمل ہونا ضروری نہیں اور اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے، فرماتے ہیں: "اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورِهِ كَمِثْلِ سَوْءٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ"

اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے، حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت؟ مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن میں پہلے سے حاضر ہے۔

## ایک اشکال اور اس کا جواب

اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن میں نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے، تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقوی ہے، مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اس پر نگاہ نہیں جتی، اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تو سنا معین کو شبہ ہوتا ہے کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا کہ اس پر نگاہ نہ جم سکے، تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوتی اور قمر سے اس لیے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ: "نور القمر مستفاد من نور الشمس" تو اس کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہوتا ہے کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے، پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور (روشنی والا) بنا دیتا ہے کہ ایک گھنڈہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہنچتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شے نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے۔ اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہو جاتا ہے اور دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطہ فی العروض ہوتا ہے، واسطہ فی الثبوت نہیں ہوتا اور چراغ واسطہ فی الثبوت ہو جاتا ہے جیسا کہ نور حق واسطہ فی الثبوت ہوتا ہے، مگر یہ تشبیہ من کل وجہ نہیں کہ اس سے نعوذ باللہ دوسرا خدا تصنیف کرنے لگیں، مطلب صرف یہ ہے کہ نور حق دوسروں کو بھی منور کرتا ہے اور منور بھی ہے، گو دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہ ہو اور یہ بات چراغ ہی میں ہے، شمس و قمر میں نہیں ہے اور یہ سب نکات ہیں مقاصد نہیں ہیں، ہر شے کو اپنی حد پر رکھنا چاہیے۔

## تراسیواں اعتراض..... واصل بحق ہونے پر شبہ!

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ بارگاہ حق کی تو کہیں انتہا نہیں، جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں:

اے برادر بے نہایت در گہمیت

ہرچہ بروئے میری بروئے ما نیست

ایک اور عارف کہتے ہیں:

نکر دو قطع ہرگز جادۂ عشق از دوید نہا

کہ می بالذبحوداں راہ چوں تاک از برید نہا

اور جب اس کی انتہاء کہیں نہیں پھر وصول کے کیا معنی؟ کیونکہ وصول تو محدود ہو سکتا ہے، غیر محدود کہاں ہو سکتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ وصول کے دو معنی ہیں، ایک وصول محدود ہے، ایک غیر محدود ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں، ایک سیرالی اللہ، یہ تو محدود ہے، ایک سیر فی اللہ، یہ غیر محدود ہے، سیرالی اللہ یہ ہے کہ نفس کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفاء ہوگی اور ذکر و شغل سے قلب کی تمیر شروع کی یہاں تک وہ انوار ذکر سے معمور ہو گیا، یعنی تخلیہ و تحلیہ (تخلیہ خالی کرنا، تحلیہ آراستہ کرنا) کے قواعد جان گئے، موانع مرتفعہ کر دیے، معالجہ امراض سے وائف ہو گئے، نفس کی اصلاح ہو گئی، اخلاق رذیلہ زائل ہو گئے اور اخلاق حمیدہ سے، انوار ذکر سے قلب آراستہ ہو گیا، اعمال صالحہ کی رغبت طبیعت ثانیہ بن گئی، اعمال و عبادات میں سہولت ہو گئی، نسبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو گیا، تو سیرالی اللہ ختم ہو گئی اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا، تعلق سابق میں ترقی ہوئی، اسرار و حالات کا ورود ہونے لگا، یہ غیر محدود ہے، یہی وہ تعلق ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے:

بحر عیش بحر عشق کہ بچش کنارہ نیست

آنجا جزاء اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص سائنس کا امتحان دیتا ہے، یہاں تک کہ پاس ہو گیا اور سند مل گئی، تو اس وقت سیرالی سائنس ختم ہوئی، اس کے بعد سیر فی سائنس ہے کہ تحقیقات میں اضافہ ہو، نئی نئی باتیں متکشف ہوں، اس کی کوئی حد نہیں، چنانچہ اہل سائنس خود اس پر متفق ہیں کہ تحقیقات سائنس کا سلسلہ غیر محدود ہے۔

جب ایک دنیوی تعلق کا یہ حال ہے تو تعلق مع اللہ کا کیا حال ہوگا؟ دوسری مثال اور لیجئے کہ ایک کرہ جو اپنے مرکز سے الگ ہو گیا ہو اور وہ حرکت اینیہ کر کے مرکز پر پہنچ جائے تو اس وقت حرکت الی المرکز ختم ہوئی، پھر اس کے بعد اپنے مرکز پہنچ کر وہ حرکت وضعیہ کرتا ہے اس کی کوئی حد نہیں، اسی طرح یہاں سمجھو! پس وہ شہید جاتا رہا ہے کہ جب بارگاہ حق غیر متناہی اور غیر محدود ہے تو وصول کے کیا معنی؟ سو میں نے بتلادیا کہ تعلق مع اللہ ایک معنی کے اعتبار سے محدود ہے، یعنی سیرالی اللہ کے اعتبار سے اور اکثر اسی حد پر خلافت دے دی جاتی ہے اور سالک (راؤ خدا ملنے کرنے والا) کو مجاز بنایا جاتا ہے، جیسے علوم ظاہر میں ایک نصاب خاص کے ختم کرنے پر اور پاس کر لینے پر سند دی جاتی ہے، یہ محدود ہے، پھر آگے عمر بھر علوم میں ترقی ہوتی رہتی ہے، یہ غیر محدود ہے، ایک درجہ غیر محدود ہے، اسی طرح یہاں تعلق کا محدود ہونا بھی صحیح ہے اور غیر محدود ہونا بھی صحیح ہے۔ (غایۃ النجیح صفحہ: ۳۸)

چور اسیواں اعتراض..... بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہو جانے کی تمنا

کرنا غلط ہے!

لوگ خاص دین کے باب میں اس کے درپے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کو ایسا شدید تعلق ہو جائے کہ حقوق خود بخود ادا ہوتے رہیں، ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے، بس محبت و شوق کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ نماز روزہ خود ہی ادا ہوتا رہے، سو یہ حالت غیر اختیاری ہے، بندہ کے اختیار میں نہیں، بلکہ اس کے ذمہ یہ واجب ہے کہ اپنے ارادہ و اختیار سے کام لے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو، یہ بہت ضروری مسئلہ ہے، جیسے حدیث میں: "الطهور شرط الایمان" (پاک و صاف رہنا آدھا ایمان ہے) وارد ہے، اسی طرح میں اس مسئلہ کو نصف السلوک سمجھتا ہوں کہ اختیاری میں کوتاہی نہ کرے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو، لوگوں نے آج کل صرف نماز روزہ کا نام دین رکھ لیا ہے، حالانکہ یہ عمل اختیاری ہی میں مشغول ہونے سے حاصل ہوتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ عمل دین کا جزو ہیں کہ اختیاری امور کے درپے ہو غیر اختیاری کے درپے نہ ہو یا درکھو یہ امور غیر اختیاری یعنی حالات و کیفیات وغیرہ اگر کبھی حاصل ہوتے ہیں۔ اعمال اختیاری سے غیر اختیاری کی نیت بھی نہ کرے، کیونکہ حصول میں تجلیل و تاخیر (تجلیل جلد کرنا، تاخیر دیر کرنا) اختیار سے باہر ہے، کبھی تو نقصان عمل کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے، کبھی قلت استعداد و ضعف استعداد کی وجہ سے دیر ہوتی ہے، پس تم اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو، خود ان کے درپے نہ ہو بلکہ ان اعمال کے درپے ہو جو تمہارے اختیار میں ہے۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مرد مکن

کہ خواجہ خود روش بندہ پر وی داند

وہ خود جانتے ہیں کہ تمہارے لیے کیا مناسب ہے، کیا نہیں؟ اس لیے اگر حالات و کیفیات تمہارے لیے مناسب ہوں گے، عطا کر دیں گے، نہیں مناسب ہوں گے تو نہیں عطا کریں گے، دیکھو ماں اپنے بچے کے واسطے جو مصلحت سمجھتی ہے وہی کرتی ہے بچے کی خواہش پر عمل نہیں کرتی، خصوصاً باپ کی وہ تو بچے کی ضد سے مغلوب ہی نہیں ہوتا، ماں تو کسی وقت مغلوب بھی ہو جاتی ہے، مگر زیادہ حالت یہی ہے کہ والدین بچے کے ساتھ اپنی رائے کے موافق معاملہ کرتے ہیں جو

مصلحت جانتے ہیں، یہی اسی عمل کرتے ہیں، گو کچھ کتنا ہی ضد کرے مولانا فرماتے ہیں:

طفل می لرزد زینش احتیاج  
مادر مشفق ازاں غم شاد کام

بچہ پچھنے لگانے والے کے نشتر وغیرہ کو دیکھ کر روتا ہے، ڈرتا ہے، مگر ماں خوشی کے ساتھ اس کے پچھنے لگواتی ہے، کیونکہ اس کی نظر انجام صحت پر ہے، تو جب ماں باپ بچوں کی رائے پر کام نہیں کرتے، پھر حق تعالیٰ بندوں کی رائے پر کیوں کام کریں؟ اور تم سے مشورہ کیوں لیں؟ وہاں شخصیت ہے، پارلیمنٹ نہیں ہے، غرض اعمال اختیار یہ میں بھی امور غیر اختیار یہ کا قصد نہ کرے، جو بات اس کے اختیار میں نہیں اس کی طرف التفات ہی نہ کرے، بلکہ اپنے کام میں لگے۔

(رفع الالتباس عن نفع اللباس صفحہ: ۵)

### سچا سیواواں اعتراض..... بزرگوں کے طریقہ اصلاح پر شبہ کا جواب!

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے یعنی طریق اصلاح اختیار کرنے سے معتقد کم ہو جائیں گے، میں کہتا ہوں اول تو یہ خیال غلط ہے، گو ظاہر میں تمہارے پاس آدمی کم آئیں، مگر دل میں معتقد زیادہ ہوں گے اور مان لو معتقد کم ہوئے تو کیا فوج بھرتی کر کے کہیں کام پر بھیج دو گے؟ اگر زیادہ معتقد بھی ہوئے اور کام نہ کیے تو ان کو لے کر کیا کر دو گے؟ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ معتقد تھوڑے ہوں اور کام کے ہوں، اس میں تو زیادہ راحت ہے کہ جہوم خلق زیادہ نہ ہوگا، کیونکہ جہوم سے اوقات میں خلل پڑتا ہے۔

یہ جواب تو بطور ارزا، عنان کے ہے، ورنہ میرا اصلی مذاق یہ ہے کہ مجھے تو لوگوں کے اعتقاد ہی سے وحشت ہوتی ہے، مگر جسے جہوم خلاق سے محبت ہو، جو ہر وقت اپنے گرد جمع چاہتا ہو، وہ تو بے شک معتقد کی قلت سے گھبرائے گا اور وہ طریق اصلاح کو اختیار نہ کرے گا، اسی واسطے میں بیعت میں جلدی نہیں کرتا، بلکہ بہت سے شرائط کے بعد کرتا ہوں، اس میں ہمارے بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اتنی سختی نہ کرنی چاہیے، بلکہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ وابستہ کر کے اصلاح کرو تب تو فائدہ بھی ہے، ورنہ وہ تو وابستہ ہو کر طریق سے بیکار اور پابستہ (پاؤں بندھا ہوا) ہو جائے گا، کیونکہ جلدی بیعت کر لینے سے وہ سمجھے گا کہ اس طریق میں عمل کے اہتمام کی ضرورت نہیں، اب بتلاؤ وہ طریق سے پابستہ ہوگا یا نہیں؟ اور جب اس سے شرطیں کی جائیں گی تو عمل کی ضرورت ابتداء ہی سے اس کے ذہن نشین ہو جائے گی، اگر وہ



روک ٹوک کا قتل کرتا رہا تو ان شاء اللہ بہت جلد اصلاح پذیر ہو جائے گا اور بدن اس کے توفیقوں بھرتی کرنا ہے، غرض اخلاق باطنہ کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال باطنہ درست ہوں۔  
(الجمعین بین النفعین صفحہ: ۲۷)

## چھیا سیواں اعتراض..... طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے!

میں کہتا ہوں کہ بھاگنا دراصل تدبیر ہی نہیں، بلکہ سوء تدبیر ہے، کیونکہ بھاگنا جیسا ضعف قلب سے ناشی ہے، اسی طرح وہ ضعف کا منشاء بھی ہے، یعنی بھاگنے والا اس فعل سے ضعف کو اپنے قلب پر غالب کر لیتا ہے، طبی قاعدے سے ایسے امراض ضعیف القلب پر سب سے پہلے قبضہ کر لیتے ہیں تو بھاگنے والے نے تو اسی وقت اپنے اوپر طاعون کو قبضہ دے دیا، اگر وہ یہاں نہیں مراتو دوسری جگہ مرے گا، اب بتلائیے بھاگنا تدبیر کس طرح ہے؟

دوسرے میں کہتا ہوں کہ اگر بھاگنا مفید بھی ہو اور بھاگنے والا طاعون سے بچتا بھی ہو تو تب بھی شریعت کو حق ہے کہ اس مفید فعل سے منع کر دے، کیونکہ بعض مفید افعال سے آپ بھی تو منع کرتے ہیں، مثلاً لڑائی سے بھاگنا تمام عقلاء کے نزدیک جرم ہے، حالانکہ یقیناً بھاگنے والے کو تو بھاگنا ہی مفید ہے، اس کی جان بچتی ہے، مگر اس کو آپ کے لیڈر بھی تدبیر نہیں کہتے بلکہ بے تدبیری کہتے ہیں، اسی طرح ہم طاعون سے بھاگنے کو بے تدبیری کہتے ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک دلیل شرعی سے طاعون سے بھاگنا ایسا ہی ہے جیسا جنگ (لڑائی) سے بھاگنا اور جہاد سے بھاگنا، کیوں طاعون کی نسبت حدیث میں وارد ہے: ”والفسار منہ کالفسار من الزحف“ (اس سے بھاگنے والا میدان کارزار سے بھاگنے والے کی طرح ہے) اور ایک حدیث میں طاعون کی حقیقت میں ”و حسرا اعدائکم الحسن“ وارد ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت جنات کا اور انسانوں کا مقابلہ ہوتا ہے، جنات انسانوں کے اندرون جسم میں زخم لگاتے ہیں، جس سے طاعون ہوتا ہے اور مقابلہ سے بھاگنا عقلاً بھی بے تدبیری ہے، اس لیے شریعت نے فرار کو حرام کر دیا تو اس حقیقت میں اطباء اور ڈاکٹروں کا اختلاف ہے، ڈاکٹر جراثیم کو سب بتلاتے ہیں، مگر اس سے مضمون حدیث کی نئی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ سب بھی ہو اور وہ بھی، مگر اصل سبب و خز جن (جن کا زخم لگانا) ہو اور ظاہری سبب وہ ہو جو تم کہتے ہو، پھر ایک اور بات بھی ہے کہ یہاں سے بھاگ کر جو لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں وہ وہاں کے آدمیوں کی نگاہ میں ذلیل ہوتے ہیں اور خصوصاً اگر تم طاعون کی جگہ سے بھاگ کر کسی شہر میں اپنے کسی دوست یا عزیز کے گھر میں ٹھہرے تو اور اتفاقاً

تمہارے جانے کے بعد اس کے گھر کوئی بیمار پڑ گیا تو اس وقت اس کی نگاہ میں تمہاری بہت ذلت ہوگی، جس کو قرآن سے تم خود بھی سمجھ جاؤ گے، کیونکہ وہ سمجھے گا کہ میرے گھر میں تو بیماری نہ تھی، یہ کم بخت میرے گھر میں بیماری لے آیا اور اگر وہ بیمار مر گیا تو اس کی موت گھر والوں کے خیال میں تمہارے نامہ اعمال میں درج ہوگی، سچ ہے:

عزیزے کہ از در گمش سر تانفت

بہر در ہے کہ شد بیچ عزت نیافت

بھراس طرح یہ لوگ دوسری جگہ بھی طاعون پھیلاتے ہیں، نہ بطریق عدولی کے بلکہ اسی قاعدہ سے کہ یہ وہاں جا کر لوگوں کے قلوب میں وہم پھیلاتے ہیں، تو دوسری ہستی کے لوگ ان بھاگنے والوں سے یوں کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے! کہیں ہماری ہستی میں بھی طاعون نہ ہو جائے جس سے ان میں بھی قبول طاعون کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی رحمت ہے کہ آپ نے بھاگنے سے منع فرمادیا۔  
(المجتہدین بین الفتنین صفحہ: ۲۳)

ستاسیواں اعتراض..... منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمر رضی

اللہ عنہ کی رائے کے افضل ہونے کا شبہ اور اس کا جواب!

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رائے تھی، وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا، کیونکہ کفار و منافقین پر غیظ اور ان سے نفرت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے نصیب ہوئی، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قل رسول کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو کفار و منافقین سے نفرت اور غیظ عطا فرمایا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے، بلکہ یوں کہو کہ آپ آدم علیہ السلام بھی تھے، حضرت نوح علیہ السلام بھی تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیننا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنبا داری

☆.....☆.....☆

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام شانیں جمع تھیں، غیظ و غضب علی الکفار بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تھا اور رحمت و رافت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ رحمت ہی کو تھا، اس لیے جب کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے، جب رحمت کا کوئی نہ بہانا ہو تو اس وقت غضب فرماتے تھے، عبد اللہ بن ابی گو منافق تھا، مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے احکام سے جدا تھے، ان کے ساتھ احکام حیات میں وہی برتاؤ ہوتا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور موت کے احکام ہنوز نازل نہیں ہوئے تھے، اس لیے بوجہ غلبہ رحمت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام حیات پر قیاس کر کے اس کے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ غلبہ غیظ و شدت کے احکام حیات کو ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھ کر احکام ممات میں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہ تھا، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی، کیونکہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع ملتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہم مسلمانوں کے لیے بہت کچھ موجب تسلی ہے، کیونکہ:

دوستاں را کجا کئی محروم  
تو کہ بادشمان نظر داری

اور:

چہ نعم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیبان  
چہ باک از موج بحر ان را کہ دارد نوح کشتی بان

اب میں اس مقام پر ایک سوال علماء سے ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ "اَسْتَغْفِرُ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ" (تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تخییر کس طرح سمجھی؟ یہ تو دید تو تسویہ کے لیے ہے کہ ان کے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے، ان کو دعا سے استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا، چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں اسی طرح "اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً" (اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے ستر مرتبہ مغفرت چاہیں) میں عدد کا ذکر تحدید کے لیے تصور ابی ہے کہ اگر ستر دفعہ استغفار کرو گے تو مغفرت نہ ہوگی، اس سے زیادہ کرو گے

تو ہو جائے گی، بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جسبھی بھی نہ مانوں گا، ہزار دفعہ کہے جب بھی کچھ نہ ہوگا، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے، بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کے لیے ہوتا ہے، نہ تحدید کے لیے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”حیرت فاسخترت و سازید علی السبعین“ کیسے فرمایا؟ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دے سکتے اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اجتہاد کے مدعی ہیں وہ تو کیا ہی جواب دیں گے؟ لیجئے! اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں، مولانا محمد یقوب صاحب رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی کی طرف التفات نہیں فرمایا، بلکہ محض نفس الفاظ سے تمسک فرمانے لگے اور نفس الفاظ میں تخیر و حصر کی گنجائش ضرور ہے، گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ غلبہ حال کا ملین پر کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ (المرابط صفحہ: ۳۹)

### اٹھاسیواں اعتراض..... تکمیل نماز کا طریقہ

تکمیل نماز کے لیے مراقبہ موت و مراقبہ لقاء اللہ کا عادی ہونا چاہیے اور میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ آیت میں یہ مراد ہے کہ عین نماز کے اندر بھی اس مراقبہ قلب کو مشغول کیا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ نماز کی ہیئت میں غور کرے کہ میں جو تمام دنیا سے رخ پھیر کر ہاتھ باندھ کر اس طرح کھڑا ہوں کہ نہ کسی سے بات کر سکتا ہوں، نہ کسی کی طرف دیکھ سکتا ہوں، نہ کھانی سکتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور ان سے عرض معروض کر رہا ہوں، پھر قیام کی حالت میں سوچے کہ خدا تعالیٰ کے مجھ پر کس قدر احسانات و انعامات ہیں جن کا شکر یہ میرے ذمہ واجب ہے اور سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکر یہ ادا کر رہا ہوں اور اس کی ربوبیت کا اقرار اور اپنی عبدیت کا اعتراف کر رہا ہوں، اور اسی عبدیت پر قائم رہنے اور اہل عبدیت کے طریقے پر چلنے کی دعا کر رہا ہوں اور جو لوگ طریقہ عبدیت سے بہک گئے اور لعنت و غضب کے مستحق ہو گئے ہیں ان کے طریقہ سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہوں اور جو قانون الہی تکمیل طریق عبدیت کے لیے نازل ہوا ہے اس پر ہمیشہ کے لیے چلنے کا عہد کر رہا ہوں، فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا یہی مطلب ہے۔

## سجدہ و رکوع میں سوچ

پھر جب رکوع میں جائے تو یہ سوچے کہ میری پیدائش اس مٹی اور زمین سے ہے جو میرے پاؤں تلے ہے، زمین کی خاک سے جیتا جاگتا سمیع و بصیر انسان پیدا ہوا جو نامحس خالق جل و علی کی قدرت ہے اور جس کی پیدائش زمین کی خاک اور اس کی نباتات وغیرہ سے ہو اس کو عبودیت اور بندگی کے سوا کچھ زبانی نہیں، برائی اور بزرگی صرف خالق جل و علی کو زیبا ہے جو تمام عیوب سے بری ہے، اسی لیے نماز میں بار بار اللہ اکبر کہا جاتا ہے کہ اے خدا! ہم نے آپ کی عظمت کے سامنے اپنی خبیلی عزت کو قربان کر دیا، پھر سجدہ میں جاتے ہوئے یہ سوچے کہ مجھے ایک زمین کے اندر بیوند ہونا ہے اور اس وقت خدا کے سوا میرا کوئی ساتھ دینے والا نہ ہوگا، دنیا سے میرا نام بھی مٹ جائے گا اور نشان بھی، اس کے بعد دوسرے سجدے میں یہ تصور کرے کہ گویا میں مرچکا ہوں اور خدا سے مل گیا ہوں، اب خدا کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں۔

## جلسہ تشہد میں سوچ

پھر جلسہ تشہد میں یہ سوچے کہ مرنے کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی، جہاں اسلام اور اعمال اقوال و احوال صالحہ ہی کام آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کیے گئے ہوں اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و حضرات ملائکہ اور تمام نیک بندوں کی عزت ظاہر ہوگی اور وہ گنہگاروں کی شفاعت کریں گے، لہذا ان پر سلام بھیج کر ان سے تعلق پیدا کرنا چاہیے، پھر چونکہ امت محمدیہ کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے، اس لیے خیر رکعت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر خصوصیت کے ساتھ درود پڑھنا چاہیے جب یہ تصور جم جائے تو اس کے بعد جلسہ میں یوں تصور کرے کہ گویا مرنے کے بعد یہ میدان قیامت میں حاضر ہوا ہے اور تمام اعمال و افعال و اقوال جو دنیا میں کیے ہیں اس کے سامنے ہیں، جن میں سے وہی کام آ رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کیے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء و صلحاء و ملائکہ کی جماعت سامنے ہے جو دربار الہی میں حاضر ہیں اور میں ان سب پر درود شریف و سلام بھیج رہا ہوں۔

## اخیر نماز میں تصور

اور اخیر میں اپنے لیے کامیابی و نجات و فلاح کی دعا کر رہا ہوں اور اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے، حالانکہ لقاء اللہ کا تو اعتقاد جازم فرض ہے محض ظن کافی نہیں، مگر چونکہ

مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقاء اللہ و رجوع الی اللہ کا اختصار کیا جائے اور یہ اختصار درجہ و فوق میں لازم نہیں، بلکہ اس کا ظن اور تصور بھی نماز میں کافی ہے کہ گویا میں اس وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مر گیا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں، اسی واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا، اسی طرح نماز پڑھنے سے خشوع حاصل ہو جائے گا اور تمام خیالات و وساوس قلب سے نکل جائیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم! ”ہذا کلہا من سبیدی و مرشدی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب دام فیوضہم“ (انج ص ۱۸)

### نو اسیواں چندہ وصول کرنے کے مفاسد!

لوگوں کو سیکریٹری وغیرہ صرف اس لیے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب وصول کرتے ہیں، غرباء کے اوپر جس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں، اس کام میں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب دین کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں، سبحان اللہ! یہ بڑا دین کا کام کیا کہ غرباء کے گلے پر چھری رکھ کر چندہ وصول کر لیا۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو ظلم کھا ڈاکو ہیں، کیونکہ وہ لوگوں سے مال چھین کر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں، جن کا نان و نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے، تو گوان کا یہ ذریعہ معاش تو حرام ہے، مگر صرف ایسا ہے جس میں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا، تو وہ حرام کا ارتکاب کر کے ایک واجب سے تو سبکدوش ہوئے اور یہ سیکریٹری صاحب حرام طریقہ سے چندہ وصول کر کے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جس کی خدمت ان کے ذمہ واجب بھی نہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ انجمن کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو کی سزا معلوم ہے، تو لوگ اس کے واسطے تیار ہیں، افسوس! آج کل چندہ میں اس کا اصلاحاً لحاظ نہیں کیا جاتا کہ یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے؟

### بیوی کے مال میں طیب نفس کی قید

حق تعالیٰ نے بیوی کے مال کے بارے میں بھی فرمایا:

”فَبِأَنَّ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْبِي مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا“ کہ اگر بیوی اپنے دل کی خوشی سے اپنے مہر میں سے مرد کو کچھ دے دے تو اس کا کھانا جائز ہے، یہاں بھی طیب نفس کی قید ہے، حالانکہ میاں بیوی کا تعلق عاشقی و معشوق کا تعلق ہوتا ہے اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے تو پھر غرباء کا رویہ بدوں طیب قلب کے کیونکر جائز ہوگا، بیوی کے معاملہ میں ایک مقام پر

اس سے بڑھ کر ارشاد فرمایا:

”وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَيُصِفْ مَا قَرَضْتُمْ  
أَلَّا أَنْ يُعْفُوَنَّ أَوْ يُعْفَوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبَ لِلتَّقْوَىٰ“ کہ اگر تم نے  
اپنی بیوی کو دُخول سے پہلے طلاق دے دی ہو اور مہر مقرر ہو چکا ہو تو بیوی کے لیے نصف مہر ہے مگر یہ  
کہ وہ اپنا حق معاف کر دے (تو کچھ نہ رہے گا) یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی ڈور ہے (یعنی شوہر)  
وہ معاف کر دے (تو پورا مہر رہے گا) اور اے مرد! تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔  
یعنی مرد کے لیے زیادہ بہتر ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر نہ رہے بلکہ خود اپنا حق معاف کر دے تو  
دیکھئے کہ باوجودیکہ عورت اگر خوشی سے مہر معاف کر دے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی  
اجازت دے دی گئی تھی، مگر اس مقام پر دوسرا ادب سکھلادیا گیا ہے کہ غیرت کا مقتضی یہی ہے کہ  
عورت کی معافی قبول نہ کرو، بلکہ تم اس کے ساتھ احسان کرو۔

### چندہ و ہدیہ کے آداب

جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول کرنے کے لیے یہ آداب ہیں، تو بھلا  
چندہ کے لیے آداب نہ ہوں گے؟ ضرور ہیں! اور ان کا لحاظ کرنا واجب ہے، شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ  
کے لیے بھی آداب مقرر کیے ہیں، چنانچہ ایک ادب یہ ہے: ”مَا آتَاكَ مِنْ غَيْرِ اشْرَافِ نَفْسٍ  
فَخَذُوهُ وَمَا لَا فَلَا تَتَّبِعُهُ نَفْسُكَ“ کہ جو چیز ہدیہ وغیرہ بدون انتظار کے آجائے لے لو اور جو  
انتظار سے آئے اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو۔ (اصول العبادۃ صفحہ ۶)

مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ جمع میں تحریک کی جائے، تاکہ جو شخص ایک روپیہ دیتا  
وہ شرمناشری پانچ روپے تو دے گا یا در کھوایہ صورت باکل ناجائز ہے، مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے  
بغیر کام نہیں چلتا، میں کہتا ہوں، یہ بتلاؤ! مقصود بالذات کیا ہے؟ کام مقصود ہے، یا دین؟ اگر صرف  
کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل میں کیوں ہوں گے؟ کیونکہ وہ بھی تو جہاد و صدقہ وغیرہ  
کرتے تھے، معلوم ہوا کہ جس کام میں رضائے حق نہ ہو وہ کام ہی نہیں، مسلمان کا اصل مقصود  
رضائے حق ہے، چاہے کام تھوڑا ہو، مگر رضائے حق کے موافق ہونا چاہئے، مثلاً اگر یتیم خانہ بہت  
بڑا ہو، مگر رضائے حق نہ ہو تو اس کو لے کر کیا کرنا ہے۔

### ایک انجمن کا واقعہ

چنانچہ آج کل جو ایک بہت بڑی انجمن ہے، میں اس کا نام بیان کرنا نہیں چاہتا اس کا ایک

عجیب واقعہ سنا ہے جس سے حیرت ہوئی، وہ یہ کہ لکھنؤ میں کسی نے بہت جا سید ادا ایک متوکل عالم متکدست کے سامنے پیش کی کہ اس کو قبول فرما کر اپنے تصرف میں لائیے! انہوں نے انکار کر دیا، اس کے بعد اس نے انجمن والوں کے سامنے پیش کی کہ میری طرف سے اس کو انجمن کے واسطے وقف کر دو، انہوں نے قبول کر لیا، لکھنؤ کے عوام نے اس پر عجیب فقرہ کسا کہ میاں! وہ بزرگ تو اکیلے تھے تو ان کو گناہوں کے انبار کا تحمل نہ تھا اور انجمن میں تو بہت موٹے موٹے ہیں، وہ سب مل کر تھوڑا تھوڑا اٹھالیں گے، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجمن کا چلانا مقصود ہے، رضائے حق مقصود نہیں، ورنہ حلال و حرام کی ضرور رعایت کرتے۔

### حب جاہ

اور یہ ساری خرابی حب جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے مقصود جاہ مطلوب ہے، چنانچہ ڈیگ میں ایک انجمن کے سیکرٹری مجھ سے ملے اور انجمن سے لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کرنے لگے، میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟ آپ پہلے خود کام کرنا شروع کر دیں، جتنا بھی آپ سے ہو سکے، دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں، پھر کام میں خود کشش ہوتی ہے، لوگوں کو خود بخود توجہ ہو جائے گی جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا، واقعی بات یہی ہے کہ یہ خود تو کچھ کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا اور کام لینا جانتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ سیکرٹری بننے کا شوق ہے اور کام کے نام صفر ہے، غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو لوگ دین کی خدمت کرتے ہیں محض جاہ کے لیے کرتے ہیں، دین و رضائے حق مطلوب نہیں۔ (ایضاً صفحہ: ۹)

نوے واں اعتراف حق تعالیٰ بدون ابتلاء و امتحان کے جنت کیوں

### عطا نہیں فرماتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلاء و امتحان کے سب کچھ عطا فرمادیتے، مگر وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرمادیتے ہیں اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے۔  
شیدہ ام کہ سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت  
فراق بار نہ آں می کند کہ بتواں گفت



حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر  
کناہیت کہ از روزگار ہجران گفت

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے: "أَحْسِبِ النَّاسَ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ"  
لوگ کیا خیال کرتے ہیں کہ وہ اس کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور وہ  
امتحان میں مبتلا نہیں کیے جائیں گے۔"

رہا یہ کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ سو اس کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی  
تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے، ان کا طریقہ یہ ہے: "ابھموا ما ابھمہ اللہ" کہ جس چیز کو اللہ  
تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے، تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔

### امتحان و ابتلاء کی حکمت

بس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے، گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں  
ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاقت بدون ابتلاء مقصود ہوتی  
تو اس کے لیے ملائکہ پہلے سے موجود تھے، انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ ملائکہ  
اطاعت بدون ابتلاء ہی کرتے ہیں، ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر  
مقاومت (مقابلہ) و منازعت (لڑائی) احکام کا مادہ رکھا گیا ہے، مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ  
بھی تکمیل اجر کے لیے اس میں رکھا گیا ہے، کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل  
ہے بوجہ مجاہدہ کے وہ درجہ خاص کی قید میں نے اس لیے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو  
"الذین یسر" (دین آسان ہے) کے خلاف ہوتا ہے اس لیے میں نے یہ قید لگادی اور یہ منازعت  
بھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے، بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الہیہ امور طبعیہ  
بن جاتے حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے، چنانچہ ششی وغیرہ میں ابتداء ہی میں  
ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے، پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ وہی پہلا ارادہ متحرقرار دیا  
جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو فضل اختیاری کہا جاتا ہے، اس پر شبہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہوگا  
کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا  
معاملہ یہی ہے کہ ابتداء سے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے،  
کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے،  
چنانچہ ہر مسلمان جو روزہ نماز کا پابند ہے، اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا، ہمیشہ روزہ  
رکھوں گا، خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو؟ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں

رکھتے، مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لیے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، اس واسطے اس کو زوال منازعت کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا ہے تو جیسے مشی (چلنا) کو نفل اختیار ہی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی، اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی، مگر چونکہ ابتداء میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی، اس لیے انتہاء تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائے گا اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا!

### عبادت میں لذت کے باوجود ثواب

ورنہ عقل کا مقتضایہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جائے اور عبادت میں لذت و حظ پیدا ہو جائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے، کیونکہ اب طاعت مع الابطال نہیں ہے، اس وقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں، مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے، ہم اس کو منازعت ہی کا اجر دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی، مگر اب ہم اس کو پیشین دیں گے، لیکن عقل پیشین کو جائز نہیں کرتی، جیسے معتزلہ نے کہا ہے کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے، غنہ و مغفرت خلاف عقل ہے، پس یوں کہے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو بعض پیروں کی وہ حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی مرید ان کی دعوت کرتا ہے تو وہ دعوت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں، جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیے، تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلایا کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں، کیونکہ انتہاء میں طاعت کا بجانا لانا کچھ کمال نہیں رہتا، بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے، اخیر میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو حدیث میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہے ”کان خلقہ القرآن“ کہ قرآن پر عمل کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو فطرت ہی سے طبیعت تھی، مگر کالمیلن کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اس وقت ان کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے، جیسے ماں بچے کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے، تو وہ اس کے چپت لگاتی ہے، ایسے ہی مٹی کے لیے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں، بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کے لیے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت کے لیے ہے، کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃ حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے، یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیے، میرے

اور یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں؟ اور بزبان حال یوں کہتا ہے:

ہم نے الفت کی نائیں دیکھیں!  
جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم؟

(سبیل السعدی صفحہ: ۴)

اکانوے وال اعتراض اختلاف رویت قمر کی صورت میں لیلۃ القدر

### کے متعدد ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود سائنس والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل و نہار کرة النسیم سے نیچے ہیں، کرة النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے، یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے، وہ یہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے سیر سادات کا ذکر نہیں فرمایا جس سے بعض اہل باطن نے سیر سادات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سادات کا ذکر اس واسطے نہیں کیا کہ وہاں ’لیلۃ‘ کی قید بھی مذکور ہے، پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر ہے کہ سیر سادات لیل و نہار سے باہر ہوتی ہے، سادات میں لیل و نہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سادات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے، ہاں! یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سادات رات میں نہیں ہوتی سو یہ مسلم ہے، بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوتی، نہ رات میں، وہ تو ایسے مقام پر ہوتی ہے جہاں رات ہے نہ دن، بہر حال وہاں لیل و نہار نہیں ہے، اس واسطے لیلۃ القدر کی جوشان و برکات ہیں، وہ لیل و نہار کے ساتھ مقید نہیں بلکہ ارادۃ حق کے تابع ہیں، تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کرة النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرة النسیم کے نیچے کل بارش ہے اگر شب قدر بھی ایسی ہی ہو کہ آج یہاں ہے اور کلکتہ میں کل ہے، تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے؟ آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا؟ پھر معنوی بارش کے برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے؟ اس لیے بے فکر ہو کر آپ اپنی ہی تاریخوں کے حساب سے کام کیجئے اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں اور کام کو دیکھتے ہیں، وہ سب کو ان کے حساب کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرمادیں گے۔

## بانوے والے اعتراض..... محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح

### نہیں ہو سکتی!

میں کتابوں کو بیکار نہیں کہتا وہ بے شک کام کی ہیں، مگر طبیب کے کام کی ہیں مریض کے کام کی نہیں، کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا، حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے، مگر تم نہیں کر سکتے، اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے، چنانچہ بحران کی بحث گو طب کی کتابوں میں مذکور ہے، مگر اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، یہ بحث اس قدر لطیف اور دقیق ہے کہ اطباء حال نے یعنی ڈاکٹروں نے تو گھبرا کر اس کا انکار ہی کر دیا کہ بحران کوئی چیز نہیں، مگر اطباء قداماء نے اس بحث کو بڑی خوبی سے ضبط کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بحث کا الہام ہوا ہے، چنانچہ انہوں نے بخار کے ایام کی تقسیم کی ہے کہ بعض ایام کی طبیعت و مرض میں مقابلہ ہوتا ہے، طبیعت ان ایام میں مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت کو دبا کر چاہتا ہے، اس کیفیت و مقاومت کا نام بحران ہے، پھر ان ایام میں بعض دن تو سخت بحران کے ہیں اور بعض دن ہلکے بحران کے ہیں، اس لیے مریض کو اور اس کے تیمارداروں کو چاہیے کہ جب کسی کو بخار آئے اس کا دن اور وقت یاد رکھیں تاکہ طبیب سے بیان کر سکیں اور طبیب کو ایام بحران کی رعایت آسان ہو بھلا محض کتاب دیکھ کر ان امور کی رعایت مریض سے کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں ہو سکتی!

### حضرت کا اپنا واقعہ

بلکہ میں تو تجربہ سے کہتا ہوں کہ مریض اپنے معالجہ میں معمولی امراض کے اندر بھی غلطی کھائے گا، چنانچہ مجھے ہر سال برسات کے اخیر میں بخار آیا کرتا تھا، اب تو بھگدہ اللہ بہت سالوں سے نہیں آیا اور ہمیشہ صفری بخار ہوتا تھا، میں نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مجھے غلہ صفری سے بخار ہوتا ہے اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے ہیں، لہذا اس کی نقل کر لیں، جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کر لیا کریں گے۔ حکیم صاحب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوگی، چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا کہ پچھلے سال کا لکھا ہوا نسخہ خود ہی استعمال کر لیا، مگر چند روز استعمال کرنے سے بھی خاک نفع نہ ہوا، آخر کار حکیم صاحب کو بلا یا، انہوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہو گیا،

پھر تحقیق ہوئی کہ اس سال صفرء کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں۔ بلکہ اب بڑھاپے کا سن شروع ہو گیا۔

اب اگر میں اس نسخہ کی بھی نقل کر لیتا کہ چلو اس میں صفرء اور بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا، بلغم ہی بڑھتا (یعنی بلکہ تکلیف و غم ہی زیادہ ہوتا یہ ”بلغم“ مرکب ہے، مفرد نہیں) کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سال بلغم صفرء سے زیادہ ہے یا مساوی ہے یا کم ہے؟ اس کا اندازہ تو طبیب ہی کر سکتا ہے جو نبض کی حالت کو پہچانتا ہے، اس لیے کتب طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے، اسی طرح احیاء العلوم و فتوحات مکہ جو تصوف کی کتابیں ہیں، بیکار نہیں بلکہ کارآمد ہیں، مگر شیخ کے کام کی ہیں، طالب کے کام کی نہیں، طالب کو تو اپنے معالجہ کے لیے کسی محقق کا اتباع لازم ہے۔

(الرغیۃ المرغوبہ صفحہ: ۲۱)

ترانوے واں..... نفع متعدی کا علی الاطلاق نفع لازمی سے افضل ہونا

### درست نہیں

اصلی یہی ہے کہ نفع لازمی (خود اپنے لیے نفع حاصل کرنا) نفع متعدی (دوسرے کو نفع پہنچانا) سے افضل ہے، کیونکہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ جب آپ نفع متعدی سے فارغ ہو جائیں یعنی تبلیغ سے تو نفع لازمی میں مشغول ہوں، یعنی توجہ الی اللہ میں یہ سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ نفع لازمی متعدی سے افضل ہے، کیونکہ متعدی سے فارغ کو طلب کیا گیا ہے نہ کہ لازمی سے، پھر اس کے بعد نفع لازمی میں اشتغال کلی کا حکم ہے کہ اس میں توجہ رکھے اس وقت دوسری طرف التفاف نہ ہو، جیسا: ”السی ربك“ کی تقدیم کا مقتضاء ہے اور ظاہر ہے کہ اگر نفع متعدی افضل ہوتا تو اس سے فراغ مطلوب نہ ہوتا، بلکہ یوں ارشاد ہوتا: ”فاذا فرغت من ذکر ربك فانصب فی التبلیغ والیہ فارغب“ نیز نفع لازمی میں مشغول ہونے کے وقت نفع متعدی سے قطع نظر کا امر ہوتا جیسا تقدیم معمول کا مدلول ہے، کیونکہ مقصود بالذات سے کسی وقت قطع نظر نہیں ہوا کرتی، اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نفع متعدی مقصود بالعرض اور نفع لازمی مقصود بالذات ہے اور گویہ مشہور کے خلاف ہے مگر حقیقت یہی ہے اور قول مشہور کا منشاء یا توجہ ہوا ہے کہ بعض جگہ نفع متعدی نفع لازمی سے اوکد (زیادہ تاکید والا) و اقدم (سب سے مقدم) ہو گیا، مگر اس سے فضیلت بالذات لازم نہیں آتی، بلکہ اقدمیت و اوکدیت ایک عارض کی وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ

نفع متعدی پھر نفع لازمی کی طرف مفضی ہوگا کہ دوسرا شخص بھی رغبت الی اللہ کرے گا اور ذکر و صلوة میں مشغول ہوگا اور اگر اس پر کوئی یہ شبہ کرے کہ شاید نفع متعدی اس لیے شروع ہوا کہ وہ نفع لازمی کے بعد پھر متعدی کی طرف مفضی ہو اس طرح کہ دوسرا شخص بھی اپنی اصلاح کر کے تبلیغ کے قابل ہوگا۔

### اپنی اصلاح مقدم ہے

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو تبلیغ کے قابل بھی وہ نفع لازمی حاصل کرنے کے بعد ہوگا، کیونکہ جس کی خود اصلاح نہ ہوئی ہو، وہ دوسروں کی اصلاح نہیں کر سکتا، پھر دوسرے کا تبلیغ کے قابل ہونا یقینی نہیں، کیونکہ بعض لوگ اصلاح و تکمیل وغیرہ کے اہل نہیں ہوتے اور نفع لازمی کا اہل ہر شخص ہے، پس نفع متعدی پر نفع لازمی کا ترتب یقینی ہے کہ آج ہی سے اس کا ترتب شروع ہو جاتا ہے، نفع متعدی کا ترتب موہوم ہے کہ نہ معلوم یہ دوسروں کی اصلاح کے قابل ہوگا، یا نہیں؟ اور تجربہ یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے قابل ہو سٹیں سے ایک دو ہوتے ہیں۔

پھر قابل ہوا بھی تو نہ معلوم کب ہوگا؟ اور ہو بھی گیا تو نہ معلوم اس کو اصلاح غیر کی نوبت آئے گی، یا نہیں؟ کیونکہ بہت سے سالک نفع متعدی کے قابل ہوتے ہیں، مگر ان کو اس کی نوبت ہی نہیں آتی، یا کم آتی ہے، تو ایسے نفع موہوم کے لیے کسی شے کا ایسا شروع ہونا کہ وہ مقصود بالذات ہو جائے، از بس بعید ہے، ہاں! یہ ممکن ہے کہ بالعرض یہ بھی مقصود ہو جائے، لیکن مقصود بالذات وہی نفع ہو سکتا ہے جس کا ترتب یقینی ہو اور اس کا ظہور بھی موہوم نہ ہو اور وہ نفع لازمی ہے جو نفع متعدی پر فوراً ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے، دوسرے اگر نفع سے مقصود نفع متعدی ہوگا تو طالب کو اس مقصودیت کی اطلاع کے بعد اس کے قصد کی اجازت بھی ہوگی، کیونکہ مقصود کا ارادہ بھی مقصود ہوتا ہے اور مقصود کی نیت مضرت تو ہو ہی نہیں سکتی، مگر شیوخ محققین سے جو کہ مجتہدین فن ہیں، جن کا فتویٰ قواعد فن سے حجت ہے، ان سے پوچھئے کہ وہ طالب کو نفع متعدی کی نیت کی اجازت بھی دیتے ہیں، یا نہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر طالب ذکر و شغل سے مخلوق کو نفع پہنچانے کا قصد کرے گا تو وہ کبھی فتح یاب نہ ہوگا، یہ ارادہ راہ زن طریق ہے، اپنی اصلاح کے زمانے میں اس کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیے، دوسروں کی اصلاح کا خیال مائع طریق بلکہ قاطع طریق ہے، اس سے اپنی اصلاح کے لالے پڑ جاتے ہیں، تو یہ اچھا مقصود بالذات ہوا جس کا قصد کرنا راہ زن طریق ہے، اب بتلائے! اس حالت میں نفع متعدی کو افضل اور مقصود بالذات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ پھر اپنی اصلاح کو تکمیل کے بعد بھی ہر شخص کو نفع متعدی کی اجازت نہیں بلکہ اس کا اہل صرف وہی ہے جس کو مشائخ نے اجازت

دی ہو، اگر نفع متعدی اصل ہے اور یہی مقصود بالذات ہے تو تکمیل کے بعد اس کو از خود نفع متعدی میں مشغول ہونے سے کیوں روکا جاتا ہے؟ اور اجازت شیخ کی قید کیوں لگائی جاتی ہے؟ یہ بھی اس میں دلیل ہے کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں کو نفع متعدی کی اجازت نہ دی گئی ہو وہ سب کے سب نائفص ہی ہوں، حالانکہ مشائخ کے نزدیک یہ بالکل غلط ہے وہ تصریح کرتے ہیں کہ کمال مقصود کا حصول اس امر پر موقوف نہیں۔

## اجازت کی قید کی وجہ

اور قید اجازت کا یہ راز ہے کہ امر بالمعروف کے لیے کچھ آداب ہیں جن کے قابل ہر ایک نہیں ہوتا، مثلاً بعضوں کو سیاست و تدبیر کا ملکہ نہیں ہوتا، جس کے بغیر امر بالمعروف بجائے مفید ہونے کے موجب فتنہ و فساد ہو جاتا ہے، اس لیے بعض لوگوں کو گو وہ درجہ کمال کو پہنچ چکے ہیں، ارشاد و تلقین و نفع متعدی کی اجازت نہیں دی جاتی، مگر اس سے ان کے کمال کی نفی نہیں ہوتی، حالانکہ نفع و متعدی کا مقصود بالذات ہونا اس صورت میں نفی کمال کو مستلزم ہے جو اہمما تحقیق کے خلاف ہے، دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ اگر نفع متعدی مقصود بالذات ہے تو حربی و دار الحرب میں اسلام لائے اور نفع متعدی پر قادر نہ ہو تو بتلائیے! وہ کیا کرے؟ نفع لازمی کو لازم پکڑے یا نفع متعدی کو؟ اگر نفع متعدی میں مشغول ہونا لازم کیا گیا تو تکلیف مالا یطاق اور اگر نفع لازمی کا اس کو امر کیا گیا تو ثابت ہوا کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں، کیونکہ مقصود بالذات سے کوئی مسلمان محروم نہیں ہو سکتا، یہ سب اس امر کے دلائل ہیں کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود بالعرض ہے اور مقصود بالذات مقصود بالعرض سے افضل ہوا کرتا ہے۔ (المرغیۃ المرغوبہ صفحہ: ۴۶)

چرانوے والی اعتراض..... جبرائیل علیہ السلام کا فرعون کے ڈوبنے

## کے وقت اس کے منہ میں مٹی ٹھونسنا!

اس کا علمائے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی، جن تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَلَمَّ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ كَمَا رَاُوْا بَاْسَنَا" (جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے تو ان کا ایمان لانان ان کے لیے نافع نہ ہوگا) تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے، بصورت اسلام سے روکتے تھے، جس پر گورحمت فی الآخرت مرتب نہیں ہوتی، مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے، جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل اور قید ہونے سے محفوظ رہے،

اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق و ہلاک سے بچ جاتا، پھر اس پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت آیت میں یا سنا سے مراد عذاب دنیا تو ہے نہیں، کیونکہ عذاب دنیا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں اور ظاہراً یہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا، ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے، چنانچہ بعض مختصرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا، چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں، تم ان سے پردہ کرو تو ابتداء انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے۔

### فرعون کا ایمان لانا

اور فرعون کے واقعہ سے ظاہراً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے، اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کا بھی ہوش تھا، چنانچہ اس کا قول: "أَمِنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آتَانِي الْمَنَىٰ بِهٖ بَنُو إِسْرَائِيلَ" (میں اس ذات پر ایمان لایا جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے) بتلا رہا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کا حق پر ہونا اور ان کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کا ہوش ضرور تھا، لیکن اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے، بس اس دلیل سے عذاب آخرت کی نفی نہیں ہو سکتی اور یہ انکشاف مانع ہے، قبول ایمان سے، پس اشکال رفع ہو گیا، اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان سے اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ تھی، اگر چہ زبان سے تافظ کیا جائے تو پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا؟ اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جائے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہیے، اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو اور یہاں عجز ہو گیا کچھ کر جب سے تو وہ اقرار مفید تحقق ہو گیا، پھر کچھ ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا؟

### فرعون کی نعش کا محفوظ رہنا

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس کے لیے گوارا نہیں کیا، اگرچہ رحمت ظاہری کا ایک گوندہ ظہور نعش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا، جیسا کہ ارشاد ہے: "فَالْيَوْمَ نُنَجِّكَ بِبَدَنِكَ" (پس ہم نے تجھے آج تیرے بدن کے ساتھ نجات دی) مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اس ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا؟ اس کا جواب وہی ہے



جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشا غلبہ بغض فی اللہ تھا، اس میں یہ بھی گوارا تھا اور یہ بھی غلبہ حق سے ایسا بغض بدون غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔

(العیون والوعید صفحہ: ۱۰)

پچانوے وال اعتراض خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی امر کے متعلق اس

کو لازم نہیں کہ وہ غیر اختیار ہو جائے!

میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے، جو چند مقدمات پر مبنی ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا ہے بھی تو مریض کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ بغض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مریض پیچھے گا نہیں اس کو دوا امت دوا اور کوئی محقق اس حالت میں بھی جبر ادا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں، وہ اپنے قواعد طبیب سے اس مرض کو لا علاج سمجھتا ہے، مگر سمجھنا ظنی ہے، قطعی نہیں وہ قدرت خدا پر نظر کر کے امیدوار ہے:

عقل در اسباب می دارد نظر  
عشق می گوید مسبب را مگر

مگر حق تعالیٰ کو تو علم غیب ہے۔ اگر "حَسَمَ اللَّهُ عَلَيَّ فَلَوْ بِهِمْ" سے ان لوگوں کے لا علاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی، کیونکہ علم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جائے، کیونکہ "لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" خلاف ہے تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو دوا پر مجبور کیا ہے "نَأْيُهَا النَّاسُ اغْبَاذُوا رَبِّكُمْ" میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے، پھر لفظ "يَأْيُهَا النَّاسُ" خود موم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توجہ و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے، جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارے میں "حَسَمَ اللَّهُ عَلَيَّ فَلَوْ بِهِمْ" فرمایا گیا ہے، پھر اس پر اجماع ہے کہ ایوہل و ابولہب وغیرہ ایمان کے مکلف نہ ہو اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ یہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے جو عذاب ہو رہا ہے، تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے "حَسَمَ اللَّهُ عَلَيَّ فَلَوْ بِهِمْ" نازل فرما دیا تھا، حالانکہ اس کا معذب ہونا مخصوص ہے، کیونکہ "حَسَمَ اللَّهُ عَلَيَّ فَلَوْ بِهِمْ" کے ساتھ ہی:

”وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ“ بھی وارد ہے، پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارے میں ”حَتَمَ اللَّهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ“ فرمایا گیا ہے، ایمان کے مکلف وہ بھی تھے، اس لیے مشتقی نہ تھے۔ اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق ”حَتَمَ اللَّهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ“ نازل ہوا ہے، ان کا مرض روحانی لا علاج نہ تھا۔ اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس علاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے، مگر وہ بھی مایوس علاج نہیں، تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لا علاج نہیں، رہا یہ سوال یہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیا، مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ: ”لَا يَوْمَنَ أَبُو جَهْلٍ وَ نَحْوَهُ مَعَ بَقَاءِ اِخْتِيَارِهِ“ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا اس کے اختیار میں ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا، خوب سمجھ لو! اس سے زیادہ کام کرنا فعل فی القدر ہے، جس کی اجازت نہیں غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا اور جب وہ اختیار سے خارج نہیں تو اس کی تدبیر کرنا فضول نہیں، ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو تو چاہیے کہ آج سے قرآن کے حفظ کو ترک کر دیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے: ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ جس میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نعوذ باللہ! قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو، لکھنا بھی چھوڑ دو، چھاپنا بھی چھوڑ دو اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں، ان کو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کافی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو میمنا بھی ہے، جتنے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کر لیں گے، کیونکہ: ”إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ میں سب طریقے آگئے، مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا، حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے، پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپ نے یہ توجیہ کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی اور چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے؟ میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے؟ آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں، اس کا جواب دیجئے! آخردونوں باتوں میں ماہ الفرق کیا ہے؟ فرق کا مبنی بتلائے! اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے! میں بتلاتا ہوں، آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ”إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ کے معنی یہ ہے کہ ہم ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کرتے رہیں گے اور ہم حفاظت کے طریقے بھی ان کے قلوب میں ڈال دیں گے کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے، لکھیں گے بھی، پڑھیں گے پڑھائیں گے بھی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد اپنی آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے اسی

طرح ہا اتفاق کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بد پرہیزی کو اس میں دخل ہے اور پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چون کہ یہ لوگ با اختیار خور بد پرہیزی کریں گے اس لیے نا اتفاق رہے گی، لیکن یہ بات ثابت ہوگی کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی چیز کے متعلق پیش گوئی کرنا اس کو تسلیم نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہو جائے اور اس کی تدریج نہ کی جائے اور اس کا راز وہی ہے جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیش گوئی بھی مرض کے لا علاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لا علاج کوئی مرض نہیں، یہاں جو پیشگوئی ہوئی ہے، مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ (الاسناد صفحہ: ۸)

چھینا نوے وال اعتراض..... خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہ سے

کثرت فتوحات کی وجہ سے افضل سمجھنا غلط ہے!

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھیں، بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمانوں کو سنبھالنے میں صرف ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہو گئے تھے، کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ خلافت اس فتنہ ارتداد کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا، مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ توفیق نہ آئی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا، روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہو گیا اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے، یہاں تک کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً و غرباً پھیل گئی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس لیے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں، مگر عقل مند خوب جانتے ہیں کہ مکہ کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھی، کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے، مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا، یہ بڑا کام ہے، دیواریں قائم کرنے والے کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پرائنٹ رکھتا چلا گیا، اس کو کون سی دماغ سوزی کرنی پڑی؟ ظاہر میں لوگ دوسرے معمار کی تعریف

کرتے ہیں، کیونکہ مکان کو اس نے مکمل کیا، مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصورتی بڑا کمال نہیں، بڑا کمال نقشہ بنانے والے اور بنیاد قائم کرنے والے کا ہے، اسی طرح جو اسرار شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلاف صدیقیہ سے خلافت عمریہ کو کوئی بھی نسبت نہیں، کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکومت اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو لقب برداشت کرنا پڑا ہے، اس کا عشر عشر بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہیں پیش آیا، یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جب کہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہوا چاہتی تھی، تمام فتنوں کا مقابلہ کر کے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کر کے ڈھائی سال کے عرصہ میں خلافت اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیے اور نظام حکومت کو ایسے مستحکم اصول پر قائم کر دیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی نہ پیش آسکے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت میں وہ اصول جاری ہو گئے اور نظام صدیقی شائع ہو گیا تو بڑا کمال حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور جس قدر فتوحات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہوئی ہیں، ان سب کا ثواب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صحیفہ اعمال میں داخل ہوگا، اہل تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے، قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا رسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا۔

(الجلالہ لئلا بتلاء صفحہ: ۹)

ستانوے وال اعتراض..... کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ

بند ہو گیا؟

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا، کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں، علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں، پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہو گیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہو سکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا؟ یا ان مسائل کے جواب کے لیے کوئی نیا نبی آسمان سے اترے گا؟ اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں قادیان والے نہ سن لیں، کہیں یہ بات ان کے کانوں میں پڑ گئی تو مسیح موعود کے دلائل نبوت کی فہرست میں ایک اور دلیل کا اضافہ کر لیں گے، پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟ ”الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبَسُوا الْحُلُمَ“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی کہ دروازہ اجتہاد بالکل بند کر دیا جائے تو پھر

شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں نہ ائمہ مجتہدین سے کہیں منقول ہے۔

## نئے مسائل کے جوابات

پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اب بتلائیے کہ اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی بھی جواب نہیں، پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا، نہ فقہاء اس کو جانتے تھے نہ کوئی حکم لکھا اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں اور ایسے نئے مسائل کا جواب دیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا، اگر اجتہاد فی الفروع بھی نہ ہو سکے تو شریعت کے نامممل ہونے کا شبہ ہوگا، جو بالکل غلط ہے، شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں، قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ میں شریعت سے نکالتے رہیں گے، کیونکہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول و قواعد سب سے پہلے مجتہدین بیان کر چکے ہیں، جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

## اجتہاد فی الاصول کی بندش

البتہ قرآن وحدیث سے اصول مستنبط کرنا یا اب نہیں ہو سکتا، یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہو گیا، کیونکہ اول تو جس قدر اصول و قواعد شریعت کے تھے، وہ سب ائمہ مجتہدین بیان کر چکے، انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا، دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کیے تو وہ مشکوک نہیں، کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لیے اب دماغ قابل ہی نہیں رہے، یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کیے جو کہیں نہیں ٹوٹ سکتے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ”ہدایہ“ کے اصول مسلم نہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ”ہدایہ“ غیر معتبر کتاب ہے۔ اس میں اصول غلط نقل کر دیے گئے ہیں بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کیے ہیں، جن میں وہ نقل نہیں ہیں، سو وہ معتبر نہیں، باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں، تو اب دیکھ لیجئے کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں، ان کی علمی شان ”ہدایہ“ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے

کمال کر دیا، ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں۔ ایک عقلی، ایک نقلی، کیا ٹھکانا ہے وسعت نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں، پھر حدیثیں گو بلا سند بیان کرتے ہیں، مگر تفتیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں، چاہے مسند بزار میں ہوں یا مسند عبدالرزاق میں، بیہقی میں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں، کہیں ضرور ملیں گی، ایک دو اگر نہ ملیں تو ممکن ہے، مگر جس شخص کی نظر اس قدر وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملے ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اصل ہی نہیں، یہ تو وسعت نظر کا حال ہے، فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے! مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا، ان کا جواب دینا، پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا، یہ ان کا خاص حصہ ہے، مگر بایں ہمہ جو اصول کو خود قرآن و حدیث سے نکالتے ہیں، ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے فیصلہ فرما دیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں، کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں، تو آج جن لوگوں کی وسعت نظر و فہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہو وہ کیا حدیث و قرآن سے اصول مستنبط کریں گے.....؟

### اجتہاد فی الفروع باقی ہے

ہاں البتہ اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ ہم بھی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی طرح مجتہد ہو گئے، کیونکہ اصحاب سیاست خوب جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے، ہم لوگ سوائے اس کے کہ ان حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث الفتاویٰ میں جاری کر دیں اور کیا کر سکتے ہیں؟ کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث و قرآن میں فوراً کر کے ایسے اصول و قواعد سمجھے، جو قیامت تک کے جزئیات کے لیے کافی ہیں، کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز و عدم جواز ان اصول سے نہ نکلتا ہو، بلکہ ان حضرات نے صرف اصول و قواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا، جزئیات بھی اس قدر نکال کر بیان کر گئے ہیں کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ہوتا ہے جس کو وہ صراحتاً یا دلالتاً بیان نہ کر گئے ہوں اور اگر کوئی شاذ و نادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہاء نے نہیں بیان کیا تو کبھی تو مفتی کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا، یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت سے نکل سکتا ہے، مگر مفتی صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا اور اگر بالفرض جزئیہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو اصول سے تو وہ ضرور ہی مستنبط ہوگا، پس آج کل یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو ائمہ مجتہدین کے برابر کر سکے۔

اٹھانوںے واں اعتراض علم الاعتبار نکات و لطائف کے درجہ میں ہے!

اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں، ان کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں، مدلول قرآن نہیں ہیں، یوں نہ کہیں گے ثابت القرآن ہیں، ہاں منطبق موافق کہہ دیں گے اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے، ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہوگا، فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس جام آیا اور اس نے کہا کہ خط بنوا لیجئے، اس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو، اتفاق سے جس وقت اس نے یہ جواب دیا تھا، لڑکے والوں کی طرف سے ڈوم بھی ان کی لڑکی کی شادی کا خط لے کر آیا، وہ بھی اتفاق سے اس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب ”بڑھنے دو“ دونوں سوالوں کا ہو سکتا ہے، اول اس سوال کا اس طور پر کہ خط بڑھنے دو جب بڑھ جائے گا بنوائیں گے۔ دوسرے سوال کا اس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے، اس کو بڑھنے دو، پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے، قصد تو یہ تھا کہ نائی کو جواب دیں، لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ ڈوم کا بھی جواب ہو گیا، بس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں، یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی، وہ یہ کہ صوفیائے کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے: مثلاً: ”اذھب الی فرعون انہ طغی“ کے متعلق لکھا ہے: ”اذھب ایھا الروح الی النفس انہ طغی و اذبحوا بقرة النفس“ تو ان تاویلوں کو دیکھ کر دو ہمتیں ہو گئی ہیں، ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور ”یحمل النصوص علی ظواہرہا“ کے پورے پابند ہیں، انہوں نے تو ان تاویلات کا بالکل انکار کر دیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس؟ کہاں موسیٰ؟ کہاں روح؟ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لے لیں اور صوفیہ کو اس بنا پر ضال و محرف کہہ کر ان کے منکر ہو گئے کہ ان کو تو یہ ضرر ہوا کہ حضرات اہل اللہ کی برکات سے محروم ہوئے، دوسرے وہ تھے جو ان حضرات کی محبت میں غرق ہیں، وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے، علماء ظاہر یہ نہیں سمجھے، اس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے، پھر اس بات میں غالین کا یہاں تک غلو بڑھا کہ بعض جگہ تو انہوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنا دی ہے، واللہ! یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوئے، خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز ہرگز نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اٹھ گیا، اس لیے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا، لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات و اشارات میں، سو اس میں بعض تو ان کے ہی منکر ہو گئے اور بعض مفسرین کے منکر ہو گئے۔

## ہمارا طریقہ کار

اب رہ گئے ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں، تو دونوں کی اعانت و حفاظت کے لیے ضرورت ہوئی کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر جمول کیا جائے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہ ہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلاف قواعد شرعیہ نہ ہو، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ صوفیائے کرام نے جو آیات کے معنی بیان کیے ہیں یہی فی الواقع تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں، ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفس اور موسیٰ سے روح اور بقرہ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرما رہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو بھی قیاس کرو، اس کی ایسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمر کی دیکھا دیکھی میں کیا اور اس میں اس کو ناکامی ہوئی تو اس موقع پر کہتے ہیں: کو چلا ہنس کر چال اپنی بھی بھول گیا، تو اس کلام میں کوئے سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمرو یقیناً نہیں ہے، کوئے سے مراد ہے کو اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقعے ایک حالت کے اندر مطابق ہیں۔ ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آ گیا اور ایک دوسرے کے ساتھ تشبیہ دے دی، مثلاً یہاں زید و عمرو اور ان کے قصے کو کوئے اور ہنس سے تشبیہ دے دی، پس ”اذھب ایھا الروح“ سے مراد یہ ہے کہ قاری صاحب تو قرآن پڑھے اور یہاں پہنچے تو اس قصے سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کے مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے، قصے کو قصے ہی کے طور پر مت پڑھو، بلکہ قرآن شریف کے ہر ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابق کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ، یہ مطلب ہے صوفیائے کرام کا، پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں، جو ان تاویلات کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو ان کی تفسیر اور مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل ہی گئے گزرے ہیں، یہ تاویلات لطائف اور نکات کے درجے میں ہیں، تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے، علوم قرآنیہ وہی ہیں جن پر عبارت النص، یا اشارۃ النص، یا اقتضاء النص یا دلالت النص سے استدلال ہو سکے، ورنہ وہ نکات و لطائف کا درجہ ہے۔

(الاتفاق صفحہ: ۱۰)





ننانوے واں اعتراض تبلیغ کو سیاسی اغراض کی وجہ سے ترک کرنا

جائز نہیں!

اب دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے؟ اور ہم کو اس طرف توجہ ہے یا نہیں؟ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں، اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں، بلکہ اگر اس میں غور بھی کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے، اس کو درجہ و جوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے، کوئی مستحب سمجھتا ہے، کوئی مستحسن اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ مصلحت سیاسیہ وغیرہ کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ ندارد اول تو یہی غضب تھا کہ بعض واجب کو مستحب سمجھا پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگادی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو، وہ کیوں؟ محض اپنے اغراض کے سبب! کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ مسئلہ ان کی اغراض کے موافق ہے، یا مخالف؟ پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی، کہہ دیا کہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے، لہذا مستحب بھی نہیں رہا، اب اس کو اصلاً مامور بہ نہیں سمجھتے، بلکہ عجب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں، افسوس مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنا لیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سرانجام پائے، پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، مگر افسوس یہ نہیں کرتے۔

لوگوں کا حال

بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لیے دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے توجہی کی کہ اس میں انہیں اغراض کی وجہ سے بے حد تامل کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی اور ایسے بہت نکلیں گے، تو ہماری یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہہ دیں کہ ”صل فانک لم تصل“ اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوا ہے، اس لیے باوجود علم کے محض دقیق تاویل میں گھڑ لیتے ہیں، مگر خدا کے ساتھ یہ جیلہ و تزور (حموت) چل نہیں سکتا۔ ”ہَلْ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْفَىٰ مَعَاذِيرَهُ“ اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے اور امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیاوی اغراض فوت ہوتے ہیں، دوسری نہیں

رہے گی، میل ملاپ نہ رہے گا، ہنسی خوشی جاتی رہے گی، اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا، پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جائے گا، پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہی ہے، ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کر لو کہ صاحب! امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی باتیں پیش آئیں تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں، یا نہیں؟ ان سے پوچھو کہ کون کون سی چیزیں مسقط و جوب امر ہیں.....؟

## امر بالمعروف کے آداب

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں، اس کے لیے کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں، برابر ہے اور ضرور ہے، مگر شرائط و ضوابط و آداب و اعذار علماء سے دریافت کرو، خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگا لیا کہ ہم تو معذور ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط و آداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو، اس کو البتہ حق ہے شرائط و ضوابط پوچھنے کا وہ اگر آداب اعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلا دیا جائے گا، باقی حالت موجود میں جب کہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں، اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے کا اور سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں جو شخص کام کا ارادہ بھی نہ کرے اس کو نہ شرائط و ضوابط بتلائے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا حق ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لیے تلاش کرے گا تا کہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جائے جب اعذار معلوم ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لے گا کہ مجھ میں یہ عذر موجود ہیں، یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں، ہم کیسے امر بالمعروف کریں؟ اس لیے علماء کو چاہیے کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط بتلا ہی نہ کریں، جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیے، ورنہ وہ تو مسقط صلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا، ہر وقت اس دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جائے، البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا وہ پوچھے تو اس کو بے شک بتلا دیا جائے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مخلص مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیے کہ ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار و مواقع کی اطلاع کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔ (آداب التبلیغ صفحہ: ۴)

## سوال اعتراف..... حضرت منصور رحمہ اللہ کے ”انا الحق“ کہنے کا راز!

وہ ”انا الحق“ خود نہ کہہ رہے تھے، بلکہ اس وقت ان کی وہ حالت تھی جیسے شجرہ موسیٰ سے آواز آئی تھی: ”إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ“ گواہ شجرہ ہی سے نکل رہی تھی، چنانچہ خود نص میں تصریح ہے:

”لَوَدَىٰ مَنْ شَاطِئِي الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يَأْمُرَنِي.....“ تو کیا شجرہ خود کہہ رہا تھا: ”إِنِّي أَنَا اللَّهُ؟“ ہرگز نہیں ورنہ شجرہ کا رب ہونا لازم آئے گا، وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ آواز شجرہ میں سے نہیں نکلی تھی، بعینہ صوت حق تھی، کیونکہ حق تعالیٰ صوت سے پاک ہے اور یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صوت ہی مسوع ہوئی تھی جو سمت خاص اور مکان خاص کے ساتھ مقید تھی، تو اس کو حق تعالیٰ نے ”وادی ایمن اور بقعہ مبارک اور من الشجرہ کے ساتھ مقید کیا ہے ورنہ کلام حق بعینہ ہوتا تو ان قیود سے مقید نہ ہوتا، پس ماننا پڑے گا کہ وہ آواز تو شجرہ ہی کی تھی اور اسی میں سے نکلی تھی مگر وہ حق تعالیٰ کی طرف سے متکلم تھا خود متکلم نہ تھا، جیسے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے: ”فَإِذَا قُرَأَتْهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ“ کہ جب ہم قرآن پڑھا کریں تو آپ قراءت کا اتباع کیجئے یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صوت کو سنتے تھے اور خدائے تعالیٰ صوت سے منزہ ہیں، پھر اس قرآن کا کیا مطلب ہے؟ یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں قراءت جبرائیل علیہ السلام کو قراءت حق کہا گیا ہے، وہ بحکم حق قراءت کرتے تھے، ایسے ہی یہاں بھی قول شجرہ کو قول حق کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نے جو کچھ کہا تھا بحکم حق کہا تھا، پس یونہی منصور کے ”أَنَا الْحَقُّ“ کو خدا تعالیٰ کا قول کہنا چاہیے، کیونکہ غالبہ حال میں کلام حق ان کی زبان سے نکلا تھا، وہ بھی متکلم بحکم حق تھے، خود متکلم نہ تھے۔

## ایک بزرگ کا واقعہ

چنانچہ ایک بزرگ کے واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ منصور نے بھی اپنے کو خدا کہا تھا اور فرعون نے بھی وہ تو مقبول ہو گئے اور یہ مردود ہو گیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ جو اب ارشاد ہوا کہ منصور نے اپنے کو منکر ”أَنَا الْحَقُّ“ کہا تھا اور فرعون نے ہم کو منکر ”أَنَا رَبِّكُمْ الْأَعْلَى“ کہا تھا اس کا یہی مطلب ہے کہ منصور نے جو کچھ کہا تھا خود نہ کہا تھا

کیونکہ وہ خود ہی کو مٹا چکے تھے، اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گفت فرعونے انا الحق گشت پست  
گفت منصورے انا الحق گشت مست  
لعنت اللہ آں انا را در فقہا  
رحمۃ اللہ ایں انا را در وفا

(المودۃ الرحمانیہ صفحہ: ۳۰)

☆.....☆.....☆

## حصہ سوم

## پہلا اعتراض..... آسمان کے وجود پر دلیل!

اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کو وجود نہیں، ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں، تو دیکھو یہ مسئلہ غلطی ہے، یا یقینی؟ تو سائنس کی رو سے عدم (نہ ہونا) قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا، آج تک جتنی دلیلیں فنی آسمان (آسمان کے نہ ہونے) پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم (علم کا نہ ہونا) ہے جو کہ عدم وجود کو تسلیم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے، کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے، یعنی آسمان کا وجود عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی مجر (خبر دینے والا) جو قطعاً صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے، پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ آسمان موجود ہے اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے، یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممنوع پس یہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری عدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی زیادہ سے زیادہ اگر کہا جاسکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت عدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، امریکا کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکا موجود نہیں ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضرب نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے ان کو وجود آسمان تسلیم کر ادیں گے، البتہ اس کے ضروری الوجود ہونے پر شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کیے ہیں۔

## فلاسفہ کے دلائل مخدوش ہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں، واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیل گوں رنگ کو جو جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا ہے اور آج یہ بات ثابت

ہوگئی ہے کہ نیل گوں رنگ آسمان نہیں ہے۔

اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے، وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بناء الفاسد علی الفاسد ہے، دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے، تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔

### شریعت سے سائنس متصادم نہیں

پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے دلائل سائنس سے متصادم ہے، سخت غلطی ہے، کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق اور تصادم ناطقین میں ہوتا ہے ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا اور جب تعارض نہیں ہے تو سہا کی تفسیر کو اکب یا فوقاً، وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے وہی کو معیار نہیں بنایا، کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ (تقوم الزلیغ صفحہ: ۱۱)

### دوسرا اعتراض..... جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو مؤثر حقیقی سمجھنا صحیح نہیں

جواب:

فرمایا: نئے خیال کے لوگ اسباب علم پر ایسے جمع ہیں کہ مسبب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا اسباب طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور غلطی ان کی یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا، مثلاً آگ کا اثر ہے، جلانا، اس کے دوام سے یہ سمجھنا کہ اس کا ذاتی اثر ہے انفکاک (جدا ہونا) متصور نہیں اور یہ سخت غلطی ہے، اس وجہ سے انہوں نے قصہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق آیت: "قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا" میں تاویلات بعیدہ کیں، یہ سمجھ کر آگ کیونکر جھنڈی ہو سکتی ہے۔

### ایک مثال

اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل والوں کی اصطلاح میں گاڑی روکنے کے لیے سرخ جھنڈی ہوتی ہے، ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ خود اس جھنڈی میں یہ اثر ہے کہ اس سے گاڑی رک جاتی ہے، کیونکہ جب دیکھا تو ایسا ہی نظر آیا اور جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ کہیں گے کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے، باقی یہ جھنڈی محض علامت ہے اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں

ایسے ہی بغیر حکم حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے تو زبان حرکت کرتی ہے تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہے، افسوس منورین! (انکار کرنے والے) نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کر لیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے۔

(ملفوظ نمبر ۲۵، دعوات عبدیت حصہ ۲)

## مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے

بعض لوگ ایسے گھڑنے والے ہیں جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں، بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز کا مدار رکھتے ہیں، حالانکہ حق تعالیٰ نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو بجا بجا ظاہر فرمایا اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جائے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو مؤثر ماننا ضروری ہے، کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادثہ کے لیے آپ نے ایک دوسری شے کو سبب مانا ہے وہ سبب بھی تو ایک حادثہ ہے، اس کے لیے کون سبب ہوا؟ اگر اس کے لیے آپ نے تیسری چیز کو سبب بنایا، ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلہ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جائے گا ورنہ تسلسل لازم آئے گا اور لامتناہی کے ابطال پر متکمین دلائل قائم کر چکے ہیں اور یہ حکماء کی حماقت ہے وہ اجزاء عالم کو حادثہ بالمشخص اور قدیم بالذات کہتے ہیں کہ ہر فرد تو حادثہ ہے، مگر نوع قدیم ہے، حالانکہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدون شخص کے نہیں ہو سکتا، پھر جب ہر شخص حادثہ ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا؟ غرض دلائل عقلیہ سے بھی اور نقلیہ سے بھی مشیت حق کا مؤثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے اور جو شخص ہر بات میں لا تسلم ہی کا سبق پڑھے اس کا علاج متکلمین نے احراق بالنار بتلایا ہے، نیز فطرۃ حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے اور ماننے کی چیز کو نہ ماننا تحکم ہے اور تحکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں ہے۔

## پاگل کا دعویٰ

جیسے ایک مجنون پاخانہ کھار ہاتھا، کسی نے ملامت کی تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے؟ یہ وہی تو ہے جو توڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا، اب وہ ہمارے اندر سے نکل کر برا کیوں ہو گیا؟ ذرا اعتلاء کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دیں مگر عرف اور طبیعت سے کام نہ لیں، محض عقلی دلیل سے اس کے دعوے کو باطل کریں میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل قائم نہ کر سکیں گے، مگر اس سے کوئی یہ کہے کہ اس مجنون کی بات صحیح ہے؟ ہرگز نہیں! سب یوں ہی کہیں گے کہ وہ نالائق پاگل ہے جو ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔

## خدا کا منکر بھی پاگل ہے

اسی طرح ہم منکر صانع (خدا کا انکار کرنے والا) کو پاگل سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے ماننے پر اجماع عقلا، و اتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید یہ تو کامل درجے کی دہریت ہے کہ خدا ہی کون نہ مانے اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے اور اس کی قدرت و مشیت کو کامل نہ مانے بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے، کیونکہ یہ شخص خدا کا قائل ہے اور محض برائے نام قائل ہے، جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پیشین یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں، چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کا کوکنے والا کہ کوک بھردینے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں، بلکہ اب وہ خود بخود چلتی رہے گی چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو، جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت نہیں، ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا، اس اسباب سے مسیبات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا، نعوذ باللہ! اس تاثر و تاثیر میں حق تعالیٰ کا کچھ بھی اختیار نہیں وہ اسباب سے مسبب کو مختلف نہیں کر سکتے۔ بس ان لوگوں کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے بعض لوگ ”من تشبه بقوم فهو منهم“ سے بچنے کے لیے کوٹ پتلون اور یوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں کہ ساری ہیئت کو کفار کی سی ہے، صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں، ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لیے قدرت و اختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے، کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی نہ ماننے کے مثل ہے، مگر الزام دہریت سے بچنے کے لیے برائے نام یوں کہتے ہیں خدا موجود ہے اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور اس کی قدرت و اختیار کامل بھی مانتے ہیں جیسے عامہ مسلمین۔

## مسلمانوں کی حالت

مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں، دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے، چنانچہ مصائب و حوادث میں ہم اپنے قلوب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے، ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتضاء ہوتا ہے، مگر پھر بھی طبیعت کے اقتضاء میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ تو فرق ہونا چاہیے، جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ تو فرق ضرور ہوتا ہے، اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی،



اسی طرح اعتقاد قدرت الہیہ کی برودت سے طبعی خلجان میں کچھ تو کمی ہونا چاہیے، ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو یہ ہے مگر چونکہ ہمارا اقرار ضعیف ہے، اس لیے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا، جیسے گرم پانی کے ایک منگے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا یا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہوگی مگر اس کا احساس بھی نہ ہوگا میں تو کہتا ہوں کہ جو شے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں، جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو وہ غیر معتد بہ ہے، اس لیے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتد بہ نہیں، دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہیں ہوگا، گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجائے۔

(خیر الحیات و خیر الممات صفحہ: ۵)

تیسرا اعتراض..... کثرت رائے کلیتہً حق ہونے کی دلیل نہیں!

جواب نمبر ایک:

آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے، صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے؟ کیا ان عوام کا الانعام کی؟ اگر انہیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا؟ ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام دوسری طرف، آخر انہوں نے توحید کو چھوڑ کر کیوں بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سہ لیا؟ اسی لیے کہ وہ قوم جاہل تھی، اس کی رائے جاہلانہ تھی، آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم میں پھوٹ ڈال دی، یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔

[فضائل العلم و الخیر: ص ۳۰]

جواب نمبر دو:

(غزوہ احد میں) ان پچاس آدمیوں میں (جو پہاڑ کی گھاتی پر متعین کر دیے گئے تھے) اختلاف ہوا، بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے، اب ہم کو گھاتی پر رہنے کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لیے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی، اس لیے حکم قرار بھی ختم ہو گیا اب یہاں سے بٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے، ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مالِ غنیمت جمع کر لینا چاہیے، بعض نے اس رائے کی مخالفت

کی اور کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ بٹنا، اس لیے ہم کو بدوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے ہرگز نہ بٹنا چاہیے۔

مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھائی سے بہت کرمال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے، یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھائی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے اس واقع میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور ملت رائے صوب پر تھی جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ (ذم النبیان صفحہ: ۱۳)

### جواب نمبر تین صرف کثرت رائے کی کوئی حقیقت نہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبل مرتد ہو گئے تھے جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے تھے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے، تو حید و رسالت کے مقرر رہے، کعبہ کو قبلہ مانتے رہے، نماز کی فرضیت کے قائل رہے مگر زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھی، اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا، اس لیے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی، اب وہ حالت نہیں رہی اس لیے فرضیت بھی باقی نہیں رہی، جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔

پہلی جماعت کے بارے میں سب صحابہ کی بالا اتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے، مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں، صرف ان سے لڑائی کی جائے ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔

### صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عزیمت

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی، وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہتے ہیں ہمارے قبیلے کی طرف نماز پڑھتے ہیں، ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے؟ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جاسکتا ہے؟ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے

فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے، حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”من بدل دینہ فاقتلہ“ اس لیے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔

### حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جواب دیا

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گوآرمیوں سے کیسے قتال کریں گے؟

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

”اجبار فی الجاہلیۃ و عوار فی الاسلام؟ واللہ! لو منعونی عقلا و فی رواۃ عننا

کانوا یؤدونه الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا قاتلیم“

”اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بڑے ہو گئے؟ بخدا! اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔“

اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ”ان اللہ معنا“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں، اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہیں۔ ان شاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس قوت قلب کی.....!!

چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے اس واقعہ سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھے ہوئے ہیں۔

(ذم النسیان صفحہ: ۳۰)

چوتھا اعتراض..... مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا کیا

### خلاف عقل ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من! ہے تو فحش بات، لیکن تفہیم کے لیے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقتہ سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہہ خانے

میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی کس طرح پیدا ہوا ہے؟ حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفینہ کہا جائے کہ آدمی اس طور پر پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقہ سے انسان پیدا ہوتا ہے، اس لیے ہم کو خلاف عقل نہیں معلوم ہوتا۔

تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں، ہمارے تمام حالات ہی خلاف عقل ہیں ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے، ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ کہا: چار روئیاں۔ ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو اور پی لو اور باتیں بنا لو جب اتنی عقل ہے تو اسرار شریعت کہاں تک سمجھ میں آئیں؟ ایسے ہی نفس اخیخہ بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے، اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابل انکار کیسے ہوگی؟ اور اس لیے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت و راز کو بیان کریں، لیکن تمہرے بتائے دیتے ہیں۔

### قربانی کی حقیقت

وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنت ابراہیم کا اتباع ہے اور شے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کر دینے سے حاصل ہو جاتا ہے، گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔  
دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں، لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں، دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے، یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح و لد کے کر دیا، اس لیے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے، جیسے آج کل تو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے، سر اسر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہار محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ اس میں حاصل ہے، پھر مال کہاں ضائع ہوا؟ (ترغیب الاخیخہ صفحہ: ۱۳)

### پانچواں اعتراض..... جماعت علماء کو نکما سمجھنا صحیح نہیں!

برسبیل وعظ بیان فرمایا کہ آج کل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت بیکاروں کی پلٹن اور کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں، حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص انجلا، ہو جاتا ہے، فرض کیجئے! اگر دو شخص یکساں دماغ کے انگریزی پڑھیں اور ایک ان میں عربی بھی پڑا ہوا ہو، صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر بہتر ہوگی، مقابلہ ضرور زیادہ ہوگا، چنانچہ ایک سنج عربی پڑھے ہوئے تھے، ان کے فیصلے نہایت نہیں مدلل اور پر زور ہوتے تھے، ہم لوگ عربی پڑھے

ہوئے اگر دنیا کمانے پر آئیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما کر دکھائیں۔

تو فہم کے متعلق تو یہ گفتگو تھی، رہی کم ہمتی، اس کا شبہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت روپے نہیں کما تے، قلیل پر قناعت کرتے ہیں تو اس کا جواب ایک مثال سے سمجھ لیجئے۔

اگر کوئی شخص آپ کے یہاں نوکر ہو اور صرف پانچ روپے ماہوار پاتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کو بیس روپے دینے لگے، لیکن وہ یہ کہہ دے مجھ کو تو یہ پانچ روپے ہی اچھے ہیں، اپنے آقا کو نہیں چھوڑا گا، تو سچ کہیے! کیا آپ اس کو کم ہمت اور بیکار کا خطاب دیں گے؟ نہیں بلکہ آپ اس کو کہیں گے کہ بڑا عالی ہمت اور وفادار شخص ہے کہ بیس روپے پر لات ماردی اور اپنے آقا کو نہ چھوڑا اور اس کے پانچ ہی روپیوں پر قناعت کی، پھر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو جو علم دین کی خدمت میں ہیں، کیونکر کم ہمت اور بیکاروں کی پلٹن وغیرہ کے خطاب ملتے ہیں؟ حالانکہ جیسا اوپر کہا گیا ہے کہ اگر یہ مولوی لوگ دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما کر دکھائیں، لیکن پھر باوجود قدرت کے دنیاوی منافع کو چھوڑ کر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور روکھے سوکھے ٹکڑوں میں خوش ہیں تو اس کو کیوں عالی ہمت اور وفادار اپنے آقا یعنی خداوند کریم کہا نہیں جاتا آپ لوگ جو خدمت علماء اور اہل دین کی کرتے ہیں یہ نہ سمجھتے کہ ہمارا احسان ہے، آپ تو شخص خزانچی ہیں اور خزانچی جو بڑے بڑے عہدہ داروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں تقسیم کرتے ہیں یہ ان کا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ خزانہ سرکاری ہے، خزانچی تو ایک چھوٹی سی تنخواہ کا ملازم ہے، اس کے سپرد ہی یہ خدمت ہے، اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجتا ہے اور گردن دبا کر آپ کے ذریعہ سے ان لوگوں کو اپنا عطیہ پہنچاتا ہے، آپ کا کوئی احسان نہیں۔

(ملفوظ نمبر: ۱۴ دعوات عبدیت حصہ دوم)

چھٹا اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے پر شبہ کا

جواب!

فرمایا: آئینہ میں صورت جب تک نظر آتی ہے جب تک کہ آنکھ سے دیکھنے والے کی کھلی ہوئی ہو، کیونکہ نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ شعاع آنکھ سے نکل کر آئینہ پر پڑھ کر پھر رانی (دیکھنے والا) کی طرف لوٹتی ہے اس لیے صورت پر نظر پڑتی ہے، جب نگاہ کی تو شعاع نہ نکلی، تو پھر نظر آنے کا کوئی سبب نہیں، غرض آئینہ میں جو نظر آتا ہے، وہ کوئی مبالغہ چیز نہیں، بلکہ اس چہر پر نگاہ لوٹ کر پڑتی ہے،

جب سرنی سے اپنی شعاعوں کا تعلق علت ہے، رویت کی پس اگر کسی شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ سیدھی شعاعوں کو مقوس کر سکے تو اس کو پیچھے سے بھی مثل سامنے کے نظر آئے گا، چنانچہ صوفیہ کے بعض اشغال میں سرنظر آنے لگتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے بھی دیکھتے تھے اور اس کی وجہ میں بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں پیچھے کی جانب دو سوراخ تھے، ان سے نظر آتا تھا تو اس کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شعاعوں کے مقوس بنانے کی قوت مرحمت فرمائی تھی جب آپ قصد فرماتے تو آگے دیکھ لیتے اور پیچھے کا قصد کرتے تو پیچھے نظر فرما لیتے، ہر شخص میں یہ قوت نہیں، اس لیے نظر نہیں آتا اور اس توجیہ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نقل فرماتے ہیں۔

(ملفوظ نمبر: ۷۵ ایضاً)

ساتواں اعتراض..... کافر کو عذاب دائمی ہونے پر شبہ کا جواب!

جواب نمبر ایک:

برسبیل و عذاب فرمایا کہ کافر کو جو جہادی عذاب ہے، اس میں کوئی ظلم نہیں کیونکہ کافر اللہ کے ہر صفت کے حقوق ضائع کرتا ہے اور اس کی صفات لامتناہی ہیں اور خود ہر صفت کے حقوق بھی غیر متناہی ہیں تو چاہیے تو یہ تھا کہ ہر صفت کے انکار پر لامتناہی سزا ہوتی اور پھر ہر صفت کے حقوق پر اسی طرح غیر متناہی سزا ہوتی، پھر زیادتی کہاں ہوئی؟ بلکہ ایک معنی سے کمی ہے بغاوت کی سزا قید دائمی ہی ہوتی ہے جس کا دوام احکام ظاہری کے اختیار میں ہے، یعنی تاحیات وہ اپنے باغیوں کے لیے مقرر کرتے ہیں اور جس قسم کا دوام احکم الحاکمین کے اختیار میں ہے، یعنی اصلی وہ اپنے باغیوں کے واسطے تجویز فرمائیں گے اس میں ظلم اور زیادتی کچھ بھی نہیں، بلکہ عین عدل ہے۔

(مجادلات معادرت نمبر: ۳ حصہ ایضاً)

جواب نمبر دو:

سزا مناسبت جنایت ہونی چاہیے اور یہاں جنایت متناہی ہے، کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے، اس کا جواب حصہ اول میں گزر چکا۔

## آٹھواں اعتراض..... احکام شریعت میں علتیں دریافت کرنا اس

### بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت حق نہیں!

صاحبو! دین کو لوگوں نے تخیل مشق بنا لیا ہے کہ لوگ اپنی راہوں کو احکام میں دخل دیتے ہیں اور ان کی علتیں گھڑتے ہیں اور علماء سے بھی اس طرح سوال کرتے ہیں کہ امر اس طرح کیوں ہے؟ سو لینا کیوں حرام ہے؟ فلاں بات کس لیے منع ہے؟ پھر فرمایا کہ میں نے ایک موقع پر اس کے متعلق یہ بیان کیا تھا کہ یہ بات تو مسلم ہے کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجینئر صاحب آن کر یوں کہیں کہ فوراً اٹھو یہ مکان گرا چاہتا ہے تو کچھ بھی تامل اٹھنے میں نہ کریں گے اور علت نہ پوچھی جائے گی اس وجہ سے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسے فن سے واقف ہیں جو ہم نہیں جانتے اس لیے ان کے حکم کی قدر کی جاتی ہے اور اس لیے ان کے کہنے کے موافق عمل کرنے میں تامل نہیں کرتے، نہ علت تلاش کرتے ہیں، نہ اس سے علت پوچھتے ہیں، بلکہ حکم کی تعمیل کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں، یا رسول سرجن صاحب آ کر اگر کوئی دواہتا میں تو اس میں کچھ بھی چون و چرا نہیں کرتے، جانتے ہیں کہ اس فن کا ماہر ہے، سمجھنے کی بات ہے کہ جس فن سے یہ لوگ واقف نہیں، اس میں لم اور کیف سے کس لیے دخل دیتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ کس کی عظمت مانع ہوتی ہے اس کے احکام کی علت ڈھونڈنے سے، اس کی نظیر ایسی سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کے مرتبے کا حکم کرے تو اس کی علت پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ حکم کس لیے دیا؟ اور ایک حاکم کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو تو ہرگز علت نہیں پوچھتے، وجہ یہ ہے کہ دوست کی عظمت اتنی قلب میں نہیں، ایک معمولی چیز ہے اور حکام کی عظمت ہے، اس لیے حجت نہیں کرتے، سو جب خدا تعالیٰ کی عظمت نہیں غرض محکوم ہونے کے حیثیت سے علت دریافت کرنا عقلاً بہودہ امر ہے، ہاں! طالب علمی کی حیثیت سے بغرض تحقیق فن مضائقہ نہیں مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے چنانچہ طلبہ اور شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی جتتیں کرتے ہیں، سنو اس کے لیے تعلیم فن کی ضرورت ہے ہمارے پاس اگر ترتیب وار پڑھو پھراپنے وقت جو امر سمجھنے کا ہے وہ سمجھ لیں اور خود آ جائے گا، دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ خیال تو کیجئے! کلکٹر کا منادی آخر جب حکم سے اطلاع کرتا ہے، تو کوئی علت نہیں پوچھتا، افسوس ہے! علماء کو ہنگامی سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگے ہیں، علماء درحقیقت منادی کرنے والے اور ناقل احکام ہیں، خود موجود احکام نہیں، اس لیے ان سے علتیں پوچھنا حماقت نہیں تو کیا ہے؟ پھر جب

آپ نے ایک فن سیکھا نہیں اور آپ اس سے محض ناواقف ہیں تو آپ کو سمجھانا بھی تو ایسا ہی ہوگا، جیسے ایک سائیکس کو اقلیدس کی اشکال سمجھانے لگیں تو وہ کیا سمجھے گا؟ اس کی تدبیر تو یہی ہے کہ پہلے اس کو اقلیدس کے مبادی سمجھا دو جو اشکال کی موقوف علیہ ہیں، پھر اشکال سمجھاؤ، تو خوب سمجھے گا، علماء آج کل لوگوں کی رائے پر چلنے لگے ہیں، جس سے عوام کی جرأت بڑھ گئی ہے، ایسا نہیں چاہیے علماء کیا نوکر ہیں کہ بے فائدہ دماغ خالی کریں؟

(مجادلات معدلت نمبر: ۸ حصہ سوم دعوات عبدیت)

نواں اعتراض..... احکام شریعت کو مصالح و مینوی کی بناء قرار دینا

### خطرناک مسلک ہے!

اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائے گا یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے، بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ حامی اسلام نہیں، بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں۔

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست

اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے؟ اس مضمون کا حاصل یہ ہے کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت شیخ گاندہ اور جمعہ و عیدین و حج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے اور ذرائع و وسائل ہیں۔ تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ سب آسانی سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کے لیے مقرر ہوئے ہیں اور ان کو کلب جانے اور تھیر میں مل کر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی ہے، جہاں راحت ہے، آرام کرسی اور گدے تکیوں پر جگہ ملتی ہے، تو وہ خواہ مخواہ مسجد میں کیوں آنے لگے؟ اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے؟

### وضو کا انکار

چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے، اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتدائے اسلام میں تھی، آج کل نہیں ہے، کیونکہ اس وقت بدوی لوگ پاک



صاف نہ رہتے تھے، جنگل کے کاروبار سے غبار آلودہ آتے تھے، اس لیے ان کو وضو کا حکم ایسا ہی اور آج کل ہم لوگ صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں، ہر وقت موزے اور دستاں چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ پیر کے دستے محفوظ رہتے ہیں، ہم کو وضو کی ضرورت نہیں۔

یہ نتیجہ ہے ایسے اسرار بیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ بھی تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدائے اسلام میں اس لیے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و سرکش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لیے یہ افعال تواضع و خشوع کے لیے تعلیم فرمائے گئے تھے اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں، ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہوگئی ہے، ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے؟

### قربانی پر اعتراض

اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں، انگلستان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جائے، جس کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے چنانچہ اس لیے منی میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھیتوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (ان حضرات نے منی میں کھیتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو وجہ بتلائی کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا، یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج میں جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں، سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں، بلکہ حجاج میں زیادہ تر غرباء ہوتے ہیں، ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر منی کی قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت لوگ پھر بھی محروم رہ جائیں گے، بلکہ منی میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دبایا جاتا ہے۔ پس اس خلاف عقل حرکت کے جواب دو وہ ڈاکٹر ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے)

غضب یہ ہے کہ آج کل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہونے لگی ہے، صد افسوس!

### قانون عقل پر حاکم ہے

میں کہتا ہوں کہ اگر حج کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کرے گا؟ ہرگز نہیں! بلکہ وہ صاف یہ کہے گا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے اور اس کے اس جواب کو سب عقلاء تسلیم کرتے ہیں، مگر حیرت

ہے کہ قانون الہی کو آج کل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے، بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جو اب علی سبیل التنزیل ہے، ورنہ قانون الہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے، بشرطیکہ عقل سلیم ہو، یہ کیا ضروری ہے کہ ہر شخص کی عقل میں اس کی حکمتیں آجایا کریں؟ آخر پارلیمنٹ کے عقلاء جو قوانین تجویز کرتے ہیں، کیا ہر عامی کی عقل اس کے مصالح تک پہنچ جاتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کے مصالح کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں، پھر قانون الہی کی حکمتوں اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے؟ اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانون الہی عقل کے مطابق ضرور ہے، مگر ہماری عقلیں اس کے مصالح سمجھنے سے قاصر ہیں، خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں، کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں، بلکہ اس کے ماتحت اور اس کی تابع ہے۔

### قربانی کا مقصد

غرض ان حضرت نے مجھے لکھا ہے کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں، بلکہ اصل مقصود غرباء کی امداد ہے اور ابتدائے اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا، موسیٰ زیادہ تھے، اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غرباء کو گوشت دے دو اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے، غلہ بھی موجود ہے، پس آج کل بجائے قربانی کرنے کے نقد روپے سے غرباء کی امداد کرنا چاہیے تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غرباء سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی آسانی حاصل ہو سکتی ہے، قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا، حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے، اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غرباء کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا، اگر اس زمانے میں نقد و غلہ کم تھا اور موسیٰ زیادہ تھے، اس لیے جانوروں کے ذریعہ غرباء کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا، تو اس کے کیا معنی کہ جانور کو ذبح کر کے غرباء کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہوا اور زندہ جانور کسی غریب کو دے دیں تو واجب ادا نہ ہو؟

پھر کیا پہلے مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی؟ بالکل غلط ہے! تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کیے ہیں، تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آج کل تو اس کا عشر عشر بھی نہ ہوگا، پھر اس وقت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھ کر سوچی؟ اور صحابہ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا؟ دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقتضی یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا، حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریبوں کو بے برابر بھی نہیں دے تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غریباً، قربانی سے مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود کچھ اور ہے، مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مختصر حکمتوں پر احکام سمجھنے لگا۔ (سبیل النجاح صفحہ: ۱۵)

دسواں اعتراض..... کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال کے لیے

جانے کی تحقیق اور اس پر شبہات کا جواب!

بعض بزرگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ مکہ معظمہ پہنچے تو جا کر دیکھا کہ کعبہ موجود نہیں ہے، سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی مجھے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے؟ چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کیے دیتے ہیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آرہے ہیں، کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا۔

اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی، ایک تو ان کو جنہیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں، ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی اور کہنے والوں پر ہنسنا اور وہم پرست کہنا شروع کیا، دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں، ایسے لوگوں نے ان کو صوفیہ کے ڈھکوسلے کہہ کر اڑا دیا، تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے، انہوں نے اس کو خلاف عقل بتلایا اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا، سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے:

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانے زدند

تو سمجھو کہ ایک کعبہ کی صورت ہے اور ایک کعبہ کی روح ہے، روح کعبہ ایک خاص تعلق ہے کہ کعبہ ظاہری اس کا مظہر ہے، پس جن بزرگوں نے دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے، بلکہ ان بزرگوں کی طرف متوجہ ہے۔

غرض بعض بزرگ ایسے بھی ہوئے کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی، لیکن حج کے لیے ان کو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا۔ (اصلاح النفس: ۱۴)

گیا رواں اعتراض..... جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب کہ

اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے!

نظام عالم با بعبیت و متبوعیت کو چاہتا ہے، اس لیے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں، اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے، تاکہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو، سب کے سب آزاد نہ ہوں، بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے، یہ حقیقت ہے سلطنت کی، اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لیے ہرگز کافی نہیں اور نہ کسی نے آج تک اس کو گوارا کیا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں، چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدون سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا؟ اگر کہوں کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا، وہی سلطنت کے مصداق ہونگے کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہو جائے گی اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کے سامنے سلب ہو جائے کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد آزادی مطلق کہاں رہی؟ اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی، تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں، اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں، خدائے تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا، بلکہ ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے، تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے ورنہ بہت اہل تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آگر کرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا، نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا، نہ علماء کا نہ مجتہدین کا۔

خدا کے یہاں پر لیس کہاں ہے؟

شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پر لیس کہاں ہے؟ میں کہتا ہوں کہ جب تم نے پر لیس ایجاد کر لیے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پر لیس بنالینا کیا مشکل ہے؟ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو، یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے، تمہارا تو محض نام ہی نام ہے، اس لیے یہ شے محض لغو ہے۔

دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں، کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا، ایسی سیاسی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے، تو پھر کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاسی سے روزانہ لکھتے ہیں، وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے؟ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا، تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔

## قانون کی پابندی

جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں، وہ بھی آزادی کا ہونا گوارا نہیں کرتے، کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی، تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی، ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں جب کہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے، بلکہ جس کے جو جی میں آئے کرنے دیا جائے، کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جائے، کیونکہ تم تو آزادی کے حامی ہو تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔

پھر تم لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو؟ اور ان کی آزادی کو قانون کے تابع کیوں بناتے ہو؟ کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو، قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے؟ اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا تابع کیوں بنا رکھا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں، وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں، مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے، کبھی حکمی، فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے، مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں، مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے، وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔

## پارلیمنٹ کی حیثیت

پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دے دے وہی پاس ہو جایا کرے، اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا، مگر وہاں تو پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص کی انفرادی

رائے معتبر نہیں، بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے شخصی رائے ہے، کیونکہ مجموعہ عمل کو واحد حکمی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور ہم شخص واحد حکمی کے حامی ہو، جمہوریت کے حامی تو ہم بھی نہ رہے، جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی، جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا، نہ ایک بادشاہ کا نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا۔

اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا؟ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے، تم نے دس کا غلام بنا دیا، تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک غلام ہونا اچھا ہے، یا دس بیس کا غلام ہونا؟ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو وہ اس سے بہتر ہے، جس پر دس بیس کی حکومت ہو۔

یہ حاصل ہے کہ جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں، مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو اور ہم یہ کہتے کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔

شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے، شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا جو اس پر نقص وارد ہو اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں، کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے؟ آخر کیوں ہٹتے ہو اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلے کو نہ مانے تو اس کو کیوں مجبور کرتے ہو اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو؟ آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے؟ مگر کیونکر آزاد رہنے دیں؟ نظام عالم بدوں اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں، بعض متبوع ہو، آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں، اس لیے یہاں آ کر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا، کیونکہ وہ تو پہلے ہی تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے، وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں، اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے، جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا، بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانہ میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کیے ہیں، تو ان میں بھی ایک تابع تھے، دوسرے متبوع تھے۔

## ایک زمانہ میں دو نبی

چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے جو نبی اسرائیل و قوم قبیلہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے، مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے، حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے، دونوں برابر درجہ میں نہ تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی، بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے، وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے چنانچہ حق تعالیٰ

نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ”تورات“ لینے کے لیے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا۔

### قصہ سامری

یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونے کا کچھڑا بنایا اور اس میں قدم جراثیل علیہ السلام کی مٹی ڈال دی، جس سے اس میں حیات پیدا ہو گئی ”فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ قَنَسِي“ جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے؟ بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا، اسی وقت انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کم بخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم کیوں رہے؟ میرے پاس باقی ماندہ جماعت کو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سر اور داڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے۔ ”قَالَ يَبْنَؤُمْ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي“ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: ”اے بھائی! میری داڑھی اور سر نہ پکڑو میری بات سنو! مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے وہاں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں؟ ان کی اصلاح کیوں نہ کی؟ اس لیے میں نہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا، حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، مگر نبوت میں ان کے تابع تھے، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعتی کے مقتضی پر عمل کیا اور وہ برتاؤ کیا جو حاکم محکوم کے ساتھ کرتا ہے، آج ایک سب انسپکٹر یا جوڈیکہ انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے، مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھے۔

### تابع اور متبوع

معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعتی محض ضابطہ کی نہ تھی، بلکہ واقعی تابعتی تھی، جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں، ایک متبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔

اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہو گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت

تھی؟ لیجئے! ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کو متبوعیت اور تابعیت کا اظہار کرنا تھا، اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بے تاب کر دیا جس سے انہوں نے اپنی حکومت و متبوعیت کے متقاضی پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی!.....

## شخصی حکومت

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں، اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے، وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں، شخص سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو، اس لیے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیے، بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیے، میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے، اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہو کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہو کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا، ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں، کسی نے کچھ سمجھا، کسی نے کچھ سمجھا، ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا، ایک نے ریل کو ایجاد کیا تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صد ہا ہزار مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا، علوم میں بھی یہ امر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محققین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں، تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے، اب بتلائیے! اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا؟ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتا، بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کی کوئی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر اور یہ کتنا برا ظلم ہے!! اس لیے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے، بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔



## سرسید اور مولانا محمد حسین میں مکالمہ

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو، کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بنیاد پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خان نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے، یہ اس صورت میں ہے جبکہ بہت سے آدمیوں کو کیف مانتی جمع کر لیا جائے تو اس میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے، لیکن جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیف مانتی جمع نہیں کیے جاتے، بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے، جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی، مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا! لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عقولوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں، تو عقلاء میں بھی کثرت انہیں لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں، پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقل کا فیصلہ تو ضرور ہوگا، سید احمد خان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، بالکل خاموش ہی ہو گئے۔

## کثرت رائے

غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں، جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے، خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو، بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی، تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا، اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا، پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا، دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں، وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے، وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف المرأے ہے کہ اس کی تمہارا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے، تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں، ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے، ان کو جمہوریت مبارک ہو ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل و عقد! اور اے جماعت عقلاء! بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صاحب المرأے ہو

کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکتے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو اور جس کی رائے میں اتنی زراعت نہ ہو، اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ، اب بتاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو، وہ حکومت شخصی کے قابل ہے، یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔

### شخصی سلطنت

بس ہم شخصی سلطنت کے اس لیے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل، صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لیے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو، تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لیے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو؟ بلکہ پہلے ہی سے ایسے شخص کو بادشاہ بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو، مستقل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے، جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں آیت پیش کرتے ہیں:

”وَأَشْرُوا زُهُمُ فِي الْأُمْرِ“ (اور تم معاملات میں ان سے مشورہ کرو) مگر یہ بالکل غلط ہے لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا ہے اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔

### حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے ایک مرتبہ حضور اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ”اے بریرہ! تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو، قصہ یہ ہوا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جس کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے کر دیا تھا جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں۔ اگر چاہیں فسخ کر دیں، اصطلاح شریعت میں اس کو خیار عتیق کہتے ہیں۔ اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا، لیکن ان کے شوہر کو ان سے محبت تھی، وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ! کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو، تو وہ دریاشت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے،

یا مشورہ کی ایک فرد ہے؟ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے، گو مجھ کو تکلیف ہی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حکم نہیں!“ صرف مشورہ ہے تو حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔

### مشورہ کا درجہ

بیچئے! اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں، بلکہ واقعی حق ہے، چنانچہ جب حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے، نہ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ گناہ ہوا، نہ ان پر کچھ عتاب ہوا، سو جب امت یار عایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے؟ اس کے خلاف کبھی نہ کرے، پس ’مشاور ہم فی الامر‘ سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں، یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں؟ اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے؟ اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک ”مشاور ہم فی الامر“ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیوں مجبور کرتے ہو؟ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے، یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے؟ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں، خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو؟

### مشورہ پر عمل ضروری نہیں!

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہرگز نہیں ہیں، بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں، خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے: ”فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ“ کہ مشورے کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں، یہاں ”إِذَا عَزَمْتَ“ صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل تھے، اسی

طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے، اگر عزم کا مدار کفر و کفران پر ہوتا تو ”اذا عزمتم“ نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے ”اذا عزم اکثرکم فنو کلو اعلی اللہ“ فرماتے، پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے، مگر ان کی حالت یہ ہے ”حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء“ کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو، چاہے وہ مشورہ پس یا نہ لیں، اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں، چنانچہ شریعت میں ’اشیاء—روہ الحکام و هو حکمکم علیہم“ کہیں نہیں کہا گیا، جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں، تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی؟ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے، چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے، یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لیے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لیے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا؟ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا؟ ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں، پس یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے۔

(تفہیم القرآن مع الامتلاء مع الانام صفحہ: ۱۸)

بارہواں اعتراض..... امن عامہ کا مل طور پر دین پر قائم ہونے سے

ہی حاصل ہو سکتا ہے!

مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے، لیکن آپ کو خبر نہیں صاحبو! غضب سے کہ غیر تو میں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی آ رہی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں، غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے، اس لیے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں، عقائد، عبادات، معاملات، آداب، معاشرت، اخلاق باطنی یعنی یہ تکبر نہ ہو، بوریاء نہ ہو، تواضع ہو، اخلاص ہو، تقاعدت ہو، شکر ہو، صبر ہو، علی ہذا پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے، اس وقت کسی نہ کسی کو، کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے، کسی نے اعمال کو چھوڑا، کسی نے معاملات کو، کسی نے معاشرت کو، اسی طرح اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے، بلکہ ان اخیر کے دو جزوں کو تو

قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد حاصل آیت شریفہ کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلاص کو فساد فی الارض میں دخل ہے، بس اب کو دیکھ لیجئے! مشاہدہ کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے؟ سنو! بعض کا دخل تو بین ہے، مثلاً اخلاق کا اثر امن عام میں دین ہے اور ذرا سے غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ احکام معاملہ کا حاصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے، پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جیسے کہ شریعت نے کی ہے، جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کیے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے، کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیج ہے اور بیج معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرور ضرر ہوتا ہے اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں تو امن قائم ہوگا، تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے، باقی تین چیزوں کا امن عام میں دخل ہونا سو یہ کم ظاہر ہے، اس لیے اس کو بھی ثابت کرنا ضروری ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخل ہیں۔

عقائد

سوال یعنی عقائد کو تو یوں سمجھو کہ توحید رسالت اور معادام العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں دخل مان لیا ہے، اس کے تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائے گا، ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا، ہمدردی کرنا، خود غرضی نہ کرنا داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے، لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں جن میں ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہو اور دوسرا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا، یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے، اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اس کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خیر ہو کر رسوائی کا اندیشہ نہ ہو اس وقت تک تو ان اخلاق پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آئے گا کہ ان اخلاق پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہے اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خیر بھی نہ ہو، جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروا نہ ہوگی، ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کی جاتی

ہے، جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں، یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔

### مذہبی طاقت کی مثال

یا فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں، جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں اور دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فاقے گزرتے ہوں اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے اور دوسرے رفیق سفر کو ان نوٹوں کے لینے کا موقع ملے اور عاقل بھی اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف ان کو فروخت کر سکے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے، اس صورت میں اخلاق اور نفس میں کشائش ہوگی، اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہیے اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر اس کو کیوں نہ رکھا لیا جائے؟ اس کشائشی میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم مہلکہ سے بچالے، بس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے، وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا، جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے، وہ اس سے بچ سکتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگھتا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگھتا پڑے گا۔

### خوف خدا کا اثر

اسی طرح ایک اور جزئی یاد آگئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آجاتے ہیں کہ ڈاک خانے کی مہر سے بالکل بچے ہوئے ہوتے ہیں، اگر میں ان کو استعمال کر لو تو کوئی بھی باز پرس نہیں کر سکتا، کیونکہ نہ میرے پاس ڈاک خانے والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے، لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اول ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں اس کے بعد خط پڑھتا ہوں، علیٰ ہذا اگر روزمرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب دل میں خوف خدا ہو، یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبداء اور معاد کا معتقد ہو، اس کی تفصیل کے لیے رسالہ مآل التجہدیب دیکھنے کے قابل ہے، اس میں دکھلایا ہے کہ اس مخترع تجہدیب کا مآل دنیا ہی میں ہونے والا ہے، انہوں نے ایک مفسدہ کو لکھا ہے اور ختم پر ہر جگہ یہ کہہ دیتے ہیں ”فویل یومئذ للمعذبین“

غرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جب ہی ہو سکتی ہے کہ عقائد درست ہوں۔

## اعمال کا دخل

اب اعمال کا دخل لیجئے! یہ بھی ان شاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا، سب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تو اضع ہے، اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے، کیونکہ فساد کا معنی ہے ”نا اتفاقی اور نا اتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانو تو نا اتفاقی کی کوئی وجہ نہیں۔

تو اتفاق کے لیے تو اضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے اور اس تو اضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے، نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت کھائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا نہیں ہوتی اور نماز میں تو اول سے ”اللہ اکبر“ کی تعلیم ہے، تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے ”اللہ اکبر“ کہے گا اور جو ارجح سے رکوع اور سجدہ کرے گا، زمین پر پیشانی رکھے گا، وہ کیونکر اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا؟

## خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ

اگر کو اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو خدا سے بڑا نہ سمجھے گا، لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھے کی کوئی وجہ نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ ناتجربہ کاری کا اعتراض ہے، دیکھو! اگر تحصیلدار اپنے جوش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک ایٹھنٹنٹ گورنر آجائے تو خود اس کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب ہونے لگتے ہیں، اس وقت اگر کوئی ”حضور“ بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی مار دی، تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے آپ کو جیوٹی سے بھی مغلوب و ناتواں سمجھے گا، کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی تو ”اللہ اکبر“ کی وہ تعلیم ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نا اتفاقی کا جاتا رہنا لازم ہے۔

## اعمال دین کے اثرات

علی ہذا قوت بیہمیہ سے سینکڑوں فساد، لڑائی، جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزہ سے قوت

بسیہ لوثی ہے، اسی طرح زکوٰۃ لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔

دیکھو! حاتم طائی سے بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنی یہی محبت ہے، تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے.....!!

علی ہذا حج پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں، ایک زمانہ میں، ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق و اتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجموعوں میں، جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی، بہت سے واردات ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔

البتہ اکثر لوگ شاید بدوؤں (الحمد للہ کہ سلطان کے حسن انتظام کی وجہ سے آج کل بدوؤں کی یہ تمام شکایتیں رفع ہو گئی ہیں) کے شاکہ ہوں گے، سو اصل میں ان کا مقصود سلب و قتل نہیں، بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں، ان کی حالت بالکل یہاں کے گاربیانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا تو خوش ہیں، ورنہ پھر دیکھئے کیسے پیر پھیلاتے ہیں؟ ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کی جائے ان کو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دے دیا جائے تو وہ بہت آرام پہنچاتے ہیں۔

اور یہ جو سننے میں آتا ہے کہ بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں، تو اول تو بہت کم ایسا ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں، وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ خود اپنی حفاظت نہ کرے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے۔

غرض حجاج کو اتفاق و امن میں بہت بڑا دخل ہے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال از سر تا پا تواضع سے پر ہیں۔

اب رہی معاشرت سوئائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں، وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر نکلتا ہے مثلاً ناجائز وضع سے شریعت نے منع کیا، سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں، ان سب میں تکبر ہے جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں، وہ غور کریں کہ اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہے؟ اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع و لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں تو ان کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا، یہ تو سمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔



## عقائد و اعمال کی خاصیت

ایک دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے، پس اسی طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرہ میں بھی اور وہ یہ ہے کہ ان سب سے قلب میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے اور سوز سے اس کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے: ”المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدہ“

اب میں ایک اور بات کہتا ہوں جو تمام اجزاء دین کو عام ہے، وہ یہ کہ دین کی یہ غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو، بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی ان کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمائیں گے: ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ“

پس دین کی درستی کو اس طرح دنیا کی درستی میں داخل ہوا، مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہوگا تو دنیا کے کام نہیں گے، بلکہ صرف اس لیے کہ:

دلا را می کہ داری دل درو بند

دگر چشم از ہمد عالم فرو بند

اور جو مصلحتیں سامنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمد کار

بگوارند و خم طرہ یارے گیرند

رند عالم سوز را با مصلحت بنی چہ کار

کار ملک ست آنکہ تدبیر وکل بایدش

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا؟ مگر حاصل ضرور ہوں گی، وفادار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو خود غرض اور خود کام کہا جائے گا، پھر آقا نے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائے گا اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کے تابع رہے، چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچتا رہے تو کام کچھ نہ کر سکے گا۔

میں نے تین تقریریں کیں، ہر تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ دین کی طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لیے کیں کہ مذاق مختلف ہیں، یہ تو اعداد بیہ کی خوبی ہے کہ ان سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہو گیا، تو دین کو یا اس شعر کا مصداق ہی ہے:

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد  
 برنگ اصحاب صورت را ببو ازباب معنی را  
 غرض جس پہلو سے چاہو پرکھو، الحمد للہ! یہ بات ثابت ہوگی کہ امن کی صورت ہے تو احکام  
 خداوندی کی پابندی سے ہے۔ (ضرورۃ العلماء صفحہ: ۲۳)

## تیر ہواں اعتراض..... دین میں تشنگی اور دشواری نہیں ہے!

اس کے دو درجے ہیں، ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے اور ایک یہ کہ  
 خود قانون ہی سخت ہے، تو اسلام میں کون سی دشواری ہے؟ آیا یہ ہے کہ خود قانون کی پابندی کرنی  
 پڑتی ہے تو تسلیم ہے، کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے، خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو، مثلاً جو لوگ  
 کہ عدالت میں نوکر ہیں اور اس کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی؟  
 ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے، مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی  
 نہ چھوڑ دیا، تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں دشواری ضرور ہوگی تو اگر اسلام میں یہ دشواری  
 ہے تو تسلیم ہے، بلکہ اس کو خود ہی ثابت کرتے ہیں ”لَا تَسْبِعُوا الْهَوَىٰ“ اور اس سے صاف ”انہا  
 لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْحَاشِيَيْنِ“

غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے، مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے؟ یہ تو سبھی کام میں بلکہ  
 کھانے میں بھی ہے، کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے اادیوں سے کہ کھانا کتنا  
 مشکل کام ہے؟

## ایک حکایت

مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو واحدی تھے، ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا  
 آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے، اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا، ایک بیٹھا ہوا، ایک  
 سوار ادھر سے گزرا لینے ہوئے نے پکار کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو میرے سینے پر رکھا ہے، میرے منہ  
 میں ڈال دو، اس کو اس آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا  
 رقیق جو پاس بیٹھا ہے، اس سے اتنا کام نہیں ہوتا، اس لیے اس نے بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو  
 ہی اس کے منہ میں ڈال دے وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی،  
 آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے؟ کل میں لیٹا تھا، یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جانی آئی اس سے منہ کھل

گیا، ایک کتا آ کر منہ میں موٹے لگا، یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دینے میں ضرور اس کے منہ میں بیرون گویا یہ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لاجول پڑھتا ہوا چل دیا۔  
تو حضرت اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے، ہمارے عزیز دو بھائی ہیں، ایک چھوٹے ایک بڑے بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔

## دشواریوں کی قسمیں

تو ایسی نظریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی، تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں، مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو، مگر اس کو کسی نے کہا کہ بڑا سخت قانون ہے؟ وجہ یہ ہے کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے، اس لیے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا اور رشوت لینا مقصود ہے، اس لیے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے، لیکن جو ڈکیتی ہمیشہ کرتے ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں؟ اسی طرح ایک جماعت بے ہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو، حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے، مگر یہ ان کو گراں ہے، تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں، تو محض پابندی سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا، پھر اسلام ہی پر کیوں اعتراض ہے؟  
دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور یہ سختی نہیں، مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے، تو واقعی یہ دشواری ہے، مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔

اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے، قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آئے، مثلاً یہ قانون ہو جائے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھائے تو پھانسی ہوگی یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی کیف ہے۔

اور ایک دشواری اس طرح کہ قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آئے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجائے تو وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے، پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرورت تنگی ہوگی، کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے، تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا باغیوں کی بغاوت ہے۔

## ایک مثال

مثلاً کوئی ایسی جگہ پہنچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہنچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دے دے، پھر اس سے کہا جائے کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دے دو، مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے، اس لیے تم کو آدھی چیز ملے گی، تو ایمان سے کہتے کہ یہ دشواری قانون کی ہے، یا ان بد معاشوں کی بد معاشی کی اور سیر بھری آدھ سیر دی تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو احمق سے پانہیں؟ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے، وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے، کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد اس میں دشواری پیش آئے اگر پچاس قباحتیں بھی آجائیں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے، صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ، تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کیے کو اسلام پر تھوپنا، ایسا ہے کہ:

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد

بہجوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

مثنوی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا کہ اور کہا میں تمہارے راتب کے لیے موٹا خرگوش لاتا تھا، راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا، شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے؟ اس نے ایک کنویں پر لے جا کر کھڑا کر دیا؟ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا، بس شیر اس کنویں میں جا کر کودا، اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا، ولانا اس کو فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد

بہجوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اسی طرح ہم کو اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے، مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر

اعتراض ہے۔

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے آئینہ دیکھا، اس میں اپنی صورت پر نظر پڑی، آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بد شکل تھا، تب ہی تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔ ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا، لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا، جھاٹکنے سے

اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے، باپ سے کہا: ”ابا اس نے یہ میرا کھڑا لایا، آپ چھیننے! باپ اٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل نظر پڑی بولے کہ لعنت ہو خدا کی بڑھا ہو کر بچہ کا چھین لیا! تفت ہے تیری اوقات پر! سو وہ تفت کس کو کہہ رہے تھے؟

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا اور وہ تنگی اپنی صفت تھی، اس کو شریعت کی تنگی سمجھا حضرت! یہ ہے حقیقت سختی کی اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے، مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دے دے، ظاہر ہے کہ جب غذا میں کھائی جاویں گی تو ضروری ممانعت ہوگی اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا کہ صاحب! کھاؤں کیا؟ جواب دیا کہ مبری کا گوشت، پالک وہ بولا یہ تو ملتا نہیں، کہا: ”موٹگ کی دال، کہا: ”یہ بھی نہیں ملتی، کہا: فرینی! کہنے لگا: یہ بھی نہیں، پھر خود پوچھا: بیٹن کھالوں کہا: ہرگز نہیں کھانا! کریلا کو پوچھا، اس کو بھی منع کر دیا، آلو سے بھی روک دیا تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب! ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں، طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا یہی ہے، دیہاتی نے باہر آ کر کہا کہ صاحب! یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ۔

تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے؟ یا کہا جائے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں سب کی اجازت دے دی، لیکن وہ مقام ایسا کوردہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں، تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔

اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سہیلو کو جو کہ قریب الوقوع ہیں، اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت بجز کہے گی اور پانچ کو لا بجز، لیکن آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو مترک کر دیں تو تنگی معاشرت کی ہوئی، یا قانون شریعت کی؟ پس یہ الزام تو بچہ نند بوجہ احسن واکمل رفع ہو گیا اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو تو علم دین پڑھے، اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسیع کی ہے.....!!

## ایک اشکال اور اس کا جواب

اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے، اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں، مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم سب کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے، عارضی دشواری تو ہوگی، تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچ گیا البتہ اعتقاد درست ہو گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں، مگر عمل کس طرح کریں؟ کیا لین دین چھوڑ دیں؟ کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز، معاملات اکثر ناجائز، تجارت ناجائز تو

یہ ایک فریاد قابل استماع ہے تو اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔

اس میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے، غیر مسلم ہے، سمجھنے کے ایسے اعمال دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اگتی ہے اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں، مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے، نماز، روزہ کرے، تکبر نہ کرے، باجا جاگا جھوڑ دے، تو بتلائیے! اس میں معاش کا کیا نقصان ہے؟ تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جائیں گے، کیونکہ پچاس عمل میں سے چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہی کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے، آگے دس ہی رہ جائیں گے، اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے، اس لیے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قابل ہیں درست فرما دیں گے، جیسے ایک شعلہ جوالہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے، حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی، مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا کہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید (لوہا) ہے، پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے، مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ترقی کا راز یہی ہے کہ ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھنا نہیں جاتا، مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں، خوب کہا ہے:

ہر چند کہ پیر خست و بس ناتواں شدم

ہر گہہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

بندگی سے قوت آتی ہے

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے! غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی، مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضحل ہو جائیں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے، جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ چاند ہی نہ دیکھیں غرض

اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جائے گی اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جائے کہ اور اس سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوں اور وکیل نے کہا کہ تین تو مل سکتے ہیں، مگر ایک نہیں مل سکتا، تو کیا کوئی یہ کہے گا:

”کہ چوں آپ از سرگذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست“

ہرگز نہیں! بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اول تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام معلوم نہیں ہیں، اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں، اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے تغیر سے وہ جائز ہو جائے گا۔

### چاندی کا مسئلہ

مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کی حرام ہے، اگر اب کہیے کہ صاحب! اچھا مسئلہ سنا کہ زرخ کے حساب سے تو سو روپے کی چاندی ایک سو بیس بھر آتی، مگر اب سو روپے کی سو ہی روپے بھر لی اچھا عمل کیا کہ بیس روپے کا خسارہ ہوا اب ساری عمر کے لیے مولویوں کو خیر باد کہہ دیں گے۔

تو سنئے! بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا، کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے؟ تو مولوی صاحب یوں کہتے ہیں کہ ان روپوں میں ایک گنی بھی ملا، تو ایک بیس بھر چاندی جو آئے گی تو پچاس روپے بھر تو پچاس روپے کی آئے گی اور باقی کی اس گنی میں شریعت محسوب کرے گی، تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں، شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے، تو اب بتلائیے! کیا نقصان ہوا؟ اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں۔

صاحبو! پوچھتے رہو اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہیں جائز کہہ دیں،

جیسا کہ ایک مطوف سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھک کر کہا کہ مولوی صاحب! اب تو معاف کر دو۔

علماء ہند

اسی طرح بعض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علمائے مصر کے کرنے لگیں ان بعض علمائے نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز ہے، تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں، علماء سے جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے، تم اس کی تصدیق کر کے توجہ کر دیا کرو، چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے نکلا کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی، سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور ماتھے کا کیا جوڑ نوکر بولا سچ ہے حضور! وہ اس وقت سم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔

تو حضور! علماء سے تو ایسی نوکری ہوتی نہیں نہ ہم اتنے ذہین ہیں نہ خدا کرے کہ ہوں تو حاصل یہ ہے کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جائے گا، تو بہت بڑا حصہ عارضی دشواریوں کا اس طرح ختم ہو جائے گا۔

ہاں! بعض امور پھر بھی ایسے رہ جائیں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے، مگر اس میں بھی دو درجے ہیں، ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں، پس اس کو تو چھوڑ دیا جائے، کیوں کہ اس کو چھوڑنا مضرت حوائج ضروریہ نہیں اور ایک درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیوں کہ اس کا چھوڑنا مضرت حوائج ضروریہ کو کافی نہیں تو بادل کا رہ اس کو کرتے رہو اور گو یہ جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جائیں اور یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہئیں، ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے، اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اب اس پر بچھتا ہے اور دعا کیجئے کہ اے اللہ مجھے معاف فرمائیے، مواخذہ نہ کیجئے۔

تو یہ کیوں نہیں کرتے؟ کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاؤ گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ تم نوکری ہی رہو گے دوسری یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ! کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ ہر شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جائے گا جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جائے گا۔ اور یہ تو سب آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور تو سب میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جائے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جائے مثلاً یہی کہ چلو آریہ



بئیں تو یہ توسع ”ایں بلا دفع بلا ہائے بزرگ“ کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہا ہوں، گنہگار  
جب آدمی نادار ہوتا ہے، تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوچتا ہے.....!!

### ایک واقعہ

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ جب تھانہ بھون میں رہتے تھے، ایک پٹھان حضرت کی  
خدمت میں دعا کرنے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائیداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے،  
حضرت رحمہ اللہ دعا فرمادیتے ایک بار آ کر کہنے لگے اب تو کہ اس نے حد ہی کر دی اور جائیداد غصب  
ہی کرنے کو ہے۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: ”بھائی! صبر کرو، اس نے کہا: بہت اچھا! دفعہ حافظ محمد  
ضامن صاحب رحمہ اللہ حجرہ سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا: ”ہرگز مت صبر کرنا! جاؤ ناش کرو  
اور ہم دعا کریں گے اور حضرت رحمہ اللہ سے فرمایا: ”آپ تو صابر اور شاکر تھے! سب چھوڑ کر بیٹھ رہے،  
اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستائے گی، یہ چھوٹی گواہی  
دے گا، چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسع کا، تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے، مگر یہ اس لیے ظاہر کر دیا  
گیا کہ کفر سے بچانا ہے، لیکن خدا کے لیے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جز تو  
بہت اچھا ہاتھ آیا۔

بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا دوسرے  
اس میں بھی یہ قید لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو، جیسے کوئی بیت الخلاء میں  
بیٹھا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

### ایک رئیس کا واقعہ

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ  
تھی، مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھکاتے۔ آخر ضرورت سے  
بیت الخلاء میں گئے تو چٹنی لگ گئی اور اس کے کھولنے سے نہ کھلی بڑے پریشان ہوئے لوگوں سے  
التحاکی، سب نے انکار کر دیا، آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم  
کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پاخانہ میں ہے، اس میں قسم کھلانا جائز نہیں ہے، تو جس طرح وہ پاخانہ  
سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو، کیا کوئی پاخانہ میں جا کر فخر کرتا

ہے؟ بلکہ قید سمجھتے ہیں، مگر مجبوری میں کیا کریں؟ بس اس کی یہ حالت ہوگی:

چونکہ برمیخت بہ بند و بستہ باش

چوں کشاید چابک و برحتہ باش

## انسانی کوشش

تو نکلنے کی فکر کرو، کوشش تو کرو، گو کچھ امید نہ بھی ہو، اسی کو فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید

خیرہ یوسف داری باید دوید

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہوا کہ جب زلیخانے دروازہ بند اور مقفل کر لیا اور آپ نکلنے کے لیے دوڑے ہیں، عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے، اس کو فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید

خیرہ یوسف داری باید دوید

اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا، نکل بھی لگ گئی، اتنے پر بھی بفضل ہو جائے گا اب بتلائیے اس میں کون سی چیز مشکل ہے؟ میں تو نوکری نہیں چھڑاتا، مگر نفور رہیں، سو یہ کیا مشکل ہے؟ اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے، بے باکی ہے، سو یہ فخر کیسا؟ اور تکبر کیسا؟ اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے؟ سو اہل اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا، مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

تو اب کونسا مرتبہ اختلاف کا رہ گیا؟ نراقانون تو دشوار ہے نہیں اور قانون سخت نہیں، صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے، تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں قفل ہی نہیں اور جو قفل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اولاً بہت مختصر ہے، ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کیے پر بچھٹانا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جزو ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے؟ تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ "وَمَا جَعَلْنَا عَلَى الْمُذْنِبِينَ مِنْ حَرَجٍ"

(نئی المخرج صفحہ ۱۸)

چودھواں اعتراض..... ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب

کرنا غلطی ہے!

دلائل شرعیہ چار ہیں، کتاب اللہ، حدیث رسول، اجماع، قیاس جو امران دلائل چارگانہ میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو وہ دین میں معتبر ہوگا ورنہ رد ہے، پس یہ بھی غلطی ہوگی کہ ان چاروں سے تجاوز کیا جائے۔

ایک عام غلطی

آج کل ایک عام غلطی یہ بھی ہو رہی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ کو قرآن شریف سے ثابت کریں، حالانکہ دلائل شریعت کے چار ہیں، اگر ان میں سے ایک سے بھی کوئی مسئلہ ثابت ہو جائے گا تو وہ شرعاً ثابت ہو جائے گا چنانچہ دائرہ رکھنے کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ کہ دائرہ رکھنا فرض ہے اور یہ دلائل کا مطالبہ کرنے والے ایسے حضرات ہیں کہ جن کو خود تحقیق و استدلال ہی سے اسلام نہیں، ان کو تو چاہیے تھا کہ محض تقلید کرتے علماء کی قاعدہ عقلی ہے کہ جس فن کا جو جاننے والا ہوتا ہے وہی اس میں دخل دے سکتا ہے اور نہ جاننے والا اگر دخل دے تو اس کو سب ہنتے ہیں، یہ قاعدہ ہر جگہ تو جاری کرتے ہیں، لیکن دین کے اندر ہر شخص مجتہد ہونے کا مدعی ہے اور ہر کس و ناکس اس میں دخل دینے کے لیے تیار ہے، فن زراعت کو مثلاً میں نہیں جانتا تو اگر میں گیہوں بونے کا طریقہ بیان کروں تو جاننے والے یہ کہیں گے کہ تم کیا جانو؟ اور تمام عقلاء کے نزدیک جواب کافی سمجھا جائے گا، مگر حیرت ہے کہ دین کے بارے میں اگر علماء بچہ بچی جواب دیتے ہیں تو ناکافی شمار ہوتا ہے۔

ایک مثال

یاد رکھو! فن کے جاننے والوں کے سامنے تمہارے مطالبہ دلائل کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے پاس گھڑی ہے اور وہ بڑی معتبر ہے، ہمارے گھر سے ملی ہوئی ہے اور ایک شخص آفتاب کی طرف رخ کیے ہوئے کھڑا ہے۔ گھڑی والا کہتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے آفتاب چھپ گیا اور اس میں برگز غلطی کا احتمال نہیں، دوسرا شخص آفتاب کو دیکھنے والا کہتا ہے کہ آفتاب میرے سامنے ہے چھپا نہیں

اور گھڑی والا اس سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ ہنستا ہے کہ وہ تو کھلی بات ہے، آفتاب نظر سے سامنے ہے، تم اس کی طرف منہ کر کے دیکھو، آفتاب موجود ہے دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ پس جن لوگوں نے دین کے باب میں اپنی عمریں کھپا دی ہیں ان کا قول معتبر ہوگا، یا ایک لڑکے کا جو آج ہی بالغ ہوا ہے؟ لیکن دین کا بالغ نہیں ہے، مولانا فرماتے ہیں:

خلق اطفال اند ز جز مست خدا

نیست بالغ جز ربیدہ از ہوا

بہر حال حساً بالغ ہو یا نہ ہو، روحاً بالغ نہیں ہے، بلکہ حساً بھی ہم کو تو ایسے لوگ بالغ نہیں معلوم ہوتے، اس لیے کہ ظاہری علامت بلوغ کی داڑھی تھی اور وہی صفا چٹ ہے، معلوم بھی نہیں ہوتی کہ نکلتی ہے یا نہیں۔

### شریعت کے دلائل

بہر حال ایسے لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ علوم دین کی ان کو ہوا تک نہیں لگی وہ دلائل کا مطالبہ کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے اندر ایک دعویٰ مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں کہ شریعت میں قرآن شریف کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے، ہم اس دعویٰ پر اول ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں، ہم کو یہ سمجھا دو کہ شریعت میں قرآن شریف ہی دلیل ہے اور کوئی دلیل نہیں، خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ علاوہ ازیں قرآن شریف کے اور بھی دلائل ہیں، فرماتے ہیں: ”وَمَا اَنْتُمْ بِالرَّسُوْلِ فَخُذُوْهُ وَاْمَانِهَاطُمْ عَنْهُ فَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۤءِ“ جو رسول خدا تم کو دس اسے لے لو اور جس سے روکیں، اس سے رک جاؤ۔“

### حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اگرچہ وہ قرآن نہ ہو، مثل قرآن شریف کے حجت ہے اور کیوں نہ ہو: ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ“ آپ کی شان ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از خلقوم عبداللہ بود

## اجماع امت

اور فرماتے ہیں: "وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ لُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ".  
اس آیت شریفہ سے اجماع امت کا حجت ہونا معلوم ہوا۔

## قیاس

اور فرماتے ہیں:

"وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَالَّذِي أُوْتِيَ الْأَمْرَ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَبْطِنُونَ مِنْهُمْ"

اور فرماتے ہیں: "فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ"

یہ آیتیں بتا رہی ہیں کہ قیاس بھی حجت ہے۔

پس اگر آپ قرآن شریف کو حجت مطلقہ مانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بعض دعاوی مسبوع اور حجت اور بعض نامسبوع، غرض یہ سخت غلطی ہے، دیکھئے عدالت میں دعویٰ کی سماعت کے لیے شہادت مطلقہ کی ضرورت ہے، مدعی اگر دو با وجہ است ادیوں کو پیش کر دے تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں بیچ صاحب اور فلاں مولوی صاحب گواہی دیں گے تو مانوں گا اور اگر وہ ایسا کہے تو حاکم ہرگز نہ سنے گا اور یہ کہے گا کہ تم ان گواہوں پر جرح کرو، تو اس کی طرف التفات ہوگا، لیکن اگر یہ مجروح نہیں تو تمہاری یہ تخصیص کہ فلاں فلاں اشخاص گواہی دیں ایک لغو بات ہوگی۔

## صحیح دلیل

اسی طرح مسئلہ عقلیہ ہے کہ دعویٰ کے اثبات کے لیے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے، مستدل جس دلیل کو چاہے اختیار کرے، مخاطب کو یہ اختیار ہے کہ اس میں جرح کرے اس کا جواب مذموم مدعی ہوگا، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے یہ دلیل کیوں اختیار نہ کی؟ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ شرعیہ کے اثبات کے لیے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے جو اادلہ اریبہ میں سے ہو، کسی خاص دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس کا لانا ضروری ہے کہ قطعی دعویٰ کے لیے قطعی دلیل اور قطعی دعویٰ کے لیے قطعی دلیل ہونی چاہیے جس کی تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے۔

غرض ایک تو قطعی یہ ہے کہ دوسرے اس کے مقابل یہ ہے کہ ان چاروں سے گزر کر نئے ظن کو

ہی جت سمجھا جائے کہ نرا گمان بھی کسی مسئلہ کا مثبت نہیں ہے، بلکہ دلیل صحیح ادلہ اربعہ میں سے ہونا ضروری ہے۔ (حصہ ششم، دعوات عہدیت و وعظ الغناء الجاز فہ صنفی: ۱۲۱)

## پندرہواں اعتراض..... آزادی کے معنی

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آئی، آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا، مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے، آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صورت دیکھ کر وہ لوگ سہم گئے، لیکن چونکہ جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہرگز نصہ نہ آئے گا اس لیے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا، لیکن آپ نے تین گناہ کیے ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے، حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے:

”لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا“

”گھروں میں داخل نہ ہو جو تمہارا گھر نہیں، یہاں تک کہ اجازت حاصل کر لو اور گھر والوں کو سلام کر لو۔“

دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن شریف میں تجسس کی ممانعت ہے ”لَا تَجَسَّسُوا“ (کسی کے پیچھے ٹوہ میں نہ پڑو) تیسرے یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے: ”وَ كَيْسَ الْبِرِّ بِأَيُّ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا“ (اور یہ نیکی نہیں ہے تم گھروں میں اس کی پشت کی طرف سے آؤ۔“)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو۔

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ آزادی ان حضرات میں تھی، یا آج کے مدعیان آزادی میں؟ بہائم کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے کھالیا اور ہوا پرستی میں عمر گزار دی۔

صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں، یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا، (خواہشات نفس) اور مطلق العنانی ہے، یہ آزادی سائنڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا، جدھر چاہا چل دیا، جو چاہا کر لیا، تو کیا کوئی آزاد صاحب سائنڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں؟ اگر اس کا جواب نعم (ہاں!) ہے تو

آج سے آپ بھی ہماری طرف سے جیسی لقب لیجئے اور اگلا (نہیں!) میں جواب ہے تو پھر اور مہربانی کر کے اپنے اور سائنڈ میں کچھ فرق بتائیے۔

(نسیان انفس صفحہ ۱۸)

سولہواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا!

اہل حق اور جدید طرز کے لوگوں کو تقریر میں جو فرق میں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں نہایت وسیع اور موثر ہوتی ہیں اور حق انہیں میں مختصر معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو اس کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور اہل لکچر کمزور اور خلاف واقع ہونا اور پرتلمیح (ملع سے بھرتی ہوئی) ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی نظر اول میں بے رنگ اور بھگی معلوم ہوتی ہیں، لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو ان کی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور قلب پر نہایت اثر ان کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تعلیمات قلب سے دھل جاتی ہیں۔

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آج کل کے علماء پر منجملہ دوسرے اعتراضات کے یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کو لیکچر دینا نہیں آتا، وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن شریف اور حدیث شریف ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے، تو ہم کو کسی ظاہری آب و تاب کی کیا ضرورت ہے؟ خوب کہا:

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی ست

مآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیارا

سادگی

لیکن لیکچروں میں طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لیکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے، ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے: ”نحس امة امیة“ امیة کے معنی سادگی کے ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ ہے، اسی لیے آپ نے لفظ ”نحس“ فرما کر ساری امت کو شامل فرمایا یہی روح ہے اتباع نبوی کی کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو، ”امیة“ ام کی طرف منسوب ہے، مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کی کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی، بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے، ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ

ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہیے تھی اور یہی بے ساختگی ہے کہ جن بوڑھوں میں بھائی جاتی ہے، آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں، تو اصلی ملک و مملکت کا یہی بے ساختگی ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مضمون ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے۔

### ساوگی کے ساتھ صفائی

تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف نہ ہونا چاہیے اور تلمیح اور تلمیح سے بالکل پاک ہونا چاہیے، البتہ بیان میں ساوگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے، لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹا جاتا ہے، ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آجاتا ہے، حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور اس میں کچھ خصوصیات ہیں، جیسا کہ ہر زبان کے لیے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں، اب اس طرز جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اردو میں لے لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں، حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتیں۔

### اردو زبان کی خصوصیات

ان کی بدولت زبان بالکل بھدی اور خراب ہوتی جاتی ہے، ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے، حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے حامی نہیں، کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے، دوسرے ہیئت اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے نہ کہ صرف مادہ کا تو جب زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہے گی تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی؟ پس اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہیے کہ ہم اس خصوصیات کو باقی رکھیں اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جاننے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں، حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے، کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے، ورنہ ہماری اصل زبان اور پدری زبان عربی ہی ہے، کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بودو باش اختیار کر لی ہے۔





ستر ہواں اعتراض..... ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج

نہیں ہیں!

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور شریعت اسلام کو تہذیب سے معرا سمجھتے ہیں، ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک ایک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی گیا، میر کے لیے چاندنی چوک میں نکلا، اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہڑ سکتی تھی، اس لیے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دکائیں نظر آئیں، دوسرے جانب کی نظر نہ آئیں، جب وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دکائیں نظر آئیں، ان کو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دہلی کے لوگ بھی کیا تم کے لوگ ہیں، ابھی یہ دکائیں دہنی جانب تھیں، ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھ دیا۔

تو ہمارے بھائیوں نے شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اس لیے وہ محتاج سمجھتے ہیں ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں، چند روز اگر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خونخوار بتلایا جا رہا ہے کہ وہ کیسی ذلت پرست ہے؟ جب اس کی حقیقت سے واقف ہو گے تو اس پر عاشق ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ:

ز فرقتا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کہ شد واسن دل میکشد کہ جا اینجا ست

کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کرو دل کھنچا چلا جاتا ہے۔

(مضار المعصیت صفحہ ۱۱)

اٹھارہواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکا تشریف نہیں

لے گئے، تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام کیسے ہوئی؟

ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہ سوال کیا کہ یہ تو میرا اعتقاد ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام ہے، لیکن یہ خلیجان ہوتا ہے کہ امریکا میں نہ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں

بھیجا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں ایسا منقول ہوتا حالانکہ منقول نہیں۔ نیز امریکا کا حال کثرت بعد میں معلوم ہوا کہ ایک جہاز غلط راستے پر ہولیا تھا اور وہ وہاں پہنچ گیا اور اس کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔

جب وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہیں پہنچی تو نبوت عام کیسے ہوئی؟ جواب میں فرمایا کہ بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی، بعثت کے عام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی جس کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہنچی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے، تو وہ کافر ہے اور یہ معنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہو گئی تھی۔

اس تقریر کے بعد اب کوئی شہ نہیں ہے، پس امریکا میں جس وقت خبر پہنچی، اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہوں گے۔ (مجاہد، معدلت، دعوات عبدیت حصہ پنجم ملفوظ صفحہ ۴۰)

انیسواں اعتراض..... جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا کہ وہ

فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟

فرمایا کہ یہ مجبوری عمل کے بعد معلوم ہوتی ہے، یعنی جب گناہ کر چکا اس وقت خبر ہوئی کہ یہ گناہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا اس سے قبل جب گناہ کیا ہے تو اس وقت کی خبر نہ تھی اور اگر کہا جائے کہ گو اس کو علم تقدیر کا نہ تھا، مگر واقع میں تو علم الہی اس کے متعلق تھا اور اس کے خلاف مجال ہے، تو اس طرح واقع میں مجبور ہوا۔

اب جواب یہ ہے کہ علم الہی اس طرح تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے ایسا کرے گا تو اختیار منفی ہوا، یا مؤکد ہو گیا، پھر سوال کیا گیا کہ اگرچہ انسان کا مجبور ہونا لازم نہیں آتا، لیکن خدا تعالیٰ رحیم ہیں، اس لیے اگر اپنی رحمت سے ہوائے نفسانی کو پیدا ہی نہ کرتے تو انسان کے لیے بہتر ہوتا اس پر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں، ازاں جملہ ایک صفت حکیم ہونا بھی ہے اور ہر صفت کا ایک خاص ظہور ہے، پس جس طرح ہوائے نفسانی وغیرہ کا پیدا ہونا مقتضاء رحمت ہے، اسی طرح ان کا پیدا ہونا بھی مقتضائے حکمت ہے۔

رہا سوال کہ وہ کیا حکمت ہے؟ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ہم کو اس حکمت کی اطلاع نہیں ہے اور فرمایا کہ یہ جواب کم فہموں کے نزدیک زبردستی کا جواب معلوم ہوتا ہے، لیکن اصل جواب یہی

ہے، البتہ اس جواب کی حقیقت سمجھنے کے لیے اس سے قبل چند مقدمات سمجھنے کی ضرورت ہے جب تک کہ وہ سمجھ نہ آئیں اس وقت تک اس کی حقیقت سمجھنی مشکل ہے اور اس وقت تک یہ زبردستی کا جواب نظر آتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب انسان ہر عمل میں اختیار کا سلسلہ امور غیر اختیار یہ تک پہنچتا ہے جس سے اہل سائنس بھی انکار نہیں کرتے اور بناءً تقدیر یہی امر ہے جیسا اوپر بیان ہوا تو اہل طبعیات کو تو تقدیر کا ضروری قائل ہونا چاہیے، کیونکہ وہ لوگ اس مسئلہ انتہاء الاختیار الی غیر الاختیار کو اس حد تک مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے افعال اختیاری کو بھی اس قاعدہ کا پابند کرتے ہیں، چنانچہ تخلیق اختیار کو موقوف مانتے ہیں، وجود مادہ قدیمہ پر جس کو اختیار خداوندی کہتے ہیں، گو اہل حق اس کے قائل نہیں، پس اس تسلیم کردہ مسئلہ کی بنا پر ان طبعین کو تو ہم سے زیادہ قائل تقدیر ہونا چاہیے۔

(مجادلت معدلت دعوات عہدیت حصہ دوم ملفوظ صفحہ: ۲۳)

بیسواں اعتراض..... اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت چھین کر

کفار کو کس لیے دے دی؟

فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف شفاف ہو، اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود میلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا، جیسے ٹوپی چھینٹ لگ جانے سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اور جوتے میں لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی، ایسے ہی مسلمان دعویٰ محبت کرتے ہیں، ان سے ذرا سی بے احتیاطی ناگوار نہیں ہوتی، بخالف اعداء (دشمن) کے کہ وہ جب کچھ بھی اصول پر عمل کر لیں تو اللہ میاں ان کو دے دیتے ہیں، اگر چہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہی ہیں۔

(مجادلت معدلت حصہ سوم دعوات عہدیت ملفوظ صفحہ: ۲۱)

اکیسواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند کرینے

سے ہماری قوم پر تباہی آگئی!

عقلاء وقت اس میں مختلف ہیں کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے؟ میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بد معاملگی ہے، بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی جو قومیں سود لیتی

ہیں وہ خوب ترقی کرتی ہیں میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لینے ہیں، لیکن ان کے کچھ بھی کام نہیں آتا، کیونکہ مال سے مقصود تمتع و نیوی ہے اور سود خور جمع کرتے کرتے مر جاتے ہیں اور بسا اوقات جن کے لیے جمع کرتے ہیں ان کو بھی نہیں ملتا ہے اور فرض کرو اگر تمتع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی نہیں، یعنی سخت دل ہو جاتے ہیں، کسی پر ان کو رحم نہیں آتا، کسی کی منصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا اور اپنے رشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے، جیسے میر سڑوں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے، سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا تو نرخ بگڑ جائے گا اور اکثر سود خواروں کو ترقی دینی بھی نہیں ہوتی اکثر سود خواروں کا مال ضائع ہوتے ہی دیکھا ہے اور فرض کرو اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لے کر کیا کریں گے؟

مباد اول آن فرو مایہ شاد

کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

### ترقی خوش معاملگی میں ہے

یہ تو دنیوی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا، دوسرے ایک دنیاوی غلطی بھی ہے، وہ یہ ہے کہ ترقی کا سبب وہ شے ہو سکتی ہے جس سے عام لوگ منقطع ہوں، اس لیے ترقی یافتہ وہی قوم ہوگی جس کے سبب افراد کو ترقی ہو اور عام طور سے ان میں غنی پیدا ہوں اور سودا یکی شے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہو سکتا، اول تو سب کے پاس مال نہیں، دوسرے آخر لے گا کون؟ اس لیے لامحالہ بعض لیں گے اور بعض نہیں، تو جو لیں گے وہ تو ترقی کریں گے اور جو نہیں لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے، بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے، پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہو سکتا، ترقی کا صریح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے، مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں، مسلمانوں میں تاجراہل ملک، رئیس سب طرح کی مخلوق ہے، مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں، اس وجہ سے تباہی آتی ہے، تو ایسی صورت ہونی چاہیے کہ سود نہ دینا پڑے اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے۔

### بد معاملگی کا انجام

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے بھائیوں سے بلا سود ملتا نہیں، اس لیے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے، ابھی میں عرض

کر چکا ہوں مسلمان میں بہت مالدار ہیں، لیکن وہ بویہ خوف بدمعاملگی کے قرض نہیں دیتے، بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں اور ان کو قرض دیں، مگر ڈرتے ہیں کہ وہ دے کر کیا لے لیں گے؟ اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہو جائے تو خود آپس ہی میں ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی رہے اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے جو تباہی کا سبب ہے، رفع ہو جائے۔

پس ثابت ہوا کہ بدمعاملگی تنزل کا سبب ہے، ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کاروبار پر لے کر دینا نہیں چاہتے، حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہوں گے تو وہ بھی نال کر دیں گے اور اس کو لازمہ ریاست سمجھتے ہیں کہ ہم سے تقاضہ کرنے کی مجال نہ ہوئی اسی طرح قرض خواں کو نہ دیں گے اور بھانہ کر دیں گے کہ بھائی! ابھی خرچ نہیں آیا اور اسی حال میں اگر بچہ کی ختنہ درپیش ہو جائے یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتیرا روپیہ اگل دیں گے، غرض بدمعاملگی کا مرض عام ہے۔

(تعظیم الشعار صفحہ: ۱۱)

## باکیسواں اعتراض..... کیا تمام علوم قرآن شریف میں ہیں؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علم حتیٰ کہ طبیعیات سائنس وغیرہ سب قرآن شریف میں ہیں، چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کر لیا کہ مادہ منویہ میں کیڑے ہوتے ہیں، سو قرآن مجید میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے، اس لیے کہ فرمایا ہے: "خلق الانسان من علق" اور علق کے معنی جو تک کے ہیں، حالانکہ یہاں "من علق" کے یہ معنی نہیں ہیں، بلکہ خون بستہ کے ہیں وہ زبردستی اس تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بناتے ہیں۔

ایک اور سائنسدان کہتے تھے کہ جیسے حیوانات میں نر و مادہ ہیں، اسی طرح نباتات میں بھی ہیں اور قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر ہے: "خلق الازواج کلہا" اس عقل مند نے ازواج کا ترجمہ میاں بیوی سے کیا، حالانکہ زوج کے یہاں یہ معنی نہیں ہیں، بلکہ بمعنی اصناف ہے۔  
صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے، یہ سخت مضطرب ہے؟

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست

ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں درست نہیں

اس میں بڑی دشمنی ہے اسلام کے ساتھ اس لیے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سائنس کے مسائل متح

نہیں ہوئے اور اس کو اہل سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اب تک اس دریا کا قطرہ بھی حاصل نہیں ہوا، پس جب کہ مسائل متح نہیں ہوئے تو اگر آج آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بنایا، مثلاً یہی کہ تخم درخت میں زرمادہ ہوتے ہیں اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت ہوگئی اور دوسری تحقیق نئی ہوئی تو اس میں تکذیب کلام الہی کی بھی لازم آئے گی، پس یہ لوگ "یصدون عن سبیل اللہ" کے مصداق بن رہے ہیں، غرض یہ کوشش کرنا کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت ہو، سخت حماقت ہے، بلکہ قرآن شریف کا کمال یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے، وہ فن اس میں ہو اور دیگر خرافات سے خالی ہو، قرآن شریف ایک طب روحانی ہے اور اس فن میں وہ یکتا ہے اور مومنی بات ہے کہ جب مسائل دینیہ فرعیہ بھی سب کے سب قرآن شریف میں نہیں ہیں، تو فنون و تجربے کے مسائل تو اس میں کل کیسے ہوں گے؟ (احاطت الاحکام صفحہ: ۶۱)

تینیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے سے مال کم

ہوتا ہے، بڑھتا کہیں ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپے رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہو جاتے ہیں، بڑھتا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتے، بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ نہ ہوتا، مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھتا ہو مال اپنے کام آئے، چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو اور اس کے کام نہ آئے، بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائے اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہوں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے، یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے، سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ شخص ہیں اور ان کی برابر آمدنی ہے، مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کرتا ہے، سو اس کی چین و آرام سے زندگی گزرتی ہے اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے۔ آج چوری ہوگئی کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا، خود بیمار ہو گئے، بچے بیمار ہو گئے، عطار کے یہاں روپیہ جا رہا ہے، طبیب کی فیس میں روپیہ خرچ ہو رہا ہے، بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آ رہی ہے جو مال بڑھنے سے غرض ہے، وہ اس کا حاصل ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ بھی ہمارے ہی لیے ہے۔ (ذکر الموت صفحہ: ۶۸)

چوبیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ مصائب میں

### زیادہ مبتلا رہتے ہیں!

آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام آتے ہیں، کوئی تنگدست ہے، کوئی بیمار ہے، غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک تو صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی حقیقت درج ہوتی ہے، مال اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اس کی راحت و تہمت قلب ہے مال و جاہ اور صحت سب سے مقصود اطمینان اور راحت ہے اگر سب کچھ ہو لیکن قلب پریشان ہو تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے چنانچہ اطمینان اور راحت ہے۔ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت، شہمت و شوکت سب کچھ ہو اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس کے مقابلے میں ایک شخص فرض کیا جائے کہ جس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے اور مزدوری کر کے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے، اس سے اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی، اگر بجائے اس کے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ اور یہ اقرار کرو کہ قاتل میں ہوں، وہ ہرگز منظور نہ کرے گا اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر جھولے میں ڈالوں گا جب میری جان ہی نہ ہوگی تو ایسی دولت کو کیا کروں؟ اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے کہ تم کو خلاصی ہو جائے مگر اس شرط سے کہ اس کا فقر وفاقہ تم کو ملے گا تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال و جاہ و صحت نہیں ہے، بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔

### اہل اللہ کا حال

پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر وفاقہ خواہ کسی قدر ہو، ان کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش و عشرت ہو، لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان رہتا ہے، خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام مانتا ہی نہیں، کیونکہ اس کو وہاں زیاں (نقصان) کا بھی کھنک لگا ہے، تو اس کا گناہ اور بھی بے لذت ہے۔

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ فرمانبرداری سے روح کو عیش میسر ہوتی ہے، ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی، کیسے اگر اگرچہ مفلس ہو، لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب



چاہوں گا سونا بنا لوں گا، اس واسطے بڑے بڑے والیان ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔

پس صاحبو! جب کہ وہ کیا جتانے کو سونا بنا دیتی ہے، یہ اثر کبھی ہے تو حقیقی کیا یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہوگا؟

پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہو گیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت ہی میں منحصر ہے۔ (شرط الایمان صفحہ ۲۳۴)

## پچیسواں اعتراض..... ناول بینی کی مضرتیں!

اس میں اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا، اگر کوئی کہے کہ غفلت تو کچھ ہی میں کام کرنے اور روٹی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے، تو چاہیے کہ سب چھوڑ دیں۔

بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں، ایک ضروری اور ایک غیر ضروری۔ ضروری اشغال کا یوں تجربہ ہوا کہ مضرتیں ہیں، اس لیے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شے کو سمجھے گا تو اول اسی اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کریں گے اور جو تھوڑی غفلت اس میں ہو جاتی ہے اس کے لیے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ دھل دھلا جاوے گی اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے، اس لیے اس کو ہی مقصود سمجھے اور وہ مضرت ہے اور مورث غفلت ہے اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے منفعی الی الکا بار بلکہ الی الکل فر ہو جاتی ہے۔

## ناول دیکھنا نقصان دہ ہے

بالخصوص ناول سے ایک بڑا ہی سخت مرض پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے بد معاشی کے طریقے قوی خوب یاد ہو جاتے ہیں، ہمارے ناول کے شیدائی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں، لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت ضائع ہو جاتا ہے، لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا، اس لیے وہ قصے صریحاً کذب اور عادتاً تخیل ہیں، مثلاً گل بکا ولی کا قصہ، بکا ولی کی تصویر اور جنوں کی عمل داری وغیرہ من الخرافات ان قصوں سے کوئی ترکیب بد معاشی کی نہیں سیکھ سکتا، کیونکہ اس میں وصال بکا ولی کا طریقہ ایک جنس کا

مہربان ہو کر پہنچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح سے حاصل کرے گا؟  
 بخلاف ناولوں کے کہ اس میں لکھا ہے کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا، جس کو ہر شخص کر سکتا ہے،  
 ناول کا طرز چونکہ ایسا دکھلایا جاتا ہے، جیسے واقعات ہوتے ہیں اس لیے اس کا ایک اثر خبیث پڑتا  
 ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشقِ نساء یا اطفال میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قلب میں سوزش کی  
 سی کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔  
 (الصوم صفحہ ۹۴)

چھبیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ قرآن مجید میں تکرار

مضامین کیوں ہے؟

اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو صاف صاف بیان فرما دیا اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ مکرر کر بیان فرمایا  
 کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا، ہم نے کیا کیا کہ اس کی قدر تو کی نہیں، برعکس اس کے اس میں شبہات  
 نکالنے لگے کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو مکرر کیوں بیان فرمایا؟

تکرار مضامین کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت یہی ارشاد فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: "وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي  
 هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا" یعنی ہم نے لوگوں کے لیے طرح طرح سے اس لیے بیان کیا ہے تاکہ  
 نصیحت قبول کریں۔

اس کی قدر اس کو ہوگی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے، دیکھو! باپ بیٹے کو کس کس طرح سے  
 سمجھاتا ہے؟ صرف ایک مرتبہ کے سمجھانے پر اکتفا نہیں کرتا اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد  
 مواخذہ کرتا ہے، بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے، دوسری، تیسری، چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے، جب  
 تک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اس کو چین نہیں آتا، جب بالکل لاچار ہو جاتا ہے بہ مجبوری زبرد تو بیخ  
 سے کام لیتا ہے، پھر اس میں بھی ایلام اور ایذا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مد نظر  
 ہوتی ہے، حق تعالیٰ کو تو باپ سے بدرجہا زیادہ شفقت ہے اور اس کو باپ سے زیادہ اس کے مصالح  
 کی رعایت ہے، اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں میں نوع نوع کے طرز سے بیان  
 فرمایا ہے اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ کو بیٹے  
 کے حال پر جو عنایت ہے، اس کا منشا تو غرض ہے کہ باپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ بیٹا میرے کام آئے  
 گا، یہ نہیں کہ اس سے میرا نام چلے گا اور کچھ نہیں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ

ایسا علاقہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے وہ اس کی تربیت و صلاح کی طرف مضطرب ہوتا ہے اور اس سے اس کو راحت ہوتی ہے۔

## انسان محتاج محض ہے

بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہے، غنی بالذات ہے اور نہ ہماری طرح کسی شے سے وہ متاثر ہوتے ہیں ہم تو محبت سے یا کسی دوسری غرض سے مجبور بھی ہو جاتے ہیں اور وہاں چونکہ غنی ذاتی ہے، اس لیے کسی شے کی احتیاج نہیں اور ماسوا کے سب محتاج ہیں، بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے، اس لیے اگر عالم میں انسان نہ رہے تو کسی شے میں کوئی خلل نہ آئے سب اپنے حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شے بھی نہ رہے تو انسان کی بقا و شواہد ہو جائے مثلاً پانی نہ رہے یا آگ نہ رہے، تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر انسان ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں، اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شے کا محتاج ہے۔

## محتاجی کی وجہ

اور یہ بات کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے یہ محتاج کیوں ہوا؟ سوراہا میں یہ ہے کہ اس کو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب نہ ہو جائے اس لیے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگا دی گئی ہیں کہ جب ناز اور فخر ہو تو فوراً اس کی طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا ناز کروں؟ میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہوں گی۔

## اللہ تعالیٰ محتاج نہیں

بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شے انسان کی محتاج نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کو انسان کی کیا احتیاج ہوتی؟ جن چیزوں کا انسان خود محتاج ہے، اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں، بلکہ یہ امر عقلاً و ظہراً ثابت ہے کہ ہر شے اپنے وجود اور بقاء میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے، پس حق تعالیٰ کے اس استغناء اور انسان کے اس حوج ترین مخلوقات ہونے کا اقتضاء تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخاطب نہ بناتے لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے، حقوق تو ضرور ہی ہوتے ہیں پس جب حقوق ہوتے تو ان کے ادا کرنے کا طریقہ بتلایا نہ جاتا تو سخت مصیبت

ہوتی جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلاتے ہیں، خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور ایک دو ہی کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتنا مزاج شناس ہو کہ اشارہ کو سمجھے۔

### شاہزادہ ایران کا واقعہ

علی حزیں شاہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادمِ رضائی نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا ایک مرتبہ علی حزیں نے شاہِ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے، بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیج دیا۔

علی حزیں باغ میں بیٹھے تھے اور نیا خدمت گار باغ کے دروازے پر تھا، ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا، اس خادم نے وہ رقعہ پینچا دیا، اس میں درخواست تھی کہ لیوں عنایت فرمائیے علی حزیں نے چہرہ پر ہل ڈال کر وہ رقعہ واپس دے دیا، یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو تو بند کر لیا اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں، یہ کسی بات پر بگڑے ہیں، اتفاق سے وہاں رضائی بھی آ نکلا اس سے خدمت گار نے سارا قصہ بیان کیا، رضائی نے کہا چہرہ پر ہل ڈال کر رقعہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ لیوں ترش ہوتا ہے، انہوں نے چہرہ ترش کر کے بتلا دیا وہ خادم یہ سن کر بھاگا اور سوچا کہ میں یہاں رہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔

### اس حکایت کا خلاصہ

یہ حکایت صحیح ہے یا غلط؟ بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے تو حق تھا، لیکن مصیبت ہوتی اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا؟ تو ایسا نہیں کیا، بلکہ ایک مضمون کو خوب کھول کر دو درجہ، تین تین مرتبہ بیان فرمایا اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیج دیا کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا ملل کرنے میں دقت ہوتی، بلکہ ایک عجیب اور فطرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جن کی شان یہ ہے: "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ،" یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں، تمہاری جنس سے، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہماری جنس سے ہونا ایک نعمت تو ہے، اس لیے کہ اگر کسی فرشتہ یا جن کو بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مرجاتے اور آپس میں کچھ مناسبت نہ ہوتی۔

آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبے سے گزرا کر الہانک پہنچادیں گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافت ہوتی ہے،

حالانکہ عین رحمت الہی اور عین کمال نبوی بھی ہے کہ بشر ہو کر قرب کے ایسے درجہ پر تھے، یہ تو کمال کا تھا اور رحمت اس لیے ہے کہ بشریت کی مناسبت سے بے براہوں کو راہ پر لائیں۔

(اشرف صفحہ: ۱۰۵)

## ستائیسواں اعتراض..... پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب!

جواب:

حق تعالیٰ نے بنون (لڑکوں) کو زینت حیاۃ الدنیا بتلایا ہے، بنات (لڑکیوں) کو بیان نہیں فرمایا، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے، کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً ڈال سمجھتے ہیں، تو تمہارے نزدیک وہ گیا خاک زینت دنیا ہوں گی؟ دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ بنات زینت دنیا میں بھی نہیں ہیں، بلکہ محض زینت خانہ ہیں، اگر وہ بھی زینت دنیا ہو تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے، پس صرف بنون کو زینت دنیا فرمایا اور بنات کو ذکر نہ فرمایا، اس کی دلیل یہ ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں، کیونکہ عرفان زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں کہ تم ان کو ساتھ لے پھرو اور سب دیکھیں کہ اس کی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ و پیراستہ ہیں، بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں، یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔

## عورت کا پردہ

دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کو پردہ کرایا جائے، کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس کے معنی لغت میں چھپانے کی چیز کے ہیں، تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورت کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے کہ جیسا کہ یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ، پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ، انکو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں۔

ایک ترقی یافتہ کہتے ہیں کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رکی ہوئی ہیں، میں نے کہا: جی ہاں! اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں، یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔

## پردہ تعلیم کے لیے مضر نہیں

اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ باہر پردگی کو کوئی دخل نہیں، بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے، اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں، ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے، کیونکہ تعلیم کے لیے کسبوسنی اور اجتماعی خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے، اس واسطے مرد بھی مطالعہ کے لیے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔

## پردہ کی وجہ

پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لیے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوں؟ جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں، ہاں علوم تجارت کے لیے سیرو سیاحت کی البتہ ضرورت ہے، مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں، ان کے لیے سیرو سیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی، بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی، اس لیے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی، کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں، مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے، وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو یہ ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادیاں کرتیں۔

پس عورتوں کے لیے یہی سیرو سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں، جن تجربوں کی ان کو ضرورت ہے، وہ گھر میں رہ کر ان کو حاصل ہو سکتے ہیں، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت میں سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں، اگر سیر و تماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے، دل کی آنکھوں سے دیکھ لو، تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواڑیوں سے استغناء ہو جائے گا۔

ستم است گر پے کشد کہ بیر مروسمن در آ  
تو زغنجی کم ندیدہ در دل کشا بچکن در آ  
چوں کوئے دوست ہست بھجرا چہ حاجت ست  
خلوت گزیدہ رہ بتماشا چہ حاجت ست

(مظاہر آمال صفحہ: ۱۶)

## جواب نمبر دو پر پردہ کی اہمیت

مردوں کو تو یہ حکم فرمایا:

”قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ بَعْضُوا مِنْ أَنْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوا أَنْفُسَهُمْ“

یعنی آپ مؤمنین سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور عورتوں کے لیے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضافہ فرمایا: ”وَالْأَيْدِيْنَ زِينَتَهُنَّ“ یعنی بناؤ سنگھار کا موقع ظاہر نہ کریں اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگھار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجازت (غیروں) کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن تو کیسے جائز ہوگا؟

دوسرا مقام پر ارشاد ہے:

”وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرُجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ“ یعنی جو عورتیں بوڑھی ہوں وہ اگر اپنے زائد کپڑے اتار کر رکھ دیں، جیسے اوپر تلے کپڑے ہو اور اوپر کا کپڑا اتار دیں، بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں، لیکن اس حالت میں بھی اپنے مواقع زینت کو ظاہر نہ کریں، مثلاً گردن، کان کہ ان میں زیور پہنا جاتا ہے اور آگے ارشاد ہے: ”وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ“ یعنی یہ زائد کپڑے اتار کر رکھنے سے بچیں تو ان کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

پس جب بوڑھیوں تک کے لیے یہ حکم ہے کہ تو اے لڑکیو! اور اے جوان عورتو! تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے بے محابا آ جاؤ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی نہ ہوا، نہ ہوگا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو بعض نو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں محض غلطیے، بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں، بس دیکھا کیا ہے؟ کوئی اخبار دیکھ لیا! اگرچہ عربی پڑھی ہے تو مصری اخبار دیکھ لیا۔

سو سمجھ لو کہ یہ پردہ جو آج کل مروج ہے یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آیا کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پردہ کے پیچھے سے خط دیا۔

## خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے اور قرآن اوپر گزرا ہے؟ پھر جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سے پردہ کرا دیں، تو کون سے پیرے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی؟ خواہ کوئی خالو ہو یا چچو چھا، دادا لگتا ہوں یا بیچیا، اگر وہ محرم نہ ہوا جنسی ہے۔ بڑا ظلم و ستم ہے کہ عورتوں کو اس کی کچھ پراوہ نہیں ہے۔

ہم نے مانا کہ تمہاروں پاک ہے، لیکن تم کو دوسرے کی کیا خبر؟ اگر کہو کہ دوسرا بھی پاک ہے تو توبہ! خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تم نے ظالم قرار دیا کہ باوجودیکہ یہ پاک تھا پھر بھی اس سے پردہ حکم دیا، اگر یہ پاک صاف ہوتے تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔

## حضرت یوسف علیہ السلام کا قول

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کو سب خیر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہے؟ انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں ہو سکتا، حضرت یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں: "وَمَا أُبْرِي نَفْسِي إِلَّا النَّفْسَ لَا مَارَةَ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَجِمَ رَبِّي" یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے، مگر جس پر میرا رب رحمت فرمائے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔

## نفس کی پاکی کا دعویٰ

اب بتلائیے کہ کس کا منہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے، مجھ کو برا وسوسہ نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ عارضی حالت ہے، چنانچہ بعض بزرگوں کو اس میں دھوکا بھی ہوا ہے کہ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کو وسوسہ نہیں آتا تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مڑکی ہو گیا ہے، اس لیے انہوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی پاک نہیں کیا اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے، خواہ وہ فتنہ قلب ہی کا ہو اور یہ کارگزاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا؟ اسی واسطے حق تعالیٰ نے اول یہ تدبیر بتلائی کہ بنگا نیبی رکھو! اگر بضرورت تم کو کسی غیر کے سامنے آنا پڑے تو نگاہ نیچی اور کپڑوں میں لپٹ کر آؤ، یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف، لیکن اصل تمام پھول پھل کی یہی ہے، جیسے زکام ہے کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے، لیکن سینکڑوں بیماریوں کا منشاء ہو جاتا ہے، اسی طرح نظر بھی ہے کہ اگر یہ بگڑ گئی تو پھر آئینہ امن اٹھ گیا، اسی واسطے اول اسی کو روکا ہے۔



## ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا پردہ

دیکھو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت نہیں ہو سکتی ہیں، میں تم کو قصہ سنانا ہوں جس سے تم کو اندازہ ہوگا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں وہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے عائشہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیٹھیں تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ نابینا ہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "افغصنا و ان انتما لستم ا تصرناہ" یعنی کیا تم بھی اندھی ہو اس کو دیکھتی نہیں ہو؟ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں امہات المؤمنین، دوسری طرف نابینا صحابی، بھلا یہاں کون سا وسوسہ کا احتمال ہو سکتا ہے؟ مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔ (العصہ صفحہ: ۷)

## اٹھا کیسواں اعتراض..... علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں!

جواب:

لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں، آج میں اس الزام کو دفع کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا، اس پر جنٹل مین چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان! میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے ہیں اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں اس پر اور بھی حیرت ہوئی میں نے کہا: حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَلِكُلِّ وَّجْهَةٍ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاَسْتَقْبُوا السَّخِرَاتِ" یعنی ہر قوم کے لیے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے، پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا، جس کے معنی ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں۔

تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افتراء کرتے ہیں! بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے، علماء کی مجال کہ اس سے منع کر سکیں؟ پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے، البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے، جنٹل مین کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اسی طرح ترقی کرو

اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کے، اسی طرح ترقی کرو، سو قرآن میں "فاسمببقوا" کے ساتھ: "السخیرات" کی بھی قید ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔

اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے، آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں، وہ ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں گے اور اگر ترقی فی الشر ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے، ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے؟ میں تو ترقی کا طالب ہوں، بتلائیے! اسے کیا جواب دیں گے؟

### ترقی محمود و مطلوب ہے

ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ برے طریقے سے حاصل کی جاتی ہے، معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو، بس اب یا تو آپ ثابت کر دیں جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے، مذموم نہیں، یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی ہم تعلیم دے رہے ہیں اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔

اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طریق تحصیل سے اختلاف ہے، کیونکہ ان طریق نے خلاف شرع ہونے کی وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشر کا مصداق بنا دیا ہے۔

غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ ان کی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں، کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو، کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے، اگر عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ بنائیں گی۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی، میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے، زیادہ تعداد تو چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے، اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ کر لی؟ پس اس کا جواب کچھ نہ تھا، وہ میرے منہ کو تنکنے لگے۔

## جواب دو علماء پر غلط الزام

یہ سب کہتے ہیں عزت و ترقی حاصل کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ علماء، ترقی کے مانع ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عزت حاصل کرنا چاہیے اور علماء اس کے مانع نہیں ہیں اور علماء کیسے مانع ہوتے؟ جس شئی کو قرآن و حدیث ثابت کرتے ہیں، اس کو کون سامولوی مٹانے والا ہے؟ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ" یعنی اللہ ہی کے لیے ہے عزت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مؤمنین کے لیے جہلاً جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہوگا، وہ کیسے اس کی نفی کرے گا؟ پھر علماء پر الزام کیا؟

بات یہ ہے کہ ان کی بات پوری طرح سنتے تو ہیں نہیں، بے سوچے سمجھے ہانک دیا کہ علماء ترقی سے روکتے ہیں۔

صاحبو! علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں، علماء جو طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہیں، وہ نفس ترقی کی طلب پر نہیں، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ لوگ اس کو غیر طریق سے حاصل کر رہے ہیں، طریق یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی پشاور جانا چاہیے اور کٹ لے لے کھلتے گا اور اس کو کوئی اس کی غلطی پر آگاہ کرے تو وہ پشاور جانے کا اور ریل میں سوار ہونے کا مخالف نہیں بلکہ طریق کے اندر مخالفت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ راستہ یہ نہیں ہے پشاور کو دوسری گاڑی جائے گی اس کا کٹ لے لو، وہ تم کو پشاور پہنچا دے گی۔

## ریل کا ایک واقعہ

میرے ایک ہم وطن اسٹیشن سہارنپور سے میرٹھ جانے والے لکھنؤ جانے والی گاڑی میں غلطی سے سوار ہو گئے، اتفاق سے میں بھی لکھنؤ جا رہا تھا، عین روانگی کے وقت تو ان سے کوئی بات ہوئی نہیں، اس لیے کہ خیال ہوا کہ یہ تو گاڑی میں موجود ہیں ہی، اس سے اطمینان سے بات کروں گا جو لوگ مجھ کو پہنچانے کے لیے آئے تھے ان سے باتیں کرتا رہا، جب ریل چھوٹ گئی تو ان کی طرف متوجہ ہوا، میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے؟ کہنے لگے میرٹھ میں نے کہا ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جائیں گے مگر یہ گاڑی میرٹھ نہ جائے گی، یہ تو روڑکی ہوتی ہوئی سیدھی لکھنؤ پہنچے گی، یہ سن کر بہت چکرائے اور سردی کا موسم تھا، ان جنٹلمینوں کو یہ مرض ہے کہ کپڑا ساتھ نہیں لیتے اور رضائی اور روئی دارا گر کھا پہننے کو خلاف تہذیب سمجھتے ہیں، بیک بنی و دو گوش ہی سفر کرتے ہیں، ایسے ہی وہ بھی تھے، خیر وہ روڑکی اترے، پھر وہاں سے اخیر شب

میں میرٹھ پہنچے، پس دیکھئے! میں ان کے ریل میں سوار ہونے کا اور میرٹھ جانے کا مخالف نہیں تھا، بلکہ گفتگو یہ تھی کہ آپ نے طریق میں نلطی کی۔

پس علماء کو اگر کہیں طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہوئے سنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترقی کے مخالف ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق سے آپ ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ طریق اس کا نہیں ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی  
کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

علماء بتانے والے ہیں

طریق اس کا وہ ہے جو مولوی بتاتے ہیں خدا اور رسول نے جو بتایا ہے وہ طریقہ ہے، مولوی بے چارے تو سرکاری حکم کے منادی کرنے والے ہیں، منادی کرنے والے سے اگر کوئی معارضہ اور مناظرہ کرے تو وہ بھی کہے گا کہ میں منادی کرنے والا ہوں مجھ سے کھنپ نہ کرو، اس کی ایسی مثال ہے جیسے چراسی سخن لایا اور اس سے مباحثہ کرنے لگے تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہوں گے، ایک تو تعیل نہ کرنے کا، دوسرے سرکاری آدمی سے مقابلہ کرنے کا، پس یاد رکھو کہ یہ علماء سرکاری آدمی ہیں، ان سے منازعت کرنا جرم ہے۔

غرض طریق ترقی کا وہ نہیں جو آپ لوگوں نے اختیار کیا ہے، ترقی اور عزت حاصل کرنے کی ضرورت تو مسلم ہے، لیکن طریقہ یہ نہیں ہے۔

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں مگر اس کی تحقیق کے لیے اول یہ سمجھئے کہ عزت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے؟ اور وہ کیوں ضروری ہے؟ سو لوگ تو ترقی اور عزت کے طالب ہیں کہ اس کی غرض محض بڑا بننا ہے، مگر میں اس کی اصل وجہ بیان کرتا ہوں کہ اس کی کس لیے ضرورت ہے؟

انسان کا مقصد

اصل یہ ہے کہ عقلی طور پر انسان کو دو چیزوں کو ضرورت ہے، منافع کو حاصل کرنا اور مضمرات سے بچنا، آدمی جو کچھ کرتا ہے، اس کی غایت صرف یہی ہوتی ہے کہ یا تو نفع کی تحصیل ہو یا مضمرات کا دفع، مثلاً کھانا کھانا ہے تاکہ بھوک کے ضرر سے بچے اور قوت کی منفعت حاصل ہو، دوا کرتا ہے تاکہ مرض دور ہو اور صحت حاصل ہو، غرض جو کچھ کرتا ہے یا تو جلب منفعت کے لیے یا دفع مضرت کے لیے اور دوسرا قاعدہ عقلی یہ سمجھو کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں، پس

جب منفعت اور دفع مضرت جس طریقے سے حاصل ہو وہ بھی ضروری ٹھہرا، سو طریقہ اس کا چننے سے کمال و جاہ کا حاصل ہونا، مال تو اصل میں منافع کی تحصیل کے واسطے ہے اور جاہ اصل دفع مضرت کے واسطے ہے، گو کبھی کبھی جاہ سے خطرے میں بھی پڑنے کا احتمال ہے، لیکن وہ بحیثیت جاہ ہونے کا خطرے کا سبب نہیں ہوتی، اس لیے کہ جاہ فی حد ذاتہ خطرات سے بچانے والی ہے، بلکہ سبب وقوع فی الخطرہ کا قلت جاہ ہوتی ہے، مثلاً بعض بڑے لوگوں کے کچھ دشمن ہو گئے اور آزار پہنچایا تو یہ ایذا جاہ کے سبب سے نہیں ہوئی، جاہ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہے، اگر غلبہ پورا ہوتا تو اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا، اسی واسطے حق تعالیٰ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ غلبہ اور عزت غیر محدود اور کمال درجہ میں ہے، لیکن تاہم جاہ ہی ایسی شے ہے جو بہت سے مصائب اور خطرات سے آدمی کو بچاتی ہے، مثلاً اب ہم اطمینان سے بیٹھے ہیں، کوئی ہم کو ذلیل نہیں کر سکتا، بیچاریں نہیں پکڑ سکتا، تو اس کا سبب کیا ہے؟ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی ہے، بخلاف ان لوگوں کے جن کو عزت حاصل نہیں ہے، پولیس نے سکم دے دیا کہ وہس پھاروں کو بیچاریں پکڑ لاء، بیچارے چارونا چار آتے ہیں، پس جاہ اور عزت کی غرض مضرت سے بچنا ہے۔

## عزت و مال مطلوب ہیں

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ عزت اور مال دونوں مطلوب اور مدوح ہیں، مہربوب عند اور مذموم نہیں ہیں اور جو مال و جاہ کی خدمت کرتے ہیں، ان کا عنوان تعبیر مختصر ہوتا ہے، مقصود و مذمت کرنا حب مال اور حب جاہ کا ہے اور جب بھی وہ جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کہ ان کی ہوس میں اللہ تعالیٰ کا حکم بھی پس پشت ڈال دے، چنانچہ ارشاد ہے:

”قُلْ إِنْ كُنْتُمْ أَحِبُّونَ آبَاءَكُمْ وَأَهْلَكُمْ وَآخِيَانَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ وَعَشِيرَتَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ فَأَقْرَبُكُمْ هِيَ وَتَحَارَةُ تَحَارَتُمْ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ“: ”أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ“ سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ مذموم اور مٹی عند نہ مال ہے نہ جاہ اور نہ حب مال اور حب جاہ، بلکہ مال اور جاہ کی حب مضرت ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے مقابلہ میں دین کی بھی پروا نہ رہے، عزت اور آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ دین رہے یا جائے، مگر بات نہ جائے۔

جیسے ایک شخص ریل میں سوار تھے، انہوں نے نماز نہ پڑھی اور کہتے تھے کہ میں نے نماز اس لیے نہ پڑھی کہ ہندوؤں کا مجمع تھا، اگر ان کے سامنے نماز پڑھتا تو وہ یوں کہتے کہ اٹھک بیٹھک کرتا

ہے؟ اور اس سے اسلام کی اہانت ہوتی، استغفر اللہ! یہ اس شخص کا گمان فاسد تھا کہ وہ نماز پڑھتا تو زیادہ عزت ہوتی۔

### حکایت وزیر بھوپال

ایک وزیر اعظم ریاست بھوپال کی حکایت ہے کہ کسی بڑے حاکم کا لیکچر ہو رہا تھا، نماز کا وقت آ گیا بڑے بڑے امراء و وزراء، شریک تھے، ان میں نمازی بے نمازی سب قسم کے تھے، سب یہ سمجھے کہ یہاں سے اٹھنا بڑی سبکی کی بات ہے، اس لیے سب ساکت بیٹھے رہے، وزیر صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضور! نماز کا وقت آ گیا ہے، ہم نماز پڑھیں گے، حاکم نے بہت خوشی سے کہا کہ ضرور پڑھ لیجئے! وزیر صاحب کھڑے ہوئے اور لوگ بھی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، دربار ہی میں بڑی شان و شوکت سے نماز باجماعت ہوئی۔

### دین سے بے رغبتی

دیکھئے! عزت یہ ہے، آج کل یہ حالت ہے کہ گودین جاتا رہے مگر ہماری آبرو و عزت مزعومہ میں فرق نہ آنے پائے، ہماری آمدنی میں فرق نہ آنے پائے، چنانچہ مختلف تدبیروں سے خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز، کوئی مال بڑھا رہا ہے، کوئی جائیداد کی فکر میں ہے، عورتیں زیور کے بڑھانے کی فکر میں ہیں، اسی طرح جاہ کو مختلف تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں اور اس کو ریاست سمجھتے ہیں، آج کل ریاست کا حاصل کیا ہے کہ اپنے دباؤ اور زور سے غریبوں پر ظلم کرنا کسی کی گھاس چھین لی، کسی کی زمین دہالی وغیرہ، غرض عزت کے مقابلہ میں جب دین کی پرواہ نہ کی تو کیا عزت ہے؟ ہاں! یہ بھیڑیے کی عزت ہے، اگر ابھی بھیڑ یا آ جائے تو سب کھڑے ہو جائیں، خواہ وہ یہ سمجھے کہ میری تعظیم کو کھڑے ہوئے (حالانکہ لوگ اپنی حفاظت کے لیے کھڑے ہوں) واللہ! ان امراء اور ظالموں کی ایسی ہی عزت ہے کہ لوگ اپنی بچاؤ کی وجہ سے ان سے ڈرتے ہیں ورنہ ویسے تو کوستے اور گالیاں ہی دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس کو غارت کر کے۔

عزت ہے اللہ والوں کی کہ ان کے لیے جان تک فدا کرنے کے واسطے لوگ حاضر ہیں، پس حقیقی عزت یہ ہے کہ دلوں پر قبضہ کرے اور دلوں پر سکھ جائے، سو ایسی عزت اللہ والوں کی ہے۔

(العرۃ صفحہ ۱۴۰)

انٹیہواں اعتراض ..... اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ

**فلاں بات خلاف عقل ہے، اس لیے قابل قبول نہیں!**

ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے، کہہ دیا کہ یہ خلاف عقل ہے، اس لیے قابل قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے، چنانچہ ان کے نزدیک صراط پر چلنا بھی خلاف عقل ہے اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں تو اس طرح انہوں نے عقائد میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا، اب ایمان کے معنی وہ نہ رہے جو پہلے تھے، یعنی ”تصدیق بما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ بلکہ معنی یہ ہو گئے کہ ”تصدیق بما اوفق عقل مما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمہ ہیں، ایک تو یہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے، تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء و راہنجن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی، وہ ان کو خلاف عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو ایسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں، جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے، چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین و علماء و صلحاء رحمہم اللہ تعالیٰ امت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں، اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے، تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم، مگر کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور ناقابل قبول ہے کیوں کہ تو انہیں سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں، مگر تم قانون والوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو، اس کو بھی جانے دو، میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا تمہاری عقل میں آتا ہے؟ واللہ! ہم کو اس پر حیرت اس لیے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے، اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔

## انسان کی پیدائش

اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچے کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہو کر آتا ہے، اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھائیں، مگر یہ نہ پڑھائیں جس میں طریق ولادت کا ذکر ہو، پھر جب وہ بی اے اور ایم اے اور ایل ایل بی ہو جائے، اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے! تو کیونکر پیدا ہوا تھا؟ اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا، جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے، پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے، پھر علقہ، پھر مضغ، پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں، پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی، جس کی پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی، پھر نو ماہ کے بعد تو شرمگاہ مادر سے نکلا اور اب وہ خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آ گیا جس سے دو برس تک پرورش پاتا رہا، (الی آخرہ) تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم! وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہے گا کہ ایک قطرہ سے ایسے حسین جسم کا بنا، پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا، عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اب بتلائیے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہوا کرے تو پھر آپ کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا غلط ہے؟ بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا، ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا، کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلاف عقل اس لیے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی، ورنہ آپ بھی وہی کہتے جو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ خلاف عقل کا وقوع نہیں سکتا۔

## خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

تو معلوم ہوا کہ آپ خلاف عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہو جائے تو وہ خلاف عقل نہ ہیں، معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کے صحیح ہونے کے لیے خلاف عادت ہونا مضرت نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے، ورنہ پھر اس لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہیے، جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا۔



اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج کا عشاء وہ ہو رہا ہے، غلط کہنا چاہیے! جیسے ریل کا ایک گھنٹے میں 60 میل طے کرنا اور 5 منٹ میں لندن سے تار کے ذریعے سے خبر آ جانا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں، میں نے مرغی کا ایک بچہ دیکھا جس کے چار پیر تھے اور آج کل دہلی میں دیولڑکیاں جڑی ہوئی نمائش میں آئی تھیں، جن کے تمام اعضا، جدا جدا تھے، مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی، مگر پیشاب نکلتا ایک کے راستے سے تھا۔

تو بتلائیے! کیا خلاف عادت کے لیے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے؟ جس کے اوپر بناء کر کے بعض امور کو مانا جائے اور کسی کے متعلق یہ کہا جائے چونکہ یہ خلاف عادت ہے، اس لیے ہم نہیں مانتے! صاحبو! آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی خلاف عادت ہے، کیونکہ عادت کا متقاضی تو یہ ہے کہ ہر شے اپنی اپنی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ کبھی فنا نہ ہو، مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے، ہزار ہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں، معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے و مستلزم نہیں۔

### خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں میں فرق نہیں کرتے، حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے، سنئے! میں اس کا فرق بتلاتا ہوں، خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہو اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے، یعنی عقل کے استحصال پر دلیل قائم کر سکے اور استحصال کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو، تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے نقیضین کا ایک محل میں، ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آ جائے اب جو لوگ معادیات کو صراط کو اور وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل سمجھتے ہیں، وہ مہربانی کر کے ان کے استحصال پر دلیل قائم کریں اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیونکر لازم آتا ہے؟ یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحصال پر قائم نہیں کر سکتے، پس بہت سے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا؟ اس کی نظیر دکھلاؤ! پس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اس لیے یہ محال ہے اور جو دعویٰ امکان کا کرتا ہے، وہ اس کی نظیر دکھلائے! عجب اندھیرے ہے کہ نظیر پر ثبوت شے کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور

جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے، لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں، نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جو صنایع اور عجائبات اس زمانے میں ایجاد یا مشاہد ہوئے ہیں کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی؟ اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیونکر ہوا؟ معلوم ہوا کہ کسی شے کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں، تو خوب سمجھئے کہ کسی دعویٰ کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں، بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لیے ہوا کرتی ہے، مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں، خصوصاً ایسے مدعی کے ذمے جو کسی امر کا ثبوت یہ کہہ کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور مجزہ کے واقع ہو، یا قیامت میں خلاف عادت یوں ہوگا، اس کے ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو اپنے دعویٰ میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعا بے نظیری کی صفت کے ساتھ متصف ہے، اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی وجہ میں لازم بھی ہو سکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہو سکتا ہے جو اپنے دعویٰ کو موافق عادت بتلائے! اور جو فرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجیب ہے.....!!

## لوگوں کا موجودہ فرق

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں، جس کے نہ ماننے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے، شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے، اس لیے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں، چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے، وہ اس کو جانتے ہیں کہ مدعی اگر نظیر بیان کر دے تو یہ اس کا تبرع ہے، بلکہ ثبوت خبر کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک خبر یہ کہ ممکن ہونا، دوسرے خبر کا صادق ہونا، پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے، ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں، دوسرے خبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہو، ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

## دینی امور کی دلیل

اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہے، یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے، اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی

ضرورت نہیں ہے، کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی، بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا یہی امکان کی دلیل ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو کہ محل واحد میں آن و عدم میں، جہت واحدہ سے ہو، تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے؟

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی خبر کوئی مخرض صادق دے وہ ثابت ہے اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر مخرض صادق نے دی ہے، پس یہ امور واقع و ثابت ہیں، ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے، باقی نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں۔

### پل صراط پر چلنا

مثلاً اگر کوئی کہے کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے، سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں گا کہ بتلاؤ! کیوں سمجھ میں نہیں آتا؟ اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چہر پر بیر آجائے؟ جب یہ محال نہیں اور مخرض صادق اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ؟ اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے، یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ مخرض صادق کی خبر نہیں، تو ہم دلیل امتناع سننے کے لیے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تو تب بھی نہ بتلاؤ گے، کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں کہ ہم اپنی سب معلومات آپ کو بتلاویں، ہاں! اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے، تو جب ثابت کر دو گے، اس وقت دیکھا جائے گا، بدون اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے، یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے، کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے، عوام سمجھے کہ یہ بھی عجیب کے ذمہ ہے تو اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات اور معادیات میں برابر چل سکتی ہے اور جو دلیلیں آج کل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے، وہ مطرد نہیں ہیں۔

### کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں

اب میں عقلاً یہ بات ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں، تقریر اس کی یہ ہے

کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے، میں پوچھتا ہوں کہ اس کے لیے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں؟ وہی ہذا، اگر ہر نظیر کے لیے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسلِ مستحیل لازم آئے گا اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر جا کر ٹھہرے گا کہ اس نظیر کے لیے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہو گیا، تو پہلے ہی کے لیے نظیر کی کیوں ضرورت ہے؟ اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے؟ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمے نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے، ہاں! اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جائے اور تسلیم کر لے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں، اس وقت اگر مجیب تقریبِ فہم کے لیے کوئی نظیر دے دے تو اس کا احسان ہے اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعویٰ کو موقوف بتلاتا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس توقف علی النظر کی دلیل مانگے۔

### پل صراط کیا ہے؟

چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔ اول پل صراط کی حقیقت سمجھئے! مگر یہ کہہ دینا ہوں کہ یہ مضمون نفی ہے، اس طور پر پل صراط کو سمجھنا واجب نہیں، اصل تو یہی ہے کہ آدمی جملہ پختہ عقیدہ رکھے، باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں، ان کے لیے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں، اگر وہ اس طرح بھی پل صراط کو سمجھ لیں تو حرج کچھ نہیں، مگر لازم بھی نہیں، لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے، اس تشبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو! جس کے لیے اول یہ مقدمہ سنو! کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے، مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لیے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے، کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے، پس دوسرا عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔

### دنیا میں اختلاف حالات

دوسرا مقدمہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریبِ فہم کے لیے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں، جیسے اقالیم کے بدلنے

سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں، مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے، یہاں آج کل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے۔ وہی ہذا چوبیس گھنٹے کا دن رات ہے اور بعض اقلیم میں چھ مہینے کی رات ہے اور یہیں سے معلوم ہوگا کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ ان کی حماقت ہے، اس میں استبعاد کیا ہے؟ جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے، تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے.....؟؟

تیسرے مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں، نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے، یہ مقدمہ بد بھی ہے محتاج دلیل نہیں اور جو شخص کسی حد پر انتہاء اختلاف کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو مستنبح کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے۔

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جا کر جو ہر ہو جائے اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے، یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شے واحد عرض و جو ہر نہیں ہو سکتی، مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جو ہر ہو جائے، اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں، اگر کسی کے پاس دلیل ہو، پیش کرے اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقلولہ کیف سے سمجھتے تھے، جن کے لیے وزن اور مقدار نہیں ہو سکتی، مگر اس زمانہ میں ان کے لیے وزن ہونا ثابت ہو گیا، اس لیے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں، سب معادیات کے سمجھنے کے لیے معین و ممد ہیں، چنانچہ ”گراموفون“ ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے، کیونکہ ”گراموفون“ میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب؟ جن میں حیات کا تلبس ہے!!

## ایک حدیث کی تشریح

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوة کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ جنت و دوزخ تو آسمان وزمین سے بڑی بتلائی جاتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیوار پر کیونکر دیکھا کیا؟ اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا؟ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کر کے اس استبعاد کو دور کر لیا، فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھونا کر کے دیکھا جاسکتا ہے اور خورد

بین میں چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جاسکتی ہے، تو خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو سجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو؟ جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلی حالت پر نظر آگئی ہو اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے "أملت لى الجنة والنار" یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین پر اترا آئی تھیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ وہ میرے لیے مشکل ہو گئیں، اسی لیے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں کیونکہ ان سے شریعت کا استیجاد دور ہوتا جاتا ہے، چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آج کل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا ہے کہ اس مکان میں کس قدر وزن کی حرارت موجود ہے؟ اور کس درجہ کی برودت ہے؟ اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے، اب اگر کسی گنوار سے کہیے کہ گرمی بھی ملتی ہے تو اس کو کتنا تعجب ہوگا.....!!

تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے ماہ الوزن کے انخفاض اور ارتفاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جو ہر سے ہے، تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جو ہری بن جائے تو کیا تعجب ہے؟ اور لیجئے! اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی طرح گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا، آخر کی بیشی کیوں؟ پانی کی مقدار دونوں حالتوں میں یکساں تھی، معلوم ہوا کہ برودت و حرارت کا بھی کچھ وزن ہے، اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے، مگر بشرط برودت و حرارت کے آخر ان کے وزن میں دخل تو ہو، تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جائے کہ یہ عرض جو ہر بن جائے تو کیا تعجب ہے۔

اور سنئے! اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے، دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی، یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جو ہر ہے، پس اس عالم میں عرض کا جو ہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔

اب پل صراط کی حقیقت سمجھئے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ مسلمانوں کا مذاق تو یہ ہونا چاہیے۔

حدیث مطرب دے گو دراز دہر کم تر جو

کہ کس نہ کسود نہ کشاید یہ حکمت این معمار

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں، میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان

کر چکا ہوں، مگر اس میں خط نہ آیا تھا، اس لیے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے۔

## شریعت پر عمل

تو سنئے! اہل صراط کی حقیقت شریعت ہے ”کما قال اصحاب الکشف من العرفاء“ پس دنیا میں اہل صراط کی نظیر شریعت موجود ہے، اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرش ہے اور وہاں جا کر جوہر بن جائے گی، باقی ان تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے، جیسے وہ بال سے باریک اور تلواریں سے تیز ہے، جس پر چلنا دشوار ہے، اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے، جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا کام نہیں کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے، تو اس پر چلنے کے لیے دو قوتوں کی ضرورت ہے، ایک قوت علمیہ کی، دوسری قوت عملیہ کی، قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ سے، پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضرت تو اس میں کہیں تو جبل منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں، تو شریعت پر چلنے کے لیے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی، قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ، یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں، افراط، تفریط اور توسط اور شریعت نام ہے توسط کا، شریعت میں افراط عقل سے کام نہیں چلتا، نہ تفریط سے کام چلتا ہے، بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کا نام جزیہ ہے، یہ نہایت مضرت ہے، جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے، جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ ”الادریہ“ مشہور ہے کہ وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے، بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بد صورت سمجھتے ہیں، بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے، اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے، کوئی غلط، تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنیہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے تو یہ اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین سمجھتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں ممکن ہے، ہماری نظر نے غلطی کی ہو۔

بس ان کا یہ حال ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے ”فہو شک و شک فی انہ شک“۔

## عقل کی مثال

تو حضرت! یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی کہ انہوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے آگے نکل جانا منفر ہے۔

میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لیے اب تین قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ تو جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے اور پھر پہاڑ پر بھی اس پر سوار ہو کر چڑھنے لگے یہ غلطی پر ہیں، ضرور کسی سیدھی اور چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ گھری سے بیدل چڑھے، نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہنچ کر تھک گئے، یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی، پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا کہ اخیر تک اسی سے راستے طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بے کار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا، صحیح بات یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لیے بیکار ہے، اس کے لیے کسی اور سواری کی ضرورت ہے، یہی عقل کا حال ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔

پس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور ”کلام اللہ“ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو، اس سے آگے فروغ میں عقل سے کام نہ لینا چاہیے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہیے، ان کی حکمت عقل میں آئے یا نہ آئے۔

## قانون سلطنت کیوں مانتے ہیں؟

دیکھئے! قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ ”جارج پنجم“ بادشاہ ہے، اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں، اس لیے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص ”جارج پنجم“ کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا، تو بتلائیے! اس شخص کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور عقلاء کہیں گے جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت ہونا معلوم تو پھر



انکار کی کیا وجہ؟ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پچنانے کے لیے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے، اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں، پھر کیا وجہ کہ دین کے معاملہ میں اخیر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں؟ یہ سخت غلطی ہے، جس سے جبر ذات کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، جب خدا کا خدا ہونا مسلم، رسول کا رسول ہونا مسلم، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم، پھر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے؟ اور ہر شخص آپ کو بیوقوف بنائے گا اور تمام عقائد کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے سچ یہ ہے:

عزیزے کہ از در گمش سر بناخت  
بہر در کہ شد تیغ عزت نیافت

کہیں عقل کو چھوڑنا بھی چاہیے

غرض عقل سے اس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے، جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو تو عقل کی بھی ایک حد ہوتی اور کیوں نہ ہو؟ وہ بھی تو ایک قوت ہے، جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے، اس سے آگے دو در بین لگانے کی ضرورت ہے، ایسے شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تمباہیکار ہے، بلکہ دو در بین وحی سے کام لینا ضروری ہے، ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے، جس کے لیے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے، پیروں کی ایک قوت ہے، جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

تو جب ہر وقت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی، اس سے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر راستہ نہ ملے گا، کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں، وہاں تو اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت ہے۔

خلاف بیہبر کسے رہ گزید!

کہ ہرگز بمنزل نخواستہ رسید!

صاحبو! دنیا میں بھی آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں دیکھئے! جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجودین میں سے کون زیادہ حافظ و تجربہ کار ہے اور جب ایک طبیب کا حافظ ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے، پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی؟ اور فلاں کیوں نہیں لکھی؟ اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا؟ چھ ماشہ کیوں نہ لکھا؟ ہم

نے کسی کو طیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا اور اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو عقلاء اس کو بیوقوف بتاتے ہیں اور طیب بھی صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طیب سمجھ کر آئے ہو تو جو سننے میں تجویز کروں، اس میں تم کو چون و چرا کا کوئی حق نہیں اور اگر چون و چرا کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھ کو طیب نہیں سمجھتے، پھر میرے پاس کیوں آئے تھے؟ اور اس کے اس جواب کو تمام عقلاء صحیح کہتے ہیں پھر حیرت ہے کہ رسول کو رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جائے اور بات بات میں الجھا جائے کہ یہ خلاف عقل ہے، ہم اسے کیونکر مان لیں؟

### رسول ماننے کا حاصل

صاحبو! اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو ہر بات کو بلا چون و چرا مان لینا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آئی ورنہ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم نے اب تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا، افسوس! دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طیب کو طیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جائے اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو.....!!

### عقل کو چھوڑنا پڑتا ہے

صاحبو! جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے تو عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلا چون و چرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیونکر چلے گا؟ کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھی ہیں، ان میں کسی قدر عقل چل بھی سکتی ہے، پھر بھی ان کو چھوڑ کر کاملین و ماہرین کی تقلید کی جاتی ہے اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں، وہاں بدون تقلید جی کے کیسے کام چلے گا؟ اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہوگی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی میزھی کھیر ہے، شان درود اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لیے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا، پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے؟ کہا: سفید ہوتی ہے! حافظ جی نے سیاہ و سفید میں کیوں فرق کیا تھا؟ ان کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی، نہ سیاہ، کیونکہ آنکھیں ہی نہ تھیں، تو آپ پوچھتے ہیں سفید کیسا ہوتا ہے؟ اس نے کہا: جیسے بگلا! حافظ جی نے پوچھا: ”بگلا کیسا ہوتا ہے؟“ لڑکے نے ہاتھ کو ح کی طرح موڑ کر کہا کہ ایسا ہوتا ہے؟ حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا، تو کہنے لگے بھائی! یہ تو بڑی میزھی کھیر ہے، میرے گلے میں کیونکر اترے گی؟

تو دیکھئے! جو چیز آنکھ سے نہ دیکھی ہو اس میں عقل سے کام لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی سے خیر کا کام کیا سے کیا بن گیا؟ جس میں چبانے اور نکلنے کی بھی مشقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسے لگی۔

## محض عقل کافی نہیں

تو واقعی اندھے کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے؟ اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق میں رہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں، بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سواٹکے کی تقلید کر لی جائے۔

اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے کبھی آم نہ کھایا ہو، آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو کیا وہ سمجھ جائے گا؟ ہرگز نہیں

! تم کہوں گے کہ آم بیٹھا ہوتا ہے، وہ کھلے گا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں، بس آم ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

صاحب! اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آم لا کر اسے کھلا دو اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہیے اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں، اسی طرح امور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو، مرنے کے بعد صراط اور وزن اعمال وغیرہ کی سب حقیقت سامنے آ جائے گی اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہیں ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن اور رسول نے جو کہہ دیا ہے اس کی تقلید کرو اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو، مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے، جیسے حافظ نے کھیر کو میڑھا بتلایا تھا۔

بس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے، جس سے بڑھ جانا مضر ہے اطباء نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے اور امراض میں شمار کیا ہے، کیونکہ افراط عقل کا نتیجہ اوہام و شلوک میں مبتلا ہے، جس سے قلب و دماغ دونوں ضعیف ہو جاتے ہیں، فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوہ پیچتا پھرتا تھا، اس سے پوچھا ”کیف تبیع الحلوہ؟“ تو حلوہ کس طرح پیچتا ہے، اس نے جواب دیا ”کذا بدانق“ کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں، تو آپ کہتے ہیں ”استلک من الکفیفة و نحبینی عن الکمیة“ میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کیت سے جواب دیتا ہے، آپ حلوائی سے الجھ گئے، اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اسی کے چکر میں رہے۔

## افراط عقل کا نتیجہ

چنانچہ افراط عقل کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہو گئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا، مگر کہنے لگے کہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں، ہم کو نبی کی ضرورت نہیں ”نحن ہذبنا نفوسنا بالحکمة“ ہم نے تو اپنے آپ کو حکمت سے مہذب بنا لیا ہے، حق تعالیٰ ایسے لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں: ”فرحوا بما عندہم من العلم“ یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہو گئے اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں چنانچہ الہیات میں فلاسفہ نے جو تحقیقات بیان کی ہیں، ان میں اتنی ٹھوکریں کھائیں ہیں کہ آج مسلمانوں کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے، یہ تو افراط فی العقل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی اس کو حماقت کہتے ہیں، شریعت میں دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں، بلکہ مطلوب تو وسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں۔

## قوت شہوانیہ

دوسری قوت شہویہ ہے، اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کا نام فحور ہے، شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں، کیونکہ اس کا انجام فسق ہے اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو، یہ بھی مطلوب نہیں، کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور اولوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتے ہیں جو بڑا نقص ہے اور ایک ہے تو وسط جس کا نام عفت ہے، یہ مطلوب ہے۔

## قوت غضبیہ

تیسری چیز قوت غضبیہ ہے، اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کو تہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھلانے لگے، جیسا آج کل ہو رہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے ہیں، یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہوگا یا نقصان؟ یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں اور ایک ہے تفریط جس کو صین اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جائے جیسے بعض لوگ ایسے ڈر پوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے، یہ بھی مطلوب نہیں اور ایک درجہ تو وسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے، یہ مطلوب ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر

جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا نطن غالب ہو اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نقصان کچھ امید نہیں، محض نقصان ہی نقصان ہے۔

### اخلاق پسندیدہ

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں۔ حکمت، عفت، شجاعت اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے اور قرآن میں فرمایا ہے: ”وَ تَحْتِهَا لَئِكَ جَعَلْنَا لَكُمْ اٰمَةً وَ نَسَطًا“ اس سے بھی عدل مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسی شریعت دے کر جو کہ سراپا عدل ہے، امت وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔ ایک مقدمہ اور سن لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وسط حقیقی، ایک وسط عرفی، وسط حقیقی وہ خط ہے جو بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا اور ایک وسط عرفی ہے، جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں، کیونکہ وہ تو منقسم ہے، اس کے اندر بھی ایک جزا میں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے، پھر وہ وسط حقیقی کہاں ہوا؟ حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بائیں کچھ نہ نکل سکے، سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔

پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے، جس میں افراط و تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو، بلکہ عین تواضع ہو، یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے اور یہی کمال ہے اور اوپر معلوم ہو چکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے، چنانچہ جس اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے اس میں افراط و تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا، نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

### شریعت کی نزاکت

پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجھ منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی کیونکہ بال بھی منقسم ہے اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے، پس قیامت میں روح شریعت یعنی وسط حقیقی جو ہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا، جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جائے گا، پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت کے ساتھ چلا ہوگا، وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا، کیونکہ وہ بھی تو شریعت ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلایا کم چلا ہے، وہ پل صراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا۔

لیجئے! میں نے آپ کو پل صراط کی سیر بھی دکھلا دی، اب تو کوئی اشکال نہیں رہا اسی طرح ہمارے

پاس تمام شریعات کے عقلی نظائر موجود ہیں، یہ نہ سمجھئے کہ پل صراطِ ہی کی خصوصیت ہے، لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے، ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ:

ما قصہ سکندر و دارا نخواستہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا پھر

باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لیے بیان کر دی تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آجائے کہ علم شریعت کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں، جس سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے، تاکہ آپ علمائے اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں، بجز اللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت ہے لیکن:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(تفصیل الدین صفحہ: ۵۳۲۳۵)

تیسواں اعتراض..... اس رائے کا جواب کہ مولوی سب باہم متفق

ہو جائیں تو سارا باہمی نزاع دور ہو جائے!

واقعی یہ ایک قیمتی رائے ہے، مگر اس میں ایک دھوکا ان صاحبوں کو ہو رہا ہے جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں، مگر اول اس کی ایک نظر پیش کرتا ہوں، کیونکہ آج کل بدوں اس کے لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔

اس وقت یہ بات سب کو مسلم ہے کہ اہل یورپ آج کل سب سے زیادہ متمدن ہیں، بالخصوص انگریز، دنیاوی امور میں ان کی عقل و فہم سب سے زیادہ جت کھتی جاتی ہے، ان کا ایک قانون ہے کہ جب کوئی عدالت میں جا کر نالش کرے تو حاکم کو اس کی تنقیح کرنی چاہیے، شہادت اور ثبوت طلب کرے اور وکلاء طرفین میں گفتگو ہو اور اخیر تک حاکم سب کی گفتگو سنتا رہے، پھر اپنی رائے کے موافق کسی ایک کو ترجیح دے کر ڈگری دیتا ہے اور اس درمیان میں ظاہر ہے کہ ہر ایک دیکھ اپنے موکل کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور طرفین میں اچھی طرح مباحثہ ہوتا ہے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کوئی تعلیم یافتہ اس طریقہ تنقیح میں اس حاکم کو ظالم کہے گا؟ ہرگز نہیں! بلکہ ہر ایک شخص اس کو عدل کے موافق سمجھتا ہے، پس اگر نہ اتفاقی بری چیز ہے تو ان وکلاء طرفین کو

کیوں نہیں ملامت کی جاتی؟ اور سب سے زیادہ اس حاکم کو ملامت کرنی چاہیے، اللہ نے اپنی کچھری میں نزاع اور بحث قائم ہونے دی اور اسی پر اپنے فیصلہ کی بنیاد ڈالی، مگر جب اس مناظرے کو قابل ملامت نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس کو عین عدل کہا جاتا ہے تو اس سے یہ بات معلوم ہوگی کہ مناظرے اور نا اتفاقی مطلقاً بری نہیں، بلکہ طریقہ یہ ہے کہ اول معاملہ کی تفتیح کی جاتی ہے اور نقل تفتیح کے دونوں میں سے کسی کو ملامت نہیں کی جاسکتی اور تفتیح کے بعد جو حق پر معلوم ہو اس کا ساتھ دو اور جو ناحق پر ہو اس کو ملامت کر دو، یہ کیا کہ دونوں کو ملامت کی جاتی ہے اور دونوں کو اس اختلاف چھوڑنے اور اتفاق کیلئے کی ترغیب دی جاتی ہے، ہر معاملہ میں ایسا اتفاق ممکن نہیں ہوا کرتا، اگر حاکم بھی ایسا کرے کہ دونوں فریق کو ملامت کرنے لگے، تو کیسے ہو؟ مگر دنیاوی معاملات میں یہ نو تعلیم یافتہ بھی اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے اور ہمیشہ ایک فریق کا جو حق پر معلوم ہو ساتھ دیا کرتے ہیں، پھر دین کے بارے میں یہ قاعدہ کیوں نہیں برتا جاتا؟ اس سے ایک راز معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے دلوں میں دین کی وقعت و عظمت کوئی چیز نہیں، اس لیے اس کی کچھ فکر بھی نہیں۔

### اختلاف کی وجہ

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر حاکم کے برابر بھی ان کے نزدیک مذہب کی ضرورت ہوتی تو یہ ہمیشہ صاحب حق کی مدد کرتے، یہ کیا کہ زید کو بھی ملامت، عمر کو بھی ملامت، اس کو اتفاق کی ترغیب، اس کو بھی، آخر کس بات میں دونوں متفق ہوں؟ کس بات کو قبول کریں؟ اگر کوئی ایسی بات ہو جس میں اتفاق ہو سکے تو خیر جب اعتقاد کا اختلاف ہے، ایک فریق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی سمجھتا ہے، دوسرا فریق ایسا نہیں سمجھتا۔ ایک فریق حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو فقیہ مجتہد سمجھتا ہے اور دوسرا ان کو مخالف خدا اور رسول جانتا ہے تو اب بتلاؤ کہ اتفاق کی کیا صورت ہے؟ دونوں کے عقائد میں تضاد ہے، اب سو اس کے کہ ایک فریق اپنا عقیدہ بدلے، اس کے سوا کوئی صورت اتفاق کی نہیں، اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہ کر اتفاق ہرگز متصور نہیں، البتہ اگر مذہب و عقیدہ کوئی ضروری چیز نہ ہو تو پھر واقع ہو سکتا ہے، مگر اس کو جو ان نو تعلیم یافتہ حضرات کے کوئی عاقل بھی تسلیم نہیں کر سکتا اور زبان سے تو یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگرچہ دلوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

دوسرے اس طریقہ پر دنیاوی امور میں بھی عمل نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک شخص نے مجلس میں ایک بات نکالی تو اس میں بھی دو چار اختلاف کرنے والے ہو جائیں گے، اب اگر دونوں فریق کو ملامت کی جائے اور اتفاق کو ترغیب دی جائے تو سو قیامتیں آجائیں گی، مگر اتفاق ناممکن ہوگا۔ پس آپ کا طریقہ تو ایسا ناممکن ہے کہ دین میں کارآمد اور نہ دنیا میں، اب میں بتلاتا ہوں کہ

اتفاق کیونکر ہو؟ پہلے آپ خود تحقیق کیجئے کہ صورت معاملہ کیا ہے؟ پھر جو حق بجانب ہو اس کا ساتھ دیجئے اور دوسرے کو ملامت کیجئے اور پہلے کا تابع نہ بنائیے یہ جو دونوں کو ملامت کی جاتی ہے، سخت غلطی ہے۔

اس زمانہ کے نوجوانوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ اتفاق کو محدود اور اختلاف کو مذموم سمجھ کر علماء کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپس میں اتفاق کر لو، پس ان کی اتنی بات تو قابل تسلیم ہے کہ نزاع و اختلاف واقعی بری چیز ہے، اس کے زائل کرنے کا جو طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کو ملامت کر کے اتفاق کی دونوں کی ترغیب دی جاتی ہے، یہ بالکل سراسر عقل کے اور فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ صاحب باطل کچھ صاحب حق کا اتباع کرے اور صاحب حق کچھ صاحب باطل کا اتباع کرے کہ پہلے ایک فریق جو خالص حق پر تھا تو اب وہ بھی باطل کا پیرو ہو جائے، اس کو فطرت انسانیہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

عجب بات ہے کہ یہ لوگ خلاف فطرت کی تعلیم کو ہمیشہ ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں اور سب سے زیادہ مدعی فطرت ہیں، مگر دین میں نہ معلوم وہ فطرت کیا ہو جاتی ہے جو خود خلاف فطرت کی تعلیم دیتے ہیں۔  
(وحدة الحب صفحہ ۸۲)

## اکتیسواں اعتراض..... مرد و عورت میں مساوات اور اس کا فیصلہ

آج کل کے نوجوانوں کا یہ دعویٰ مساوات محض زبان سے ہی ہے، عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے، ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا کہ وہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے، مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں، ایسے لوگوں کی تقلید پابند مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے؟ پھر اس کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر نہ کی کہ اس مساوات کا اثر ان کے حق میں مفید ہوا یا مضر؟ غرض بالکل کورانہ تقلید کر کے مساوات نساء کے قائل ہونے لگے۔

جب خدا ہی نے عورت کو تشریحا و تکوینا محکوم بنایا ہے، تو اس کو برابر کون کر سکتا ہے؟ کیونکہ خدا کا عورتوں کو محکوم بنانا جیسا کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے، دلیل عقلی سے بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس بات پر سارا عالم متفق ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں۔

بہت سی باتوں میں اس کا کسی کو انکار نہیں اور جس بات پر ساری دنیا کا اجماع ہو وہ عینی تقاضا اور فطری قانون ہوتا ہے، عقلی دلیل کے علاوہ حسی دلیل بھی اس بات پر قائم ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں۔



## مرد و عورت کی خلقت میں فرق

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ خدا نے عورت و مرد کی خلقت میں کتنا فرق رکھا ہے؟ مرد جسمانی قوت میں عورت سے زیادہ ہوتا ہے، عقل مرد کی زیادہ ہوتی ہے، آواز مرد کی بلند ہی ہوتی ہے، مرد عورت سے رائے میں زیادہ پختہ ہوتا ہے اور عورت کو دیکھا جائے تو اس کی ہر چیز مرد سے کم نظر آتی ہے، ظاہری اعضاء کی بناوٹ میں بھی اور عقل و رائے میں بھی۔

قرآن میں حق تعالیٰ کفار کی خرابی عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”أَمْ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُمْ بِالْبَنِينَ“

یعنی کیا خدا تعالیٰ نے اپنے لیے مخلوقات میں سے لڑکیاں تجویز کی ہیں اور تم کو لڑکوں کے ساتھ منتخب کیا ہے؟

پھر فرماتے ہیں:

”أَوْ مَنْ يَتَّخِذُ فِي الْحُلِيِّهِ وَهُوَ فِي الْحِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ“

کہ خدا تعالیٰ کے لیے تجویز بھی کیس تو لڑکیاں جو ابتدا سے زیور اور گہنے میں پرورش پاتی ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ قوت بیانیہ میں نہایت ضعیف ہیں، یہ دو باتیں عورتوں میں نقص کی ایسی ہیں کہ آنکھوں سے دیکھ لو، واقعی لڑکیوں میں ابتداء سے ہی زیور کا شوق ہوتا ہے اور یہ دلیل ہے، ان کی محدودیت فطری، چنانچہ خود مردوں ہی میں دیکھ لو جس کو زینت کا شوق ہوگا، اس کے خیالات پست اور محدود ہوں گے اور جو سادہ ہوگا اس کے خیالات عالی ہوں گے اور اس کا راز یہ ہے کہ لباس و نمبرہ ضرورت کی چیزیں ہیں اصل مقصود نہیں، اب سمجھ لیجئے کہ ضرورت کی چیزوں سے کتنا تعلق ہونا چاہیے؟ سو ظاہر ہے کہ ہر عاقل ضرورت کی چیزوں سے ابتدا ضرورت تعلق رکھے گا اور زیادہ کوشش اصل مقصود میں کرے گا، وہ شخص نہایت پست خیال ہے جو غیر مقصود چیزوں کی دھن میں لگا رہتا ہو، پس لڑکیوں کو زیور اور زینت سے رغبت ہونا ان کے پستی خیالات کی دلیل ہے، مرد اکثر سادے ہوتے ہیں، ہاں! جن مردوں میں زینت پن غالب ہو یہاں ان کا ذکر نہیں۔

## تعلیم یافتوں کا حال

تعلیم یافتہ تو مومن کو بھی دیکھ لیجئے! تجربہ کار لوگوں کا بیان ہے کہ ان کی عورتیں باوجود تعلیم حاصل کر لینے کے پھر بھی مردوں سے بہت کم ہیں، ایک شخص کہتے تھے کہ اگر ان میں کسی عورت کو کچھ بیان کی ضرورت پڑ جاتی ہے، تو وہ چند جملے کہہ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ مردوں کی طرح اس کی گفتگو

میں کبھی وسعت نہیں ہوتی، تو یورپ کی عورتیں بھی لیاقت علمی میں مردوں کے برابر ہرگز نہیں۔  
دوسری بات ہے کہ وہ دستکاری میں باکسی خاص سلیقے میں برابر یا زیادہ ہوں۔

غرض جس کو قدرت نے محکم بنایا ہو اس کو مساوی کون کر سکتا ہے؟ اور یہ حکومت عورتوں کے لیے خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے (اور یہ اس لیے کہا گیا تا کہ عورتیں اس تقریر کو سن کر دل گیر نہ ہوں) نعمت اس لیے ہے کہ اگر دنیا میں سب برابر درجے کے ہوتے تو انتظام قائم نہ رہ سکتا، تو یہ ضروری بات تھی کہ ایک گھٹا ہوا اور دوسرا بڑھا ہوا ہو، اگر سارے حاکم ہی ہوتے تو کاشتکاری کون کرتا؟ عمارت کون بناتا؟ آنا کون پیتا؟

### انتظام کا تقاضا

غرض دنیا کا انتظام اس کو چاہتا ہے کہ سب ایک درجے کے نہ ہوں، بلکہ ایک بادشاہ ہو، ایک وزیر، کوئی حاکم، کوئی رعیت، کوئی تاجر، کوئی مزدور یہ فرق مراتب ضروری تھا، ہاں! اس فرق مراتب کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ عورتیں پڑھی ہوئی ہوتیں، وہ گھٹے ہوتے، مگر چونکہ ان کی عقل درائے ضعیف ہے، اس لیے تمدن خراب ہو جاتا ہے، وہ خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں، دوسروں پر حاکم بن کر نگہبانی تو کیا کرتیں؟ یہ توف کے لیے یہی مصلحت ہے کہ کسی کے تابع ہو کر رہے، اگر کسی بیوقوف کو حاکم بنا دیا جائے تو دیکھو انجام کیا ہوگا؟ خود بھی ہلاک ہوگا، دوسروں کو بھی تباہ کرے گا، اگر چھوٹے بچے کو ماں باپ کا تابع نہ کیا جائے تو وہ یقیناً ہلاک ہوگا، کیونکہ اس کو اپنے نفع اور ضرر کی کچھ خبر نہیں۔

تو بیوقوف کے لیے کسی کا ماتحت ہونا بھی مصلحت ہے تاکہ دوسرا اس کو روک ٹوک کر سکے اور یہی راز ہے اس حدیث کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ وہ تو م کبھی فلاح نہ پائے گی جس کی حاکم عورت ہو، کسریٰ شاہ فارس کی بیٹی جب بادشاہ ہوئی تھی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

### عورتوں کو حاکم بنانا

یہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل ہماری خرابی و خستگی کا باعث ایک یہ امر بھی ہے کہ ہم نے عورتوں کو اپنے گھر کا حاکم بنا دیا ہے، اگرچہ یہ چھوٹی سی حکومت ہے، مگر اس کا نتیجہ بھی خراب ہی ہے، مثلاً شادی بیاہ کی ساری رسمیں عورتوں ہی کی خواہش سے پوری کی جاتی ہیں، جس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے؟ کس قدر خاندان ان رسوم شادی میں تباہ ہو گئے! یہ سارا فساد عورتوں کے

حاکم بنانے کا ہے، عورتوں کی دل جوئی کرنا ضروری ہے، مگر ان کے تابع بننا برا ہے، اس وقت سارا مال و اولاد عورتوں کے قبضہ میں ہم نے کر دیا ہے، پھر دیکھ لیجئے روپیہ کیسے بیجا مواقع میں صرف ہوتا ہے؟ اور بچوں کی صحت خراب اور اخلاق تباہ ہو رہے ہیں، عورتیں بچوں کو جو چاہیں کھلا دیتی ہیں، جس سے ان کی زندگی بیماری میں گنتی ہے، محبت و پیار حد سے زیادہ کرتی ہیں، جس سے لڑکے شوخ ہو جاتے ہیں۔

تو اپنے مال و اولاد کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہیے، عورتوں کو حاکم کر دینا سخت باعث منزل ہے، جس کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے فرما گئے ہیں۔

اس حدیث میں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض متقدم قوموں میں عورتیں حاکم ہوتی ہیں اور بعض جگہ اب بھی ہیں اور پھر ان کو ترقی ہے، اول تو مال و مادیات کی ترقی فلاح نہیں، فلاح تو ہی کی اصل ترقی اخلاقی و علمی و روحانی ہے، تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جن قوموں میں عورت بادشاہ ہے، ان کو یہ ترقی نصیب ہوئی اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کی ترقی حقیقی ترقی ہے، تو ہم کہیں گے کہ یہ اس کا اثر ہے کہ ان میں عورتیں خود مختار حاکم نہیں، محض ضابطہ کی حاکم ہیں، اصل بادشاہ پارلیمنٹ ہے، تو ایسی حکومت کوئی حکومت نہیں، نام کی بادشاہت ہے، اس سے مضمون حدیث پر غبار بالکل نہیں آسکتا، میں نے اس حدیث کو اس وقت اسی لیے پڑھ دیا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت جو ہم نے گھر باہر کا حاکم عورتوں کو بنا رکھا ہے، اس کو بھی ہماری پستی اور تنزلی میں دخل ہے اور آج کل ہم پر یہ ایسی تباہی آرہی ہے کہ بجائے متبوع بننے کے عورتوں کے بالکل تابع ہو گئے اور غضب یہ ہے کہ عذر کے موقع میں کہا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں؟ عورتیں نہیں مانتیں! سو یہ کہنا کتنی کم ہمتی کی بات ہے! اگرچہ یہ بھی ایک بہانہ ہے جس بات کو ان کا خود جی چاہتا ہے اس میں عورتوں کے کہنے سے مجبور ہو جاتے ہیں، ورنہ جس بات کو ان کا جی نہ چاہے، مثلاً بعض لوگ اپنی عورتوں کو باپ کے گھر نہیں جانے دیتے، اس میں عورتیں لاکھ تقاضا کریں، کبھی نہیں مانتے، پس اول تو یہ عذر بالکل غلط ہے اور اگر سچ ہے تو اور بھی ہر اسے کہ مرد ہو کر بیوی کے غلام بن گئے۔

عرض عورت کے لیے یہی مصلحت ہے کہ مرد کے تابع ہو کر رہے اور شریعت نے بھی عورتوں کو محکوم ہی بنایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" یعنی مردوں کو عورتوں کا نگران بنایا گیا ہے۔

بتیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب ہو تو نا

جی کیوں نہیں؟

ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے، مگر ہمیشہ قانون کے خلاف عمل کرتا ہے، چوری بھی کرتا ہے جو ابھی کھیلتا ہے اور بد تہذیب بھی ہے، تو ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے، اس لیے اسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کے لیے مردود و نظر نہ ہوگا، بلکہ صرف اختتام سزائے معین تک اور اس کے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائے گا۔

برخلاف اس شخص کے جو کہ نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو، مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہ کرتا ہو تو اس کو بغاوت کی یہ سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا یا پھانسی دے دیا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے معتوب رہے گا۔

اے صاحبو! سمجھ لیجئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے اگرچہ نماز روزہ کرے اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لیے مردود بارگاہ ایزدی ہوگا اگر توبہ نہ کرے، برخلاف اس شخص کے جو نماز و روزہ کچھ نہیں کرتا اور ہر قسم کے معاصی میں مبتلا رہتا ہے، مگر عقائد اچھے ہوں تو اس کو وہی میعاد کی سزا خلاف قانون عمل کرنے کی ہوگی اگر توبہ نہ کرے، لیکن باغیوں میں شمار نہ ہوگا اور اختتام سزاکے بعد پھر وہی حق تعالیٰ کی محبوب رعایا یعنی جنتیوں میں داخل ہو جائے گا۔

غیر مسلم کے ناجی نہ ہونے کی وجہ

مگر یہاں پر بعض شبہ کیا کرتے ہیں کہ جب کسی غیر مسلم میں اخلاق و اعمال شائستہ ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ ناجی نہیں!

میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ پر بھی اعتراض کیا ہوتا کہ کیا وجہ ہے کہ جب ایک باغی مہذب ہے، بقیہ جرائم قانونی سے بھی محفوظ ہے، پھر کیوں اس کو سزا ہوئی ہے؟ اس کے سزا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ

باقی ہے تو اس کے سارے کمالات قیج در قیج ہیں، پس اسلامی قانون بھی ایسا ہی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جتنے شبہے اسلام پر ہیں، اپنے معاملات میں غور کریں تو سب کا جواب اگلے آگے

کا، مگر غور کون کرے؟ دین تو آنکھوں میں کھلتا ہے.....!!

افسوس! کیسی آفت ہے؟ کیسا طوفان بے تمیزی برپا ہے؟ اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے

(الوقت - صفحہ ۱۴۹)

ہیں.....!!



## حصہ چہارم

پہلا اعتراض..... ڈارون کے اس کہنے کی تردید کہ اصل انسان بندر ہے!

کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک لٹھ ہے، وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلق موجود تھا اور پھر تحریک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی اور شمس وغیرہ بنا اور اس کے بعد پھر نباتات بنے، پھر حیوانات بنے، ان میں بندر بنا اور بندر کا ایک جسٹ کر کے انسان بن گیا، اسی طور پر وہ تمام حیوانات و نباتات میں اسی کا قائل ہے کہ ایک دوسرے سے نکلنے چلے آئے ہیں، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر شبہ کیا جاتا ہے اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے، یہی ایمان ہے.....؟؟ ڈارون تو صنایع کا قائل نہیں تھا، اس لیے ایسی بچیدار بیہودہ تاویلیں کرتا تھا، مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صنایع کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں، شاید کوئی یہاں یہ کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس لیے ہوتا ہے کہ حکماء کا مشاہدہ ہے اور اسی بناء پر ہم کو قرآن پر شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے؟ یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔

یہ مشاہدہ نہیں ہے

میں کہتا ہوں کہ آپ تو مشاہدہ کی حقیقت کو نہیں جانتے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہوگئی؟ پھر شمس و کوکب ہوئے، نباتات ہوگئی اور نباتات سے حیوانات اور حیوانات میں ایک خاص نوع بندر بھی تھی، پھر بندر کا ایک جسٹ کر کے انسان ہو گیا، یہ سب دھکوسلے ہیں، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان مقررین بالقرۃ کو بھی بندر

نہ بننے دیں، آدمی ہی بنا نہیں، یہی مشاہدات ان ہی دیکھ سولوں اور مہمل اور وہی باتوں کو مشاہدات قرار دے کر خدا اور رسول پر شہادت اور اپنے کو مسلمان کہتے ہیں.....!! افسوس کی بات ہے، کیا یہ مشاہدات ہیں کہ آفتاب کو سکون ہے؟ زمین کو حرکت ہے؟ خیر ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس کو سکون ہے اور کس کو حرکت؟ کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں، مگر سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے؟ دلیل کچھ بھی نہیں، مگر ہم کہیں گے کہ ”الشمس تجری“ چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے، اس لیے آفتاب کو ساکن محض مانتے گزرتے رہوں گے زمین کو چاہے ساکن نہ ماننے، متحرک محض ماننے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا۔

### زمین کی حرکت کا مسئلہ

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ: ”وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاقِيًا... الخ“ سے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے، پھر یہ کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں، جواب یہ ہے کہ اس سے نفی حرکت اضطرابیہ مراد ہے، غیر اضطرابیہ کی نفی مراد نہیں، غرض اس کی آپ کو اجازت ہے کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک مانیں، کچھ حرج نہیں، اسی طور اس کی خبر دی گئی ہے کہ آسمان موجود ہے یہ کون سے مشاہدہ کے خلاف ہے؟ گو اس نظام طلوع و غروب کے لیے سموات کی ضرورت نہ ہو لیکن نظام خاص میں ضرورت نہ ہونائی کی تو دلیل نہیں ہو سکتی، آسمان دوسری مستقل دلیل سے ثابت ہے، اس کی نفی کرنا جائز نہیں، یہ کس مشاہدہ سے ثابت ہے کہ آسمان نہیں ہے؟ بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر مان کر آسمان کی نفی کا ہمیں جواب سکھا دیا، کیونکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے، یہی آسمان ہے، پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا؟ ہم یہ کہیں گے کہ نظر اس لیے نہیں آتا کہ آپ نے اسی سقف نیلی کو حد نظر مان لیا ہے، پس جب یہ حد نظر ہے، تو آسمان اس کے آگے ہے اور چونکہ حد نظر کی یہاں تک انتہا ہو جاتی ہے، اس لیے آگے کچھ نظر نہیں آتا، اب آپ کو آسمان کی نفی کرنے کی بالکل گنجائش نہیں رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی تکذیب نہیں کرتے، بلکہ مشاہدہ کی بناء پر۔

### آفتاب کا طلوع و غروب ہونا

جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا اور قرآن مجید میں سکندر ذوالقربین کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کچھ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا، بھلا دیکھو! کتنا مشاہدہ کے خلاف ہے؟ آفتاب ایک جرم عظیم

ہے، زمین سے کتنا ہی حصہ بڑا ہے، کہیں زمین کی دلدل اور کچھڑ میں غروب ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آئے گا، یعنی قرآن مجید میں ”وَجَدَهَا... الخ“ وارو ہوا ہے، یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا، یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھڑ میں دھنس رہا ہے، یہ نہیں فرمایا: ”غربت فی حمئة“ جہاز پر سوار ہو کر دیکھنے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے اور اسی میں ڈوب رہا ہے، اسی طرح پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع و غروب کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا زمین میں ہی گھس گیا، پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا؟ اب فرمائیے! مشاہدہ سے کہاں تعرض ہے؟ کہیں بھی نہیں، پھر افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور قرآن اگر فیثا غورث کے قول کے مخالف ہو تو قرآن پر خلاف مشاہدہ کا شپ کرتے ہیں، فیثا غورث کے قول پر خلاف واقعہ ہونے کا شپ نہیں ہوتا، اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی، غرض یہ ہے کہ سنے مذاق میں یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ سائنس والے جو کہہ دیں اس پر تو ”آمنا و صدقنا“ قرآن پر شبہات۔

(الوقت صفحہ: ۱۲۷)

## دوسرا اعتراض..... آدمی علم دین پڑھ کر کم عقل نہیں ہوتا ہے!

فرمایا میں اکثر وعظ میں بیان کیا کرتا ہوں کہ فی زمانہ جو اہل علم کم عقل مشہور ہیں اور ان کو دیکھ کر علم دین پڑھانے میں یہ عذر کرتے ہیں کہ عربی پڑھ کر آدمی بیوقوف ہو جاتا ہے، یہ عذر کرنے والے ذرا غور تو کریں کہ یہ بیوقوفی انہیں کی نامعقول تجویز کا ثمرہ ہے، کسی چیز کے پڑھنے سے عقل نہیں بڑھا کرتی ہے، ہاں علم بڑھتا ہے، عقل ایک فطری شے ہے، اب اہل علم کے بیوقوف ہونے کی وجہ ذرا ملاحظہ فرمائیے! عادت یوں ہو گئی ہے کہ سب اولاد میں جو بیوقوف، گنہا، اندھا، لجا یعنی جس میں سب عیب ہوں اور جو کسی طرح انگریزی میں کام نہ دے سکے جس کو انگریزی والے کسی درجہ میں بھی نہ گھسنے دیں اس کے واسطے عربی تجویز کی جاتی ہے کہ اس کو ملنا بنائیں گے، اب وہ احمق نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ اور جو اولاد تیز ذہن کی ہے، وہ انگریزی کے واسطے چھٹی جاتی ہے، آپ ہی تو احمقوں اور بیوقوفوں کے لیے عربی تجویز کرتے ہیں اور آپ ہی کہتے ہیں کہ عربی پڑھ کر بیوقوف ہو گیا، یہ بیوقوفی انہیں نامعقول تجویزوں کا ثمرہ ہے اور اگر ایسا شخص مقتدائے دین ہو گیا تو طرح طرح کی خرابیوں کا اندیشہ اس سے ہے اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کسی نے اپنے تیز ذہن لڑکے کے واسطے ہی عربی تجویز



کی اور پھر بھی اس سے کوئی فساد نظر ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اول درجہ میں طماع ہیں وہ بھی بیوقوفی میں داخل ہے، کیونکہ طرح بھی تو حماقت ہے، بلکہ طمع رأس الحماقت ہے۔ پس عربی پڑھنے کے واسطے دو چیزیں اگر ہوں تو اس کا مزہ معلوم ہو، اول ذہن و ذکاوت، مقل کی تیزی، دوم سیر چشتی، استغناء پھر دیکھو اہل علم کیسے عقل مند ہوتے ہیں! انہیں بیوقوف کہنا اپنی حماقت کا اظہار ہے۔ (مقالات حکمت حصہ ۸ دعوات عبدیت مانوفا نمبر ۶)

تیسرا اعتراض..... قرآن پڑھنے سے فائدہ ہے اگرچہ معنی نہ سمجھتا ہو!

بات یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے میں جو فائدہ ہے اس سے لوگ واقف نہیں، اگر فائدہ سے واقف ہو جاتے ہیں تو اس کے لیے کوشش کرتے، جیسا کہ تجارت میں بڑی بڑی مشققتیں برداشت کرتے ہیں، کیونکہ اس کے نفع سے واقف ہیں کہ ایک روپے کے دو ہو جائیں گے۔ دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب کسی تجربہ کار سے معلوم کر لیا کہ فلاں چیز کی تجارت میں بہت نفع ہے، تو اس کے قول پر اکتفا کر کے تجارت شروع کر دیتے ہیں اور اگر ایک دو بار نقصان بھی ہو جائے تو ہمت نہیں ہارتے، بلکہ وہ کام کرتے ہیں، چنانچہ آم والوں کو بعض دفعہ خسارہ بھی ہوتا ہے، مگر خسارہ والا پھر بھی کام کرتا ہے اور اگر خسارہ نہ بھی ہو، بلکہ برابر معاملہ رہتا ہو کہ نہ نفع ہے، نہ نقصان جب تو اس تجارت کو چھوڑ ہی نہیں سکتے اور یوں کہتے ہیں کہ تجارت میں یہ بھی ایک قسم کی کامیابی ہے کہ نقصان نہ ہو، دوسرے اب نفع نہیں ہوا تو آئندہ امید ہے، بلکہ خسارہ ہوتا بھی ایک امید نفع کو نفع سمجھا جاتا ہے، مگر افسوس! دین میں معلوم نہیں یہ اصول کہاں گئے؟

صاحبو! کیا حیرت نہیں کہ دنیا کے کاروبار میں تو نقصان ہونے کو بھی کامیابی سمجھا جاتا ہے اور دین کے کام میں نفع کی تاخیر کو بھی کامیابی نہیں سمجھا جاتا، زراعت، تجارت، ملازمت سب میں کبھی نفع ہوتا ہے، کبھی نہیں اور بعض دفعہ نقصان بھی ہو جاتا ہے، مگر ان کو کیونکر چھوڑ دیں؟ وہاں تو تجربہ کاروں کا قول ہے کہ ان کاموں میں فائدہ ہے، گو بیشک اکثر ہی ہو اور گوجا مل نہ ہو مؤخر ہی ہو، مگر افسوس! کیا خدا اور رسول کا قول ان تجربہ کاروں کے قول سے بھی کم ہو گیا؟ جو صاف صاف قرآن کے منافع بیان کر چکے ہیں، بجز وہ بھی ہر حالت میں خواہ سمجھ کر پڑھو، یا بدوں سمجھے پڑھو۔

## ایک شبہ کا جواب

اور میں والدہ! کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ ہم سمجھتے نہیں تو قرآن کے پڑھنے سے فائدہ؟ یہ محض حظ نفس کے بندے ہیں، ان کو عقل سے ذرا مس نہیں گودعوئی بہت کرتے ہیں، اگر یہ عقل کے بندے ہوتے تو ایسی بے عقلی کی بات نہ کہتے کیونکہ عقلی قواعد میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک دلیل سے ضد شے اور عین شے دونوں پر استدلال ہو سکے، اگر شے عقلی ہوتا کہ جب معانی نہ سمجھے تو الفاظ سے کیا فائدہ؟ تو بتائیے! اس قاعدہ عقلیہ سے کیا ثابت ہوتا؟ آیا یہ کہ الفاظ کو چھوڑ دو؟ یا یہ کہ محض الفاظ پر اکتفاء نہ کرو، بلکہ معانی بھی حاصل کرو ظاہر ہے کہ اس کی الفاظ کے چھوڑنے پر دلالت نہیں کیوں کہ جب معانی کی ضرورت اس قاعدہ میں مسلم ہے اور معانی الفاظ کے تابع ہیں اور ضروری کا موقوف علیہ ضروری ہوتا ہے تو اس سے تو خود علم الفاظ کی ضرورت پر دلالت ہو رہی ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہم! الفاظ کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں، مگر ان کو اس وقت حاصل کرنا چاہیے جب کہ معانی کی فہم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہو سکے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کی یہ تاویل اس وقت چل سکتی تھی، جب کہ ہم دیکھتے کہ تم اپنے بچوں کو بچپن میں تو قرآن نہ پڑھاتے، کیونکہ اس وقت سمجھیں گے نہیں، بلکہ بڑے ہو کر بڑھاپے کے وقت سمجھیں گے، مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم نہ بچپن میں پڑھاتے ہو، نہ جوانی میں تو معلوم ہوا کہ تم اس قاعدہ سے علی الاطلاق خود عدم ضرورت الفاظ پر بھی استدلال کرنا چاہتے ہو اور یہ وہی بات ہے کہ دلیل سے ضد شے پر استدلال کیا گیا ہے، حالانکہ وہ عین شے کو بھی مثبت ہے، معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ عقلیہ نہیں ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ اس کا منشاء محض نفس پرستی ہے، ان لوگوں نے اس قضیہ کو عرض نفس کا ایک بہانہ بنا لیا ہے اور دل میں ان کے یہ ہے کہ نہ قرآن کے الفاظ کی ضرورت ہے، نہ معانی کی، گویا بان سے معانی کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں، مگر ان کا عمل بتلاتا ہے کہ وہ کسی کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے، ورنہ کسی وقت تو قرآن کو معانی ہی کے ساتھ حاصل کرتے اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دلاتے جب عمل یہ ہے تو اب زبان سے معانی کی اہمیت ظاہر کرنا مخلوق کو دھوکہ دینا ہے، مگر خدا کو کس طرح دھوکہ دے لوگے؟ جو عظیم بذات الصدور ہے، وہ تو تمہارے دل کی حالت خوب جانتا ہے کہ تم خود قرآن کی تعلیم ہی کو مطلقاً بے فائدہ سمجھتے ہو، خواہ محض الفاظ ہوں یا معانی کے ساتھ ہوں:

خلق را گیرم کہ بقربنی تمام  
 در غلط اندازی تا ہر خاص و عام  
 کارہا باخلق آری جملہ راست

باخدا ترویر و حیلہ کے رواست

کاربا او راست باید داشتن

رایت اخلاص و صدق افراستن

خدا کے ساتھ دھوکہ نہیں چل سکتا، حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ترسم کہ صرّفہ نہ برد روز باز خواست

نان حلال شیخ زآب حرام ما

یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا آب حرام شیخ کے نان حلال سے قیامت میں بڑھ نہ جائے، کیونکہ وہ مخلوق کو دھوکہ دینے کے لیے تقویٰ اور بزرگی کی صورت بناتا ہے اور ہم اپنے کو قصوروار سمجھ کر گناہ میں مبتلا ہیں اور خدا کے یہاں دھوکہ چل نہیں سکتا، اس لیے اندیشہ ہے کہ کہیں ریاکار مشائخ کا تقویٰ ہماری زندگی سے گھٹ نہ جائے۔

عام مسلمان بہتر ہے

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ فاسق مسلمان جو اپنے کو گنہگار سمجھتا ہے، ان مہذب لوگوں سے اتنی پڑے رہیں گے جو عقائد اسلام میں شبہات نکالتے ہیں اور عقل سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہیں چونکہ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان ہیں، اس لیے زبان سے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن پڑھنے کو مطلقاً ہمارا جی نہیں چاہتا، ورنہ کفر کا فتویٰ لگ جائے گا اس لیے یہ قاعدہ غرض نفس کے موافق گھڑ لیا کہ جب معافی نہیں سمجھتے تو الفاظ سے کیا نفع؟

اس کا جواب بس یہی ہے کہ بہت اچھا! آپ اپنے بچوں کو معافی ہی کے ساتھ قرآن پڑھائیے اور ان کو ابتداء ہی سے عربی کی تعلیم، صرف و نحو کی تعلیم دیجئے، مگر اس سے تو اور بھی خون خشک ہو جائے گا، کیونکہ وہ تو الفاظ کو نال کر معافی سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے، یہ ایسی الٹی پڑ گئی کہ صرف و نحو بھی گلے پڑ گئی، مگر جو شخص الفاظ کو بدون معنی کے بے فائدہ کہے اور صرف معافی کی ہی ضرورت کا قائل ہو اس کو یقیناً ضروری کی تحصیل پر مجبور کیا جائے گا، صاحبو! ظاہر میں یہ قضیہ بدون سمجھے الفاظ سے کیا فائدہ؟ پر مغز معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل ان لوگوں نے مغز اسلام نکال دیا ہے، ان میں سے بعض نے تحصیل معافی کی بھی کوشش کی، مگر وہ اس کا مصداق تھی:

گر غفلت سے باز آیا جفا کی

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی!

انہوں نے معافی حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ترجمہ قرآن کا مطالعہ کر لیا، مگر یہ ایسا ہے

کہ جیسے کوئی خوانِ نعمت سے گلے پکانا سیکھے، کیونکہ اس میں سب کھانوں کی ترکیب لکھ دی ہے، مگر اس سے آنا گوندھنے کا طریقہ اور پانی کھپانے کی ترکیب اور آج کا انداز کیسے معلوم ہوگا؟ نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صاحب نے ضاد کے بارے میں مجھ سے تحریراً سوال کیا تھا کہ ضاد کا تخریج کہا سے ہے؟ اور اس میں اور ظاء میں فرق کیونکر ہوتا ہے؟ مگر میں نے لکھ دیا کہ یہ بات خط سے نہیں معلوم ہو سکتی، کیونکہ:

گر مصور صورت آں داستان خواهد کشید

لیک جیرانم کہ نازش را چپا خواهد کشید

اس کو کسی ماہر تجوید سے زبانی سن کر سمجھ سکتے ہو، تو حضرات! بعض باتیں ایسی ہیں جو مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان کے لیے استاد کی ضرورت ہے، کیونکہ بعض باتیں سینہ بہ سینہ ہوتی ہیں اور اس میں کچھ تصوف اور سلوک ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ ہر علم میں ایک بات ایسی ہوتی ہے جو سینہ بہ سینہ ہے کہ صرف استاد سے حاصل ہوتی ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست

بسیار شیبہ باست تباں را کہ نام نیست

## قرآن کا سمجھنا

پھر قرآن ہی اتنا سستا کیوں ہو گیا کہ اس کا مطلب بدون استاد کے سمجھ میں آ جائے گا؟ آج کل تعزیرات ہند کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے، ذرا کوئی اس ترجمہ کو دیکھ کر مطلب صحیح تو بیان کر دے، یقیناً بہت جگہ غلطی کرے گا، اسی طرح کیمیا کی کتابیں اردو میں ہو گئی ہیں، کوئی ان کو دیکھ کر کیمیا تو بنالے، کبھی نہیں بنا سکتا، پس معانی قرآن کے حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ترجمہ دیکھ لیا جائے، ترجمہ قرآن اگر دیکھو تو صرف ونحو اور قدرے فقہ کے بعد دیکھو، اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اردو ترجمہ کسی عالم سے تو سبقاً سبقاً پڑھ لو سو ایک جماعت تو یہ تھی کہ جس کے عقائد کو تعلیم جدید کی وجہ سے خراب ہو گئے ہیں اور جماعت عوام کی ہے، ان کا عقیدہ یہ تو نہیں کہ بدون معانی کے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ؟ مگر اس کا اثر لیے ہوئے ہیں کہ قرآن کے پڑھنے میں کوشش نہیں کرتے، سو یہ لوگ دوسرے رنگ میں اس غلطی میں مبتلا ہیں، اس لیے اس وقت میں اس غلطی کو رفع کرنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اول: ”الرا“ فرمایا ہے یہ تو حروف مقطعات ہیں، جن کے معنی ہم کو معلوم نہیں، گو بقول محققین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھے لیکن امت کو نہیں بتلائے

گئے، مگر میں ان سے بھی اپنے مقصود میں کام لوں گا، سامعین کو تعجب ہوگا کہ جب معنی ہی معلوم ہو جائے تو اس سے مضمون کو کس طرح ثابت کیا جائے گا؟ لیکن یہ تعجب میری تقریر کے بعد مرتفع ہو جائے گا، ابھی میں آیت کا ترجمہ بیان کر دوں اس کے بعد ان حروف سے ثابت کروں گا، تو حق تعالیٰ نے فرمایا: "تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَ الْقُرْآنِ مَبِينٌ" یہ آیت کتاب اور قرآن میں کی ہیں، یہی ترجمہ دوسری آیات کا ہے، صرف کتاب و قرآن کا تقدیم و تاخیر میں فرق ہے، تو اس جگہ آیات کے دو لقب بیان کیے گئے ہیں، ایک قرآن، دوسرے کتاب، قرآن کے معنی میں، مایقراً یعنی پڑھنے کی چیز اور کتاب کے معنی میں "مسابکتاب" یعنی لکھنے کی چیز اور ظاہر ہے کہ پڑھنے اور لکھنے کی چیز کیا ہے؟ الفاظ ہی تو ہیں، معانی کو کون پڑھ سکتا ہے؟ یا کون لکھ سکتا ہے؟ اور ایک مضمون ابھی ذہن میں آیا ہے جو شروع میں نہ آیا تھا، اب تک تو ذہن میں یہ بات تھی کہ الفاظ ہی پڑھنے لکھنے کی چیز ہیں، معانی کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتے، اس پر ایک اظہار یا دیا کہ خوبین نے کہا ہے کہ ضربت میں ضو مستتر ہے، اس کا مطلب یہ تو ہے کہ ظاہر میں ضمیر مذکور نہیں، سمجھنے میں آتی ہے، مگر ایک طالب علم یہ سمجھے کہ ضرب کے اندر ضمیر ہو چھپی ہوئی بیٹھی ہے، تو آپ نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا، یہاں تک کہ کاغذ پھٹ گیا اور اتفاق سے دوسرے ورق میں اس جگہ لکھا ہوا تھا، یہ بڑے خوش ہوئے کہ واقعی استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کے اندر ہو پوشیدہ ہے، دیکھو چھیلنے سے نکل آیا، پھر دوڑے استاذ کے پاس آئے کہ دیکھئے میں نے ضرب کو چھیلنا تھا، یہ ہونکل آیا جو اس میں چھپا ہوا تھا اور اس کا مطلب دوبارہ سمجھایا، غرض یہ طالب علم یوں سمجھا تھا کہ معانی بھی کتابت میں آ سکتے ہیں، مگر یہ اس کی غلطی ہے، معانی قراءت و کتابت میں نہیں آ سکتے اس کا محل صرف ذہن ہے، لوگ بے تار کی خبر پر تعجب کرتے ہیں، مگر خدا تعالیٰ نے اس کو پہلے سے پیدا کر رکھا ہے، کیونکہ الفاظ سے معانی کا سمجھنا یہ بے تار کی ہی خبر ہے، کیونکہ معانی کا مرکز قلب ہے اور جہاں الفاظ کسی کی زبان سے نکلے، معاہدہاں معانی سمجھے گئے۔

غرض ان آیتوں میں اشارہ کیا بلکہ صراحت ہے کہ قرآن کے ساتھ پڑھنے کا تعلق رکھو، کیوں کہ لفظ قرآن کے معنی یہی ہیں اور ظاہر ہے کہ قراءت الفاظ ہی کی ہوتی ہے نہ کہ معانی کی، دوسری صفت اس جگہ کتاب ہے، جس کے معنی لکھنے کی چیز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ قرآن کے ساتھ قراءت کے علاوہ ضبط و کتابت کا بھی تعلق رکھنا چاہیے، سو یہ ہے کہ کتابت کا مصداق حقیقتاً الفاظ ہیں، نہ معانی، کیونکہ الفاظ تو زبان سے ادا ہوتے ہیں، ان کا محل زبان ہے، لفظ کے معنی لغت میں پھینکنے کے ہیں، چونکہ الفاظ زبان سے پھینکے جاتے ہیں، یعنی نکالے جاتے ہیں، اس

لیے ان کو الفاظ کہا جاتا ہے اور معانی کا نکل صرف ذہن سے، وہ تو کتاب کا مصداق کسی طرح ہے ہی نہیں، بلکہ اس کا مصداق دوسری چیز ہے، یعنی نقوش جن کو عوام کرم کانٹے کہتے ہیں، کیونکہ ان پڑھ آدمی لکھا ہوا پڑھ نہیں سکتا، نہ سمجھ سکتا ہے، اس لیے وہ ان کو کرم کانٹے کہتے ہیں، مگر کتاب کا مصداق مطلق نقوش نہیں بلکہ وضعی نقوش ہیں، جیسا کہ الفاظ کی دلالت معانی پر وضعی ہے، اس لیے پڑھے ہوئے آدمی ان کو سمجھتے ہیں، ان پڑھ نہیں سمجھتے، جب یہ معلوم ہو گیا کہ کتاب کا حقیقی مصداق نقوش ہیں تو آپ تو الفاظ ہی کو غیر مقصود بتلاتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نقوش قرآن بھی قابل حفاظت و مستحق ہیں، یہ تو الٹی پڑی کہ گئے تھے نماز بخشنا نے روزے بھی گلے پڑ گئے، مگر صاحبو! یہ گلے نہیں پڑے، کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بادشاہ کسی شخص کو اشرفیاں اور جواہرات دے کر اس سے کہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو، قفل اور تالا لگاؤ، اگر اس شخص کو روپے اور جواہرات کی قدر معلوم ہے تو اس حکم کی قدر کرے گا اور کہے گا:

بِزَاكَ اللهُ كَمَا جِئْتُ بِكَ بِرُؤْيَا

مرا با جان جان ہمراز کردی

اور جس کو روپے کی قدر نہ ہوگی وہ کہے گا کہ یہ اچھی بلا میرے سر پڑی کہ حفاظت کرو اور قفل لگاؤ! اسی طرح جو لوگ معانی کی قدر کرتے ہیں وہ ان الفاظ و نقوش کی بھی قدر کریں گے، کیونکہ یہ ان ہی کی حفاظت کا سامان ہے اور جو قدر نہیں کرتے وہ اس کو سر پڑی بلا سمجھیں گے، پس معلوم ہوا کہ جو نونعیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں، درحقیقت وہ معنی قرآن کی قدر نہیں کرتے، ورنہ ان کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی۔

## قرآن کا معجزہ

صاحبو! الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بڑا دخل ہے، کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ! خدا نخواستہ! یہ لکھے ہوئے مصاحف گم ہو جائیں تو ایک بچہ حافظ قرآن اپنی یاد سے اس کو دوبارہ لکھوا سکتا ہے، بڑوں کا تو ذکر ہی کیا، مظفر گڑھ کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک واعظ نے قرآن کے اس معجزہ کو ظاہر کرنا چاہا تو درمیان وعظ میں ایک آیت پڑھ کر اٹک گئے اور مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اس میں جس قدر حافظ ہوں، چھوٹے بڑے سب کھڑے ہو جائیں، مجھے ایک آیت میں شبہ ہو گیا ہے اس کو حل کرنا چاہتا ہوں تو چاروں طرف سے بہت سے آدمی کھڑے ہوئے جس میں بچے بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی تھے اور اہل بیہوشی

بھی، یہ دیکھ کر واعظ نے کہا: ”الحمد للہ! صاحبو! مجھ کو آیت میں شبہ نہیں ہوا تھا، یہ صرف یہ دکھلانا تھا کہ اس مجمع میں جس کے اندر حفاظ کو بالقصد جمع نہیں کیا گیا، یوں ہی کیف مالتفق کی جمع آ گیا ہے، اس قدر حفاظ قرآن موجود ہیں، اب قیاس کرو کہ سارے شہر میں کتنے حفاظ ہوں گے؟ اور پھر یہ اندازہ کرو کہ پورے ضلع میں کتنے ہوں؟ پھر سوچو سارے ہندوستان میں کتنے ہوں گے؟ اور دنیا بھر میں کتنے ہوں گے؟ صاحبو! یہ قرآن کا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ قرآن کی طرف رغبت کا کوئی سامان نہیں تو اس کے حفظ کرنے والوں کو کوئی بڑا عہد ملتا ہے، بلکہ زیادہ تر امراء کی توجہ انگریزی پڑھنے کی طرف ہے اور کفار قرآن مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، اس قدر حفاظ موجود ہیں کہ بچے بھی حافظ ہیں اور مرد بھی اور بعض قصبات میں عورتیں بھی حافظ ہیں، چنانچہ قصبہ پانی پت میں بہت عورتیں حافظہ ہیں اور بعض تو سب سے قراءت کی حافظہ ہیں۔

قرآن یاد کرنے کو بے کار کہنے والے

صاحبو! میں نہایت آزادی سے صاف صاف کہوں گا کہ جب لوگ بدون معافی سمجھے الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بیکار کہتے ہیں، واللہ! وہ حضرات حق تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن کے حافظ پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ محفوظ رہے اور یہ لوگ دنیا سے حفظ قرآن کو مٹانا چاہتے ہیں، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ حفظ قرآن بچپن ہی میں اچھا ہوتا ہے، بڑے ہو کر ویسا حفظ نہیں ہوتا تو اب اگر ان لوگوں کے مشورہ پر بچوں کو قرآن نہ پڑھایا جائے تو اس کا انجام یہی ہے کہ حفظ کا دروازہ بند ہو جائے، مگر ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نُوْرٌ وَّلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ“

یہ خدا کے نور کو مٹانا چاہتے ہیں، بخدا یہ خود ہی مٹ جائیں گے اور خدا کا نور ان کے مٹانے سے ہرگز نہ مٹے گا، یہ لوگ اپنے ایمان کی خیر منائیں، یہ ہیں کس ہوا میں؟ خدا کی قسم! ان کا نام و نشان تک نہ رہے گا یہ بالکل تباہ و برباد ہو جائیں گے:

چراغِ را کہ ایزد فرورد  
ہر آنکو تف زند ریتشش بسوزد

اور

اگر گیتی سراسر باد گیرد  
چراغِ مقبلاں ہر گز نمیرد

اس عارف نے یہ بات اہل اللہ کے انوار کے متعلق فرمائی ہے، تو جب اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ کا نور کس طرح مٹ سکتا ہے؟ بعض اہل اللہ پر ظالموں نے ستم کیا اور ان کو ذلیل کرنا چاہا، اس کی قبر پر گوڑ لویا، مگر ان کا نام اور ان کے انوار اب تک تاباں و درخشاں ہیں اور وہ ظالم گنہگار اور ناپید ہو گئے کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں، نہ ان کی قبر کا نشان باقی ہے اور اہل اللہ کے مزارات اس وقت تک مرجع الخلاق بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ مشاہد ہے کہ اہل اللہ اپنے کو خود مٹانا، ناپید کرنا، گنہگار کرنا چاہتے ہیں اور اہل ظاہر اپنے کو ظاہر کرنا مشہور کرنا چاہتے ہیں، مگر اہل اللہ یعنی اہل باطن ہی چمکتے ہیں اور اہل ظاہر کی شہرت چند روزہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہے، بعض مصنفین نے اپنی کتابوں کا نام تک ظاہر نہیں کیا، مگر کتابیں ان کی مقبول و متداول ہیں اور اہل ظاہر بڑے اہتمام سے اپنا نام ظاہر کرتے ہیں، مگر ان کی کتابوں کو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔

اللہ کا نور مٹ نہیں سکتا ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ تعالیٰ کا نور کیوں کر مٹ سکتا ہے؟ بس یہ خدا کی حفاظت ہے کہ قرآن کے اس قدر حفاظ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں کہ ان کا شمار و احصاء دشوار ہے، اس پر بعض لوگ یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ خدا قرآن کا حافظ و نگہبان ہے تو ہمیں اس کے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ اے صاحبو! یہ بات ایسے دل سے نکلی ہے جس میں خدا سے ذرا بھی علاقہ اور لگاؤ نہیں، کیا اگر جارج پنچم آپ کو کوئی تحفہ دیں تو آپ اس کی بے قدری کر سکتے ہیں؟ خصوصاً ان کی نگاہ کے سامنے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کو سراور آنکھوں پر رکھا جائے اور ان کی جان سے زیادہ حفاظت کی جائے اور اگر وہ کوئی تحفہ کھانے کے واسطے آپ کو دیں اور ان کے سامنے آپ اسے کھائیں تو کیا زمین پر آپ اس کا کوئی ریزہ گرنے دیں گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس طرح شوق سے کھائیں گے کہ گویا کہ کبھی یہ نعمت آپ کو ملی ہی نہیں تھی اور اگر اس میں سے ذرا سا بھی زمین پر گرے تو فوراً اٹھا کر سر پر رکھیں گے۔

قرآن کی حفاظت

ہمیں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقیقت سمجھ لو کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ زمین پر گر جائے تو اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لو، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں، تو ان کی نعمت کی ان کے سامنے بے قدری کرنا بڑی بے حیائی ہے تو صاحبو! خدا تعالیٰ



نے آپ کو ہاتھوں میں قرآن دے دیا ہے تو اب تو یہ آپ کا ہو گیا، تو کیا اپنی ایک جینٹلمن کے جو سلطان السلاطین کے دربار سے ملی ہے، آپ کو حفاظت نہ کرنی چاہیے یقیناً کرنی چاہیے! جب کہ خدا کی مرضی اس کی حفاظت میں ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی مرضی حق پر چلنا چاہیے اس کی حقیقت اولیاء اللہ سے پوچھو۔

### اسباب محبت

صاحبو! محبت کا سبب کمال اور جمال و نوال ہے اور یہ سب باتیں حق تعالیٰ شانہ کے اندر کامل طور پر موجود ہیں، ان سے بھی اگر محبت نہ ہو تو پھر کس سے ہوگی؟ خبر بھی ہے! حق تعالیٰ کون ہیں؟ تمام حسن و جمال کا مبداء و منتبأ ہیں، تو جب خدا تعالیٰ ایسے محبوب ہیں تو ہم کو ان کی مرضی کی رعایت کرنا چاہیے اور خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ قرآن مجید محفوظ رہے تو آپ کو اس کی طرف جھکنا چاہیے اور اس کے الفاظ کا پورا اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ الفاظ و معانی و نوال قابل اہتمام ہیں مگر الفاظ میں اتنی بات زیادہ ہے کہ معانی کی حفاظت الفاظ کی حفاظت پر موقوف ہے، کیونکہ معانی کا ضبط بدون الفاظ کے نہیں ہو سکتا ہے۔

### الفاظ قرآن کی حفاظت کا اہتمام

دیکھئے! سب سے پہلے معانی کا نزول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا ہے، مگر وہاں بھی بواسطہ الفاظ کے ہوا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حافظہ بہت قوی تھا، بلکہ سارے ہی قومی مضبوط تھے کہ تریسٹھ سال کی عمر میں بھی آپ کے بال کچھ ہی سفید ہوئے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا کیا پوچھنا، آج کل سے تو اس زمانے کے سب ہی لوگ قوی تھے، حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا حافظہ ہم لوگوں سے زیادہ قوی تھا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو سب ہی سے زیادہ قوی تھا، لیکن باری ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا کہ فرشتے کے ساتھ قرآن پڑھتے جاتے تھے، کیونکہ:

بایں سایہ ترا نمی پسندم  
عشق است و ہزار ہدگمانی

آپ کو ان محبوب الفاظ کے نکلنے کا اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی لفظ میری یاد سے نکل نہ جائے، اس لیے ساتھ پڑھتے جاتے تھے، اس سے اندازہ کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ قرآن سے

کس درجہ عشق تھا! یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے منع کرنے کی نوبت آئی ہے کہ آپ ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت برداشت نہ کیا کریں "لا تحرك به لسانك لتعجل به" ہم ذمہ لیتے ہیں کہ قرآن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر جمادیں گے اس تسلی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا تو ہم کو بھی ان کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ بدون الفاظ کے معانی کی حفاظت نہیں ہو سکتی، لہذا معانی کی نگہبانی یہی ہے کہ الفاظ کو یاد کیا جائے، حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ نے تو قرآن کے نقوش اور رسم خط کی بھی یہاں تک حفاظت کی ہے کہ رسم قرآن میں مستقل رسائل تصنیف کیے اور اس کو علیحدہ فن قرار دیا ہے اور اس میں تغیر و تبدل کو ناجائز قرار فرمایا ہے۔

### قرآن کے رسم خط کی حفاظت

صاحبو! آج کل تو یادگار قدیم کی اس قدر حفاظت کی جاتی ہے کہ اس کے تغیر کے بعد بھی اس کا فوٹو لیا جاتا ہے، تو خدا نخواستہ اگر رسم خط قدیم متغیر بھی ہوتا جب بھی یادگار قدیم ہونے کی وجہ سے اس کی حفاظت ضروری تھی، چہ جائیکہ وہ بالکل محفوظ و صحیح ہے، بلکہ اس میں نکات ہیں، چنانچہ ایک جگہ "بِقَدْر" میں الف نہیں لکھا گیا، کیونکہ وہاں دوسری قراءت سے "بِقَدْر" ہے تو صحابہ نے اس جگہ "بِقَادِر" میں الف نہیں لکھا تا کہ دوسری قراءت پر بھی رسم خط دال رہے، اسی طرح سورہ فاطمہ میں "مَسَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ" میں الف نہیں لکھا، کیونکہ ایک قراءت میں "مَسَلِكِ" ہے، پس رسم خط قرآن میں اس کا بے حد لحاظ کیا گیا ہے کہ سب قراءتوں کو جامع رہے، اس لیے اس کا بدلتا حرام ہے۔ صاحبو! جب قرآن کی ہر چیز کی حفاظت کی گئی ہے اور یہ مسلمانوں کے لیے بڑا فخر ہے کہ ان کے برابر کسی قوم اور کسی امت نے آسمانی کتاب کی حفاظت نہیں کی، تو آپ کو بھی اس کی ہر چیز کی ویسی ہی حفاظت کرنی چاہیے جیسا کہ اب تک امت نے کی ہے اور یہ مت کہو کہ خدا تو اس کا خود نگہبان ہے، پھر ہم کو کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ اس کی محافظت کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ اس نے محافظت کا حکم اپنے بندوں کو دے دیا اور یہ ان کا احسان ہے اور انعام ہے کہ اس نے یہ خدمت ہم سے لے لی، اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم سے یہ کام لے لیں گے، چاہے چھوڑ کر دیکھ لو، تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی ہے، اللہ تعالیٰ کو تو ہمارے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی اور یہ بھی ان کا انعام محض ہے کہ ہم کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا اور پیدا کرنے سے پہلے ملائکہ سے فرمایا: "إِنِّي جَاعِلٌ فَی الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کہ زمین کے اندر اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں، کس قدر عنایت ہے کہ:

ما نودیم و تقاضائے ما نبود  
لطف تو ناگفتہ نامی شنود

## خليفة اللہ کا خطاب

ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ہم کو خلیفۃ اللہ کا خطاب دیا، تو کیا خلافت کا یہی حق ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں کہ زبان پر یہ بات آرہی ہے کہ خدا قرآن کا خود نگہبان ہے، ہم کو کیا ضرورت ہے؟ خدا تعالیٰ کی عنایت تو دیکھئے کہ ہم کو ایسی حالت میں خلیفہ بنایا کہ دوسرے لوگ اس منصب کے طالب موجود تھے، ملائکہ نے اسی وقت جب کہ اللہ تعالیٰ نے ”انسی جاعل فی الارض خلیفہ“ فرمایا، یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قرآن میں ملائکہ کا یہ سوال اور اس کا جواب مفصل مذکور ہے، میں اس وقت اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا ہے، صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو ہماری ضرورت نہ تھی، بلکہ جس کام کے لیے ہم کو پیدا کیا گیا ہے، اس کے انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوق اپنی خدمات کو پیش کرنے کے لیے موجود تھی، مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ہمارے حال پر عنایت کرم ہے کہ دوسری جماعت کے ہوتے ہوئے پھر بھی ہم کو منصب خلافت عطا کیا اور ہم کو اس خدمت کے لیے پیدا کیا، اسی طرح خدمت قرآن کے لیے بھی خدا تعالیٰ کو ہماری کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ اگر ہم خدمت دین میں کوتاہی کریں گے تو دوسری قوم کو اس کی خدمت کے لیے پیدا کر دیں گے۔

## ارشاد خداوندی

چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس خیال کا بھی جواب صاف صاف دیا ہے:

”وَ اِذْ تَقُولُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَا مَا عٰبَرٰكُمْ كُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْنَ اَمۡمًا لِّكُمْ“

یعنی اگر تم دین سے اعراض کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے عوض تمہاری جگہ دوسری قوم کو کر دے گا پھر وہ تمہاری طرح ست و کاہل اور دین سے جان چھڑانے والے نہ ہوں گے، صاحبو تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی، تم آج چھوڑ کر دیکھ لو، گاڑی ویسی ہی چلتی رہے گی، ہاں! تم خود ہی گر پڑو گے، اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت اور قرآن کی حفاظت کے لیے ایسی قومیں پیدا کر دیں گے جو تمہاری جیسی نہ ہوں گی۔

بیدار ہو جاؤ!

صاحبو! میں آپ کو خبردار و بیدار کرنا چاہتا ہوں کہ جلدی سمجھ لو، کہیں اس وعید کا ظہور نہ ہو جائے کیونکہ مجھے اس کے آثار نظر آ رہے ہیں، اس وقت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں

کی تحریریں تو کفر آمیز شائع ہوتی ہیں اور اہل یورپ کی تحریریں اسلام کی مدح میں شائع ہو رہی ہیں۔ گویا بعض مسلمان کفر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بعض کفار اسلام کی طرف تو اس حالت کو دیکھ کر مجھ کو سخت اندیشہ ہوتا ہے کہ جب دونوں جماعتیں سرحد پر پہنچ چکی ہوں گی، تو ایسا نہ ہو کہ وہ تو کفر سے نکل کر مسلمان ہو جائیں اور یہ اسلام سے نکل کر کافر ہو جائیں، صاحبو! خدا تعالیٰ دوسری قوموں کو اسلام کی مدح و ثناء کی طرف مائل کر کے ہم کو متنبہ فرما رہے ہیں کہ مت سمجھنا کہ خدا کو یا اسلام کو تمہاری ضرورت ہے، بلکہ تم ہی کو اسلام کی ضرورت ہے "وَإِنْ تَسْأَلُوهُ لِمَ تَبَدَّلَ قَوْمًا غَيْرَكُمْ لَمْ يَلْبَسُوا إِيمَانَكُمْ"، اگر تم اعراض کر دو گے تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو کر دیں گے جو اس وقت باوجود کفر کے اسلام کی مدح کر رہی ہے اور تم ان کی جگہ ہو جاؤ گے کہ باوجود مسلم ہونے کے اسلام کی توہین کرتے ہو اور اگر تم اعراض نہ کرو بلکہ بدستور اسلام کی خدمت انجام دیتے رہو، اس صورت میں تم بھی مسلمان رہو گے اور شاید دوسری قومیں بھی مسلمان ہو جائیں اور اسلام کی خدمت باقرآن کی حفاظت جو کچھ آپ کرتے ہیں، یہ محض برائے نام ہے، جس سے صرف آپ کا نام ہو جاتا ہے، ورنہ اب بھی قرآن کے محافظ دراصل حق تعالیٰ ہی ہیں۔

### قرآن بعد حفظ ہوتا ہے

تم اپنے حفظ پر کیا ناز کرتے ہو؟ ذرا کافیہ یا کوئی اور نظم و نثر کی کتاب تو حفظ کر لو، آپ کو اسی وقت اپنے حفظ کی حقیقت معلوم ہو جائے گی، یہ خدا تعالیٰ ہی کی تو حفاظت ہے کہ قرآن جیسی ضخیم کتاب کا حفظ کرنا ایسا آسان کر دیا ہے کہ بچے تک حفظ کر لیتے ہیں، حالانکہ قرآن میں متشابہات بھی کثرت سے ہیں، اس بات پر یہی کہنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا محض نام کرنا مقصود ہے کہ وہ ہم کو حافظان قرآن کی فہرست میں داخل کر کے انعام دیتے ہیں ورنہ اصل حافظ وہی ہیں، کسی نے خوب کہا ہے:

کار زلف تست مشک انشائی اما عاشقان

مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چین بستہ اند

واللہ! اس انعام پر جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر فرمایا ہے، یوں کہنا چاہیے:

کہاں میں اور کہاں یہ نکبت گل؟

نیم صبح تیری مہربانی!!

## تلاوت قرآن کی برکت

اور عارفین کی نظر تو اس سے بھی آگے بڑھتی ہے، عارفین تو جب قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، تو ان کو یہ بات مشوف ہوتی ہے کہ ہم خود نہیں پڑھ رہے، بلکہ آرگن ہائے کی طرح بول رہے ہیں جس میں کسی اور کا کام بند کر دیا گیا ہے اور ہائے سے وہی نکلتا ہے جو اس میں بند کیا گیا ہے، مگر ظاہر میں سمجھتا ہے کہ باج بول رہا ہے یا اس وقت وہ مثل شجرہ طور کے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں یہ درخت کبڑا ہاتھا 'یا مونسى ائى انا اللہ رب العالمین' (اے مونسى! میں ہی اللہ ہوں جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے) مگر درخت کی کیا مجال تھی کہ وہ اس طرح خود بولتا، بلکہ کوئی دوسرا بول رہا تھا اور درخت شخص اس کا ناقل وحاکی تھا:

چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

ایک عارف اس کو فرماتے ہیں:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشت اند

آنچه استاد ازل گفت گوی گویم

## عارفین کا حال

عارفین کو جب اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو کچھ نہ پوچھئے کہ تلاوت قرآن کے وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اور تلاوت قرآن میں تو اس حالت کا غالب ایک خاص وجہ سے زائد ہوتا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ صاف صاف اپنی شوکت و عظمت و جلال کو ظاہر فرماتے ہیں، کہیں عتاب ہے، کہیں شکایت ہے، کہیں تسلی ہے، کہیں بشارت ہے، کہیں تکلم ہے، کہیں خطاب ہے، ورنہ ایک تلاوت قرآن ہی کیا انسان کے تو سارے ہی افعال ایسے ہیں کہ ان میں انسان شخص برائے نام فاعل ہے، ورنہ اصل کرنے والے وہی ہیں، یہ کیا ناز کرتا ہے اپنے علم و کمال پر کہ میں نے یہ کام کیا ہے، میں نے فلاں مسئلہ حل کیا ہے، واللہ! اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے کے کھیت پر دعویٰ کرے کہ یہ کھیتی میری ہے، مگر ساتھ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ زمین بھی دوسرے کی اور بیج اور نبل بھی دوسرے کا، اس نے اس کو پانی دیا، کھاؤ ڈالی اور کھیت کو پرورش کیا ہے، ظاہر ہے کہ ہر شخص اس مدعی کو احمق بتائے گا کہ جب ساری چیزیں دوسرے کی ہیں، تو کھیتی تیری کدھر سے ہوئی.....؟؟

## توت و اعضاء انسانی کا اقرار

صاحبو! مگر اس حماقت میں ہم سب مبتلا ہیں، کیونکہ جس دماغ اور جن ہاتھ پیروں سے ہم کرتے ہیں، ہر ایک کو اقرار ہے کہ یہ سب سامان خدا کا عطا کیا ہوا ہے، عقل و فہم اور قوت ارادہ قوت عمل بھی انہی کی دی ہوئی ہے، اب فرمائیے کہ ان سب قوتی اور جوارح سے جو انفعال و کمالات ظاہر ہوں گے وہ ہمارے کدھر سے ہوں گے...؟؟

بیاد دم از خانہ چیزے نخست

تو دادی ہمہ چیز من تست

حیرت ہے اگر ہم اب بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم خود قرآن کی حفاظت کرتے ہیں جب ہمارا پڑھنا اور یاد کرنا ہمارے قبضہ کا نہیں تو ہم حفاظت کرنے والے کون ہیں؟ بلکہ وہی محافظ ہیں جنہوں نے ہم سے یہ کام لیا اور اس کے اسباب عطا کیے اور حفاظت کا ادھر سے ہونا بہت ہی ظاہر ہے، حقیقت میں تو ہمارا پڑھنا اور تلاوت کرنا بھی ادھر ہی سے ہے، اگر ادھر سے توفیق نہ ہو تو کسی کی مجال نہیں کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔

## ایک واقعہ

کانپور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے جمائی لی تھی، اس کے بعد منہ بند نہ ہوا، کھلا کھلا رہ گیا، بڑی مصیبت ہوئی نہ کھانے کا رہا، نہ بات کرنے کا، پھر بڑی دقت سے کئی دن میں منہ بند ہوا، شاید کوئی کہے کہ دو اداروں سے منہ بند تو ہو گیا، یہ کام تو انسان کی تدبیر سے ہوا، میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی تدبیر کا محض نام ہی ہے، خدا کو منظور نہ ہوتا تو قیامت تک منہ بند نہ ہو سکتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تمام اطباء اور ڈاکٹرز عاجز ہو جاتے ہیں اور بیمار کو شفاء نہیں ہوتی، بلکہ جوں جوں دوا کرتے ہیں، مرض کو ترقی ہی ہوتی ہے اور یہ حال ہوتا ہے کہ:

از قضا سر کنکلبین صفرا فرود

روغن بادام خشکی نی نمود

ہر تدبیر الٹا کرم کرتی ہے، جس دوا کو تریاقتی سمجھا جاتا ہے، وہی زہر کا اثر کرتی ہے، اگر شفا طلبیوں، ڈاکٹروں کے قبضہ میں ہے تو ان کی بیوی بچے تو ہمیشہ مرض کے بعد ضرور صحت یاب ہو جایا

کریں، کیونکہ اس موقع پر طیب و ذاکر کبھی تدریس میں کمی نہیں کر سکتا، مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔  
مجبوراً ماننا پڑے گا کہ:

درد از یار است و درماں نیز ہم  
دل فدائے اوشد و جان نیز ہم  
ہر چہ می گویند آن بہتر ز حسن  
یار ما این دارد و آل نیز ہم

اب تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ قرآن پڑھنا بھی مستقلاً ہمارا کام نہیں، اس کے صحافظ تو ہم کیا ہوتے؟  
تو اب یہ محض حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ وہ ہمارا نام ہی کرنا چاہتے ہیں، ورنہ دراصل سب تفرقات وہ  
خود کرتے ہیں، اگر اب بھی اس انعام کی طرف رغبت نہ ہو تو سخت محرومی کی علامت ہے، یہ مضمون  
درمیان میں استطراداً ہو گیا اس امر پر تنبیہ کرنے کے لیے قرآن کی حفاظت جو آپ کے سپرد کی گئی  
ہے تو آپ اس پر ناز نہ کریں، خدا کو آپ کی ضرورت نہیں، بلکہ آپ ہی کو خدا کی ضرورت ہے۔

### بے معنی سمجھے قرآن کا فائدہ

اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ بدون معنی کے سمجھے قرآن  
پڑھنے کا کیا فائدہ؟ کیونکہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ معانی کی حفاظت بدون حفاظت الفاظ کے نہیں  
ہو سکتی اور حفظ معانی کی ضرورت آپ کو بھی مسلم ہے، یہ جواب تو سائنس و عقل کے موافق ہے اور  
آج کل عقل و سائنس کی پرستش زیادہ ہے اس لیے یہ جواب تو تعلیم یافتہ جماعت پر زیادہ حجت  
ہے اور ایک جواب نقلی ہے جو دینداروں پر حجت ہے جو نقل کے سامنے عقل کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے  
وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ہر الفاظ پر درس نیکیاں ملتی ہیں، جس نے ایک  
بار زبان سے الحمد کہا اس کے نلکہ اعمال میں اسی وقت پچاس نیکیاں لکھی گئیں، شاید عقل پرستوں کو  
یہ جواب پھیکا معلوم ہوا ہو، مگر صاحبو! حقیقت میں بڑا قیمتی نفع ہے جس کی قدر کرنے کے بعد معلوم  
ہوگی جب کہ نیکیوں ہی کی پوچھ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کے پاس مکہ کے ہلالے اور  
مجیدیاں بہت سی جمع ہوں اور ہندوستان والے اس کا مضحکہ اڑائیں کہ اس سیکے کو جمع کرنے سے  
تجھے کیا نفع؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ہاں! ابھی تو کچھ نفع معلوم نہیں ہوتا لیکن ایک خاص  
دن معلوم ہو جائے گا، پھر یہ شخص اور اس کا مضحکہ اڑانے والے دونوں حج کو جائیں تو وہاں پہنچ کر  
معاملہ برعکس ہوگا کہ اب وہ شخص جس کے پاس ہلالے اور مجیدیاں جمع تھیں، ان لوگوں کا مضحکہ

اڑائے گا، جن کے پاس ہندوستانی تاجے کے پیسے بہت ہیں، مگر مکہ کا سکہ کچھ نہیں تھا اور اب یہ لوگ اس کے سامنے شرمندہ ہوں گے۔

## ایک دوسرا عالم بھی ہے

صاحبو! اسی طرح ایک عالم آنے والا ہے جس کے بازار میں آپ کے ان سکوں کی کچھ قدر نہیں جو آپ آج کل جمع کر رہے ہیں، نہ وہاں روپے کی قدر ہے، نہ اشرفی کی، نہ انٹرنس کی قدر ہے، نہ بی اسے کی، نہ ایل ایل بی کی، نہ سی ایس ائی کی، وہاں سکہ یہی نیکیاں ہیں، جن کی آپ اس وقت قدر کر رہے ہیں، پس قرآن کے الفاظ کا دوسرا نفع یہ ہے کہ آخرت کا سکہ ہے جس کی ایک سورت سے آخرت کے بے شمار خزانے جمع ہو جاتے ہیں جب آپ وہاں جا کر دیکھیں گے کہ ایک سورہ فاتحہ اور قل حوالہ اللہ سے اتنا بے شمار ثواب مل گیا تو بے ساختہ یوں کہیں گے:

خود کہ باید این چنین بازار را

کہ بیک گل می خری گزار را

مگر ابھی اس واسطے قدر نہیں کہ یہ بازار اس سکہ کا نہیں ہے، یہاں یہ سکہ رائج نہیں، لیکن آخر آپ مسلمان ہیں اور آخرت و قیامت کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں، پھر اس نفع کی بے قدری کس لیے ہے؟ واللہ! وہاں جا کر آپ افسوس کریں گے ہائے ہم نے رات دن قرآن کی تلاوت کیوں نہ کی؟ جو آج مالا مال ہو جاتے اور اس وقت اپنے ان عذروں اور بہانوں پر افسوس ہوگا جو آج کل تحصیل قرآن میں کیے جاتے ہیں۔

## تلاوت قرآن کا ذریعہ

مجھے دیندار طبقے کی بھی شکایت ہے کہ یہ طبقہ بھی تلاوت قرآن کا پوری طرح اہتمام نہیں کرتا، بعض یہ عذر کرتے ہیں ہم کو فرصت نہیں ملتی، طلبہ اور مدد رسیدین کو زیادہ تر یہی عذر ہے، مگر یہ محض لغو ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ دوستوں سے باتیں کرنے میں بہت وقت ضائع کر دیتے ہیں، اس وقت ان کو کہاں سے فرصت مل جاتی ہے؟ پھر افسوس ہے تلاوت قرآن کے لیے تھوڑا سا وقت نہیں دیا جاتا ہے۔

قلق از سوزش پروانہ داری

ولے از سوز ما پروانہ داری



دوستوں کے راضی کرنے کا تو اتنا اہتمام اور خدا کے راضی کرنے کا مطلق اہتمام نہیں، بتلائیے اگر خدا تعالیٰ آخرت میں یہ سوال فرمائیں کہ تم نے فلاں دن دوست سے ایک گھنٹہ تک باتیں بنائیں مجھ سے آدھ گھنٹہ بھی باتیں نہ کیں، تو اس کا جواب کیا دو گے؟ بس سچا جواب تو یہ ہوگا کہ یوں کہہ دو کہ ہم کو (معاذ اللہ) خدا سے محبت نہیں، اگر یہ کہہ دو تو پھر ہم آپ سے خطاب ہی نہ کریں گے، لیکن آپ یہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔

### اللہ تعالیٰ کی محبت

کیونکہ آپ کو خدا تعالیٰ سے محبت ہے، اس لیے کہ آپ مومن ہیں اور مومن کی شان یہ ہے "وَالَّذِينَ آمَنُوا اشْبَهُوا حُبًّا لِلَّهِ" کہ جو لوگ ایماندار ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے، پس آپ کو اللہ تعالیٰ سے ضرور محبت ہے اور ایسی محبت ہے کہ کسی سے بھی اتنی محبت نہیں، بعض لوگوں کو شاید اس میں غلبان ہو کہ ہم کو تو بظاہر اپنی اولاد اور بیوی کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں اولاد اور بیوی کے ساتھ طبعی محبت ہے، عقلی محبت نہیں اور طبعی محبت تو جانوروں کو بھی اپنی اولاد وغیرہ سے ہوتی ہے، یہ کچھ کمال نہیں اور نہ خدا و رسول کے ساتھ ایسی محبت مامور بہا ہے، بلکہ محبت عقلیہ مامور بہا ہے، جس کا منشاء محبوب کا کمال ہوتا ہے، سو یہ محبت اللہ و رسول کے ساتھ زیادہ ہے اور کسی کے ساتھ ان کے برابر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے برابر صاحب کمال کوئی نہیں اور خدا تعالیٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی صاحب کمال نہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یقیناً بہ نسبت سب کے زیادہ محبت ہے، مگر عقلی اور غور کر کے دیکھا جائے تو طبعی بھی مسلمانوں کو اللہ و رسول ہی سے زیادہ ہے اور کسی کے ساتھ اتنی محبت نہیں مگر اس کا ظہور کسی محرک کے وقت پر ہوتا ہے۔

### ایک واقعہ

چنانچہ ایک قصہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی، ہمارے اطراف میں ایک بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ زمرے ہیں جو تقویٰ کے اندر ہمارے اکابر میں مسلم و ممتاز تھے، وہ ایک بار موضع گوہی پختہ تشریف لے گئے وہاں کے رئیس نے مولانا سے سوال کیا کہ حدیث میں آیا ہے۔

"لَا يَوْمَنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ أَحِبُّ إِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهِ وَ مَالِهِ وَوَلَدِهِ وَ النَّاسِ أَجْمَعِينَ"

کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہوگا، جب تک اللہ اور رسول اس کی جان و مال

وغیرہ سب سے زیادہ اس کو محبوب نہ ہو جائیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنے والد صاحب سے محبت زیادہ ہے، مولانا نے اس وقت تو اس کا ایک مناسب جواب دے دیا، پھر یہ چاہا کہ ان کے اس شبہ کو علمی طور پر فرغ کر دیا جائے تو زیادہ اطمینان کا باعث ہوگا، چنانچہ آپ نے علمی طور پر اس کا جواب اس طرح دیا کہ تھوڑی دیر میں باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ایسا ہے جس میں ہر مسلمان کو لطف آتا ہے، سب لوگ شوق سے سننے لگے اور وہ رئیس بھی بہت مزے لے لے کر سن رہے تھے، جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں بہت مزہ آرہا ہے تو درمیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قیغ کر کے فرمانے لگے کہ اچھا خان صاحب! اس ذکر کو تو رہنے دیجئے، اب میں کچھ آپ کے والد ماجد کے کمالات و مناقب بیان کرتا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی تھے، وہ رئیس بولے: حضرت! توبہ توبہ! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد صاحب کا تذکرہ کہاں سے ٹھونس دیا؟ نہیں نہیں! آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا تذکرہ کیجئے، میرے والد صاحب کے کمالات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت؟ جو آپ درمیان میں خواہ تو اداں کا ذکر کرنے لگے، میرے قلب کو اس سے بہت گرانی ہوئی مولانا رحمہ اللہ نے ہنس کر فرمایا کیوں خان صاحب؟ تم تو یہ کہتے تھے مجھے والد کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ گراں کیوں ہوا؟ خان صاحب سمجھ گئے کہ مولانا رحمہ اللہ نے میرے شبہ کا علمی جواب دیا ہے، کہنے لگے: ”مولانا! جزاک اللہ! اب میرا شبہ جاتا رہا اور معلوم ہو گیا کہ الحمد للہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی محبت ہے کہ والد کی محبت کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں۔“

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی

مرا باجان جان ہراز کردی

تو صاحبو! موازنہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اللہ و رسول کے برابر مسلمان کو کسی سے محبت نہیں اور موازنہ ہوتا ہے کہ کسی محرک کے پائے جانے پر، مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص تمہارے ماں باپ کو گالی دے اور ایک شخص اللہ و رسول کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی کرے تو بتلاؤ کہ تم کو کس پر غصہ زیادہ آئے گا؟ یقیناً جس نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے، اس پر زیادہ غصہ آئے گا اور تم آپ سے باہر ہو کر اس کی زبان نکالنے پر آمادہ ہو جاؤ گے جب ہر مسلمان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی ذلت اور ماں باپ کی ذلت گوارا کر سکتا

ہے، مگر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ذرا سی گستاخی کا تحمل نہیں کر سکتا تو اب مطمئن ہو کہ بجز اللہ تم کو طبعی محبت بھی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے، مگر اس کا ظہور کسی محرک کے پائے جانے پر ہوتا ہے اور جب آپ کو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے تو اب اس کے کیا معنی کہ بدون سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ؟ صاحبو! اگر کوئی محبوب ایک مہمل زبان تصنیف کر کے عاشق سے اس میں باتیں کرے تو عاشق اگر سچا عاشق ہے تو یقیناً اس کی قدر کرے گا اور وہ مہمل زبان ہی اس کی نظر میں فصیح زبان سے زیادہ پیاری ہوگی، کیونکہ محبوب کی زبان ہے اور قرآن تو مہمل بھی نہیں بلکہ نہایت فصیح و بلیغ و عجیب شیریں زبان ہے جو لوگ سمجھتے ہیں وہ تو اس کی فصاحت اور بلاغت اور شیرینی کو سمجھتے ہیں۔

## قرآن میں مزہ

مگر جو کہ نہیں سمجھتے ان کو اس میں بہت مزہ آتا ہے، تجربہ کر کے دیکھ لو اور جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں، وہ اس کا خوب تجربہ کیے ہوئے ہیں اور اگر کسی وقت کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو ذرا اس سے قرآن سن کر دیکھ لو کہ بدون معنی سمجھے تم کو مزہ آتا ہے یا نہیں؟ واللہ! بعض دفعہ نہ سمجھتے والوں کو بھی ایسا مزہ آتا ہے کہ دل پھٹ جاتا ہے، بس قرآن کی یہ حالت ہے:

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد

برگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن پڑھنا گویا اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے، پھر حیرت ہے آپ عاشق ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنا نہیں چاہتے! حالانکہ محبت وہ چیز ہے کہ عاشق طرح طرح اس کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔

## حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوا تھا ”وَمَا تِلْكَ بِسَمِيِّكَ يَا مُوسَى“ اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس کے جواب میں صرف اتنا کافی تھا کہ ”عصا“ کہہ دیتے، مگر نہیں! چونکہ ان کو محبت تھی تو اس وقت کو غنیمت سمجھ کر کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے، انہوں نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا ”هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّلُ عَلَيْهَا وَاَهْلُسُ بِهَا عَلَى غَنَجِي“

یہ میری لاشھی ہے، میں اس پر سہارا لگا لیتا ہوں اور اس سے کبریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔ کتنی طویل بات کی کہ ”ہی“ بڑھایا اول میں اور یائے منتظم کا اضافہ کیا آخر میں، پھر اس لاشھی کے منافع دو جملوں میں بیان کیے اور اس کے بعد فرمایا: ”وَلَيْفَ ذُنُوبًا مَّارِبًا أُخْرَى“ کہ اس میں میرے اور بھی مقاصد ہیں، یہ اس واسطے بڑھایا تا کہ آئندہ بھی کلام کی گنجائش رہے کہ شاید حضرت حق دریافت فرمائیں کہ ہاں صاحب! وہ اور مقاصد کیا ہیں؟ ذرا وہ بھی بیان کیجئے! تو پھر اور باتیں کروں گا، یا خود ہی عرض کریں گے کہ حضور! اس وقت اس کی شرح نہ ہوئی تھی، میں اب عرض کرنا چاہتا ہوں، غرض آئندہ باتیں کرنے کی گنجائش رکھ لی، یہ بات ابھی ذہن میں آئی، غرض عشاق کو محبوب سے باتیں کرنے میں عجیب مزہ آتا ہے اور یہ دولت مسلمانوں کو گھر بیٹھے ہر وقت نصیب ہے کہ وہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ سے باتیں کر لیں، یعنی قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔

### کلام اللہ پڑھنا

پھر یہ حیرت ہے کہ قرآن کے بدون سمجھے پڑھنے کو بے فائدہ بتلایا جائے، کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے؟ صاحبو! یہ بڑی دولت ہے! مگر اس کی قدر محبت والے جانتے ہیں، پس محبت کی ضرورت ہے، عشاق کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب کا نام سننے میں بھی ان کو مزہ آتا ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے:

الافسقنى حمراً وقل لى هى الخمر

ولا تسقنى سرامتى امكن الجهر

کہ مجھ کو شراب پلا اور زبان سے یہ بھی کہتا رہ کہ شراب ہے شراب ہے، آخر شراب منہ سے لگ جانے کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے کہ نام لیا جائے؟ اس کا یہی راز ہے کہ محبوب کا نام سننے میں مزہ آتا ہے، پھر غضب ہے کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کا نام سننے میں مزہ نہ آئے اور قرآن سے زیادہ خدا کا نام کس کتاب میں ہوگا؟ ہر آیت میں قریب قریب بار بار خدا کا نام آتا ہے اور جا بجا خدا کی حمد و ثناء اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی طریقہ بہتر نہیں، حدیث سے یہ بات تصریح کے ساتھ ثابت ہے مگر نماز اور تلاوت سے زیادہ کوئی طریقہ بہتر نہیں، حدیث سے یہ بات تصریح کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے الفاظ سے اس قدر عشق تھا کہ آپ خود تلاوت کرتے ہی تھے، ایک دفعہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ قرآن سننا! انہوں نے عرض کیا: ”اعلیک اقرء! علیک انزل او کما قال“ کیا حضور کو میں سنناؤں؟ حالانکہ آپ ہی پر اترا ہے! فرمایا: ہاں! میں دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہوں، آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ درخواست کیوں کی؟ حالانکہ سارا قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

حفظ تھا اور اس کے معنی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں حاضر تھے، صرف اسی لیے کہ قرآن کے الفاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشق تھا اور دوسرے کی زبان سے سنتے ہیں بوجہ یکسوئی کے مزہ زیادہ آتا تھا، اس سے معلوم ہو گیا کہ صرف الفاظ قرآن بھی بدون لحاظ معنی کے مطلوب و مقصود ہیں، صاحبو! اس سے بڑھ کر الفاظ قرآن کا نفع اور کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی قراءت کی طرف توجہ فرماتے ہیں، نہایت توجہ سے سنتے ہیں، اب غور کیجئے کہ اگر عاشق کو کسی مجھ سے یہ معلوم ہو جائے کہ مجھ کو بہ تیرا گانا سن رہی ہے، تو بتلائے! وہ کیسے مزے لے لے کر گائے گا! اور کس طرح بنا سنوار کر پڑھے گا! پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل اور اصدق کون مضر ہوگا؟ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے پر بہت متوجہ ہوتے ہیں اور نہایت توجہ سے اس کی قراءت سنتے ہیں، اس سے بھی الفاظ کا مشہور ہونا ظاہر ہے، کیونکہ قراءت اور استماع الفاظ ہی کے متعلق ہے، نہ کہ معانی کے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ہم کو قرآن پڑھتے ہوئے اس امر کا احتضار کرنا چاہے کہ حق تعالیٰ ہماری قراءت کو سن رہے ہیں، اسی مراقبہ کا یہ اثر ہوگا کہ نہایت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ صحت کا لحاظ کر کے قراءت کی جائے گی اور بے پروائی کے ساتھ نہ پڑھا جائے گا۔

### الفاظ بھی مقصود ہیں

دوسرے! اچھا میں نے مانا کہ معنی ہی اصل مقصود ہیں، مگر یہ کبھی نہ مانوں گا کہ معانی ہر وقت مقصود ہوتے ہیں، بلکہ ایک وقت ایسا بھی ضرور ہونا چاہیے، جس میں صرف الفاظ ہی مد نظر ہوں اور معانی پر التفات نہ ہو، جیسا کہ ریاضی میں پہاڑے یاد کیے جاتے ہیں، اس وقت مقصود پر اصلاً نظر نہیں، بلکہ صرف الفاظ ہی کو رٹا جاتا ہے اور جیسے کھانا کھانے سے مقصود قوت ہے، مگر کھانے کے وقت لذت پر نظر ہوتی ہے، صورت پر بھی نظر ہوتی ہے کہ روٹی جلی ہوئی سیاہ نہ ہو، سالن میں نمک مرچ بہت تیز یا کم نہ ہو، اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ مقصود تو قوت ہے، صورت اور لذت پر نظر کرنا بے فائدہ ہے، افسوس! دنیا کی چیزوں میں تو صورت اور لذت پر نظر ہو اور قرآن میں یہ امور بے فائدہ ہو جائیں، حیرت ہے! اور تلاوت قرآن میں لذت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ تلاوت کے وقت معانی کی طرف توجہ نہ ہو، صرف الفاظ ہی پر توجہ ہو، کیونکہ وہ مراقبہ جو ابھی بیان ہوا کہ تلاوت کے وقت اپنے کو پڑھنے والا سمجھے اور حق تعالیٰ کو متکلم سمجھے اور اپنے کو شجرہ شجرہ طور کے حاکم اور ناقل سمجھے یہ مراقبہ صرف الفاظ ہی پر توجہ کرنے میں حاصل ہو سکتا ہے، معانی پر توجہ کے ساتھ یہ مراقبہ نہیں ہو سکتا، چاہیے تجربہ کر کے دیکھ لو، اسی طرح یہ مراقبہ بھی کہ اللہ

تعالیٰ ہماری تلاوت کو سن رہے ہیں، صرف توجہ علی الالفاظ سے حاصل ہوتا ہے، بدون اس کے نہیں ہو سکتا، پھر الفاظ بدون فہم معانی کے بیکار کیوں ہوتے؟

### دریا کی سیر

صاحبو! دریا کی سطح کی سیر میں جو لذت ہے وہ سیر عمیق میں نہیں ہے، گو سیر عمیق سے موتی ہاتھ لگتے ہیں جو سطح کی سیر سے حاصل نہیں ہوتے، مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سطح دریا کی سیر بیکار ہے؟ ہرگز نہیں! اطباء سے پوچھو وہ سطح دریا کی سیر کو فروخت بخش بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے دل و دماغ کو سرور اور نگاہ کو تازگی و نور حاصل ہوتا ہے، چنانچہ مدقوق کے لیے سیر دریا اسی واسطے تجویز کی جاتی ہے کہ اس کو فرحت ہو اور فرحت سے طبیعت کو قوت حاصل ہو، جس سے مرض کو وہ از خود دفع کر دے، تو کیا سطح دریا کی سیر کو تو بیکار نہ کہا جائے اور سطح قرآن کی سیر کو بیکار کہا جائے! کتنا بڑا ظلم ہے! علاوہ ازیں یہ کہ اصل مقصود تمام طاعات سے قرب حق ہے، حق تعالیٰ کے یہاں سے اولاً الفاظ آئے ہیں اور معانی ان کے تابع ہو کر آئے ہیں۔

### الفاظ قرآن

پس الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہوا، اگر یہ الفاظ قرآن بے معنی بھی ہوتے تو عاشق کے لیے یہی کافی تھے، کیونکہ محبوب اگر عاشق کو کوئی چیز دے تو وہاں دو لذتیں ہیں، ایک لذت محبوب کے ہاتھ سے ملنے کی، دوسری لذت اس چیز کے کھانے کی اور ظاہر ہے کہ عاشق کے رقص کے لیے تو یہی لذت کافی ہے کہ اس کو محبوب کے ہاتھ سے یہ چیز ملی ہے، چنانچہ بعض دفعہ اس چیز کو صرف بھی نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ محبوب کی یادگار سمجھ کر بطور تبرک کے رکھ لیا جاتا ہے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ایک قیراط دیا تھا، انہوں نے اس کو خرچ نہیں کیا، بلکہ اس کو ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا، پس عشاق کے لیے تو الفاظ قرآن ہی رقص کے واسطے کافی تھے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً بالذات ہم کو ملے ہیں، گو ان میں معنی بھی نہ ہوتے، مگر معنی سے دو لذتیں جمع ہو گئیں، تو اب کیونکر ہو سکتا ہے، کہ لذت معانی سے لذت الفاظ کو چھوڑ دیا جائے؟ بلکہ دونوں لذتیں قابل لحاظ ہیں اور الفاظ کی لذت اس جہت سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً آئے ہیں، گو باعتبار قصد کے معانی اصل ہیں اور الفاظ ان کے تابع، غرض بعض جہات سے ان الفاظ کو زیادہ قرب ہے اور بعض جہات سے معانی کو زیادہ قرب ہے اور کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں، یہ میں نے اس لیے کہہ دیا کہ کہیں حفاظ خوش نہ ہوں کہ ہم سب سے افضل ہو گئے،

کیونکہ الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب ہے تو وہ ایک طرف فیصلہ کر کے خوش نہ ہوں، میں ایک طرف فیصلہ کر کے ڈگری نہیں دیتا، بلکہ دونوں جماعتوں کے لیے فیصلہ کرتا ہوں کہ بعض جہات سے الفاظ افضل ہیں اور بعض جہات سے اہل معنی اور قرآن کی دونوں چیزیں قابل اہتمام ہیں، صورت بھی اور معنی بھی، کیونکہ ہر چیز کی طرف صورت و معنی دونوں ہی کی وجہ سے رغبت ہوتی ہے۔

### سیرت کے ساتھ صورت پر نظر

صورت کو کوئی بیکار نہیں کہہ سکتا، دیکھئے! کاپلی کی مصری شیرینی تو یہاں کی بجری کے برابر ہے، مگر صورت اور صفائی کی وجہ سے لوگ منگاتے ہیں، کیونکہ صورت خوش دیکھ کر کسی چیز کا کھانا عجیب لطف دیتا ہے، اسی طرح کپڑوں میں ایک صورت ہے، ایک معنی مقصود تو ستر عورت ہے اور گرمی و سردی سے بچانا اس میں ہر قسم کا کپڑا یکساں ہے اور ایک صورت ہے، یعنی کپڑے کی باریکی اور نزاکت اور نقش و نگار وغیرہ ظاہر ہے کہ صورت محض بیکار نہیں، بلکہ اس کے لیے بھی بڑی کوشش کی جاتی ہے اور دیکھئے! عورت کی ایک صورت ہے اور ایک معنی، یعنی تو ہم بستری اور خانہ داری کا کام لینا ہے، اس مقصد کے لیے ہر عاقل بالغ عورت کافی ہے اور ایک صوت ہے کہ رنگ بھی اجلا ہو ناک نقشہ بھی خوبصورت ہو، خاندان کی بڑی ہو، اگر صورت بیکار ہے تو یہاں صورت پر کیوں مرتے ہو؟ اور کیوں اس کے لیے خاک چھانی جاتی ہے؟ اور اسی طرح ادویہ میں بہت چیزیں ایسی ہیں جو باہم یکساں خاصیت رکھتی ہیں، مگر بعض دفعہ ادویہ کو صورت نوعیہ کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے، کیونکہ دوائیں بعض مؤثر بالخاصہ بھی ہوتی ہیں، جیسے ”تعلیق کبرا“، ”خفقان کو نافح“ ہے تو ایسی ادویہ صورت نوعیہ کی وجہ سے مؤثر ہوتی ہیں، یہاں صورت کا لحاظ کیوں کیا جاتا ہے؟ اسی طرح بہت سے الفاظ باہم متحد المعانی ہوتے ہیں، مگر صورت کی وجہ سے ان میں بڑا فرق ہو جاتا ہے، اس لیے بعض الفاظ القاب و آداب میں اپنی صورت کی وجہ سے مطلوب ہوتے ہیں، اگر ان کی جگہ دوسرے الفاظ ان ہی کے ہم معنی بولے جائیں تو سخت حماقت قرار دی جاتی ہے، مثلاً کوئی باپ کو برخوردار، نور چشم لکھ تو پاگل شمار ہوگا، حالانکہ اس کے معنی کچھ بھی برے نہیں، برخوردار بمعنی دامن ظلم کے ہے کہ ہمیشہ دنیا سے پھل کھاتے رہیں، یا صاحب نصیب ہوں اور نور چشم کے معنی ہیں آنکھ کی روشنی تو باپ آنکھ اور کان سب ہی کا وسیلہ ہے، یہ آنکھ کی روشنی بھی اولاد کو باپ ہی سے ملتی ہے، تو معنی تو برے نہیں مگر الفاظ کی صورت کی وجہ سے کاتب کو اتمی اور پاگل بنایا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ ناطہ ہے کہ معنی ہی ہمیشہ مطلوب ہوتے ہیں اور الفاظ مطلوب نہیں ہوتے۔

## صورت کی اہمیت

اس سے بڑھ کر اور سنیئے! انسان کی ایک صورت ہے اور ایک معنی چنانچہ معنی انسان روح انسان ہے، جس کی بدولت آدمی گدھے کتوں سے ممتاز ہے تو اگر یہ دعویٰ مان بھی لیا جائے کہ صوت محض بیکار ہے تو ان مدعیوں کو چاہیے کہ اپنی اولاد کا گلا گھونٹ دیا کریں، کیونکہ یہ تو محض صورت ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ منقذود تو معنی ہیں، یعنی روح اور وہ گلا گھونٹنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، کیونکہ موت سے ارواح فنا نہیں ہوتیں، تو کیا اس کو کوئی عاقل گوارا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! معلوم ہو کہ معنی کی طرح صورت بھی مطلوب ہے، پھر قرآن ہی میں اس کے خلاف یہ نیا مقدمہ کیوں جاری کیا جاتا ہے کہ اس کی صورت یعنی الفاظ بدون معنی کے بیکار ہیں.....؟؟

الحمد للہ میں نے مختلف وجوہ سے مسئلہ کو ثابت کر دیا کہ الفاظ قرآن بدون فہم معنی کے بھی مطلوب ہیں اور ان کا پڑھنا ہرگز بیکار نہیں، اب یہ دعویٰ بالکل باطل ہو گیا کہ بدون معنی کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ۔

## حروف مقطعات کے نکات

اب میں حروف مقطعات کا نکتہ بیان کرتا ہوں، جو ان آیات کے شروع میں وارد ہیں، ان سے بھی اپنا مدعی ثابت کروں گا جیسا کہ میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا۔

حروف مقطعات میں بہت سے نکات ہیں۔ ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ اسرار ہیں درمیان اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معانی سے واقف تھے، مگر دوسروں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے معانی ظاہر نہیں فرمائے، کیونکہ ان کا تعلق محکمہ شراعی عالیہ سے نہیں، بلکہ دوسرے محکمہ سے ہے، ان اسرار کو اسی محکمہ کے آدمیوں پر ظاہر کیا جاتا ہے تو ممکن ہے کہ ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو ان سے واقف کیا گیا ہو، چونکہ امت کو اس محکمہ سے تعلق نہیں اس لیے ہم لوگوں کو اس اسرار پر مطلع نہیں کیا گیا، ایک مرتبہ میں نے درس میں یہی تقریر کی تھی اور اس وقت ایک گورٹ انسپکٹر موجود تھے، وہ کہنے لگے آپ سچ کہتے ہیں، واقعی ہر محکمہ کے خاص اسرار ہوتے ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا، میں نے کہا آپ تو ایسے تصدیق کر رہے ہیں جیسے آپ پر بات گزری ہو؟ کہنے لگے: جی ہاں! مجھے آج کل ہی یہ بات پیش آئی ہے، میں ایک دن سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی پر گیا ہوا تھا، ان کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی میں اس کو دیکھنے لگا تو صاحب نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا: یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے،



اس میں محکمہ خفیہ پولیس کے اصرار ہیں، جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا اور وہ اصرار کچھ اصطلاحات ہیں کہ سی آئی ڈی والے ان اصطلاحات میں ایک دوسرے کو تیار کرنے کے ذریعے سے خبریں دیتے ہیں اور دوسرے لوگ ان اخبار پر مطلع نہیں ہوتے، اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا کہ حیات میں اس کی نظیر موجود ہے۔

### قرآن سے معنی کے ساتھ الفاظ بھی مقصود ہیں

دوسرا نکتہ اس میں ابھی میرے ذہن میں آیا ہے وہ یہ کہ ممکن ہے کہ اس میں اس مضمون پر تنبیہ مقصود ہو کہ قرآن سے محض معانی مقصود نہیں، بلکہ الفاظ بھی مقصود ہیں، کیونکہ بعض الفاظ قرآن میں غیر معمولی المعنی ہیں، اگر صرف معانی مقصود ہوتے تو قرآن میں ایسے الفاظ کیوں ہوتے؟ حالانکہ وہ جز قرآن ہیں، جن کی قرآنییت کا انکار کفر ہے۔

ایک نکتہ اس میں یہ ہے کہ حروف مقطعات میں احاد و عشرات و مآت کو جمع کیا گیا ہے، جس سے بعض اہل کشف نے بعض حوادث پر پیشین گوئی کے استدلال کیے ہیں جو ایک مستقل علم ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے نکات ہیں، خلاصہ بیان یہ ہے کہ محض الفاظ مقصود سمجھو اور معانی کو بیکار نہ محض معنی کو مقصود سمجھو اور الفاظ کو بیکار، بلکہ قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں مقصود ہیں۔

(ایضاً صفحہ ۷۲)

### چوتھا اعتراض..... فرشتوں سے سوال کہ: ”میرے بندے کیا

#### کر رہے ہیں؟“

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق یہ بات کہہ دی تھی جس سے اب تک ان کا بیچھا نہیں چھوٹا، سو ان سے پوچھ کر یہ جملاتے ہیں کہ دیکھو یہ وہی تو ہیں جن کے بارے میں تم نے ایسا کہا تھا، فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا فرشتوں نے کہا تھا:

”انس جعل فیہا من بفسد فیہا“ کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد کہے گا ’من‘ سے مراد عام تھا کہ وہ سب ایسے ہی ہوں گے، سو وہ موجود کلیہ کے مدعی تھے، پس سالہ جزئیہ ان کے مقابلے میں کافی ہو گیا، یعنی ایک ایسے شخص کا پیش کر دینا جو مطہج کامل ہو، ان کے موجودہ کلیہ توڑنے کے لیے کافی ہے، یہ نہیں کہ سارے مطہج ہوں تب ہی ان کا جواب ہو سکے، سو فرشتے ایک دفعہ ہم پر اعتراض کرنے سے پکڑے گئے، آج تک ان کا بیچھا نہیں چھوٹا، جب کوئی

موقع ہوتا ہے تو حق تعالیٰ جتنا دیتے ہیں، اسی طرح فرشتوں کی بدلی ہوتی ہے، عصر اور صبح میں جو فرشتے عصر کے وقت آتے ہیں، دو صبح کے وقت رخصت ہوتے ہیں اور ان کے بجائے دوسرے فرشتے آتے ہیں، پھر وہ عصر کے وقت چلے جاتے ہیں اور دوسرے آ جاتے ہیں، جب واپس ہو کر جاتے ہیں، تو ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے بندے کیا کر رہے تھے؟ وہ عرض کرتے ہیں: یا الہی! جب ہم گئے تھے جب بھی نماز پڑھے رہے تھے اور واپسی کے وقت بھی نماز پڑھتے چھوڑا، اللہ میاں دونوں وقت فرشتوں کو جتلا دیتے ہیں اور بدلی بھی خاص اس وقت کرتے ہیں جو نماز کا وقت ہے اور اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟ حالانکہ فرشتے دیکھتے سب ہیں جو کچھ بندے کرتے ہیں، کیونکہ ان کی شان ہے "بَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ" مگر ان سے صرف اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں اور بلا پوچھے خود وہ کہہ نہیں سکتے۔  
(الصلوٰۃ صفحہ: ۴۵)

## پانچواں اعتراض..... لوح محفوظ کی وسعت پر شبہ کا جواب!

ایک دفعہ ایک منکر غیبات نے مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ سے پوچھا کہ لوح محفوظ کتنی ہی بڑی مان لیجئے مگر کبھی تو ختم ہو جائے گی، ہزاروں لاکھوں برس ہو چکے ہیں، بے شمار چیزیں پیدا ہوئیں اور فنا ہوئیں، کہاں تک لوح محفوظ میں لکھا گیا ہوگا؟ مولانا نے فرمایا کہ تمہارا ذہن ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوتا، اس میں تم نے کتنی چیزیں بھری ہوں گی، مگر وہ ابھی تک خالی ہے، تو لوح محفوظ تو ذہن سے بہت بڑی ہے، ہاں واقعی اتنے سے ذہن میں کس قدر گنجائش ہے کہ دلی، کلکتہ، زمین و آسمان سب کچھ سمایا ہوا ہے، اگر حصول الاشیاء بانفسہانہ مانئے تو بشاہدہا کے قائل ہو جائے، تب بھی شبہ دلی کی دلی کے برابر تو ہوگی، جیسا کہ سوچنے سے صاف معلوم ہوتا ہے، اسی ذہن پیمانہ سہمی کہ اشیاء یا اشیاء لطیف ہیں تب بھی اتنا بڑا آسمان اتنی بڑی زمین اتنی بڑی دلی، ذہن اتنا بڑا کہاں سے ہو گیا؟ تو لوح محفوظ میں تمام چیزوں کا ساجانا کیا مشکل ہے؟ تو ذہن محض اس وسعت میں تو سب کا مشابہ لوح محفوظ کے ہے، مگر علم صحیح سے خاص باعتبار علوم عالیہ کے بھی بالکل سچا نمونہ لوح محفوظ کا ہو جاتا ہے۔  
(روح الجوار صفحہ: ۹)

## چھٹا اعتراض..... مر جانے کے بعد عذاب قبر روح پر ہوتا ہے یا جسم پر!

بات یہ ہے کہ وہ روح ہے جس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے، رہا یہ کہ روح مجرد ہے، یا مادی ہے؟ بعض اہل کشف کا قول ہے کہ مجرد ہے اور بعض متکلمین اس طرف گئے ہیں کہ مادی ہے اور

دلیل یہ بیان کی ہے کہ تجرد و خواص واجب سے ہے، لیکن یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے، بلکہ خود بھی واجب سے قدم اور وجوب ہے، سو جو حکماء مجردات کے قائل ہوئے ہیں وہ مجردات میں قدم بھی مانتے ہیں، یہ بے شک باطل ہے، باقی اگر روح کو مجرد کہا جائے اور حادث بالذات و بالزمان بھی مانا جائے تو کون سی دلیل عقلی کے خلاف ہے؟ غرض بعض متکلمین تو سوائے واجب کسی چیز کے مجرد ہونے کے قائل نہیں اور صوفیہ کرام کئی چیزوں کے تجرد کے قائل ہوئے ان کو لطائف کہتے ہیں، جیسے روح، قلب، سیرخفی و انہی اور کہتے ہیں کہ انسان جس طرح عناصر سے مرکب ہے، اسی طرح ان اجزائے مجردہ سے بھی اور اس پر دلیل بیان کرتے ہیں کہ ہم نے خلوات اور مراقبات میں مجردات کا مشاہدہ کیا ہے، سو جب تک قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو کیونکہ اس کا انکار کر سکتے ہیں؟ تو اگر روح مجرد ہے تو اس پر البتہ بیٹھنا صادق نہیں آتا مگر صوفیہ اس کے قائل ہوئے ہیں اور دوسرے بدن جو مشابہ اسی بدن عنصری کے ہوتا ہے، عالم بزرخ میں دیا جاتا ہے، تو جس طرح یہ جی تھا وہ بھی جی ہے، سب عذاب و ثواب اس پر ہوتا ہے اور اس بدن کی طرح اسے بھی حس ہوتی ہے کیونکہ اس کا مادہ لطیف ہوتا ہے۔

### ساتواں اعتراض..... بارہ بروج کا ثبوت قرآن مجید سے دینا صحیح نہیں!

فرمایا: ”تجمین“ حکماء نہیں، کسی شخص نے ان کو زمرہ حکماء میں نہیں شمار کیا، حکماء وہ لوگ ہیں جنہوں نے حقائق و اصول اشیاء معلوم کر کے دلائل عقلی و براہین قطعی سے ثبوت دیا ہے اور اہل نجوم محض تخمینات و توہمات و خرافات سے کام لیتے ہیں دلائل تو دلائل، دعاوی بھی نور علی نور ہیں! اور ہمارے بعض مفسرین نے غضب ہی کیا ہے کہ بعض آیات کی تفسیر ان کے اقوال پر مبنی کر دی ہے، بعض اصطلاحات ایسے مشہور و معروف ہو جاتے ہیں کہ ان سے اصاغروا کا بروکونی نہیں پختا، الا ماشاء اللہ! چنانچہ بعض مفسرین نے تو قرآن شریف میں بروج سے بارہ بروج اہل ریاضی کے مراد لیے ہیں، حالانکہ وہ خود اجزائے تخیلیہ ہیں، موجود حقیقی نہیں اور متبادر قرآن سے ان کا وجود حقیقی ہے، بس بحیثیت تفسیر صحیح نہیں، سیدی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ہے، فرماتے ہیں کہ بروج سے مراد کوکب عظام ہیں، نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال کو چھوڑ کر اہل ریاضی کی تقلید قرآن مجید میں کی، خود قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے ”وَأَسْمَاءُ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشْتَدَّةٍ“ اس سے صریحاً تاہید ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ہوتی ہے اور بعض نے بیانات و نجوم دونوں کو مخلوط کر دیا، یعنی ان بروج کے ساتھ خاص خاص کوکب کو مختص بھی کر دیا ہے، جس کی بناء محض خرافات نجومیہ ہیں، ورنہ اہل ہیئت بعض کوکب کو بعض بروج

سے مختص نہیں سمجھتے، بلکہ ہر کوکب ہر برج میں گردش کرتا ہے، البتہ اہل نجوم کہتے ہیں کہ بعض کوکب بعض بروج کے ساتھ مختص ہیں اور دلیل وہ لچر پوچھ کہ ناگفتہ بہ، کہتے ہیں کہ مثلاً ایک برج ہے جس میں کچھ کوکب ثابت جمع ہو کر شکل ”اسد“ موہوم ہو گئے اس طور سے اپنے خیال میں سوچا کہ اس کا نام اصطلاحاً ”اسد“ رکھ دیا تھا، اس عققل کے دشمنوں نے یہ گھڑ لیا ہے کہ اسد حار المرآج ہوتا ہے، اس وجہ سے کوکب حار کو شمس سے مناسبت ہے، بھلا کیا محض نام سے اس برج میں حرارت آگئی؟ ان کی عققل کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ اس دلیل سے ”اسد“ کے ساتھ شمس کو مختص کہہ دیا۔

(از ملفوظات ہفت اختر ملفوظ نمبر: ۱۰۲)

### آٹھواں اعتراض..... آیات کی تفسیر قواعد ہیئت پر ہے!

فرمایا: علماء اسلام کے کلام میں جو بعض نصوص متعلقہ کو ان کے قواعد ہیئت پر تطبیق پائی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اقوال مشہورہ ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ان الفاظ کے سنتے ہی تبار ذہن کا ان معانی مصطلحہ کی جانب ہو جائے گو وہ لغتاً مراد نہ ہوں اس سے عام قلوب میں ان امور غیر ثابتہ بالدلیل کی وقعت ہو جاتی ہے، پس نصوص کو بھی ان پر منطبق کرنے لگتے ہیں، حالانکہ ان کے دعاوی کی خود ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، چنانچہ کتب ہیئت میں مصرح ہے کہ شمس کو سماء اربع پر مانا جاتا ہے، لیکن خود ہمارے پاس اس کی کوئی حجت نہیں، اسی طرح بعض نے ثوابت کو ہر ایک کو ہر ایک آسمان میں مانا ہے، ان احتمالات کے ہوتے ہوئے ان پر تفسیر قرآن کو مبنی کرنا محض غیر موہبہ ہے، بلکہ ان سب کے خلاف ان نصوص کی تفسیر میں یہ کہا جاسکتا ہے، کہ سب کوکب و ثوابت و سیارہ و شمس و قمر سماء دنیا میں ہیں اور سب متحرک بالذات ہیں اور ہر ایک کی حرکت علیحدہ ہے اور ثوابت کی حرکت خواہ ذاتیہ اور متشابہ ہو یا آسمان دنیا کے اندر کوئی جز، ایسا ہو جو ان سب کو لے کر حرکت کرتا ہو اور سماء خواہ متحرک ہو یا نہ ہو، البتہ جن کوکب کی چند حرکتیں محسوس ہوتی ہیں، ان میں سے کسی ایک حرکت کو بالعرض کہہ دیں۔

قرآن شریف سے ظاہر ایسی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوکب سماء دنیا میں ہیں اور یہ متحرک بالذات نہیں۔

﴿لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ﴾، ﴿قَوْلِ تَعَالَى: "وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ"﴾

اور: ”كل في فلک“ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ہر کوکب جدا آسمان میں ہے، کیونکہ فلک اور سماء مترادف نہیں ہیں، فلک کہتے ہیں کہ دائرہ کو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوکب کی حرکت سے دائرہ ضرور

پیدا ہوتا ہے، خواہ تحقیقی ہو یا تقریبی اور شریعت سے حرکت سہا ثابت نہیں، بلکہ آسمان جیسا کہ آکب کی حرکت مثل پچھلیوں کی حرکت کے پانی میں سے اور جو کلماء نے جو فلک کو بہت سخت صعب مان کر ان کا خرق و التیام کا حکم کیا ہے، محض اپنے خیال سے لٹیر گھڑا کر باوجود عدم ثبوت مقدمات کے پھر حکم جازم کر دیا چنانچہ متکلمین نے کتب کلامیہ میں ان مقدمات کا جواب دیا ہے۔ (ایضاً مانوٹظ نمبر ۱۰)

نواں اعتراض..... قرآن وحدیث کا جو مطلب علماء بیان کرتے ہیں

وہی درست ہے!

اس شبہ کے اٹھانے کے لیے دوسری نظیر دیتا ہوں کہ قانون وہ ہے جو کہ پارلیمنٹ نے تجویز کیا ہے اور اس کے معنی وہ ہیں جو کہ جج سمجھتے ہیں، کیونکہ آپ سے براہ راست تو خط و کتابت ہی نہیں جو وہ خود آپ سے اس کے معنی بیان کرتے، بس جن لوگوں کو انہوں نے قانون لایا کا اہل سمجھ کر عہدہ دیا ہے، وہ جو معنی قانون کا بیان کریں اس کو ماننا پڑے گا کہ قانون کے درحقیقت یہی معنی ہیں۔

دیکھئے جب ایک ہائی کورٹ کا جج ایک فیصلہ دیتا ہے تو کیا اس وقت آپ کا یہ کہنا قابل سماعت ہوگا کہ قانون کے یہ معنی نہیں جو تم نے سمجھے؟ ہرگز نہیں! اور اگر کوئی ایسا کرے کہ اس کے ساتھ گلچپ ہو اور حکم نہ مانے تو اس کو قانون کی مخالفت قرار دیا جائے گا اور اس کے لیے سزائے جیل تجویز ہوگی، اگر اس وقت آپ یہ کہیں کہ صاحب! آپ حکم ہی نہیں سمجھے، قانون کے یہی معنی ہیں جو میں سمجھتا ہوں تو کیا آپ کے اس کہنے کی سماعت ہوگی؟ ہرگز نہیں! بلکہ جو اب ملے گا کہ تم اپیل کرو، سو دیکھئے کہ ہائی کورٹ کے جج قانون سمجھنے والے تسلیم کر لیے گئے ہیں اور جو یہ قانون کے معنی بیان کریں اس کی مخالفت قانون ہی کی مخالفت قرار دی گئی ہے، کیونکہ پارلیمنٹ کے حکام ہر مقدمہ کا فیصلہ خود تو کرتے نہیں بلکہ وہ اصول و کلیہ بنا دیتے ہیں، اس لیے قانون کے سمجھنے والے ہائی کورٹ کے جج قرار دیے گئے ہیں تو ہر چند کہ ہائی کورٹ کی مخالفت کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں پارلیمنٹ کا خلاف نہیں کرتا، بلکہ جو یہ اس قانون کا معنی بیان کرتے ہیں، اس کا خلاف کرتا ہوں، بس ایسے ہی حضرات ائمہ مجتہدین چونکہ قرآن وحدیث کے سمجھنے والے مان لیے گئے ہیں، اس لیے ان کی مخالفت خدا ورسول کی مخالفت ہے، گو حدیثیں کسی شخص کو ان سے زیادہ معلوم ہوں مگر کثرت معلومات سے مجتہد نہیں ہو سکتا۔

مشاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد

بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

## مجتہدین کی شان

مجتہدین کو حق تعالیٰ نے ایک خاص شان عطا فرمائی ہے، اب کوئی اللہ میاں سے لڑے کہ ان کے اندر یہ قابلیت کیوں رکھی؟ اور ہمارے اندر کیوں نہیں رکھی؟ تو یہ بات ہم سے پوچھنے کی نہیں، خدائے تعالیٰ سے پوچھئے، پھر یہ بھی پوچھ لینا کہ انبیاء کو نبوت دی مجھے کیوں نہیں دی؟ ایک وہ نظم ہے کہ فلاں کو دی پیغمبری:

میری بار کیوں دیر اتنی کرئی؟

اول نظم سے اخیر تک خدا کی شکایت ہے، تو اگر ایسی ترقی ہے تو خدا خیر کرے، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ:

آنکس کہ تو نگرمت نمی گرداند

او مصلحت تو از تو بہتر داند

غرض یہ کہ خدائے تعالیٰ نے مجتہدین میں ایک کمال پیدا کیا ہے، جو ہم لوگوں میں نہیں ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس وقت قرآن سے تم چند ایسی جزئیات استنباط کرو جن کا حکم فقہاء کے کلام میں نہ دیکھا ہو، پھر اول معاملات میں فقہاء کا قول دیکھو اور اپنے استنباط کو ان کے استنباط کے ساتھ موازنہ کرو، تب معلوم ہوگا کہ فقہاء اور مجتہدین کی شان کیا ہے! مگر اس کے لیے بھی ضرورت ہے علم کی سوا کیا کرنے پر بہت آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم میں ائمہ میں مجتہدین میں کتنا بڑا فرق ہے، پس اس تفاوت کی وجہ سے عوام کی تو ایسی مثال ہے جیسے عام رعیت اور علماء کی ایسی مثال ہے جیسے ہائی کورٹ کے جج، پس جب ایک رعیت کو ہائی کورٹ کے جج بلکہ ایک معمولی جج کی مخالفت جائز نہیں تو عوام کو علماء کی مخالفت کب جائز ہوگی؟ میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں سے غلطی نہیں ہوتی بلکہ ہو جاتی ہے، مگر اس کا پکڑنا عوام کا کام نہیں ہے، بلکہ علماء ہی کا کام ہے اور جب تک کہ ایک متدین عالم کا فتویٰ بلا تعارض موجود ہے، عامی کے ذمہ واجب ہے کہ اس کا اتباع کرے تو اب اس کے کہنے کی کہاں گنجائش رہی کہ میں تو علماء کی مخالفت کرتا ہوں خدا اور رسول کی مخالفت نہیں کرتا! پس معلوم ہوا کہ علماء کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں حتیٰ کہ اگر آپ کے سامنے ترجمہ حدیث کا موجود ہو جب بھی آپ کو علماء کی مخالفت جائز نہیں، کیونکہ ترجمہ سمجھنے کے لیے بھی علم کی ضرورت ہے جیسے کہ آپ کا قانون کا ترجمہ ہو گیا ہے، مگر پھر بھی کوئی شخص جج کی مخالفت میں اپنی رائے نہیں پیش کر سکتا گو وہ قانون کا ترجمہ ہونے کی حالت میں ہوتا یعنی قانون کا مخالف قرار دیا جائے گا، تو اسی طرح اگر حدیث کا ترجمہ ہو گیا ہے، مگر پھر بھی آپ کو اجتہاد کرنا اور علماء سے

مزاہمت جائز نہیں اور جس طرح حکام کی مخالفت کرنے والا واقع میں گورنمنٹ کی مخالفت کرنے والا ہے، اسی طرح علماء کی مخالفت کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت کرنا اور علماء کی مخالفت کر کے یہ عذر کرنا کہ ہم خدا اور رسول کے خلاف نہیں کرتے، نہایت نازیبا اور لچر عذر ہے۔

### علماء کی پیروی

الحمد للہ! یہ امر بہت خوبی کے ساتھ ٹٹے ہو گیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ علماء کا اتباع کریں میں کہتا ہوں کہ آپ کو علم دین سے اتنی بھی مناسبت نہیں جتنی کہ ہر شخص کو طب کے ساتھ ہوتی ہے، چونکہ طب سے تو ہر ایک شخص کو کم و بیش مناسبت ہوتی ہے اور تجربہ بھی ہوتا ہے، برخلاف علم دین کے کہ وہاں کسی کا تجربہ کام نہیں دیتا تو جتنی طب کے ساتھ مناسبت ہے اتنی بھی دینیات کے ساتھ نہیں مگر باوجود اس کے کتنا بڑا کوئی شخص ہو، مگر جب بیمار ہوگا طبیب ہی سے رائے لے گا، کبھی طب کی کتابیں دیکھ کر مسہل نہ لے گا، اگرچہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ صغراء کا فساد ہے جب بھی رائے اپنی سے علاج نہیں کرے گا، لیکن کسی نے ایسا کیا ہے؟ ہرگز نہیں اس کی ہمت نہیں ہوتی، اگر کوئی یہ رائے دے بھی کہ طبیب کی کیا ضرورت ہے؟ تو یہ کہیں گے کہ بغیر طبیب کے علاج نہیں ہونا چاہیے، اپنی عقل اور رائے سے خدا جانے کیا خرابی پیدا ہو، اس کے راز سے طبیب ہی واقف ہیں، پس طب میں تو باوجود مناسبت ہونے کے اپنی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا، مگر علم دین میں باوجود مناسبت نہ ہونے کے ہر شخص اجتہاد کرنے لگتا ہے، تو گویا شریعت کوئی راز ہی نہیں ہے اور وہ ایسی پامال اور معمولی شے ہے کہ اس کے لیے علم کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر شخص خود اس کو سمجھ سکتا ہے، حالانکہ جیسے وہاں کوئی کیسا ہی عاقل سے عاقل ہو، مگر بدون اتباع طبیب کے چارہ نہیں اسی طرح امور شریعت میں سوائے اتباع علماء دین کے چارہ نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ بغیر ماہر کو ماہر کا اتباع کرنا ضروری ہے، پس عقلی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ علماء کا اتباع آپ کو ضروری ہے اور وہ جو احکام بتلاتے ہیں وہ درحقیقت خدا اور رسول کے احکام ہیں، پس جب یہ خدا اور رسول کے احکام ہیں تو ہر مسلمان کو ان کی اتباع کرنا چاہیے، کیونکہ مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا اور رسول کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ (اتباع المذنب صفحہ: ۱۴)

### دسواں اعتراض..... طاعون میں اعمال کی خرابی!

آج کل تو اس مذاق ہی کے لوگ کم ہیں جو ان مصائب کو اعمال کی خرابی کی طرف منسوب کریں بلکہ بہت سے لوگ ان کو اسباب مادیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ہوا بگڑ گئی اس سے طاعون

ہو گیا، میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ طاعون میں ہوا بگڑنے کو دخل نہیں، ممکن ہے کہ اس کو دخل ہوگا۔  
 ہو مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ شریعت کے بتلائے ہوئے سبب کا کیوں انکار کرتے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہو  
 سکتا کہ ایک چیز کے متعدد اسباب ہیں؟ ایک سبب قریب ہو ایک سبب بعید، ایک سبب ظاہری ہو،  
 ایک سبب حقیقی ہو آپ کہتے ہیں ہوا بگڑنے سے طاعون ہوا میں کہتا ہوں کہ یہ ظاہری سبب ہے حقیقی  
 سبب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گناہوں کی کثرت کی اس کا انکار آپ کس دلیل سے کرتے ہیں؟ میں  
 اس مقصود کے واضح کرنے کے لیے ایک مثال بیان کرتا ہوں، اس سے آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ  
 ظاہری سبب اور حقیقی سبب میں کیا فرق ہے؟

مثلاً ایک شخص کو چھاسی ہو گئی اور وہ مر گیا، اب دو شخصوں میں گفتگو ہوئی کہ اس کی پھانسی کا  
 سبب کیا ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ صرف اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کسی طرح سے تختے کے اوپر پہنچ  
 گیا اور ریشمی پھندا اس کے گلے میں بڑ گیا، پھر کسی طرح تختے اس کے نیچے سے الگ ہو گیا، تو اس  
 کا گھلا گھٹ گیا اور مر گیا۔ ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اس پھانسی کا سبب یہ ہے کہ اس نے ایک  
 جرم کیا تھا، اس وجہ سے اس پر حاکم نے ناراض ہو کر پھانسی دلوادی، تو کیا اس پر وہ پہلا شخص یہ  
 اعتراض کر سکتا ہے کہ تم سائنس کے منکر ہو کہ اس کی موت کا سبب تو اختناق (یعنی گھاگھٹ جانا)  
 ہے اور تم جرم کو اس کا سبب بتلاتے ہو؟ کیا اس جرم نے آ کر اس کا گھلا گھونٹ دیا؟ ظاہر ہے کہ وہ  
 یہ اعتراض کبھی نہیں کر سکتا اور اگر کوئی احمق یہ اعتراض کرے بھی تو تمام مخلوق اس کو پاگل بنائے گی  
 اور یہ کہے گی کہ تیرا یہ کہنا صحیح ہے کہ موت کا سبب اختناق ہے، مگر اس کا اصل سبب تو حاکم کا حکم ہے  
 اور اس حکم کا سبب اس کا جرم ہے۔

غرض اس اختلاف میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ وہ شخص سچا حق پر ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس سبب طبعی  
 کا سبب خود اس کا فعل ہے، ورنہ پھانسی تو پہلے سے بھی موجود تھی، پہلے سے کیوں نہ مر گیا؟ اور اب  
 بھی موجود ہے، پھر اس سے روزانہ موتیں کیوں نہیں ہوتیں؟ تو صاحبو! غضب کی بات ہے کہ اس  
 شخص کو تو محقق سمجھا جائے اور علماء کو جو کہ طاعون کا سبب آپ کے گناہوں اور افعال کی خرابی کو  
 بتلاتے ہیں، غیر محقق کہا جائے، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس کو کوتاہ نظر کہا جاتا ہے، اسی کی نظر کو  
 دوسری جگہ عالی نظر کہا جاتا ہے؟

غضب ہے کہ دین ہی کے موقع پر سب لوگ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

## ایک حکایت

اس پر مجھے ایک دوست کی بیان کی ہوئی حکایت یاد آئی ہے کہ انہوں نے لاہور کے پاگل خانے



میں ایک مجنون کو دیکھا کہ وہ سب باتیں ٹھکانے کی کرتا تھا جس سے کسی کو بھی نہ معلوم ہوتا تھا۔ پانگل ہے، مگر جہاں اس کا نام اس کے سامنے لیا گیا اس پر جنون سوار ہوا، یہی حالت آج کل ہمارے بھائیوں کی ہے کہ جب تک ان کے سامنے دین کا نام نہ لو تو عاقل بھی سمجھدار بھی سب کچھ ہیں، مگر جہاں دین کا نام کسی نے لیا اور وہ کوٹاہ نظر ہوا، صاحبو! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جو شخص چھانسی کا سبب ڈکیتن بتلاتا ہے، اس کو تو تم عاقل کہتے ہو؟ اور اس کی نظیر وہ عالم شریعت ہے جو طاعون کا سبب آپ کی بد عملی کو بتاتا ہے، یہ شخص عالی نظر کیوں نہیں؟ چونکہ یہ دین کا معاملہ ہے، اس لیے اس میں علماء کو تو کوٹاہ نظر سمجھا جاتا ہے اور اس شخص کو عالی نظر سمجھا جاتا ہے جو ریشم کو طاعون کا سبب بتاتا ہے، میں کہتا ہوں کہ اچھا! تم نے مانا کہ طاعون کا سبب آپ وہ ہوا کہ خراب ہونا ہی تھی، لیکن یہ بتاؤ کہ آب وہوا کے خراب ہونے کا سبب کیا ہے؟ اگر اس کا کوئی بھی سبب ہے تو اس کا کیا سبب ہے کیوں کہ ہر حادث کی ابتدا ایک قدم پر ضروری ہے تو اس کی ابتدا بھی قدیم ہوگی اور قدیم پر انبیاء نہ مانو تو تسلسل لازم آئے گا، کیونکہ ہر حادث حلت علت اور سبب کا محتاج ہونا ہے اور تسلسل محال ہے، تو منتہا ہونا ضروری ہے اور منتہا ہونے کے قبل سوائے مشیت الہی کے اور کوئی چیز نہیں تو جس طرح حاکم نے چھانسی کا حکم دیا تھا جس سے مجرم ہلاک ہوا، اسی طرح حق تعالیٰ نے کارکنان قضا و قدر کو حکم دیا تھا جس سے مجرم ہلاک ہوا، اسی طرح حق تعالیٰ نے کارکنان قضا و قدر کو حکم دیا کہ آب وہوا کو خراب کر دو، انہوں نے آب وہوا خراب کر دی جس سے چوہے مرنے لگے اور طاعون پھیل گیا، اب جیسا کہ وہاں ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے جو یہ بتلائے کہ چونکہ اس شخص نے جرم کیا تھا اس وجہ سے حاکم نے چھانسی کا حکم دیا اسی طرح یہاں بھی ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے، جو یہ بتلاوے کہ گناہوں کی وجہ سے بلائیں نازل ہوئی ہیں۔ تو سنو! وہ سچا صرف قرآن ہے جس میں حق تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔

”وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَمَا تُسَبِّبْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْبُؤْا عَنْ كَلِمَةٍ“

کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تمہارے ہاتھوں کے کرتوت سے پہنچی ہے اور حق تعالیٰ بہت سے گناہوں سے درگزر بھی کرتا ہے، پس یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سبب اس طاعون کا ہماری بد عملی اور سیاہ کاری ہے.....!!



گیار ہواں اعتراض..... مصیبت اگر گناہوں کی وجہ سے آتی ہے تو

### کفار پر آنی چاہیے

مصائب کا سبب جیسا کہ گناہ ہے، اسی طرح رنج درجات بھی اس کا سبب ہے، بعض دفعہ امتحان اور آزمائش کے لیے اور درجات بلند کرنے کے لیے بھی بلائیں نازل ہوتی ہیں، سینے! حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

”أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْتُمُ الْبَاءُ سَاءَ وَالضَّرَّاءُ وَزُلُوفًا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللَّهُ إِلَّا نَصُرَ اللَّهُ قَرِيبٌ“

”کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ جنت میں ویسے ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تم کو وہ حالت پیش نہیں آئی ہے جو پہلے لوگوں کو پیش آ چکی ہے کہ ان کو لڑائی اور تکلیف پہنچی اور وہ یہاں تک جھڑھڑائے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ والے مسلمان کہنے لگے کہ دیکھئے اللہ کی مدد کب آتی ہے؟ تو سن لو! اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔“

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

”حَتَّى إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّى مَنْ نَشَاءُ وَلَا يَرِدُ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ“

”یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہو گئے اور کفار نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا اس وقت ہماری مدد آئی تو جن کو ہم نے چاہا ان کو نجات دی گئی اور باقی لوگ ہلاک کیے گئے اور ہمارے عذاب مجرم لوگوں سے مل نہیں سکتا۔“

ان آیتوں سے حاصل مشترک اتنا ثابت ہوا کہ پہلے زمانے میں حضرات مقبولین پر اور ان سے بڑھ کر رسولوں کا طبقہ ہے جن میں معصیت کا احتمال ہی نہیں ان پر ایسے ایسے مصائب آئے کہ رسول گھبرا کر کہنے لگے کہ متی نصر اللہ! کہ خدا کی مدد کب آئے گی؟ ”حَتَّى إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ اِى مِنْ اِيْمَانٍ قَوْمِهِمْ“ یہاں تک کہ رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے اور انبیاء علیہم السلام کی یہ حالت نہ تھی کہ ایک وعظ کہہ کر جو دیکھا کہ لوگ جنید بغدادی نہیں ہوئے، تو ان کی اصلاح سے ناامید ہو جائیں بلکہ حالت یہ تھی کہ ایک مدت تک وعظ کہہ کر بھی ناامید نہ ہوتے تھے،

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو نصیحت کی اور تا امید نہ ہو گئے، جب اتنی مدت میں بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا، تب ان کے ایمان سے مایوس ہوئے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کتنی مدت دراز تک اپنی قوم سے مایوس نہ ہوتے تھے، تو اتنی طویل مدت کے بعد نصرت خداوندی نازل ہوئی تھی اور اس وقت تک حضرات انبیاء علیہم السلام اور مؤمنین مصیبتیں ہی جھیلتے تھے۔ ”وَوَظَنُوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا“ کی تفسیر میں بہت اقوال ہیں اور بعض سخت اور مشکل ہیں، مگر سہل یہ ہے کہ ”ظنوا“ کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہے کہ کفار نے نہ کہا کہ ہم مکذوب ہیں، یعنی رسولوں نے جو ہم کو عذاب کی دھمکی دی ہے وہ جھوٹ بات ہے، اگر سچی ہوتی تو اس مدت دراز میں عذاب کے کچھ تو آثار معلوم ہوتے۔

### حضرات انبیاء علیہم السلام پر عذاب

غرض ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور پہلے مقبولین ایک مدت تک ”مَسْتَهْتِمُ الْبِئْسَاءِ وَالصَّرَاءِ“ کی حالت میں اور ایسی ایسی بڑی مصیبتوں میں رہے کہ ایسی مصیبتیں ہم لوگوں کو کبھی پیش بھی نہیں آتیں، مگر آج ترکوں (جس زمانے میں یہ وعظ ہوا تھا اس زمانہ میں ترکی کی جنگ کفار سے جاری تھی، بعض دفعہ بہت متوحش خبریں آئی تھیں کہ ترک مغلوب ہو گئے) کی ذرا سی حالت میں لوگوں کو خدا تعالیٰ سے بدگمانی ہونے لگی، یاد رکھو! خدا تعالیٰ پر کبھی کسی کو بدگمانی کا حق نہیں، ان حکومتوں کے راز کسی کو کیا معلوم؟ آپ اپنے خانگی معاملات کے راز اپنے نوکروں کو نہیں بتلاتے، حالانکہ آپ میں اور ان میں بہت تقارب ہے، مگر اس کے باوجود بھی اپنا بھید آپ نوکروں کو نہیں بتلاتے تو خدا کیوں آپ کو اپنے معاملات کے راز بتادیں؟ آپ میں اور خدا میں تو کچھ بھی مناسبت نہیں ”چہ نسبت خاک رابا عالم پاک“ اسی کو حافظ فرماتے ہیں:

حدیث مطرب دی گو دراز دہر کمتری جو

کہ کس نکشود نکشاید حکمت ایں معمار

بہر حال حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں جن کی وجہ سے مقبولین پر بھی وہ مصائب نازل کرتے ہیں:

جان صدیقان ازیں حسرت برینخت

کاسماں بر برق ایشاں خاک مخیت

زاں بلا با کانبیاء برداشتند

سر پچرخ ہفتتیمین افراشتند

## درجات کی بلندی

یہ گو یا رفح درجات ہے، ان بلاؤں سے مقبولین کے درجے بلند ہوتے ہیں، نیز اس میں مجاہدہ اضطراب یہ بھی ہے کہ مصائب سے اخلاق درست ہو جاتے ہیں، نفس کی اصلاح بہت کچھ ہو جاتی ہے، جب ہم لوگوں کو اپنے نفس کی اصلاح اور درستگی اخلاق کی خود فکر نہیں ہوتی تو حق تعالیٰ مجاہدہ اضطراب یہ سے ہماری اصلاح فرماتے ہیں، آپ ان شکستوں کی خبروں سے یہ سمجھتے ہیں کہ ترک مغلوب ہو گئے، مگر آپ کو کیا معلوم کہ اس سے جو ان کے نفس کی اصلاح ہوتی ہوگی وہ کتنی فتوحات کا پیش خیمہ ہوگی؟ یہی حال طاعون میں سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں طاعون کا زیادہ پھیلنا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ مسلمان خدا تعالیٰ کے نزدیک ان کافروں سے بھی زیادہ ذلیل ہیں، ہرگز نہیں! بلکہ کبھی مسلمانوں کے درجے بلند کرنے اور ان کو شہادت کے مرتبے دیئے منظور ہوتے ہیں، اس لیے ان میں طاعون زیادہ پھیلتا ہے، حدیث میں صاف تصریح ہے: "المطعمون شهید" یعنی طاعون میں مرنے والا شہید ہے، اسی لیے جو لوگ اس راز کو سمجھتے ہیں وہ ہر بلا سے خوش ہوتے ہیں نہ وہ شکست و ہزیمت سے گھبراتے ہیں نہ طاعون سے پریشان ہوتے ہیں اور یوں کہتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجان من

دل فدائے یار دل رنجان من

اور دوسروں کو بھی اس کی وصیت کرتے ہیں کہ محبوب حقیقی سے راحت میں اور رنج میں غرض ہر حال میں خوش رہنا چاہیے۔

بس زبون و سوسہ باشی ولا

گر طرب را بازوانی از بلا

یعنی دونوں حالتوں میں کچھ فرق نہ ہونا چاہیے، سمجھ کر کہ یہ حالت محبوب ہی کی طرف سے ہے دونوں پر راضی رہنا چاہیے یہ تو خواہ کلفت ظاہری ہو یا باطنی، وہ ہر ایک پر راضی رہتے ہیں اور باطنی کلفت پر راضی رہنا یہ بہت بڑا صبر ہے، کیونکہ ظاہر کلفت میں صرف جسم کو تکلیف ہوتی ہے، روح کو بلاشت رہتی ہے اور باطنی کلفت میں یہ وہم ہو جاتا ہے کہ مردود ہو گیا کہ حالت قبض میں ایسا ہوتا ہے اور یہ خیال سا لک کے لیے سخت سواہن روح ہے، مگر وہ اس پر بھی راضی ہوتے ہیں۔

باغبان گریخ روزے صحبت گل بایش  
 برجھائے خار جہراں صبر بلبل بایش  
 اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال  
 مرغ زریک چون بدم اقدار تحمل بایش  
 آگے اسی کی تمہیم کے لیے کہتے ہیں:

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریت  
 راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایش

یہ اسی لیے کہا کہ کبھی ذکر کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ میں اتنا کام کرتا ہوں، اتنا مجاہدہ کرتا ہوں پھر  
 یہ پریشانی کیوں؟ تو کہتے ہیں:

راہرو گر صد ہنر وارد توکل بایش

(الاسراف صفحہ: ۱۲۳-۱۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مقبولین پر کفایتیں آتی ہیں، ظاہر پرستوں کو اس سے شبہ ہو جاتا ہے کہ اگر گناہوں  
 کی وجہ سے مصیبتیں آتی ہیں تو انہوں نے کیا گناہ کیا تھا؟ بلکہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ نیک بندے  
 اور مقبولین کو فقر و فاقہ وغیرہ کی تکلیف زیادہ رہتی ہے اور رند، بازاری لوگ ہر طرح عیش و مزے  
 میں زندگی گزارتے ہیں، یعنی ظاہری عیش ان کو زیادہ ہوتا ہے، کھانے پینے میں تنگی نہیں ہوتی، مگر یہ  
 شہ لغو ہے، کیونکہ دنیا میں عادیۃ اللہ یہ ہے کہ سب نعمتیں ایک شخص کو نہیں دی جاتیں، کسی کو ظاہری  
 عیش نصیب ہوتا ہے، کسی کو باطنی عیش عطا فرماتے ہیں، ایسے بندے بہت کم ہیں جن کو دونوں عیش  
 نصیب ہوں، اسی کو ایک محقق کہتے ہیں:

کم عاقل عاقل اعیت ہذاہبہ

و جاہل جاہل تلقاہ مرزوقا

ہذا الذی ترک الاوہام حائرة

وصیر العالم النحریر زندبقا

### خوشحالی و بدحالی

یعنی دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض عاقل کامل تنگی میں ہیں کہ ان کو کوئی ذریعہ معاش میسر نہیں  
 اور جاہل کامل صاحب نصیب اور وسعت رزق سے مالا مال ہے، اس بات نے عقلموں کو حیران  
 کر دیا اور بعض تبحر عالم اس سے زندگی ہو گئے، نعوذ باللہ من ذلك!

## ایک واقعہ

سویہ مسئلہ ایسا باریک ہے کہ اس سے ہزاروں عالم بدوین ہو گئے، مگر جس کو خدا پچائے وہ بیخ سکتا ہے، اس نکتے پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی کہ ایک درویش تھے جو چلے جا رہے تھے، ایک شہر میں پہنچے تو وہاں پچانک بند دیکھا، پوچھا کہ بھائی پچانک بند کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ بادشاہ کا باز جھوٹ گیا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے جائیں تاکہ باز باہر نہ چلا جائے، درویش کو بادشاہ کی حماقت پر بہت تعجب ہوا، یہ ناز میں آ کر کہنے لگے کہ واہ اللہ میاں نے ایتھے کو بادشاہی دے رکھی ہے ایک ہم ہیں کہ پاؤں میں جوتیاں تک سالم نہیں، بعض اہل اللہ پر ناز کی شان غالب ہوتی ہے، وہاں سے ارشاد ہوا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ اس کی سلطنت مع اس کی حماقت کے تم کو دیں؟ اور تمہاری صلاحیت اور عقل مع تمہارے فقر و فاقہ کے اس کو دے دیں؟ درویش ڈر گیا اور کانپ گیا کہ کہیں ساری عمر کی کمائی سلب نہ ہو جائے اللہ! میں اس پر راضی نہیں ہوں، میں اپنی حماقت سے توبہ کرتا ہوں۔

سو واقعی عقل وہ دولت ہے جس کے سامنے ہفت اقیم کی سلطنت گرد ہے، اگر ایک عاقل تنگدست ہو اور ایک بیوقوف مالدار ہو تو عاقل کو غور کرنا چاہیے کہ میرے پاس عقل کی کتنی بڑی دولت ہے.....!!

(ایضاً ۱۶ تا ۱۵)

## عقل کا تبادلہ دولت ہے

الغرض ان درویش کو یہ کہا گیا تھا کہ کیا تم راضی ہو کہ تمہارا فقر و فاقہ اور صلاحیت اور علم بادشاہ کو دے دیا جائے؟ اور اس کی سلطنت اور حماقت تم کو دے دی جائے؟ اسی طرح جو لوگ کفار کی ثروت اور عیش کو دیکھ کر اپنی مصیبت و تکلیف پر نظر کر کے لپٹاتے اور خدا تعالیٰ کی شکایتیں کرتے ہیں، ان کو سمجھنا چاہیے کہ اگر حق تعالیٰ کفار کا کفر اور ثروت و عیش ان کو دے دیں اور ان کا فقر و فاقہ و ایمان ان کو دے دیں، تو کیا وہ اس پر راضی ہوں گے؟ اگر اس پر راضی نہیں ہو سکتے اور یقیناً کوئی مسلمان اس پر راضی نہ ہوگا، تو ان کو خدا تعالیٰ کی شکایت کرتے ہوئے ڈرنا چاہیے اور اپنے ایمان کی دولت پر خدا کا شکر کرنا چاہیے۔

## امام غزالی رحمہ اللہ کا قول

علامہ امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جس عالم کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ مجھے مال کیوں نہیں ملا؟ تو گویا

وہ یہ کہتا ہے کہ بادشاہ نے مجھے گھوڑا تو دے دیا، گدھا کیوں نہیں دیا؟ گدھا بھی مجھے دو، تو اس کا یہ کہنا غلط ہے، بلکہ جب تمہیں گھوڑا مل گیا تو گدھا کسی دوسرے کو دے دیا جائے گا، اسی طرح یہ استدلال ہے کہ ہمیں علم ملا، تدبیر ملی تو مال بھی مانا چاہیے، سوسا کو جاننا چاہیے کہ یہ اس کی غلطی ہے جب تم کو علم دیا گیا ہے تو مال کسی دوسرے کو ملے گا، پس جو لوگ اس راز کو سمجھ گئے وہ ایسی تمنا سے بچ گئے ورنہ زندیق بنوئے میں کوئی تعجب ہی نہیں۔

## مصیبت کیوں آتی ہے؟

غرض یہ شبہ اس لیے واقع ہوا تھا کہ آپ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مصیبت ہمیشہ گناہی سے آتی ہے، حالانکہ کبھی رفع درجات کے لیے بھی آتی ہے، ممکن ہے کہ اس کو کوئی تاویل سمجھے، تو بات یہ ہے کہ محبت میں سب باتیں ظاہر ہیں ورنہ کچھ بھی نہیں، اگر خدا تعالیٰ سے تعلق اور لگاؤ ہو تو ہر مسئلہ میں انسان کی تسلی ہو سکتی ہے، طبیعت خود بخود دروہ نکال لیتی ہے اور اگر تعلق نہ ہو تو سچی بات بھی تاویل معلوم ہوتی ہے، اگر اس تقریر سے کسی کی تسلی نہ ہوئی ہو تو وہ یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ حکیم ہیں، ان کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں اور حکمت کا مقننضاء یہ ہے کہ اس عالم میں ہر چیز کسی سبب اور علت کے ساتھ وابستہ ہے، پس لامحالہ مصائب اور تکالیف کا بھی کوئی سبب ہونا چاہیے، مگر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسبب کے لیے ایک ہی سبب ہوتا ہے اور کبھی ایک مسبب کے لیے کئی سبب ہوتے ہیں۔ جیسے چلنا کہ اس کے کئی سبب ہوتے ہیں کبھی نماز کے لیے چلتے ہیں، کبھی قضا حاجت کے لیے کبھی کسی پر ظلم کرنے کے لیے اور جیسے غصے کہ کبھی دشمن پر آتا ہے جس کا سبب عداوت ہے اور کبھی کسی وجہ سے دوست پر بھی آتا ہے، غرض ایک مسبب کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، اب بعض دفعہ ان اسباب میں سے ایک سبب ظاہر ہوتا ہے اور بقیہ اسباب ذرا خفی ہوتے ہیں، تو کوتاہ نظر آدمی اسی ظاہری سبب کو سبب سمجھ لیتا ہے اور باطنی اسباب پر اس کی نظر نہیں ہوتی تو اس لیے وہاں ضرورت ہوتی ہے جمیع اسباب کے احاطہ کی بجائے میں اس کی ایک اور مثال بیان کرتا ہوں کہ مسبب واحد کے لیے کئی اسباب بھی ہوتے ہیں۔

## ایک مثال

مثلاً آپ کو ایک شخص نے بڑے زور سے دبا یا اور ایسا دبا یا کہ آپ کی ہڈی پسلی ٹوٹنے لگی تو دیکھیے! دبانے کے اسباب جدا جدا ہیں، ایک تو یہ کہ راستہ میں آپ کو کوئی دشمن ملا، اس نے آپ کو کوئی تکلیف پہنچانے کے لیے دبا یا اور ایک صورت یہ ہے کہ آپ کو کوئی ایسا شخص ملا جس کے

دیکھنے کو آپ ترستے تھے اور یہ امید بھی نہ تھی کہ آپ کو وہ ہاتھ لگائے گا، دفعہ وہ شخص بے خبری میں آپ کو ہالے اور بہت زور سے دبوچے ممکن ہے کہ جب تک آپ کو یہ علم نہیں کہ دبانے والا کون ہے اس وقت آپ کو تکلیف اور پریشانی رہے، مگر جب یہ معلوم ہو جائے کہ دبانے والا کون ہے، اس وقت آپ کیا نہیں گئے:

اسیرت نخواہد رہائی زبند  
شکایت نہ جوید خلاص از گمند

اگر تھوڑی دیر کے بعد آپ کی جان پر ترس کھا کر خود چھوڑنا بھی چاہے کہ مبادا کہیں آپ مرنے جائیں تو آپ یہ کہیں گے:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغیت  
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہ کہیں گے:

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے  
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے!

تو دیکھئے اس سبب واحد ہے اور سبب مختلف ہے، مگر ہر ایک کا اثر جدا ہے، جو بابت عداوت کی وجہ سے پڑا اس کا دوسرا اثر ہے اور جو محبت کی وجہ سے ہے، اس کا دوسرا اثر ہے، جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ایک سبب کے لیے مختلف اسباب بھی ہوا کرتے ہیں تو اب سینے کے آپ نے اب تک صرف ایک سبب کو سنا ہے "مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ" کہ جو مصیبت آتی ہے وہ انسان کی بد اعمالی کی وجہ سے آتی ہے۔

### انبیاء علیہم السلام پر مصائب

دوسرا سبب بھی تو سینے! حدیث میں ہے: "أشد الناس بلاء الانبياء ثم الامثل فالمثل" کہ سب سے زیادہ سخت بلا انبیاء علیہم السلام پر آتی ہے، پھر ان لوگوں پر جو ان کے بعد دوسروں سے افضل ہوں، و علی ہذا معلوم ہوا کہ کلفت کا سبب فقط ایک ہی نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام یقیناً گناہوں سے معصوم ہیں تو ان پر گناہوں کی وجہ سے کلفت و رنج کا آنا ممکن نہیں، لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ کبھی رفع درجات کے لیے بھی کلفت پیش آتی ہے، اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت گناہ ہی کی وجہ سے آتی ہے، کیونکہ "مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ" سے عموماً استفاد ہوتا ہے اور "فِيمَا كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ" سے ظاہر احصر معلوم ہوتا ہے اب اس آیت کا اس حدیث



سے تعارض ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا رفع درجات کے لیے بھی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ حدیث و قرآن میں تعارض کے وقت قرآن ہی کو ترجیح ہوگی، پس یہی ثابت ہوا کہ گناہ کی وجہ سے مصیبت آتی ہے، جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اور اس شبہ تعارض کا جواب خود اس آیت میں موجود ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ”مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ“ کہ جو یہ کجتم کو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے کرمات سے آتی ہے، تو یہاں مصیبت کا لفظ ہے اور حدیث میں مصیبت کا لفظ نہیں ہے، وہاں بلا کا لفظ ہے، پس آیت کا حصر بالکل صحیح ہے، کیونکہ مصیبت مذہبیں ہی کو آتی ہے اور مقبولین اہل مصیبت نہیں ہیں، وہ اہل بلا ہیں، ان پر جب بھی بلا آتی ہے رفع درجات اور ازادیا و محبت ہی کے لیے آتی ہے اور مصیبت اور بلا میں صورۃ فرق کم ہوتا ہے، ظاہر میں دونوں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں، مگر آثار میں دونوں کے بڑا فرق ہوتا ہے، جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کی حقیقت بھی الگ الگ ہے، پس مصیبت کی حقیقت ہے عز اور انقاس اور بلا کی حقیقت ہے محبوبانہ چیزیں سبھاڑ اور امتحان، محبوب کے دبانے اور کھینچنے کو مصیبت کوئی نہیں کہا کرتا، پس انبیاء اور مقبولین پر بلا آیا کرتی ہے، مصیبت نہیں آیا کرتی اور بلا کے معنی لغت عربی میں آزمائش اور امتحان کے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے دو شخصوں کے برابر بخار آتا ہے! آخر اس کی کیا وجہ ہے کیا لغو یا اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ صادر ہوتے تھے، ہرگز نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے بالکل معصوم تھے اور اگر کوئی لغزش اپنے درجہ کے مناسب ہو بھی گئی تو پہلے ہی سے اگلی پچھلی سب خطا میں معاف ہو جانے کی خوشخبری آچکی تھی اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو یہ احتمال کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا، پس وجہ وہی ہے کہ بیماری میں ذرا انسان پر عجز و انکساری اور آہ کرنا، کراہنا غالب ہوتا ہے اور یہ ادا حق تعالیٰ کو پسند ہے اس ادا کے سیکھنے کے لیے مقبولین پر بلا بھیجتے ہیں اور کبھی صبر کا امتحان کرنا منظور ہوتا ہے، تو جب یہ بات ہے کہ کلفت کے اسباب مختلف ہوں تو لازمی طور پر آثار بھی مختلف ہوں گے، اہل مصیبت یعنی اہل معصیت ذرا سی تکلیف سے بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں، چنانچہ ایسے ہی لوگ طاعون سے بھاگتے ہیں اور کوئی شخص طاعون کی جگہ سے آیا ہو اس سے بھی بھاگتے ہیں کہ یہ طاعون کی جگہ سے آیا ہے، شاید اس کو طاعون پٹ رہا ہو اور اس کے پاس جانے سے ہمارے اوپر بھی اثر نہ ہو جائے، بھلا اس وہم کا کچھ ٹھکانا ہے!! بات یہ ہے کہ معاصی کا یہ خلاصہ ہے کہ اس سے دل کمزور ہو جاتا ہے، اس لیے اہل مصیبت کا دل بہت کمزور ہوتا ہے۔

## طاغون سے بھاگنے والا

ایک شخص طاغون سے بھاگ کر ایک گاؤں میں ایک شخص کے مکان پر ٹھہرا اور تھا نمازی، مسجد میں نماز کے لیے جاتا تو اس مسجد میں بعض پرانے نمازیوں نے نماز کے لیے آنا چھوڑ دیا، اس شخص کو کتنی بڑی ذلت ہے!! تو بات یہ ہے کہ طاغون سے بھاگنے والے کی کسی جگہ جا کر عزت نہیں ہوتی، جس میں راز یہ ہے کہ یہ شخص خدا تعالیٰ سے بھاگتا ہے، اس پر مجھے یہ شعر یاد آیا کرتا ہے:

عزیزے کہ از در کیش سر بتافت

بہر دو کہ شد تیغ عزت نیافت

اور جو لوگ کہ اپنے گھر میں پڑے رہتے ہیں، ان کی آخرت میں تو عزت ہوتی ہے کہ طاغون کی جگہ ایمان و ثواب کی نیت سے جتنے رہنے پر شہادت کا ثواب ملتا ہے چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح ہے، مگر اس کے علاوہ ان لوگوں کی دنیا میں بھی عزت ہوتی ہے کہ لوگ ان کو قوی القلب اور مستقبل المزاج سمجھتے ہیں، بہر حال اہل ذنوب کو پریشانی ہوتی ہے اور جہاں کلفت کا سبب رفع درجات ہوتا ہے وہاں آثار بھی دوسرے ہوتے ہیں کہ نہ وہ پریشان ہوتے ہیں، نہ گھبراتے ہیں، چاہے ان کے جسم میں تکلیف ہو، مگر روح خوش رہتی ہے، روح کے لیے ایک عید ہوتی ہے، کیونکہ "از محبت تلخ ہاشیریں شود" اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس مسرت کو بے ساختہ ظاہر کر دیتے ہیں، ورنہ روح کو تکلیف دینے کی حالت میں مسرت کب ظاہر ہوتی ہے؟ پھر سب سے بری مصیبت جس کو ام المصائب کہنا چاہیے، موت ہے کہ اس پر کوئی راضی نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ تمہارے لیے دو صورتیں ہیں یا تو اسی وقت مر جاؤ، یا ایک برس تک بیمار رہو، ان دونوں میں سے جس کو چاہو اختیار کر لو، تو غالباً ہر شخص اتنی مدت مدید تک مریض رہنے پر راضی ہو جائے گا، مگر موت پر ہرگز راضی نہ ہوگا، مگر اہل اللہ کی یہ حالت ہے کہ وہ خود موت کے مشتاق رہتے ہیں، وہ حضرات یوں کہتے ہیں:

خرم آں روز گزیر منزل ویراں بردم

راحت جاں طلبم در پئے جانان بردم

نذر کردم گر آید بسر این غم روزے

تا درمیکدہ شاداں و غزل خوان بردم

## خوشی بوقت موت

وہ تو موت کے وقت کے لیے نذریں مانتے ہیں، اس پر شاید یہ شبہ کرے کہ حجرہ میں بیٹھ کر ایسا کہہ دیا ہوگا، مگر جب نزع کا وقت آیا ہوگا اس وقت ساری حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی، اس وقت یہ سب باتیں بھول گئے ہوں گے، تو حضرت! یہ بات نہیں واقعات سے ان حضرات کی حالت سچی معلوم ہوتی ہے اور یقیناً وہ موت کے وقت بھی ایسے ہی خوش تھے وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس کی تعلیم کرتے آئے ہیں کہ زندگی ایسی اختیار کرو کہ مرنے کے وقت سب لوگ تمہاری فرقت میں رو رہے ہوں اور تم وصال خداوندی کے سرور میں ہنس رہے ہو، چنانچہ ایک قطعہ اس مضمون کا مجھے یاد آیا، فرماتے ہیں:

یاد داری کہ وقت زادن تو

ہمہ خنداں بدند تو گریاں

یعنی پیدائش کے وقت تم روتے ہوئے آئے تھے اور اعزہ واقارب ہنس رہے تھے، خوشیاں منا رہے تھے۔

آچننا زنی کہ وقت مرون تو

ہمہ گریاں بشوند تو خنداں

زندگی ایسی اختیار کرو کہ مرتے وقت اور سب تو روئیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ، چنانچہ ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ بعض اہل اللہ مرنے کے وقت بالکل شاد و خرم نظر آتے ہیں۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کے نزع کے وقت سب تو رو رہے تھے اور ان کی یہ حالت تھی کہ وہ بے ساختہ یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

وقت آن آمد کہ من عریاں شوم

جسم بگذارم ہراسر جاں شوم

اب وہ وقت آ گیا کہ میں تیز جسم سے آزاد ہو جاؤں گا، بدن کو چھوڑ کر سرتاپا روح بن کر وصال حق سے سرفراز ہو جاؤں گا، تو صاحبو! نزع کے وقت یہ مستی بناوٹ سے نہیں ہو سکتی ہے اور اگر ہو سکتی ہے تو کوئی کر کے دکھلا دے اور فرماتے ہیں:

چست توحید آنکہ از غیر خدا

فرد آئی در خلا و در بلا

## بعد موت کا حال

یہ تو آپ نے موت کے وقت کا حال سنا اور اس سے بھی زیادہ سخت موت کے بعد کا ہے کہ وہی وقت ہے مصیبت کا جو کچھ ثواب و عذاب ہوگا موت کے بعد ہی تو ہوگا، مگر اہل اللہ کی حالت اس وقت بھی عجیب ہوتی ہے، آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وہ اور بھی زیادہ خوش رہتے ہیں۔

حضرت سلطان الاولیاء رحمہ اللہ کی حکایت ہے کہ جب ان کا جنازہ چلا تو ان کے ایک مرید پر حالت طاری تھی، کیونکہ شیخ کے انتقال کا صدمہ مریدوں سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے؟ غرض جنازہ جا رہا تھا کہ اس مرید نے جنازہ کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا:

سرہ سمینار بصرائے می روی  
سخت بے مہری کہ بے ما میروی  
اے تماشا گاہ عالم روئے تو  
تو کجا بہر تماشا می روی

تاریخ میں لکھا ہے کہ کفن میں آپ کا ہاتھ اونچا ہو گیا، لوگوں نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو؟ چپ رہو! اس واقعہ سے کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے، کیونکہ مرنے کے بعد انسان کو دوسری حیات عطا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ سب کچھ احساس کر سکتا ہے اور یہ حیات اولیاء میں عوام سے زیادہ ہوتی ہے، تو کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ اس حیات کا اثر بطور کرامت کے جسم پر بھی ظاہر ہو جائے، مگر یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔

غرض خدا نے ظاہر کر دیا کہ اب یہ لوگ اس قدر مطمئن ہیں کہ ان کو مرنے کے بعد وجد آتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" تو صاحبو! ان حضرات کو مصیبت کہاں ہوتی؟ جن باتوں کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں، ان میں ان کو لذت آتی ہے۔ (ایضاً صفحہ: ۲۳ تا ۱۷)

## بددینی کا اثر

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں آج کل افلاس ہے، اس لیے ان کی حالت خراب ہے، میں کہتا ہوں کہ صاحبو! افلاس کا ڈر نہیں، اصل میں اس خرابی کا سبب بددینی ہے، آپ یورپ کو دولت مند سمجھتے ہیں، مگر کیا اس میں سب ہی دولت مند ہیں؟ ہرگز نہیں! ان میں بھی کتنے مرد مردی سے مر جاتے ہیں، معلوم ہوا کہ کسی قوم کی حالت اچھی ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ ان میں ہر شخص

دولت مند ہو، بلکہ حالت درست ہوتی ہے، انفعال حسہ اور اخلاق حمیدہ سے، جس قوم میں یہ باتیں ہوں گی، اس کی حالت درست ہوتی ہوگی چاہے وہ کیسی ہی مفلس قوم ہو، شاید آپ یہ کہیں کہ یورپ تو کافر ہیں وہ تو دیندار نہیں ہیں، پھر ان کی حالت ترقی پر کہوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ کافر ہیں، خدا کے دشمن ہیں، اس لیے اگر وہ تھوڑے سے کام بھی اچھے کریں گے تو ان کی حالت دنیوی درست ہو جائے گی، ان میں اتفاق اور اتحاد اور قومی ہمدردی بہت زیادہ ہے، دوسرے ان میں ہر کام کا ایک انتظام اور قاعدہ ہے اور یہ باتیں فی نفسہ اصلاح حال میں مؤثر ہیں، جو اصل میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے تھیں، کیونکہ ان کو مذہباً اس کی بہت تاکید کے ساتھ تعلیم کی گئی ہے، مگر مسلمانوں نے ان باتوں کو چھوڑ دیا، دوسری قوموں نے ان سے فائدہ اٹھایا، مگر یاد رکھیے مسلمانوں کی حالت صرف اتفاق و اتحاد سے درست نہیں ہو سکتی، بلکہ ان کو پوری طرح احکام اسلام کی پابندی اور وقعت کرنا لازم ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کے خاص بندے ہیں، اگر یہ تھوڑی سی بھی نافرمانی کریں گے تو اس پر غضب زیادہ ہوگا، تو صاحبو! اگر اپنی بھلائی چاہتے، تو خود دینداری اختیار کرو اور ابھی تک مسلمانوں میں اتنی فلاکت کسی میں نہیں ہوئی کہ تباہ ہو جائے اور اگر ان میں اتفاق ہو تو ایک کی امارت سے دس آدمی کھاسکتے ہیں، مگر آج ہمدردی تو کیا ہوتی؟ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ غزنی کو حرم قرار دیتے ہیں، حالانکہ غزنی اور امیری کسی کے اختیار میں نہیں، آج ایک شخص امیر ہے، کل کو غریب ہو جاتا ہے، آج ایک آدمی غریب ہے، چند روز میں حق تعالیٰ اس کو کٹھنی کر دیتے ہیں۔

### مالدار کی کا مشاہدہ

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ چھ پیسے روز کی کنڈے اٹھانے کی مزدوری کماتے تھے، پھر وہ لاکھوں روپے کے آدمی ہو گئے، اب بھلا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ تدبیر سے اس درجہ کو پہنچ گئے؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ محض مشیت الہی کی وجہ سے ہوا، میں کہا کرتا ہوں جو لوگ تدبیر پر مرتے ہیں، وہ ایک آدمی کو بجائے چھ پیسے روز کے تین آنے دیں اور وہ تمام تدبیریں بنلا دیں جن سے بظاہر پہلے شخص کو ترقی ہوئی، پھر ہم دیکھیں گے کہ دوسرا شخص تدبیروں سے کتنی ترقی کرتا ہے، اگر اس طرح ترقی ہو آگرتی تو ہر شخص دوسروں کی تدبیروں کو دیکھ کر امیر ہو جایا کرتا، درحقیقت فرانچی اور گنگلی کا مدار ان اسباب پر نہیں ہے، مشیت الہی پر ہے، دوسرے کسی قوم میں افلاس انتاعام نہیں ہوتا کہ سبھی مفلس ہوں بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر قوم میں کچھ غنی ہوتے ہیں، کچھ مفلس ہوتے ہیں، جب یہ بات ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں ہی کی حالت خراب ہے؟ سو یہ بات ہے کہ ان میں انفعال حسہ اور اخلاق حمیدہ کی کمی ہے، پس اصل شکایت ان کی بددینی کی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۴۳۴ تا ۴۳۵)

## صورت و حقیقت

تو ان حضرات پر اگر مصیبت آئے گی تو کہ کوئی مصیبت ہے؟ ہرگز نہیں! ہاں! مصیبت کی صورت ہے، حقیقت میں وہ ہرگز مصیبت نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مٹھائی کا کر یا بناوے اور اس کے متعلق دو شخصوں میں اختلاف ہو، ایک تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ کر یا ہے اور دوسرا سمجھتا ہے کہ یہ مٹھائی ہے، اب دوسرے نے اس کو توڑ کر کھانا شروع کیا، تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ یہ کر یا کھار ہا ہے؟ ہرگز نہیں! درحقیقت وہ مٹھائی کھا رہا ہے، ہاں! صورت کر یا کی ہے، جس سے نادان کو شبہ ہوتا ہے کہ اس کا مزہ کڑوا ہو گیا ہوگا، مگر اس کھانے والے سے کوئی اس کے مزے کو پوچھے! بس یہی مثال اہل اللہ کی مصیبت اور عوام کی مصیبت کی ہے، اہل اللہ پر جو مصیبت آتی ہے وہ کر یا کی صورت میں مٹھائی ہے، جس سے ان کو لذت حاصل ہوتی ہے اور عوام کی مصیبت حقیقت میں کر یا ہے جس سے ان کو تنگی اور پریشانی حاصل ہوتی ہے۔

میں نے اس مثال میں ایک باریک مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا، آپ رات دن دیکھتے ہیں کہ مٹھائی کے کھلونے اور مختلف پھل بنائے جاتے ہیں، مگر وہ محض صورت ہی صورت ہوتی ہے، حقیقت میں وہ خاص شکر ہے، میں نے سنا ہے کہ محمود آباد میں ایک باورچی نے مٹھائی کا اتار بنایا تھا جو ڈیڑھ سو روپے میں تیار ہوا تھا، اس کے اندر زرہ جھلی اور دانوں میں سرخ شربت تک تھا اور یہ تو میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک دعوت میں باورچیوں نے مٹھائی کا پان بنایا تھا، تو کسی نے اگر ایسا ہی کر یا بنا یا ہو اور ایک شخص اس کو کھانے لگے اور دوسرا اس پر رحم کرنے لگے تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں؟ یقیناً حماقت ہے! تو جس طرح کر یلی کی دو قسمیں ہیں، اسی طرح مصیبت کی دو قسمیں ہیں۔

## مصیبت کی قسمیں

ایک صورت ایک حقیقت اور نعمت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورت اور ایک حقیقت کفار کو جو دولت دنیوی عیش و آرام دیا گیا ہے، یہ ظاہری نعمت ہے، حقیقت میں یہ سب وبال جان ہے اور مسلمانوں کو جو مصیبت پیش آتی ہے، وہ ظاہری مصیبت ہے، حقیقت میں وہ بڑی نعمت ہے، صاحبو! اس کو وہ سمجھے گا جو اس مزے کو پہلے کچھ چکا ہو اور جس نے باطنی دولت کا مزہ نہیں چکھا وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا۔

پرسید کیے کہ عاشقی چیست؟  
گفتم کہ چو ما شوی بدانی!

## بچہ کے ختنہ کی مثال

کیا آپ نے ختنہ کے وقت یا فصد کراتے وقت بچوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھا؟ سوچئے کہ دل سے پوچھئے وہ اس کو کیا سمجھتا ہے؟ وہ تو اس کو سخت مصیبت کہہ گا، مگر آپ کے نزدیک وہ مصیبت نہیں راحت ہے:

طفل می لرزد زیش احتیاج  
مادر مشفق ازاں غم شاد کام

کیا آپ نے کبھی اپنے یا اپنے کسی عزیز کے نشتر نہیں لگوا یا؟ اور کیا پھر نشتر دینے والے کو انعام نہیں دیا؟ ضرور دیا ہے! تو کیا نشتر دینے کے وقت کی تکلیف دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے انعام کا کام نہیں کیا؟ ہرگز نہیں! آپ کا دل جانتا ہے کہ اس نے بڑا احسان کیا ہے اور بہت راحت پہنچائی کہ آئندہ کی تکلیف سے نجات دے دی کہ نشتر دینے کے وقت آپ کے آنسو بھی نکلے ہوں گے، تب بھی دل اندر سے راضی ہوگا۔

معلوم ہوا کہ بعض مصائب ایسے بھی ہیں جو صورت میں مصیبت ہیں اور حقیقت میں راحت معلوم ہوتے ہیں، پس اہل اللہ مصائب کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، وہ غوب جانتے ہیں کہ ان تکالیف کی وجہ سے ہماری آخرت درست ہو رہی ہے، جتنی ہم کو یہاں تکلیف ہوتی ہے، اسی قدر عذاب جہنم سے ہم کو نجات نصیب ہوتی ہے، تو وہ ان تکالیف کو بالکل ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ نشتر کی تکلیف کو سمجھتے ہیں، آپ نشتر کی تکلیف پر دل سے راضی ہیں، وہ فخر و فاقہ اور طاعون وغیرہ کی تکلیف پر دل سے راضی ہیں، اب یہ شبہ زائل ہو گیا کہ انبیاء و اولیاء تو گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں، ان پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟ معلوم ہو گیا کہ ان حضرات پر واقع میں مصیبت ہی نہیں اور جو واقع میں مصیبت ہے، وہ بد اعمالیوں ہی سے آتے ہیں۔

(ایضاً صفحہ: ۳۳۳۳)

## باراہواں اعتراض..... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی!

جو طالع زمانہ کے جدید رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ان میں تو یہ کوتاہی شاہد ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں کہ دوسرے اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کی گفتگو کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری میں سے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقوال و افعال کی حکمتوں سے (خواہ ان کی حقیقت تک ان کے ذہن کی رسائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو) صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے، محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں کہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کی عزت ظاہر ہو جائے اور اس کو اسلام کی خدمت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادائے حقوق کے لیے کافی سمجھتے ہیں، باقی مذاہب کو ضروری سمجھتے ہیں، نہ محبت کا کوئی اثر پایا جاتا ہے، بلکہ اتباع کو تعصب اور محبت کو وحشت سمجھتے ہیں اور سب خفی اس کا یہ ہے کہ اس زمانے میں سب سے بڑا مقصد جاہ و عزت کو قرار دیا گیا ہے، جس کے مطلوب ہونے کا ہم کو بھی انکار نہیں، مگر کلام اس میں ہے کہ آیا وہ مطلوب بالعرض ہے، یا خود مطلوب بالذات ہے؟ بہر حال چونکہ اس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کمالات حقیقت عظیم الشان میں سے ان کی نظریں اس کا انتخاب کرتی ہے اور دوسرے کمالات کا مثل محبت الہی و خشیت الہی و زہد و صبر و تربیت روحانی و مجاہدہ و شغل بحق و دیگر فضائل علیہ و عملیہ کا کبھی ان کی زبان پر نام بھی نہیں آتا، جس کا خلاصہ یہ لکھتا ہے کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاص اسی غرض کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ ایک جماعت کو قوم بنا کر اس کو دنیوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرمائیں، تاکہ وہ دوسری قوموں پر سابق و فائق رہ کر دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کریں، کیا قرآن مجید و حدیث شریف میں گہری نظر رکھنے والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا یہ خلاصہ نکال سکتا ہے؟ ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کرنے کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ علماء محققین و عرفاء محققین کی طول صحبت و ملازمت کا التزام کریں اور ان کی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کر کے رہیں، خود ان کے اقوال متفرقہ و ارشادات مختلفہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہو جائے گی اس کے بعد جو شبہات رہ جائیں ان کو ادب کے ساتھ ان کے حضور میں پیش کریں اور توجہ و انصاف کے ساتھ جواب سنیں، ان کو اس زمانہ سکوت میں جو اصول و قواعد سننے اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معین ہوں گے اور اطمینان و شفاء کلی میسر ہوگی، اس طریق اصلاح کو جو مجرب ہے سرسری خیال نہ فرمائیں اور نیز حدیث کی کتاب الرقاق و کتاب الزہد کا بار بار مطالعہ فرمائیں۔

(الشفی و فی حقوق بدر البدر صفحہ ۴۳۳)

ایسے لوگ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق میں تقصیر کیے ہوئے ہیں، متابعت و محبت کا موجود نہ ہونا تو ظاہر ہے اور اوپر اس کو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے، البتہ ان کے اس عمل سے کہ ان کی زبان یا قلم سے بعض ایسے مضامین صادر ہوتے ہیں کہ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، یہ شرع ہو سکتا ہے کہ شاید وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق عظمت ادا کرتے ہیں، لیکن اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ احتمال بھی واقعت نہیں رکھتا، حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے، وہ عظمت ہے جس کے



ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف ہیں اور ان لوگوں کی تحریر و تقریر میں نظر کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عظمت ہے، وہ اس حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حکیم و متدین ہونے کی حیثیت سے ہے، کیونکہ ان دونوں عظمتوں کے آثار کا موجود ہونا ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے، چنانچہ اعتقاد و عظمت نبوی کے آثار یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سنتے ہی یہ معلوم ہو کہ گویا حق تعالیٰ نے ہم سے خود فرما دیا ہے اور یہ کہ اس حکم کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت سمجھنے کا ہرگز انتظار نہ ہو بلکہ اگر بادی النظر میں کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہوتے ہیں اسی خوشی سے قبول کرے، جیسا حکمت معلوم ہونے کے وقت کرتا اور نہ بدون حکمت سمجھے، یہی اس حکم کی وقعت میں کچھ کی ہو، بلکہ جس طرح ادنیٰ خدمت گار شاہی حکم سن کر مغلوب و دالہ ہو کر دیوانہ دار اس کی بجا آوری کے لیے دوڑتا ہے، اسی طرح اس کی کیفیت ہو جائے اور یہ کہ اس کے خلاف کا مستحسن ہونا خیال بھی نہ آئے بلکہ اجمالاً تو سمجھے کہ بس تمام خیر و برکت اور حکمت و مصلحت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے، خواہ ہمارا ذہن کوتاہ اس کی تفصیل تک پہنچے نہ پہنچے بقول حضرت عارف گہنوی رحمہ اللہ

بلبل تازہ کردن باقرار تو  
غنیلتجن علت از کار تو!

اور صرف حکیم و متدین ہونے کے لحاظ سے جو اعتقاد و عظمت ہوتا ہے، اس کے آثار یہ ہے کہ حکم سن کر اتنا ہی اثر ہو جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے کو سن کر ہوتا ہے اور یہ کہ اس کے قبول کرنے میں یا اس کو بنظر وقعت دیکھنے میں اس کا بھی انتظار ہو کہ اس میں عقلی (اور دینی) مصلحت کیا ہے جب تک مصلحت معلوم نہ ہو، اس میں سخت تردد و غلبان رہے اور ہرگز اس پر عمل کرنے میں شرح صدر نہ ہو خود بھی ایک قسم کی تنگی اور جبر و تکم کا سا اثر رہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا دعویٰ کرتے ہوئے ایک گونہ غلبت اور بے وقعتی کی سی کیفیت رہے اور بار بار اس حکم کی جانب مخالف کی ترجیح کا جہوم اور اس کی تمنا کا قلب پر غلبہ رہے اور ہرگز اس کے صحیح ہونے کا دل کھول کر حکم نہ کر سکے، بلکہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہ ہو اور جب اور کچھ نہ ہو سکے تو بعض تاویلات سے اس حکم کے شرعی ہونے کا انکار کر دے، کبھی اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے، بلکہ اس کو راویوں کی نقل کی غلطی یا ان کی رائے کی آمیزش کا اثر بتلا دے اور کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کسی ضرورت و مصلحت وقت کے اتباع کا دعویٰ کرے اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہیں رہی، لہذا اس حکم کو بھی موجود نہ سمجھے، غرض ہزاروں حیلے نکالے لگے اس حکم کو نہ مانے (اور یہ ان

میں سب سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال ہے) اور یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش کفر سے سب ملے ہوئے ہیں، کوئی صریح کفر کوئی خفی کفر ہے، کوئی کفر بننے کو ہے۔ ”کما لا یحسبی علی المتفطن السلیم“ جب دونوں اعتقادوں کے آثار جدا جدا معلوم ہو گئے آگے ہر شخص کو مشاہدہ سے اپنے اندر بھی اور غیر کے اندر بھی ان کے آثار کا وجود و عدم معلوم ہو سکتا ہے اور اس سے ہمارے دعویٰ سابقہ کا صدق بخوبی واضح ہو جائے گا (اس مضمون کی شرح زیادہ تحقیق کے ساتھ مطلوب ہو تو مضمون عظمت و جی رحم زدہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دامت فیوضہم جو القاسم کے نمونہ میں شائع ہوا ہے، ملاحظہ فرمایا جائے)

### احکام شرعیہ کی حکمت

ہماری اس تقریر کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ احکام شرعیہ حکمت سے خالی اور عاری ہیں، حاشا و کلا! بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہم حکمت پر موقوف نہ ہونا چاہیے ہاں! وہ خود ایک مستقل علم ہے کہ اس کو اسرار شریعت کا لقب دیا جاتا ہے، مگر اس کے اہل خواص عارفین ہیں، عوام الناس کو اس سے بجائے نفع کے ضرر کا احتمال غالب ہے، کئی وجہ سے اول ایک اس لیے کہ ان میں سب تو منصوص ہیں نہیں، اجتہادی یکثرت ہیں، جن میں احتمال بھی ہے، سواگر کبھی اس کا غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت یقینی تھی تو اس کے صحیح نہ ہونے سے اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھے گا (بخلاف خواص کے کہ وہ اس کو یقینی علت اور مبنی حکم کا نہ سمجھیں گے، اس لیے حکم میں ان کو کبھی کوئی خدشہ نہ ہوگا)

دوم اس لیے کہ کبھی کوئی مبنی اور حکمت صحیح معلوم ہوگی، لیکن بعض اوقات وہ وجہ اور حکمت اس عامی کی نظر میں با وقعت نہ ہوگی تو اس حکم کو بھی بے وقعت سمجھنے لگے گا۔

سوم اس لیے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی، بعض اوقات عامی اس کو علت اور اصلی سبب سمجھ کر کسی موقع میں اس کے موجود نہ ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے۔

چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی، بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھ کر کسی موقع محل میں حکمت کے حاصل ہو جانے کو کافی سمجھ کر تحصیل حکم ضرورت نہ سمجھے گا اور ان دونوں صورتوں (سوم و چہارم) میں اجتہاد باطل کا باب وسیع ہو جائے گا، مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم لگا دیا گیا ہے، لیکن یہ علت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم لگا دیا گیا ہے، لیکن یہ علت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت بھی نہ ہو تو تب بھی قصر ہے اور اسی طرح وضو مشروع ہوا ہے، حکمت نظافت و طہارت سے، لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضو سے استغناء نہ ہوگا۔

تہم یہ کہ عامی مخالف دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کرے اور اس میں اسلام کو اور دین کو صدمہ پہنچے، مثلاً کسی نے کتا پالنے کی ممانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ اس میں صفت سبوحیت کی ہوتی ہے تو اگر کسی نے اس میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ تعلیم کے بعد سبوحیت نہیں رہتی، پھر کیوں ممنوع ہے؟ تو یہ شخص بزبان حال اس حکم کو بے بنیاد کہے گا، بخلاف راسخ فی العلم کے کہ وہ بجائے حکمت کے یہ کہے گا کہ ہمارے آقا عظیم الشان صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے، ہم نہیں جانتے کیا مصلحت ہے۔ تو اس شخص پر کوئی خدشہ ہی نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً صفحہ: ۸ تا ۷)

تیر ہواں اعتراض..... ترقی مطلوب کی شریعت نے تعلیم نہیں فرمائی!

ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے، لیکن اس وقت اس کا حاصل محض طول اہل و حرص سے جس کی شریعت مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نمونے تھے، انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی جگہ نہیں دی، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدون ہے، اس کو دیکھا جائے ابتدا سے انتہا تک کہیں بھی آپ کو یہ تعلیم نہ ملے گی، رہے تاریخ واقعات سوان کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ احادیث کے مطابق ہوں تو قابل اخذ ہیں ورنہ ہیچ شخص۔ (تجارت آخرت صفحہ: ۲)

غرض حدیث کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز زندگی کیا تھا؟ اور وہی طرز صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تھا، تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے یہاں طول حرص اور طول اہل کا نشان بھی نہ تھا، ان کی ترقی ترقی دین تھی، اگرچہ اس کے تابع ہو کر ان حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں، لیکن محض نظر صرف ترقی دین تھی، چنانچہ ان حضرات کی اسی شان کو خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

”الَّذِينَ إِذَا مَسَّكُمُ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ“

کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دے دیں تو یہ لوگ اس وقت بھی نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور بری باتوں سے روکیں یہ ہے ان کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا، اب ان کو یاد رکھئے اور پھر ان کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھئے! اور انطباق کیجئے واللہ! ایسا دشاوار انطباق ہے جیسے خط مستقیم پر خط منحنی کو منطبق کرنے لگے کہ جب تک اس میں استقامت اور اس میں انحناء باقی رہے گا، کبھی انطباق ممکن ہی نہیں، تو ہمارے خیالات خط منحنی کی

طرح ہیں اور ان حضرات رضی اللہ عنہم کے خیالات کی مثال خط مستقیم ہے، جمد اللہ یہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی، کیونکہ خط منحنی کے انطباق علی الاستقیم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعض اجزاء تو خط مستقیم پر سے گزرے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض اجزاء اس سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں، یہی حالت ان خیالات محترمہ کی ہے کہ ان میں اگر ایک قدم شریعت پر ہے تو دوسرے اس سے بالکل الگ جس کا کسی تاویل سے بھی جادہ شریعت پر انطباق نہیں ہو سکتا، بس ایسے حالات و خیالات کس طرح قابل مدح ہو سکتے ہیں؟؟ (انطباق صفحہ: ۴۳ تا ۴۴)

### چودھواں اعتراض..... محدثین رحمہ اللہ پر اعتراض کا جواب!

بعض خود رد مصنفین پر افسوس ہے کہ وہ محدثین رحمہ اللہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے، لیکن جو محدثین رحمہ اللہ کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین علیہم الرحمہ نے کس تدوین سے کام لیا ہے، البتہ یہ اعتراض مطابق واقع کے مؤرخین پر ضرور ہو سکتا ہے، صاحبو! محدثین کا تدوین اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ ایک باب کی حدیث سے ایک باب کو ثابت کرتے ہیں، تو اس کے بعد ہی دوسرا باب اس کا معارض صوری بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی حدیث پیش کرتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ ان حضرات رحمہ اللہ کا مقصود محض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا جمع کرنا ہے نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا یا اس پر زور دینا، کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو اس پہلی سے معارض ہے موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس حدیث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی تو بصورت ایراد معارض کوئی خاص رائے کیونکر مقصود ثابت ہو سکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنی اغراض کی تائید مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں ہاں! تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک مؤرخ نے اپنے خیال کے مؤید واقعات کو لیا اور دوسرے نے اپنے خیالات کے مؤیدات کو پس جب حدیث و تاریخ میں یہ تفاوت ہے تو حدیث قابل وثوق ہوئی اور اس کے مقابل تاریخ قابل وثوق نہ ہوئی تو جو واقعات تاریخ میں حدیث کے خلاف ہوں گے اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی تو وہ محض چیخ ہیں ہرگز قابل قبول نہیں۔ (ایضاً صفحہ: ۲)

پندرہواں اعتراض..... محتاج اصلاح دوسروں کی اصلاح کیا کریں گے؟

آج دیکھ لیجئے کہ ان مدعیان طبابت اخلاق کا کیا برتاؤ قوم کے ساتھ ہے؟ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی ان کو ہمدردی نہیں اور اپنے امراض کے علاج پر بھی توجہ نہیں اور یہی سبب ہے قوم سے ہمدردی نہ کرنے کا کیونکہ طبعاً اپنا خیر خواہ انسان زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو جو خیر خواہی کرتا ہے اس میں اپنی خیر خواہی مضمر ہوتی ہے، پس جو شخص اپنا ہمدرد نہ ہوگا وہ دوسروں کا کیسے ہمدرد ہوگا؟ یہ لوگ اول تو اپنی اصلاح کریں، پھر دوسروں کی اصلاح حقیقی کی فکر کریں، آج یہ حالت ہے کہ انظار ہمدردی اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں، انجمنیں قائم ہوتی ہیں، مگر نہ نماز کی فکر ہے، نہ روزے کا خیال ہے، مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو اور بھی لے جائیں، لیکن محبت اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، وضع کو دیکھئے! سر سے پاؤں تک اسلام کے بالکل خلاف، گفتگو کو دیکھئے! وہ مذہب سے بالکل جدا تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ ان کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے؟ بات یہ ہے کہ ہر زمانے کی ایک رسم ہوتی ہے کہ اہل زمانہ اسی پر چلنے لگتے ہیں، آج کل یہ رسم ہے ہر مشہور یا غیر مشہور تحصیل شہرت یا تکمیل شہرت کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے منجملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جلسے کیے جائیں، کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے، کوئی سیکرٹری کوئی کچھ کوئی کچھ اور اس سے عام و خاص میں ان کو امتیاز ہو جائے، پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی، کیونکہ وہ انطباق کی برکت سے ایک دن مبدل بہ حقیقت ہو سکتی تھی اور جب ظاہری انطباق علی الشریعت بھی نہ ہو تو سرسر مضر اور سم قاتل ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکماء امت نے عوام الناس سے اسی قدر کو کافی سمجھا ہے کہ وہ اپنی صورت ظاہری شریعت کے موافق بنالیں اور صورت عبادت کے پابند ہو جائیں کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی ان شاء اللہ ایک دن مبدل بہ حقیقت ہو جائے گی۔ (تجارت آخرت صفحہ: ۶۰۵)

## آج کل جلسے

خلاصہ یہ ہوا کہ آج کل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلا معنی ہیں اور صورت بھی ٹھیک نہیں اور لوگوں نے ان کو محض رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے، نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ یہ جب اپنا ہی دین بر باد کر رہے ہیں، تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں؟

اور اگر کہیے کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم کر رکھا ہے، اس لیے باوجود اپنے دین کے قائم نہ کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیاوی منافع میں ہے، دینی منافع میں نہیں، یعنی اگر ہمارا کوئی دنیاوی نفع فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جائے تو اس کو ایثار کہیں گے اور اگر دین تباہ ہو کر دوسروں کو نفع پہنچے تو یہ ایثار نہیں کہلائے ورنہ اگر دین کو تباہ کر کے بھی ایثار ہوتا تو باغی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں اور ان کو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہیے، کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی و ایثار ہے کہ انہوں نے اپنی جان بھی دے دی اور تمام منافع جو اطاعت سے ان کو پہنچے وہ دوسری رعایا کے لیے چھوڑ دیے صاحبو! یہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا کہ دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی۔

(ایضاً صفحہ: ۷، ۸)

غرض جیسے فرعون کی ہمت تھی ویسی ہی آج کل کے ایثار والوں کی ہمت بھی ہے اور فرعون کی وہ ہمت کہ ہمت کہلانے کے قابل نہیں تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے، بس معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں، وہ دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کے لیے کر رہے ہیں۔

(ایضاً صفحہ: ۹)

## سوالہاں اعتراض..... علماء کا استیصال اسلام کا استیصال ہے!

آج کل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے اور طرح طرح کی تدبیروں سے ان کے اثر کے مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے، برا بھلا بھی ان کو کہا جا رہا ہے، مگر علماء اس بارے میں خاموش ہیں وہ بہت احتیاط کرتے ہیں، وہ کسی کو بلا ضرورت برا نہیں کہتے، مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جائے، جب کہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے اور وہ ضرورت یہ ہے کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہو رہے ہیں، یہ لیڈر دین میں دخل دیتے ہیں اور اپنی رائے سے جس طرح چاہتے ہیں، احکام میں تخریف کر دیتے ہیں اور عوام الناس! میں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں، مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں، کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد ہو اور رسول پر اعتقاد جیسی ہوگا جب کہ حاملان شریعت سے اعتقاد ہو، کیونکہ عوام کو رسول کی معرفت علماء ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے، جس نے علماء کو نہیں پہچانا وہ رسول کو نہیں پہچان سکتا، پس جو لوگ علم اور علماء کے استیصال کی فکر میں ہیں، وہ خود مسلمانوں کی، بلکہ عالم کے استیصال کی فکر میں ہیں۔

(المراہطہ صفحہ: ۱۳، ۱۴)

## حجرہ نشینوں کا جواب

بعض لوگ ان حجرہ نشینوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی میدان میں نکلو، حجرہ میں کیوں بیٹھے؟ مگر ان سے کوئی پوچھے کہ حجرہ والوں کو میدان میں آنے کون دیتا ہے؟ ان سے کام کون لیتا ہے؟ اگر یہ میدان میں نکلیں گے تو شریعت کے اتباع کا حکم کریں گے جو آج کل لوگوں کے نزدیک تعصب اور تنگ خیالی ہے، پھر تم خود ہی یہ کہو گے کہ یہ مولوی ہمارے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں، ان کو حلال و حرام جائز و ناجائز ہی کی پڑی رہتی ہے، اب میدان میں نکل کر ان سے میدان کا کام ہوگا، نہ خلوت کا دنوں سے گئے گزرے ہوئے اس سے تو ان کو خلوت ہی میں رہنا اچھا اور تم کو بھی خبر ہے! جو لوگ میدان میں نکلے ہوئے ہیں، وہ بھی ان حجرہ نشینوں ہی کی برکت سے کام کر رہے ہیں، کیونکہ یہ حجرہ والے ہر وقت مسلمانوں کی کامیابی اور صلاح و فلاح کی دعا کرتے رہتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں:

ہر کہ تہنا نا در این راہ را برید  
ہم بعون ہمت مرداں رسید

صاحبو! دین کا سمجھنا ان لیڈروں کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ انہیں لوگوں کا کام ہے جنہوں نے حجرہ میں بیٹھ کر چرائوں کا ڈھواں پھانکا ہے اور پانی کی جگہ تیل پی لیا ہے۔  
بعض طلبہ کو ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ مذاق میں ان کو کسی نے پانی کی جگہ تیل دے دیا اور وہ مطالعہ میں ایسے مصروف تھے، کہ ان کو اصلاً اس کی خبر نہ ہوئی۔ (ایضاً صفحہ: ۲۳)

تو مدقیق اور تحقیق احکام ان علماء کا کام ہے، لیڈروں کا کام نہیں، غضب یہ کہ لیڈر علماء کا کلام بھی نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا کلام بیان کرتے ہیں اور اپنے کلام سے علماء کے کلام کو رد کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس بات کی بھی لیاقت نہیں رکھتے کہ علماء کے کلام کو سمجھ سکیں اس پر ان کا حوصلہ یہ ہے کہ علماء کو میدان میں نکلنے کی تاکید کرتے اور ان کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا چاہتے ہیں، صاحبو! میرے نزدیک یہ وقت میدان میں نکلنے کا نہیں کیونکہ حدیث میں ہے: "ان را بست شحاً مطاعاً دنیا مشورۃ و ہوی متبعا و اعجاب کل ذی رأی برأیہ فعلیک بخاصۃ نفسک و دح عنک امر العامۃ"

”اور میرے نزدیک آج کل یہ سب علامات موجود ہیں، اس لیے آج کل گوشہ نشینی لازم ہے، مگر میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا، اگر کسی عالی ہمت کے نزدیک ابھی ان علامات کے ظہور کا وقت نہ ہو تو بسم اللہ! وہ میدان میں نکلے مگر اپنا بھوں کو کیوں اپنے ساتھ کھینچتے ہیں؟ آخر ایک کام یہ

بھی تو ہے کہ خدا سے دعا کریں، تو ان کو اس کام کے واسطے رہنے دیں، ایک جماعت اس کے واسطے بھی رہنی چاہیے یہ تقسیم عمل اچھی ہے مگر انفس آج کل دعا کو لوگ عمل ہی نہیں سمجھتے۔

(ایضاً صفحہ: ۲۳، ۲۴)

## سزہ ہواں اعتراض..... لیڈران قوم کے طریقے شریعت کی نظر میں!

آج لیڈروں نے فلاح دنیا کے طریقے کچھ اور سوچے ہیں، یہ وہ صورت اختیار کرتے ہیں جو یورپ نے اور غیر اقوام نے اختیار کی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تدبیریں فلاح دنیا میں مؤثر نہیں، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ مسلمانوں کے واسطے مفید نہیں، کیونکہ مسلمانوں میں ان تدابیر کی تاثیر سے ایک مانع موجود ہے، وہ کیا؟ معصیت، خدا کی نافرمانی اور یہ مانع کفار میں نہیں ہے، کیونکہ وہ مکلف بالفروع نہیں، وہ تو صرف ایمان کے مکلف ہیں، ان کو کفر کا عذاب ایسا ہوگا کہ جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں، بقیہ اعمال کی بابت ننان سے باز پرس ہے، ننان پر کوئی سزا ہے اور مسلمانوں سے کفر کا عذاب تو ہٹا ہوا ہے، کیونکہ وہ بجم اللہ دولت ایمان سے مشرف ہیں، اس لیے ان کے اعمال پر باز پرس و گرفت ہوتی ہے، جب یہ ایسے طریقے فلاح دنیا کے لیے اختیار کرتے ہیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہیں تو ان کو کامیابی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ان تدابیر کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں تاکہ دنیا میں مخالفت کی سزا بھگت لیں، پس ان کی اور کفار کی ایسی مثال ہے جیسے ٹوپی اور جوتا کہ ٹوپی میں نجاست لگ جائے تو فوراً پھینک دی جاتی ہے اور اچھی طرح پاک کرنے کے بعد اس کو استعمال کیا جاتا ہے اور جوتے میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکتے نہیں ہیں، بلکہ رگڑ کر کام میں لے آتے ہیں، جس طرح ہر چیز کے پاک کرنے کا طریقہ مختلف ہے، اسی طرح ہر قوم کی فلاح و ترقی کا طریقہ الگ ہے، یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو نافع ہو وہ سب ہی کو نافع ہو، اگر ہم مان بھی لیں یہ تدابیر ہم کو بھی مانع ہیں، تب ہم کو احکام الہیہ کا اتباع لازم ہے اور ان تدابیر غیر مشروعہ کا اختیار کرنا جائز نہیں، کیا شراب اور قمار و سود میں نفع نہیں؟ ضرور ہے! خود نص میں ارشاد ہے: "قُلْ فِيهِمَا اٰثَمٌ كَثِيْرٌ ۗ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ" مگر اس نفع کو لے کر کیا کریں گے جس کے ساتھ خدا کا غضب بھی ملا ہوا ہے؟ اس لیے مسلمانوں کو وہی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جو شریعت کے موافق ہوں اس کی یہی صورت ہے کہ عمل کا اہتمام کیا جائے، اب لیڈر تدابیر تو خلاف شرع کرتے ہیں اور علماء کی شکیات کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ مل کر کام نہیں کرتے، میں کہتا ہوں کہ اعمال غیر مشروعہ میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتے، اگر یہ اعمال مشروعہ بھی ہوں تب یہی شکیات صحیح نہیں تھی،



کیونکہ مل کر کام کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب کے سب ایک کام کو لپٹ جائیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کام تقسیم کر دیے جائیں، جیسے لوہار، بڑھئی، معمار، مزدور سب مل کر مکان بناتے ہیں، اس کے یہ معنی تھوڑا ہی ہیں کہ ہر اینٹ کو لوہار بھی ہاتھ لگائے بڑھئی بھی ہاتھ لگائے، بلکہ اپنے اپنے کام ہر ایک الگ کر رہا ہے، پھر نتیجہ مجموعہ پر مرتب ہوتا ہے، اسی طرح لیڈر اگر شریعت کے موافق بھی تدبیر کریں تب بھی علماء کا یہ کام نہیں کہ وہ ان تدابیر میں عملی حصہ لیں، بلکہ یہ کام عوام کا ہے، یا لیڈروں کا، علماء کا کام یہ ہے کہ جو تدبیر کرنا چاہو اول علماء سے استفتاء کر لو جاؤ بھی ہے یا نہیں؟ اور وہ اس کے متعلق حکم شرعی بتاویں گے تم اس پر عمل کرو تمام متقدمان اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ ان کے یہاں عملی محکمہ الگ ہوتا ہے، یہ نہیں کیا جاتا ہے کہ ایک کام کے لیے طلبہ اور اساتذہ بھی لگ جائیں بلکہ طلبہ اور اساتذہ اپنے پڑھنے میں بدستور لگ رہتے ہیں، کام کرنے والی جماعت دوسری ہوتی ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہر قسم کی فلاح اطاعت و عمل ہی سے حاصل ہوگی دنیا میں بھی آخرت میں بھی اب چونکہ مسلمانوں نے عمل صالح ترک کر رکھا ہے تو دیکھ لیجئے کیسی فلاح ہو رہی ہے؟ ہر روز پیلے سے بدتر ہے۔

(المراہطہ صفحہ: ۵۱۳۳۸)

## اٹھارہواں اعتراض..... غیر قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے؟

آج کل ترقی کی پکار بہت ہے، ہر شخص ترقی کا طلب گار ہے اور دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھرا آتا ہے اور ان کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے؟ مگر اب تک حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا، کسی نے کہا یہ لوگ سوڈ لیتے ہیں، اس وجہ سے ترقی ہو رہی ہے، مگر یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ اگر اس میں یہ خاصیت ہوتی تو چاہیے کہ جو مسلمان سوڈ لیتے ہیں، ان کو بھی ترقی ہو، حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ شریعت میں چونکہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، اس لیے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے، مگر یہ بھی غلط ہے، کیونکہ معاملات میں حدود شرعیہ کے پابند کتنے تاجر ہیں؟ ذرا مجھے تو بتلاؤ! ان شاء اللہ دو چار کے سوا کوئی نہ ملے گا، پھر ان مسلمان تاجروں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی؟ یہ کون سے ناجائز معاملات چھوڑ دیتے ہیں؟ غرض سب کی مشق اسلام پر ہے کہ مذہب ہی ترقی سے مانع ہے۔

(الصرۃ بذخ البقرۃ صفحہ: ۴۴)

غیر قوموں کی جو باتیں ترقی میں دخیل ہیں، وہ دوسری ہیں، وہ ان کی خاص صفات ہیں، جو انہوں نے آپ ہی کے گھر سے لی ہیں، مثلاً منظم ہونا، مستقل مزاج ہونا، پابند وقت ہونا، تحمل ہونا، انجام کو سوچ کر کام کرنا، صرف جوش سے کام نہ کرنا، ہوش سے کام لینا، آپس میں اتفاق و اتحاد کرنا ایک دوسرے کے راز کو چھپانا، یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور ان حکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے، خواہ کوئی بھی اختیار کرے، اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا، نہ ان میں اتفاق و اتحاد ہے، نہ راز داری کا مادہ ہے، نہ انتظام ہے، نہ وقت کی پابندی ہے، نہ انجام پنی ہے، جو کام کرتے ہیں جوش سے کرتے ہیں، ہوش سے نہیں کرتے، اس لیے ان کو تنزل ہے اور غیر قوموں نے ان کے گھر سے چرا کر ان باتوں پر عمل شروع کر دیا، تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوئی کہ ان کو ترقی ہونے لگی، پھر یہ سرتق ناقص ہے، کیونکہ چور کو گھر کے اندر کی سب چیزیں معلوم نہیں ہوا کرتیں، اس کو وہی چیز ہاتھ لگتی ہیں جو ظاہر ہوں (یا تالے کچی میں ہوں) دے ہوئے خزانے کی اطلاع اسے نہیں ہوا کرتی، اس لیے وہ پارس کی پتھری جو آپ کے گھر میں تھی اس کی انہیں خبر ہوئی، مگر انہوں نے بیکار سمجھ کر انہیں چھوڑ دیا کیوں کہ پارس کی پتھری دیکھنے میں تو پتھری ہی ہوتی ہے، اس کی خاصیت جسے معلوم ہو وہی اس کی قدر جان سکتا ہے، ناواقف کے نزدیک کالج کا ٹکڑا اور بلور کا پتھر برابر ہے، وہ پارس کی پتھری آپ کے گھر میں کیا ہے؟ ایمان و توحید و اعتقاد و رسالت، نماز و روزہ وغیرہ افسوس! آپ کو اپنے گھر کی قدر نہیں اگر آپ میں وہ صفات ہوتیں جو دوسری قوموں نے آپ سے لی ہیں، تو پارس کی پتھری کے ساتھ مل کر آپ کو وہ ترقی ہوتی جو غیر قوموں کے خواب میں بھی کبھی نہ آئی ہوگی، آپ کو وہ عروج حاصل ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا، کوئی ان کے ساتھ آنکھ نہ ملا سکتا تھا، مگر آج کل مسلمانوں کو اس ارشاد الہی پر نظر نہیں۔

”وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ لِيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَ لِيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ حَوْفِهِمْ أُمَّمًا يُعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا“  
 اور یہ سمجھتی ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے، حالانکہ اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر صاف صاف وعدہ ہے استخلاف فی الارض اور تمکین کا، مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے، افسوس! جس خزانے کو چور نے ناواقف ہو کر یا بیکار سمجھ کر چھوڑا تھا، اس کی قیمت و قوت سے خود گھر والے ابھی آج ناواقف ہیں، یا بعض اعتبار سے یوں کہے کہ بیکاری سمجھتے ہیں۔

## مسلمانوں کی حالت

مگر ایسوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہیے، یہ کابے کے مسلمان جو روزہ کو بیکار سمجھیں، مگر ایسے تو دو چار ہی نکلیں گے، زیادہ وہی ہیں جو اپنے خزانے کی قیمت سے ناواقف اور اس کی طاقت سے بے خبر ہیں، اس لیے اعمال کی بے قدری کرتے ہیں، کوئی مسلمانوں کی حالت کا تتبع کرے تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا اور انہوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے؟ اور بہت سے ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں، کبھی جی چاہا جگہ کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں اور جو تھوڑے سے اللہ کے بندے پانچوں وقت کی نمازوں کے پابند ہیں، ان میں بھی قاعدہ کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں، کسی کا رکوع غلط ہے، کسی کا سجدہ، کسی کا تومہ، کسی کا جلسہ، ایک گڑبڑ کر رکھی ہے، تو اب آخر یہ کیا ہے؟ بے قدری ہے یا نہیں؟ اور بخدا یہ بے قدری اسی واسطے ہے کہ نماز کو صرف ثواب کا کام سمجھ رکھا ہے، اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں، بلکہ بعض تو نماز روزہ کو دنیوی ترقی سے مانع سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جاتی اور یہ خبر ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکن فی الارض میں بھی دخل ہے، تو پھر دیکھتے کہ مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجالاتے ہیں، گو اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں، خلوص کے خلاف ہے، طاعات سے ثمرات دینا کا قصد نہ ہونا چاہیے، وہ تابع ہیں، خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں، الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں اور آپ ہی کے گھر سے لوگوں نے چرائے ہیں اور آپ کی یہ حالت ہے کہ دوسروں سے لیتے اور در بدر گدائی کرتے پھرتے ہیں، پس وہ حال ہے:

یک سید پر نان ترا بر فرق سر  
تو ہی جوئی لب نان در بدر  
تا بز انوی میان قعر آب  
و ز عیش و ز جوع کشنی خراب

## مجلس کے آداب

روٹیوں کا ٹوکرا تو سر پر رکھا ہوا ہے اور در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں، دریا کے اندر کھڑے ہوئے ہیں اور پیاس کے مارے ہر حال ہے، اب دیکھئے! اسلام میں ایک تعلیم یہ ہے کہ جو شخص خانہ مجلس میں ہو، مجلس عام میں نہ ہو تو اس کے پاس بدون اجازت نہ جاؤ اور زمانہ مکان ہی کی

تخصیص نہیں بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہے، اس کے پاس بھی بدون اجازت کے نہ جانا چاہیے اور زمانہ مکان میں جس طرح دوسروں کو استیذان کا حکم ہے، خود گھر والے کو بھی حکم ہے کہ اپنے گھر میں بدون اطلاع کے نہ جائے ممکن ہے کہ کوئی پردہ دار عورت آئی ہو، اگر تم بلا اطلاع چلے جاؤ اس کا سامنا ہو جائے، یا ممکن ہے تمہاری ماں، بہن، بی کسی وجہ سے غلطی بیٹھی ہو، اپنے گھر میں بھی بدون اطلاع کیے نہ جائیں، پھر اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جب تم کسی کے پاس جانا چاہو اور وہ اجازت نہ دے بلکہ یہ کہہ دے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا، پھر کسی وقت ملوں گا، تو اس بات کا برنامہ مانو، بلکہ لوٹ آؤ۔ رَانَ فَبَلَّ لَكُمْ اِنْ جِئْتُمْ اَنْفَارًا جَعُوا لَهَا كَهَيْئَةَ كَلْبٍ اَوْ راس میں حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ بڑتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے، کیونکہ ایسے وقت میں شرما شرمی اگر کسی نے بلا بھی لیا تو انشراح و انبساط کے ساتھ وہ تم سے نہ ملے گا، اس لیے کہ دل تو ملنے کو چاہتا ہی نہ تھا، تو یقیناً اس کے قلب پر تمہاری ملاقات سے گرانی ہوگی، پھر ممکن ہے کہ اس گرانی کا احساس تم کو بھی ہو جائے تو اس سے تم کو بھی دل میں شکایت ہوگی کہ یہ کیسا روکھا آدمی ہے؟ کیسا بدخلق ہے؟ جس پر میرا آنا اتنا گراں ہوا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ جب کوئی کہہ دے کہ اس وقت نہیں مل سکتا، فوراً لوٹ آؤ، اب اس مسئلہ میں ہم لوگ کتنی کوتاہی کرتے ہیں، استیذان کا سبق ہم لوگوں نے بالکل ہی بھلا دیا، مگر دوسری تو میں اس پر عمل کرتے ہیں، کوئی شخص کسی کے کمرے میں بدون اجازت کے نہیں جاسکتا، سو دیکھ لیجئے! جو تو میں اس پر عمل کر رہی ہوں ان میں باہم کیسا اتفاق ہے، آگے یہ ان کے تکلفات ہیں کہ استیذان ان کے لیے اپنے پتہ کا کارڈ بھیجتے ہیں، ہم کو ان تکلفات کی ضرورت نہیں، بس زبانی اجازت لینا کافی ہے، مگر ہماری تو یہ حالت ہے کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو چاہے کوئی سو ہی رہا ہو، مگر ان کا سلام اور مصافحہ قضائے ہو، حالانکہ شریعت میں سونے والے کی اس قدر رعایت ہے کہ حدیث میں آتا ہے:

### آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور

حضرت مقدر رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ ایک بار یہ اور چند اشخاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو فرادیر سے گھر میں تشریف لاتے اور یہ مہمان لیٹے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت آہستہ آہستہ تشریف لاتے اور ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ جاگئے والا تو سن لے اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو، حالانکہ یہ وہ ذات ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل بھی کر دیتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انکار نہ ہوتا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا، ان کے نزدیک فخر تھا، مگر پھر بھی حضرات صحابہ رضوان

اللہ علیہم اجمعین کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے، مگر یہاں حالت یہ ہے کہ ہر وقت سلام اور ہر وقت مصافحہ ہے، چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو، چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روگ ٹوک اور انتظام بہت ہے، جس پر عنایت فرماؤں نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں، ایک صاحب نے تو میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں، انگریزوں کا ساقانون، ہر بات میں انتظام، ہر بات میں انتظام، فموس! گو اسلام میں انتظام ہی نہیں، بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے، حالانکہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا، ہر کام کا وقت مقرر ہے، نماز کا بھی، روزہ کا بھی، حج کا بھی اور اتنا بڑا انتظام ہے، ذرا ایک تاریخ سے حج مقرر ہو جائے تو پھر سال سے ورے نہیں ہو سکتا، تو کیا اس کو بھی انگریزی قانون کو جو؟ عیادت اور بیمار پرسی کے لیے یہ قانون ہے، "و اذا عباد احدکم المریض فلیخفف الحلو" حدیث میں ہے کہ جب بیمار کی عیادت کیا کرو تو اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرو، کیونکہ بیمار کو زیادہ جہوم سے تکلیف ہوتی ہے، حضرات فقہاء نے اس حکم کی حقیقت کو سمجھا، وہ فرماتے ہیں کہ جس چیز سے توحش ہو وہ کام نہ کرو، جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کو بدھ کے دن عیادت کرنے سے اعتقاد شرک ہو گا تو اس دن عیادت نہ کرو بلکہ دوسرے دن عیادت کر کے اس عقیدہ کی اصلاح کرو، کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نہیں ایسے شخص کی عیادت بدھ ہی کے دن کرنا چاہیے، تاکہ اس عقیدہ کا باطلہ کی مخالفت ہو، تو اسے صاحبو! پھر وہ عیادت ہی کیا ہوئی؟ مناظرہ ہو گیا! عیادت سے مقصود تو مریض کی دل جوئی ہے، آپ کی اس مخالفت سے یہ مقصود کہاں حاصل ہوا؟ بلکہ اس کو تو آپ کی صورت دیکھ کر روٹی وحشت ہوگی کہ کجنت بدھ کے دن کہاں آ مر؟ دیکھتے اس کا کیا نمونہ اثر ہوتا ہے، تو وہ اس سے گھبرائے گا، بات چیت کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا: "لا یتناحبی الفان دون الثالث حتی یاتی رابع (او کما قال) یعنی جہاں تین آدمی بیٹھے ہوں وہاں دو شخص آہستہ آہستہ باتیں نہ کریں، اس سے تیسرے کی دل شکنی ہوگی کہ مجھ کو غیر سمجھا، یہاں تک کہ چوتھا آجائے، تو اب دو شخص باتیں کر سکتے ہیں، کیونکہ تیسرے کو باتوں کا شوق ہوگا تو وہ چوتھے سے کرنے لگے گا، پھر اس کو وہ بدگمانی نہ ہوگی، احتمال ہوگا کہ شاید اس چوتھے سے اخفاء مقصود ہو اور چوتھے کو تیسرے پر یہی احتمال ہوگا، سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے کسی ذرا ذرا سی باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور یہ معجزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت کے دقیق سے دقیق امور کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا، کیا بدون نبوت کے ایسا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

## کفار کا قول

اسی جامعیت کی تعلیم کو دیکھ کر تو کفار کہا کرتے تھے حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ہر بات سکھائی حتیٰ کہ ہانا موتنا بھی سکھایا، کفار نے تو یہ بات طعن سے کہی تھی، مگر حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا کہ ہاں! بے شک ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے کہ بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ یا پشت نہ کریں اور داہنے ہاتھ سے اپنے عضو کو نہ چھوئیں اور تین ڈھیلوں سے کم استنجے کے واسطے نہ لیے جائیں اور ہڈی اور گولہ سے استنجا نہ کریں، یہ تعلیم سن کر کفار کی آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی بول و براز کے یہ آداب تو بدون تعلیم کے معلوم ہو ہی نہیں سکتے، بھلا کچھ ٹھکانا ہے، انتظام کا کہ پیشاب پاخانہ کے لیے بھی آداب مقرر ہیں، پاکی اور صفائی کا یہ قانون ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اذا استبقيظ احدكم من منامه فلا يغمس يده في اناقه لانه لا يدري اين باتت يده" جب کوئی سو کر اٹھے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے، کیا خبر اس کا ہاتھ کہاں کہاں پہنچا ہوگا؟ بھلا یہ انتظام نہیں تو اور کیا ہے؟ نیز ارشاد ہے: "نظفوا افيئتيكم و لا تشبهوا باليهود" اپنے گھر کے سامنے کا میدان صاف رکھا کرو، یہودی طرح نہ بنو، وہ صفائی کا اہتمام نہیں کرتے، سبحان اللہ! جب فناء دار کا اتنا اہتمام تو خود گھر کی صفائی کا اہتمام کیا ہوگا!! اور جب گھر کا اتنا اہتمام ہے تو لباس کی صفائی کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا، پھر بدن اور روح کی نفاذت کا امر تو کیا کچھ ہوگا.....!!!

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

## نفاذت کا قول

اسی سے عاقل سمجھ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر کی نفاذت کا اتنا خیال ہے تو نفاذت باطنی کا تو کس درجہ اہتمام ہوگا، مگر آج کل مسلمان اپنے گھر کے اس سبق کو ایسا بھولے ہیں کہ اگر کوئی اس زمانے میں نفاذت مکان و نفاذت لباس و بدن کا اہتمام کرنے لگے تو اس کو عیسائی اور انگریز کہنے لگیں، چنانچہ مدراس میں ایک انگریز اسلام لایا، ایک روز وہ جامع مسجد میں گیا تو حوض کی نالی میں اس قدر ریٹ جمنا ہوا تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی، اس سے نہ رہا گیا، اس نے ایک دو لوٹے پانی سے سب دھویا اور لوگوں سے کہا کہ صاحبو! ذرا نالی میں سے کبھی کبھی ریٹ تو صاف کر دیا کرو، دیکھو کیسا برا معلوم ہوتا ہے؟ تو لوگ کیا کہتے ہیں! معلوم ہوتا ہے تجھ میں ابھی عیسائیت کا اثر باقی ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون! بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ نفاذت اسلامی کو کوئی

دوسری قوم اختیار کر لے تو وہ اسلام سے نکل جائے اور انگریزوں کا کام ہو جائے، میں بنگال تک گنواؤں شریعت کے انتظام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں: *يقولون احدكم عثت نفسي و ليقولن قلست نفسي* " (او کما قال) یعنی اگر جی متلائے تو خست نفسی نہ کہو، کیونکہ مسلمان کا نفس خست نہیں ہوا کرتا، بلکہ یوں کہو میرا جی متلاتا ہے، سبحان اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بات کرنے کے بھی طریقے بتلائے ہیں تو صاحب! دوسری قوموں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے گھر سے یہ چند باتیں چرائی ہیں، انتظام پابندی قوت، راز داری، اتحاد و اتفاق وغیرہ اور ان اعمال کی خاصیت یہ ہے کہ جو ان کو اختیار کرتا ہے اسے ترقی ہو جاتی ہے، اس لیے دوسری قوموں کو ترقی ہو رہی ہے اور آپ نے ان اعمال کو ترک کر دیا ہے، اس لیے آپ منزل میں ہیں، پھر دوسری قوموں نے جو ان اعمال کو اختیار کیا ہے، وہ اختیار ناقص ہے، اگر اختیار کامل ہوتا تو وہ نتیجہ ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا:

جرعاً خاک آمیز چوں مجنوں کند

صاف گر باشد ندانم چوں کند

ایک خاک آمیز گھونٹ نے تو نچا دیا اگر خالص جام پیتے تو نہ معلوم کہاں پہنچتے؟؟

(العمرۃ بذبح البقرۃ صفحہ ۳۹ تا ۵۷ ملخصاً)

## انیسواں اعتراض..... ہندو مسلم اتحاد کی خرابی!

آج کل اتحاد و اتفاق کا بہت شوق ہے، اسی جوش میں ایسے عالی مضامین اور باریک نکات سوچتے ہیں کہ کیا کہنے! چنانچہ مظفر نگر میں ایک ہندو نے اپنی تقریر میں کہا تھا جب تک ہم میں اتفاق نہ ہوگا کامیابی نہیں ہو سکتی، پھر کہا: جانتے بھی ہو کہ ہم کے کیا معنی ہیں؟ ہم کے معنی ہیں ہندو بھائی اور مسلمان "ہا" سے مراد ہندو اور "میم" سے مراد مسلمان، پھر کہا ہمارے ہندو بھائی ناخوش نہ ہوں کہ "ہا" ذرا سی ہے اور "میم" لمبا ہے، بات یہ ہے کہ ہندو تو ہندوستان ہی کے اندر اندر ہیں، یہ کہیں باہر سے نہیں آئے اور مسلمان عرب اور ایران وغیرہ بہت دور سے آئے ہیں، تو ان کی مسافت بہت لمبی ہے اس لیے ان کے واسطے "میم" اختیار کیا گیا اور اس کو لمبا لکھا گیا ہے، مگر اس شخص نے مسلمانوں کی بابت یہ خیال نہ کیا کہ شاید وہ یہ شبہ کرنے لگیں کہ "ہا" پہلے لکھا گیا اور "میم" کو پیچھے اور "ہا" کو "میم" کے سر پر سوار کیا گیا، اس کی کیا وجہ؟ شاید اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہندو یہاں پہلے سے رہتے ہیں، اس لیے "ہا" کو پہلے اور "میم" کو پیچھے لایا گیا، مگر یہ شبہ پھر بھی باقی

رہا ہے کہ ”ہا“ کو ”میم“ کے سر پر سوار کیوں کیا گیا اس کو پہلے ہی لکھا ہوتا، مگر ”میم“ سے ”ہا“ الگ لکھا ہوتا، مگر شاید اتفاق و اتحاد ظاہر کرنے کے لیے خلط کی ضرورت پڑی ہو اس لیے ایسا کیا گیا۔

## غیروں کی تعریف

واہیات خرافات یہ آج کل کے نکات ہیں، جن کے ندر سر نہ پاؤں، مگر لوگ ہیں کہ ان مضامین پڑاؤ ہیں اور ستم یہ کہ مسلمان بھی اس تقریر کے مداح تھے، جن کے یہاں نکات و معارف ایسے ایسے عالی ہیں کہ دوسری قوموں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی، اسلامی علوم کے ہوتے ہوئے یہ واہیات باتیں اس قابل ہیں کہ مسلمان اس کی تعریف کریں؟ مگر ہماری قوم میں ایک خاص مرض یہ بھی ہے کہ دوسری قوموں کے افعال کی مدح کرتے ہیں اور اپنے گھر کی چیزوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ ایک زمانہ انگریزوں کی پرستش کا تھا، اس وقت تک ان کے افعال اور معاشرت کی مدح سرائی ہوتی تھی اور مسلمانوں کے طرز معاشرت پر ان کے طرز معاشرت کو ترجیح دی جاتی تھی، اب ہندوؤں کی پرستش کا دور ہے، اب ان کی باتوں کی مدح و ثناء ہوتی ہے، غرض یہ ہمیشہ دوسروں ہی کی پرستش میں رہیں گے، ان میں یہ جوصلہ نہیں رہا کہ اپنی دولت کے سامنے کسی کی چیز کو بھی منہ نہ لگائیں، بلکہ سب کو اسی کے کے سامنے جھکانے کی کوشش کریں، افسوس! ایسے مسلمان اب زمین کے اندر پہنچ گئے اب تو ایسے مسلمان رہ گئے ہیں کہ ایک صاحب کا مقولہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو فلاں شخص (یعنی گاندھی) نبوت کا مستحق تھا، افسوس، اس شخص کو مسلمانوں میں کوئی اس قابل نہ ملا تھا، ایک ہندو ہی اس قابل ملا تھا؟

اے صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کون سا اسلام ہے؟ جس میں بنی ہونے کے لیے ایمان کی بھی شرط نہیں، پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت نہ کرو، جس اتحاد کا یہ نتیجہ ہو کہ مسلمان اس سے الحاد کی طرف جائیں اس اتحاد پر صد نفرین ہے۔

پھر کوئی ان لیڈر صاحب سے پوچھے کہ جب تمہارے نزدیک ہندو بھی قابل نبوت ہو سکتا ہے تو تم نے اس قضیہ شرطیہ کو کیوں تکلیف دی کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی؟ کیونکہ ایسی نبوت تو ختم نہیں ہوئی، اس لیے ختم تو وہ چیز ہوتی ہے جو پہلے شروع بھی ہو چکی ہو اور ایسی نبوت تو آج تک شروع ہی نہیں ہوئی جس میں اسلام و ایمان کی قید نہ ہو، جب وہ شروع نہیں ہوئی تو ختم بھی نہیں ہوئی، بلکہ یہ تم نے نبوت کی نئی قسم نکالی ہے، اس کے لیے یہ شرط بڑھانا کہ ”اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی“ محض حماقت ہے، تم کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نبوت اسلام تو ختم ہو چکی، اب میں نبوت کی ایک دوسری قسم ایجاد کرتا ہوں جس میں ایمان و اسلام کی بھی قید نہیں اور اس قسم کا پہلا نبی فلاں شخص ہے، غرض



تقریف کرنے کے لیے بھی ہنر چاہیے، کفر یہ کلمہ بھی زبان سے نکالا اور وہ بھی بے تکا جس حکم سے نہ پائیں اور کمال یہ کہ ایسے کلمات کو پنہاں بھی نہ کر سکے، یہ لوگ لیڈر اور مسلمانوں کے مقتداء بنے ہوئے ہیں، کوئی عالم یا جاہل اس شخص کو متنبہ نہیں کرتا کہ ان کلمات نا شانستہ سے ایمان میں فرق آگیا تو اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کر اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے تب تو ظاہر ہے اور اگر توبہ کر لے جب بھی یہ لوگ لیڈر اور مقتداء بننے کے قابل نہیں، کیونکہ ایسے کلمات سے معلوم ہو گیا کہ یہ اسلام کی تعلیم سے بالکل کورے اور نرے جاہل ہیں، سو توبہ کر کے گناہ تو معاف ہو جائے گا مگر ایک منت کی توبہ سے علم تو حاصل نہ ہوگا۔

غرض مسلمانوں کے اندر یہ بڑا مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ان کو دوسری قوموں کی باتیں زیادہ واقع معلوم ہوتی ہیں اور اپنے علماء کو چھوڑ کر یہ دوسری قوموں کے افراد کی عظمت کرنے لگتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قومیت اسلامی کے حامی و محافظ ہیں، ڈلے پتھر کیا قومیت اسلامی کی یہی حمایت ہے کہ تم اسلامی تعلیم کو دوسرے مذاہب کی تعلیم کے آگے، اسلامی علماء کو دوسری قوموں کے افراد کے سامنے ذلیل و پست کر دو؟ واللہ! یہی لوگ اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہی قومیت اسلامی کو برباد کرتے ہیں، ان تحریکات سے خدا تو ان کو مطلوب ہے ہی نہیں، مگر جس قومیت کا یہ رات دن روناروتے ہیں، اس کی کجی جڑیں اکھاڑ رہے ہیں۔

## قومیت کی حفاظت

قومیت کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی قوم کو دوسروں سے مستثنیٰ ثابت کرو، خود محتاج نہ بنو دوسروں کو اپنا محتاج بناؤ، اپنی تعلیم کے مقابلے میں کسی کی تعلیم کو ترجیح نہ دو اور ثابت کر دکھاؤ کہ اسلامی تعلیم سے بہتر کوئی تعلیم نہیں، نیز اپنے علماء کے سامنے دنیا بھر کے عقلاء کو پست اور نیچا دکھا دو اور اس کے لیے تم کو کچھ کرنا نہیں پڑے گا، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ الحمد للہ! اسلام میں وہ لوگ موجود ہیں جن کے سامنے دنیا بھر کے سیاستدان طفل مکتب ہیں، قرآن و حدیث کے برابر سیاسی اور تمدنی تعلیم کون سی کتاب میں ہے؟ ذرا کوئی لا کر تو دکھائے! پھر جو لوگ قرآن و حدیث کے حقیقی طور پر سمجھنے والے ہیں، ان کے برابر کوئی بھی عاقل یا سیاستدان ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! بخدا ہرگز نہیں! مگر یہ ساری خرابی ان علماء کی ہے جو ہر بات میں ان لیڈروں کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور لیڈروں کی طرح خود بھی کافروں کی سیاستدانی کے معتقد ہیں، ان کی علانیہ مدح کرتے اور منبر پر بیٹھ کر وعظوں میں تعظیم سے ان کا نام لیتے ہیں اور یہ وہ علماء ہیں جنہوں نے کسی صاحب دل کی

جو تیاں سیدھی نہیں کیں، مجھس کتاب پڑھ کر عالم ہو گئے ہیں مگر:

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت رہبری داند

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(محاسن اسلام صفحہ: ۳۳۲ تا ۳۲۷)

## غیر مسلموں کی حمایت

چنانچہ بعض نام نہاد علماء ہندوؤں کے ساتھ ان تحریکات میں شریک ہوئے ہیں اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اپنی روش پر چلنے سے تو کچھ زیادہ قدر نہیں ہوتی نہ زیادہ دولت ملتی ہے، لاؤ وہی طریقہ اختیار کریں جو ہندوؤں نے اختیار کیا ہے، شاید اس طرح کچھ زیادہ وقعت مل جائے اور اگر انہوں نے سوراخ لے لیا تو اس میں ہمارا بھی حصہ رہے گا، اگر ہم الگ رہے تو بالکل محروم رہیں گے۔

افسوس! مسلمان ہو کر غیر پر نظر؟ بڑی شرم کی بات ہے! ان لوگوں نے یہ خیال نہ کیا کہ جو طریقہ کفار کے لیے حصول عزت کا ہے، مسلمانوں کے لیے وہ طریقہ نہیں ہے، مسلمان کبھی دوسری قوموں کی اتباع کر کے ترقی نہیں کر سکتا، اگر وہ مسلمان ہے، مسلمان کی ساری عزت اسی میں ہے کہ وہ اپنے طریقے پر قائم رہے اور کسی حال میں احکام شریعت سے تجاوز نہ کرے، اسی سے فلاح ہوتی ہے، گو سامان کم ہو اور اس کے خلاف میں فلاح نہیں، گو سامان زیادہ ہو۔

## قتال کی اجازت

دیکھئے! اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں کہ وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوتی، مدینہ پہنچ کر اجازت ہوئی اس کی کیا وجہ ہے؟ ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت جماعت و قلت اسباب اس کا سبب تھا، یہ خلاف تحقیق ہے، کیونکہ مدینہ ہی پہنچ کر کیا جماعت بڑھ گئی تھی؟ کفار کا پھر بھی غلبہ تھا، مدینہ کی جماعت تمام عرب کے مقابلہ میں کیا چیز تھی؟ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلہ میں یہ اجازت ہوئی تھی، تب تو مدینہ کیا، سارا عرب بھی قلیل تھا، اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی؟ کفار ہمیشہ نہایت ساز و سامان سے مقابلہ کرتے تھے اور مسلمانان مدینہ کی یہ حالت تھی کہ بعض مواقع میں ایک ایک سواری پر سات

ساتھ آٹھ آٹھ آدمی شریک ہوتے تھے، بعض دفعہ چند آدمیوں میں ایک ہتھیار مشترک ہوتا تھا، پس یہ کہنا بالکل واقع کے خلاف ہے کہ مدینہ جا کر جماعت و سامان کی زیادت اس اجازت کا سبب بنی ہوئی خصوص سے خود کو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلہ میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا، چنانچہ ارشاد ہے: ”وَ أَنْزَلْنَا حُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا“ اور ارشاد ہے:

”بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَ يَأْتُواكُمْ مِنْ فُرُجِهِمْ هَذَا يُمَدِّدْكُمْ رَبُّكُمْ بِحَمْسَةِ آيَاتٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ“

### اخلاق کا سرخ

اور یہ صورت نزول ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی، مگر پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی تو اس کی کوئی وجہ بتلانی چاہیے، اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے، محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ اخلاص و صبر و تقویٰ وغیرہ کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے، اس وقت اگر اجازت قتل کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جوش، غضب و انتقام للنفس کے لیے ہوتا، محض اخلاص و اعلا کلمۃ اللہ کے لیے نہ ہوتا اور اس حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کی جائے اور حمایت الہی ان کے شامل حال ہو، چنانچہ آیت مذکورہ میں ”بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا“ کی شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الہی اس وقت متوجہ ہوتی ہے جب کہ مسلمان صبر و تقویٰ میں راسخ ہوں اور تقویٰ کے معنی ہیں ”احتراز عما نہی اللہ عنہ و امتثال ما امر بہ“ جس میں اخلاص راسخ اور احتراز عن الریاء عن شائیتہ النفس بھی داخل ہے اور مدینہ پہنچ کر یہ اخلاص ہو گئے تھے، مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذا پر صبر کرنے سے نفس کی مقاومت بہل ہو گئی، نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی، پھر ہجرت کی وقت جب انہوں نے اپنے وطن و اہل و عیال و مال و دولت سب پر خاک ڈال دی تو ان کی محبت الہی کامل ہو گئی اور محبت دنیا ان کے قلب سے بالکل نکل گئی۔

### النصار مدینہ

النصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا، اس سے ان کے قلوب بھی محبت الہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک ہو گئے تھے، چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک کرنا چاہا، بلکہ بعض حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تو یہاں تک کیا کہ

ایک مہاجر صحابی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم میرے بھائی ہو گئے ہو، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تمام مال آدھوں آدھوں تقسیم کر کے نصف خود لے لو اور نصف تم کو دے دوں اور میرے پاس دو بیبیاں ہیں، ان میں سے جو کسی تم کو پسند ہو، میں اسے طلاق دے کر ابھی الگ کر دوں، عدت گزرنے کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا۔ مہاجر نے ان کو دعا دی کہ خدا تمہارے مال و عیال میں برکت دے، مجھے اس کی ضرورت نہیں، تم مجھے بازار کا راستہ بتا دو، میں تجارت کر کے اپنا گزر کروں گا۔

### واقعہ ہجرت سے امتحان

غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اترے اس کے بعد ان کو اجازت قتال دی گئی کہ اب جو کچھ کریں گے، محض خدا کے لیے کریں گے، اس وقت یہ اس قابل ہوں گے کہ حمایت الہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں، چنانچہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے، خدا کے لیے کرتے تھے، حتیٰ کہ منثویٰ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی کو معرکہ قتال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا، مہرتا کیا نہ کرتا اس کبخت نے آپ رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک پر تھوکا، اب چاہیے تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے، مگر تھوکنے پر آپ رضی اللہ عنہ فوراً اس کے سینے پر سے کھڑے ہو گئے اور فوراً اسے چھوڑ دیا، ہو یہودی بڑا متعجب ہوا کہ میری اس ترکیب کے بعد تو ان کو چاہیے تھا کہ مجھے کسی طرح جیتا نہ چھوڑتے، مگر انہوں نے برعکس معاملہ کیا، آخر اس سے نہ رہا گیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی وجہ پوچھی کہ آپ نے اگر مجھ کو کا فر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا تو تھوکنے کے بعد کیوں رہا کر دیا؟ اس نعل سے نہ میرا کفر زائل ہوا، نہ عداوت سابقہ ختم ہوئی، بلکہ اور زیادہ ہو گئی تھی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ واقعی اس نعل کے بعد میرا رہا کر دینا بظاہر عجیب ہے، مگر بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا، تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا اور جب تو نے میرے اوپر تھوکا تو مجھے فصد اور جوش انتقام پیدا ہوا، میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لیے نہ ہوگا، بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہوگی اور میں نے نہ چاہا کہ نفس کے لیے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کر دوں اس لیے تجھے رہا کر دیا، یہودی یہ سن کر فوراً مسلمان ہو گیا اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب حق ہے، جس میں شرک سے اس درجہ نفرت دلائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کے لیے نہ کرے بلکہ

محض خدا کے لیے ہر کام کرو، دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے، ہاں ہماری حالت یہ ہے کہ یہ لوگ خدمت اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو کلمہ لگاتے واسطے کام کرتے ہیں، اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں، احکام الہی کی پرواہ نہیں کرتے، بس ان کا مقصد یہ ہے کہ کام ہونا چاہیے خواہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف چندہ میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں، صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں پھر حمایت الہی ان کے ساتھ کیونکر ہو.....؟؟

## مسائل سے اجتناب

بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو، اس وقت تو کام کرنا چاہیے بعد میں مسئلے مسائل دیکھے جائیں گے، انا للہ و انا الیہ راجعون! ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ نبوی فلاح ہو سکتی ہے نہ اخروی اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے، جو یہاں صفر ہے، ہمارے بزرگان دین جو بحمد اللہ اب بھی موجود ہیں، وہ محض خدا کے واسطے کام کرتے ہیں، اسی لیے وہ کسی کام میں شریعت سے ایک انچ بھی بڑھنا نہیں چاہتے، اسی طرح جو ان حضرات کے صحبت یافتہ ہیں، وہ بھی نفس کے کام نہیں کرتے۔

(ایضاً ۳۸۳۱۲)

اور جن کو خدا کے ساتھ یہ تعلق حاصل نہیں، ان کی یہ حالت ہے کہ آج ان کے کچھ فتوے ہیں اور کل کو جہاں اغراض بدلیں ساتھ کے ساتھ ان کے فتویٰ بھی بدل گئے ارے! یہ کیا قصہ ہے؟ یہ کیسا اسلام ہے جو اغراض کے تابع ہے؟ مسلمان کو تو ایسے ہونا چاہیے۔

یکے نخوان و یکے دان و یکے گو

مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس ذات کے ساتھ علاقہ رکھے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور اغراض فانیہ کی نفی کرنی چاہیے اور ان کے متعلق: ”لا احب الا فلین“ کہہ دینا چاہیے۔

خلیل آسا در ملک یقین زن  
صدائے لا احب الا فلین زن

## ایک فتویٰ

پہلے سب علماء کا فتویٰ تھا کہ ریل میں بدون ٹکٹ سفر کرنا حرام ہے، مگر اب یہ حالت ہے کہ اس کو جائز کر دیا ہے، بہت لوگ جو علماء و طلبہ کہلاتے ہیں، بے ٹکٹ سفر کرنے لگے۔

میرے پاس ایک طالب علم کا خط آیا کہ بدون ٹکٹ کے ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتا ہوں اور میرا باپ اس سے منع کرتا ہے، ان کے باپ انگریزی خواں دنیا دار تھے، اللہ اکبر! کبھی وہ زمانہ تھا کہ عربی خواں اس سے منع کرتے تھے اور انگریز خواں اس کو جائز کہتے تھے، اب یہ حالت ہے کہ عربی خواں جائز کہتا ہے اور انگریز خواں منع کرتا ہے، بات یہ ہے کہ وہ انگریزی داں کسی دانا (یعنی عارف) کا ذبح کیا ہوا تھا۔

(ایضاً صفحہ: ۹۴۴)

اسی طرح اللہ کا ہو رہے، تب اسلام کامل ہوتا ہے، ورنہ وقت پر سب لکھا پڑھا ہونا نائب ہو جاتا ہے، صاحبو! بدون صحبت اہل اللہ کے توحید بھی کامل نہیں ہوتی، کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی سے خوف و طمع نہ ہو:

موحد چہ بر پائے ریزی رزش  
چہ فولاد ہندی زنبی بر سرش  
امید و ہر اشش بنا شد و کس  
بزمین سب بنیاد تو حید بس

اسلام میں قناعت

مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اسلام کے درجہ ناقص پر کفایت کرتے ہیں، اس کی تکمیل کی فکر نہیں کرتے، نہ نماز کی فکر ہے، نہ روزہ کی، بس ہم کو تکمیل اسلام کی فکر کرنا چاہیے اسلام کامل یہ ہے کہ انسان پورا اللہ والا ہو جائے جب اس کا ایک شعبہ یہ ہے کہ دین کو دنیا اور اغراض کے تابع نہ بنایا جائے، اس وقت دین کی فہم حاصل ہوگی اور جس کے اوپر اغراض نفسانی کا غلبہ ہوگا، اسے دین کی سمجھ حاصل نہ ہوگی، ایسے ہی علماء کا یہ خیال ہے کہ ذبیحہ گاہ شعرا را سلام نہیں۔

(ایضاً صفحہ: ۴۵)

تبلیغ دین کی ممانعت

آج کل ایسے بھی مسلمان ہیں جو تبلیغ کے کام میں روزے انکاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ کام چھوڑ دو، اس سے ہندو مسلم اتحاد میں فرق آتا ہے، انا لکھ وانا الیہ راجعون! ان کے یہاں ابھی ہندوؤں سے اتحاد ہی چلا آ رہا ہے، مگر مزہ یہ ہے کہ اتحاد تو جائین سے ہوا کرتا ہے، مگر ان کا اتحاد یک طرفی ہے کہ ہندو تو ان کی زرا سی بھی رعایت نہیں کرتے، جہاں ان کو موقع ملتا ہے، مسلمان کو مرہم کر لیتے ہیں آبروریزی یا جان و مال کے درپے ہو جاتے ہیں، مگر

ان حضرات کا اتحاد اب بھی باقی ہے، بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جب مسلمانوں کو ہتھیار دیا جائے تو کیا مسلمانوں کو مرتد ہونے دیا جائے؟ ان کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی جائے تو اگر ان کی یہی رائے ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ چاہے ایمان جاتا رہے، مگر اتحاد نہ جائے تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے جس کے واسطے ایمان و اسلام کی بھی پرواہ نہ رہے، جن صاحبوں کی یہ رائے ہو وہ خود تبلیغ نہ کریں، مگر جو لوگ یہ کام کرنا چاہتے ہیں، ان کو یہ کس لیے روکتے ہیں؟ (ایضاً صفحہ: ۵۵)

اور تمنا شاید ہے کہ آج کل جو یہ تحریک اندازہً تندرست اور تندرست رہتی ہے، اس کے متعلق ایسے بعض علماء نے ایک اشتہار میں شائع کیا ہے، کہ یہ تحریک چونکہ خالص مذہبی تحریک ہے، اس لیے اس میں ہر طبقہ کو شریک ہونا چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں، اس میں غیر مذہب کا بھی دخل تھا، دل میں تو ان تحریکات کی حقیقت کو سمجھ ہی رہے تھے، مگر الحمد للہ! برسوں کے بعد اب زبان سے بھی اقرار کر لیا کہ یہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں، پھر نہ معلوم ان میں شرکت نہ کرنے والوں کو کافر و فاسق کیوں بنایا گیا؟ یقیناً جو امر مذہب و غیر مذہب سے مرکب ہوگا وہ فرض و واجب کبھی نہیں ہو سکتا، مگرستم یہ ہے کہ ان لوگوں نے تحریکات سابقہ کی شرکت کو فرض و واجب بنا رکھا ہے۔

صاحبو! مذہب میں بھی سیاسیات کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر وہ سب مذہب کے تابع ہے اور وہ سیاسیات خالص مذہبی سیاسیات ہیں، ان میں غیر مذہب کا دخل ہرگز نہیں ہو سکتا، اگر ان حضرات کے نزدیک پہلی تحریکات مذہبی سیاسیات میں داخل نہیں تو ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ تحریک اندازہً تندرست و خالص مذہبی تحریک ہے، اس میں سب کو شریک ہونا چاہیے، اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں، تو پھر وہ مذہبی سیاسیات میں داخل نہ تھیں۔ (ایضاً صفحہ: ۶۴)

**بیسواں اعتراض..... مقصود بالذات رضائے حق ہے نہ کہ سلطنت!**

آج کل جو عوام حکومت کے مقابلہ میں بہادر بنے ہوئے ہیں، اس کا راز یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کو پوچھتا کون ہے؟ ہاں! جو لوگ مشہور ہیں، ان کا حکومت سے مقابلہ کرنا بے شک بہادری ہے، کیونکہ ان کو ہر وقت اپنے اوپر خطرہ ہے، گو اس سے بحث نہیں کہ یہ بہادری جائز ہے یا حرام؟ اور یہ دینی شجاعت ہے یا نفسانی تہور؟ اس کو علماء سے پوچھو، مگر صاف بات یہ ہے کہ علماء بھی سب

نہیں ہیں، بلکہ علماء بھی حقیقت میں وہی ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں، حکم شرعی کے تابع ہوں اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہیں، ان کی حالت یہ ہے کہ واللہ! اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہو جائیں، مگر میں عقل مند فوراً فتویٰ نہ بدلیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں، بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستے پر آ جائیں گے۔

### علماء لیڈروں کے ساتھ

آج کل علماء لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں، یا تو اس لیے کہ ان سے علیحدگی میں زوال جاہ کا اندیشہ ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے ان تحریکات میں شرکت نہ کی تو مدرسہ کا چندہ بند ہو جائے گا، کوئی مدرسہ کی اعانت نہ کرے گا، ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا، میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ کافی ہے اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں، لعنت ہے ایسے جاہ و مال پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو۔

مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہیے کہ رضائے الہی کے سامنے اس کو کسی کی پرواہ نہ ہو، اگر مخلوق اس کو پاگل بنا کر چھوڑ دے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لیے سلطنت ہے، اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے؟

ما اگر فلاش و گر دیوانہ ایم

مست آں ساقی و آں پیانہ ایم

اس کے نزدیک جو خدا کا دیوانہ نہ ہو وہ خود دیوانہ ہے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مرعش را دید و درخانہ نشد

مگر ان کی دیوانی عقل کی دوائی نہیں، بلکہ مستی عقل سے ان پر ایک نشہ سوار ہے، یہ وہ دیوانگی

ہے جس پر ہزار عقلیں قربان ہیں۔

او گل سرخ ست تو از خویش میخوان

مست عقل است او تو میخوان میخوان

کوئی تو اس لیے نیند میں سو رہا ہے کہ روٹی نہیں ملی، فاقہ گزر رہا ہے اور یہ اس لیے نیند میں ہے کہ کھا



بہت گیا ہے، بہت کھانے سے بھی نیند آتی ہے، اسی طرح کوئی تو اس لیے مجنون ہے کہ اس کے اس عقل نہیں اور کوئی اس لیے مجنون ہے کہ غلبہ عقل سے مست ہو گیا ہے، یہ لوگ مصاحف کو مصاحف کی طرح پیس ڈالتے ہیں، ان کی بڑی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ ایک کو راضی کر لیں۔

مصلحت دیدمن آنت کہ یاران ہمہ کار  
بگذارند و خم طرہ یاری گیرند

## رضائے حق

یاد رکھو سلطنت مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصد درضائے حق ہے، اگر ہم سے خدا تعالیٰ راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں، اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون و ہامان و نمرود شدا بڑے مقرب ہونے چاہئیں، حالانکہ وہ مردود ہیں، معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو وہ وبال جان ہے، اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاجانا نشانے پر بھی راضی ہیں اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں، آخر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے؟ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی، پھر کیوں چھوڑی؟ کھنڈ اس لیے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا، معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہوتے گد تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے، حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ ہر فن کے امام ہیں، حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیہ میں تو امام ہیں، ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا! جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے، پھر دیکھو تو انہوں نے کیا کیا؟ جب رضائے حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کر الگ ہو گئے۔

حضرت ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سلطنت مضمر مقصود نہ تھی، تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کر لیں اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے مضمر مقصود تھی، تو ان کے لیے حکم ہے: "الآن تلبس مال بکم ولا تقضین بین الفین" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق ہے، اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہوتا تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو اتباع احکام کا ارادہ بھی کرتے تھے، ان کو جب بھی قضاء و حکومت کی اجازت نہ دی گئی اور تم تو اتباع احکام کا بھی قصد نہیں کرتے، اس حالت میں تم کو کیونکر اجازت دی جا سکتی ہے؟ چنانچہ دیکھ لو کہ جو لوگ ابھی

تھوڑا زمانہ ہوا پچائیت میں مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے، ان کے کتنے فیصلے شریعت کے موافق ہوتے تھے؟ اور وہ خود اتباع احکام کتنے کرتے تھے؟ حالت یہ تھی کہ وہ خود لوگوں کے دبائے ہوئے ہیں اور پچائیت میں فیصلہ کر رہے ہیں، جن میں اکثر فیصلے خلاف شریعت ہوتے تھے، اگر ان لوگوں کو سلطنت مل جاتی تو مخلوق کو کچا کھا جاتے، تو کیا تم یہ چاہتے ہو خدا تعالیٰ اس ظلم کی حالت میں تم کو سلطنت دے دیں؟ ارے اگر تم بادشاہ بن جاتے تو نہ معلوم مخلوق کا کیا حال ہوتا؟ بڑی خیر ہوئی کہ خدا نے گنہگاروں کو ناخن ہی نہ دیے، اتنا ہی فرق دیکھ لو اپنے میں اور ان لوگوں میں جن کو خدا نے سلطنت دے رکھی ہے کہ تم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ اور اہل سلطنت میں تمہارے ساتھ باوجود تمہاری اس مخالفت کے کیا برتاؤ کیا۔ اگر تم بادشاہ ہوتے اور اس وقت تمہارے ساتھ کوئی اس طرح مقابلہ سے پیش آتا، جیسا تم اس وقت سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو تو نہ معلوم کتنوں کو پھانسی پر لکاتے؟ اور ساری خرابی اس کی ہے کہ تم صرف سلطنت کو مقصود سمجھتے ہو، رضائے حق کو مقصود نہیں سمجھتے ہو، اس لیے تم کو خلاف شرع اقوال و افعال سے ذرا باک نہیں۔

(تقلیل الاختلاط مع الامم صفحہ ۶۰ تا ۶۳)

## اکیسواں اعتراض..... تشبیہ بالکفار مذہبی کاموں میں حرام ہے!

میں ایجادات یورپ سے انتفاع کو منع نہیں کرتا، ہاں! تشبیہ اور کورانہ تقلید سے منع کرتا ہوں اور تشبیہ بالکفار جو شریعت میں حرام ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ تشبیہ بالکفار امور مذہبیہ میں تو حرام ہے اور شعارتومی میں مکروہ تحریمی ہے، باقی ایجادات و انتظامات میں جائز ہے وہ درحقیقت تشبیہ ہی نہیں، بعض لوگ ان احکام کو شریعت سے خارج سمجھتے ہیں، اس لیے میں نے اس مضمون کو بیان کر دیا کہ شعارتومی میں بھی تشبیہ حرام ہے، گو تم اول کے درجے میں ہو مگر پیشاب و پاخانہ میں فرق ہونے سے کوئی پیشاب پینا گوارا کر لے گا؟ ہرگز نہیں! بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کوٹ پتلون پہن کر ٹوپی تو اسلامی پہن لی ہے، اب تشبیہ کہاں رہا؟ میں کہتا ہوں کہ تشبیہ کامل نہ سہی، ناقص تو ہوا اگر آپ ایسا کر سکیں کہ سارا لباس زنانہ پہن کر اوپر سے مردانہ ٹوپی پہن لیں اور اسی حلیہ سے محفل میں جا سکیں تو ہم آپ کو اسلامی ٹوپی اور کفری پاٹجامہ کی بھی اجازت دے دیں گے۔

## مشتبہ صورت

صاحبو! مشتبہ صورت بھی ممنوع ہے، ہمارے یہاں ایک طالب کنویں کے پاس پانچجام دھورے تھے، میں نے پوچھا، یہ پاجامہ پاک ہے یا ناپاک؟ کہا: ”مشتبہ ہے۔“ میں نے کہا: ”پھر تم اس کو کنویں کے پاس دھوتے ہو اور یہی ہاتھ ڈول اور رسی کو لگاتے ہو، جس سے سارا کنواں مشتبہ ہو جائے گا تم خانقاہ سے نکلو، ہدایہ (کتاب) پڑھ کر بھی پاپی ناپاپکی کا خیال نہیں؟“ کہنے لگے: ”مجھے عقل نہیں!“ میں نے کہا: ”اس جواب سے جرم کی تو لٹی ہوگی، مگر ضرورت اخراج کی نفی نہیں ہوئی، کیونکہ اخراج کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جرم ہی پر اخراج ہو، بلکہ کم عقلی بھی موجب اخراج ہے۔“ غرض ان کو خانقاہ سے نکال دیا گیا، تو آپ نے دیکھا کہ مشتبہ پانچجامہ کو ناپاک ہی کا حکم دیا گیا، جیسے ناپاک کپڑوں کا دھونا کنویں کے پاس جرم ہے، ایسے ہی مشتبہ کپڑے کا دھونا بھی جرم ہے، اس طرح آپ اس کو بھی سمجھ لیجئے کہ اسلامی لوپی اور کفری پانچجامہ سے گوا آپ بالکل ناپاک نہ ہوں گے، مگر مشتبہ تو ہو جائیں گے اور اسلام نے مشتبہ صورت سے بھی منع کیا ہے۔

صاحبو! کیا حیرت نہیں ہے کہ ایک برطانوی جرنیل کو تو یہ حق ہو کہ وہ جرمنی وردی کو جرم قرار دے دے کیونکہ وہ برطانیہ کا دشمن ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنان خدا کی وضع کو جرم قرار دیں، مگر اسلام میں تعصب نہیں، چنانچہ تخبہ بالکفار کے مسئلہ میں شریعت نے تفصیل کی ہے کہ جو چیز کفار ہی کے پاس ہو اور مسلمانوں کے یہاں اس کا بدل نہ ہو اور وہ شے کفار کی شعار قومی یا امر مذہبی نہ ہو، تو اس کا اختیار کرنا جائز ہے، جیسے بندوق، توپ، ہوائی جہاز، موٹر وغیرہ، چنانچہ ایک بزرگ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں بندوق ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں: ”نعم السلاح“ کہ یہ بہت اچھا ہتھیار ہے، میں اس خواب سے استدلال نہیں کرتا صرف تائیداً بیان کر دیا، ورنہ اصل استدلال تو اعدہ فقہیہ پر ہے، اس قاعدہ کی بنا پر نہ ہم ایجادات سے منع کرتے ہیں اور نہ ایجادات یورپ کے استعمال سے منع کرتے ہیں، گو اسلام میں ایجادات کی تعلیم بھی نہیں ہے اور یہ اسلام کا کمال ہے کہ اس میں صرف مقاصد کی تعلیم ہے، غیر مقاصد کی تعلیم نہیں، اس کی ایسی مثال ہے جیسے بی اے کے اسکول میں جو تانہ بنانے کی تعلیم نہیں ہوتی اور یہ اس کے لیے نقص نہیں بلکہ کمال ہے اور اگر اسکول میں بی اے کے ساتھ جو تانہ سینے اور پانچامہ کمانے کی بھی تعلیم دی جاتی ہو تو یہ اس کے لیے نقص ہوگا، کمال نہ ہوگا۔

## اسلام کی تعلیم

حکیم محمود خاں کا یہ کمال تھا کہ وہ جو تانبانے کی ترکیب نہیں سکھاتے تھے، ہاں! یہ بتلاتے تھے کہ جو تاس طرح منت سلواؤ کہ اس کی میتیں ابھری ہوئی ہوں، جس سے پیر زخمی ہو جائے، اسی طرح اسلام ایجادات نہیں سکھاتا، ہاں! یہ سکھاتا ہے کہ کسی ایجاد کو اس طرح نہ اختیار کرو، جس سے دین میں خلل ہو، یا جان کا خطرہ ہو، اسی طرح یہ بتلاتا ہے کہ بے ضرورت ایجادات کے درپے ہو کر ضروری کاموں کو ضائع نہ کرو اور ضروری ایجادات میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ مہموم منفعیت کے لیے خطرہ تو یہ کاتل نہ کرو۔

غرض اصول تو ہر ایجاد کے متعلق بتا دیے ہیں، مگر ان کی ترتیب نہیں بتائی، کیونکہ یہ مقصود اسلام سے الگ ہیں اور کمال اسی کا نام ہے کہ مقصود سے تجاوز نہ کیا جائے، یہ تو ان ایجادات کا حکم تھا جن کا بدل مسلمانوں کے یہاں نہیں ہے اور جو ایجادات ایسی ہوں جس کا بدل مسلمانوں کے یہاں بھی موجود ہے، اس میں تشبہ مکروہ ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فارسی کمان کے استعمال سے منع فرمایا ہے کہ اس کا بدل مسلمانوں کے پاس عرب کمان موجود بھی اور دونوں کی منفعیت برابر تھی، صرف ساخت کا فرق تھا۔

غرض اسلام میں تعصب نہیں جیسا کہ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا، ہاں! اسلام میں غیرت ہے کہ جو چیز مسلمانوں کے پاس بھی ہے اور کفار کے پاس بھی ہے، صرف قطع قطع کا فرق ہے، اس میں اسلام نے تشبہ بالکفار سے منع کیا ہے کہ اس میں علاوہ گناہ کے ایک بے غیرتی بھی تو ہے کہ بلاوجہ اپنے کو دوسری قوموں کا محتاج ظاہر کیا جائے، مگر آج کل مسلمانوں میں غیرت نہیں رہی کہ یہ اپنے گھر سے بے خبر ہو کر بلکہ یوں کہے کہ اپنے گھر کو آگ لگا کر دوسروں کی عادات و معاشرت کا اتباع کرنے لگے، بس ان کی مثال ایسی ہے، جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

یک سید پر نان ترا بر فرق سر  
تو ہی تجوی لب ناتا در بدر  
نا بزائوی میان قعر آب  
و زعطش و زجوع کشتی خراب

بے پردگی

چنانچہ آج کل بے پردگی میں بھی مسلمانوں یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں، حالانکہ یورپ

والے عورتوں کی آزادی سے بہت گھبرائے ہیں، اسی طرح بعض لوگ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات دینا چاہتے ہیں، یہ سبق بھی یورپ ہی سے سیکھا ہے اور یورپ والے اس سے گھبرائے ہیں، کیونکہ عورتوں نے مطلقہ بند کر رکھا ہے، اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اہل یورپ کو عورتوں نے پریشان کر رکھا ہے.....!!

صاحبو! اسلام کی تعلیم کی قدر کرو، اسلام کی تعلیم کی قدر کرو!! اسلام کی تعلیم یہ ہے ”وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِأَلْمَعْرُوفِ وَاللَّيْحَالِ عَلَيْهِنَّ ذَرْجَةٌ“ یعنی حقوق میں تو عورتیں مردوں کے مساوی ہیں، مگر درجہ میں مرد بڑھے ہوئے ہیں، جس کو دوسرے مقام پر صاف طور پر بیان فرمایا ہے ”الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا آتَفَقُوا مِنْ أَمْرِ اللَّهِ“ کہ مرد عورتوں پر سردار ہیں، کیونکہ خدا نے ان کو فضیلت دی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی امام نہیں بن سکتیں، نہ ان پر حکومت کر سکتی ہیں: ”وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ ذَرْجَةٌ“ کے بعد ارشاد فرماتے ہیں: ”وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ“ کہ اللہ زبردست ہیں، اگر وہ چاہتے تو مرد و عورت دونوں کو برابر کر دیتے، مگر وہ حکیم بھی ہیں، حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ برابر نہ ہوں، اگر عورتوں کو آزادی دے دی جائے تو پھر ان کی آزادی کی روک تھام بہت دشوار ہوگی، جیسا کہ اہل یورپ کو دشواریاں پیش آرہی ہیں، کیونکہ اول تو آزادی کی روک تھام عقل سے ہوتی ہے اور عورتوں کے عقل نہیں، ان کا ناقص العقل ہونا مشاہد ہے، دوسرے طبعی قاعدہ ہے کہ جو قوت ایک زمانہ تک بند رہی ہو جب اس کو آزادی ملتی ہے تو ایک دم سے اہل پڑتی ہے، جیسے امریکا والے ایک عرصہ تک جاہل رہے، جب ان کو تعلیم حاصل ہوئی تو ایک دم سے ایسے اہل پڑے کہ اپنے استاد سے بھی آگے بڑھ گئے، اس قاعدہ کی بنا پر ہندوستان کی عورتوں کو بلکہ مسلمانوں کی عورتوں کو تو ہرگز آزادی دینا مناسب نہیں، کیونکہ اب تک تو وہ قید میں رہیں، اگر ان کو آزادی مل گئی تو یقیناً ایک دم اہل پڑیں گی۔

غرض اسلام میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات تو نہیں ہے، مگر حقوق کی اس قدر رعایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت کی ہے۔

(الحدود والقیود ۱۹، ۳۳)

## بائیسواں اعتراض..... آج کل کے مسلمانوں کا حال!

آج کل کے مسلمانوں کی رال پگھتی ہے، دوسری قوموں کے سامان عیش و دلکھ کر، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ خیر اور سلامتی اس میں ہے کہ ان کو دنیا زیادہ نہ ملے، اگر ہم کو زیادہ مال دیا جاتا تو رات

دن دنیا ہی کی فکر میں رہتے، آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔

کانپور میں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سا ڈھیلا رو مال سے ڈھک کر بیٹھے اور رات بھر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ! اس کو سونا بنا دے، وعظ میں کسی مولوی سے سن گئے تھے کہ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے، وہ ظالم یہ دعا کرنے بیٹھے صبح کو خوش خوشی جو رو مال کھولا تو وہ ڈھیلا کا ڈھیلا ہی تھا، بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دعا کیوں نہ قبول ہوئی؟ ایک درزی نے کہا کہ اللہ میاں حکیم ہیں وہی دعا قبول فرماتے ہیں جو بندے کے لیے مصلحت ہو، خدا کا شکر کرو کہ یہ سونا نہ بنا، ورنہ تم آپس میں ہی مرکٹ جاتے واقعی سچ کہا! بعض لوگوں کے لیے یہی حکمت ہے کہ ان کو سامان عیش زیادہ نہ دیا جائے۔

اس پر شایدان کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خوب نیک کام کریں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خوب خرچ کریں، تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں، تم کو کیا خبر ہے کہ اس وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں، زیادہ مال ملنے کے بعد باقی رہیں گی یا نہیں؟ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر خوش نیت کون ہوگا؟ مگر حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی جب کہ میرے بعد ممالک و بلاد مفتوح ہوں گے اور تمہارے پاس کثرت سے مال و متاع اور غلام خادم ہوں گے، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا یا رسول اللہ! اس وقت ہم اللہ کی عبادت کے واسطے فارغ ہو جائیں گے ”تفسرغ للعبادة و كفى العنونة“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! تمہاری یہی حالت اچھی ہے جو آج کل ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے زیادہ مال کو پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ ترقی کی اور دنیا میں منہمک نہیں ہوئے، پھر ہمارے لیے کثرت مال کیونکر مفید ہو سکتی ہے.....؟؟

بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر رال نہ ٹکانا چاہیے ”اولئك عجلت لهم طيباتهم في حياتهم الدنيا“ ان کو سب راحت یہیں دی گئی اور پیٹ بھر کر روٹی مل جائے، ستر عورت کے لیے کپڑے اور رہنے کو مختصر مکان اور اتنا بجز اللہ اکثر مسلمانوں کو آج کل حاصل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو اتنا بھی سامان میسر نہ تھا، ہم لوگ تو اس زمانے کے اعتبار سے آج کل بادشاہ ہیں، کیونکہ حدیث میں ہے: ”من اصبغ معافى في جسده امنه في سريره و عنده قوت يومه فكانما حزت له الدنيا بحذا فيرها“ کہ جو شخص اس حالت میں شیخ کرے کہ بدن میں صحت ہو اور نفس میں بے فکری ہو، ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا

مل گئی، جب صحت اور اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھر میں موجود ہو تو یوں سمجھو کہ تمام دنیا کے  
میں آگئی، اگلے دن کی فکر نہ کرو۔

مترس از بلائے کہ شب درمیانت  
جس مصیبت کے درمیان رات حائل ہو اس سے اندیشہ نہ کرو، جب گل ہوگی دیکھا جائے گا، کیا  
خبر گل کو تم بھی ہو گے یا نہیں؟ ایک بزرگ اسی کو فرماتے ہیں:

چوں ترا نانے و خرقانے بود

ہرین مومے تو بکانے بود

غرض حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ بعض لوگوں کو غریب رکھتے ہیں، اس کو کیا خبر کہ امیر ہونے کے  
بعد وہ کیسا ہوتا؟ ایسے شخص کو ثواب دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرماتے ہیں، اس لیے  
یہ نیت ہی درجات عالیہ حاصل کرنے کے لیے کافی ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یوں خرچ  
کرتا، حق تعالیٰ کے یہاں عجیب دربار ہے، وہاں کچھ انفاق ہی پر در آمد نہیں، غریب کے حق  
میں نیت انفاق بھی بمنزلہ انفاق کے ہے، خود نص میں ارشاد ہے: ”قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ  
مِّنْ صَدَقَةٍ تُبْعَثُهَا اَدْنٰی وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ“ پس جس کے پاس مال نہ ہو وہ حال اور قال سے  
ثواب حاصل کرے:

لا خيل عندك تهديها ولا مال

فليسعد النطق الم يسعد الحال

اور جس کو خدانے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت و ہمت کے موافق خرچ کر کے خدا کو راضی کرے۔  
(مطابرا الاموال صفحہ: ۱۸)

## تیسکسوال اعتراض..... جدید تعلیم یافتہ کا غلط استعمال!

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے جاں نثار تھے کہ انہوں نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ترک  
تائیر کی طرف دیکھا، اسی وقت سب نے تائیر چھوڑ دیا، جس کا یہ اثر ہوا کہ اس سے پھل کم آیا تب حضور  
صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ٹوکا نہیں، بلکہ اس فعل میں طبعی خاصیت ہے اور یہ طبی تدبیر ہے،  
اس لیے آئندہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور فرمایا: ”انتم اعلم بامور  
دنیاکم“ کہ اپنے دنیاوی کاموں کو تم ہی زیادہ جانتے ہو۔

اس سے تو تعلیم یافتہ نے یہ مضمون نکالا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دنیاوی امور

میں بالکل دخل نہیں دیا، بلکہ ان کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا ہے کہ جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کریں، یہ مولویوں کی زیادتی ہے کہ دنیاوی معاملات میں بھی دخل دیتے ہیں کہ فلاں تجارت حرام ہے، فلاں جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا جائز نہیں، اس طرح اجارہ کرنا فاسد ہے وغیرہ وغیرہ، میں کہتا ہوں کہ اگر ”انتم اعلم بامور دنیاکم“ کا یہ مطلب ہے تو کیا قرآن کی ان آیتوں کو جن میں ربا، سود اور اکل اموال بالباطل اور رشوت وغیرہ کو حرام کیا گیا ہے، قرآن سے نکال دو گے؟ اور ہزار ہا حدیثیں بھی جن میں بیوع اور اجارات و نکاح و طلاق و ہبہ و میراث کے احکام مذکور ہیں، حدیث کی کتابوں سے نکال باہر کرو گے؟ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی معاملات میں دخل نہیں دیا؟ معلوم ہوا کہ تم نے اس حدیث کا مطلب غلط سمجھا، بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ امور دنیا جو تجربہ کے متعلق ہیں، ان کو تم زیادہ جانتے ہو، باقی ان امور کے متعلق جو احکام ہیں، ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں، مگر چونکہ واقعہ تاہیر سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نبی کیسے ہیں جن کو حقائق اشیاء کا صحیح علم حاصل نہیں ہوا، اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا: ”انتم اعلم بامور دنیاکم“ جس کا حاصل یہ ہے کہ تجربات کا جاننا نبی کے لیے ضروری نہیں بلکہ ضروری حقائق کا علم ضروری ہے۔

(البرہ بالبر صغ: ۶)

## چوبیسواں اعتراض..... ہر اتفاق نہ محمود ہے اور نہ ہر اختلاف مذموم ہے!

خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جب کہ دین کو مفید ہو اور نا اتفاقی جب ہی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اتفاق دین کو مضر اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت وہ نا اتفاقی مطلوب ہوگی، اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں، چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعا علیہ عدالت سے مرافعہ کرتے ہیں تو اس وقت دونوں سے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دست بردار ہو جاؤ، کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نا اتفاقی پیدا ہوگی ہے اور نا اتفاقی مذموم ہے، بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص حق پر ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو، بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دست بردار بھی ہو جائے تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔

صاحبو! اگر نا اتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیے کہ کوئی مقدمہ عدالت میں دائر ہو تو جج مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا دیا کرے، کیونکہ نا اتفاقی کے مجرم دونوں ہیں، مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہ عقلاً کبھی ایسی



رائے دے سکتے ہیں؟ مگر یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ گونا اتفاقی دونوں طرف سے ہے، مگر ایک طرف سے حمایت حق کے لیے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کے لیے، پس تفتیش و تحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہوا اس کی ڈگری ہونا چاہیے اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیے، یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نا اتفاقی مطلقاً مذموم نہیں، مگر افسوس! دین کے معاملے میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا، بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نا اتفاقی چھوڑ دو اور اتفاق پیدا کرو۔

### حق کا ساتھ دینا چاہیے

صاحبو! آخر یہاں پر کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے کس کی نا اتفاقی حمایت حق کے لیے ہے اور کس کی حمایت باطل کے لیے ہے پھر جو حق پر ہوا اس کا ساتھ دیا جائے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جائے اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں، تو بتلائیے! صاحب حق صاحب باطل کے ساتھ کیونکر اتفاق کرے؟ دونوں طرف سے اگر اتفاق ہوگا تو عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ صاحب حق حق کو چھوڑ دے اور دونوں باطل پر ہو جائیں، یعنی دین دار دین کو چھوڑ کر بد دین ہو جائے، ایک یہ کہ دین دار تو دین پر قائم رہے اور بد دینی چھوڑ دے، تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ دین دار دین کو چھوڑ دے اور کچھ بد دین بد دینی کو چھوڑ دے، اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے، اب عقلاً، خود فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون سی صورت عقل کے مطابق ہے؟ یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جائے گا کہ دین دار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی کو چھوڑ دے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دین دار کو تو بد دین سے نا اتفاقی کا حق ہے، مگر بد دین دین دار سے نا اتفاقی کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کو دین دار کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیے۔

### افتراق کی مثال

صاحبو! یہ وہ افتراق ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے، کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر اس اتفاق کو توڑ دیا اور باپ بیٹوں کو باہم جدا کر دیا اور یہ وہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ"

اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایہ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اس لیے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں، بلکہ

کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے جو لوگ حق پر ہوں ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل چھوڑتے ہیں ان کے ساتھ فصل کا حکم ہے۔

پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آج کل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں، دونوں کو مورد ملامت بناتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو آپس میں اختلاف کرتے ہو؟ اور دونوں کو باہم انفاق پر مجبور کرتے ہو، جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بددین ہونا چاہیے اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کر لے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے، بلکہ متعسفانے منتقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا شخصوں میں اختلاف ہو تو اول یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون، حق متعین ہو جائے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جائے، بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے، قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے: ”فَقَاتِلُوا آلَئِي تَبَغَىٰ حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ“ اور اگر آپ کو تحقیق حق کی فرصت یا لیاقت نہیں تو آپ سے دخل دینے کو کس نے کہا ہے؟ اپنے گھر میں بیٹھنے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برائے کہئے۔

(الانسان والفساد: ص ۳۰)

## پچھلی سوال اعتراض..... حقیقت شریعت اعتدال کا نام ہے!

اعتدال اوروں کے لیے تو فرضی ہے، مگر شریعت کے لیے حقیقی ہے کہ اس کی ہر بات انفرادی و تقریبی کے درمیان وسط ہے اور وسط بھی بحرکت سین یعنی وسط حقیقی کیونکہ ایک تو ہے وسط بسکون السین یعنی وسط مطلق اور ایک وسط ہے بفتح السین، یہ ہے وسط حقیقی، اسی واسطے مشہور ہے کہ الوسط متحرک یعنی متعین نہیں کہ ادھر ادھر ہو سکتا ہے، الوسط ساکن یعنی متعین ہے، میں نے اس سے بھی زیادہ لطیف کر دیا کہ الساکن متحرک و المتحرک ساکن اور وسط بسکون السین پر چلنا آسان ہے اور جب اسے بدل دینی سین کا فتح کر دو تو پھر مشکل ہوتا ہے، کیونکہ وسط حقیقی ایک غیر منقسم شے ہے، کیونکہ اگر اس کی تقسیم ہوگی تو پھر اس میں بھی طرفین اور وسط نکلے گا، حالانکہ اس کو وسط حقیقی فرض کیا تھا، ہذا خلف اور ظاہر ہے کہ غیر منقسم پر چلنا جیسا دشوار ہے، چنانچہ اگر کوئی کہے کہ سڑک پر اس طرح چلو کہ وہ جو پتھوں بیچ کا سیدھا خط ہے، اس سے ادھر ادھر نہ ہو تو بہت مشکل ہے، ہاں اگر کسی نے وسط حقیقی میں ایک ڈورا (خط) کھینچ دیا تو اب اس کی سیدھ پر چلنا آسان ہے اور شریعت کی حقیقت ہے وسط حقیقی، چنانچہ شریعت نے ہر چیز میں ایک وسط نکالا، جن میں تہور میں شجاعت، نمود و فوج میں عنف وسط نکالا، اسی طرح جزیرہ و بلاہت میں حکمت وسط نکالا ہے، یعنی جزیرہ تو یہ ہے

جیسا کہ کسی طالب علم نے تیلی سے پوچھا کہ تیل کے گٹھ میں گھنٹی کیوں باندھی؟ اس نے کہا: ”جب تک گھنٹی کی آواز آتی رہے“ یہ معلوم رہے کہ چل رہا ہے، اس نے کہا کہ کھڑا ہو کر خالی گردن بلایا کرے اور جیسے کسی طالب علم نے اپنے باپ سے کہا کہ میں دو دائروں کے سوائڈے بنا سکتا ہوں، انہوں نے کہا: ”اچھا بناؤ!“ آپ نے کہا: ”ایک یہ، ایک یہ اور ان کا مجموعہ، یہ تین ہوئے پھر تین وہ اور ایک تیلوں کا مجموعہ ہوا“ ”وہلم حرا الی ما لا یبناھی“ باپ نے ان کی معقول کو ماکول کر دیا کہ ان دونوں میں سے ایک تو خود کھالیا، ایک دوسرے بیٹے کو دے دیا اور ان سے کہا: ”وہ اٹھانو آے آپ تناول فرمائیں! وہ انڈے کیسے تھے کہ ان سے سوائڈے ہو گئے، کہ اب انہیں نظر نہ آئے جیسے کسی استاد نے ایک بھینگے شاگرد سے کہا ذرا فانی بوتل تو اٹھا لاؤ، اس نے کہا: ”وہاں تو دو ہیں، کون سی اٹھا لاؤں؟“ ”بھینگے کو ایک کے دو نظر آیا کرتے ہیں، استاد نے کہا: ”نہیں! ایک ہی ہے۔“ اس نے کہا: ”دو ہیں۔“ استاد نے کہا: ”اچھا دوسری بوتل تو ڈالو۔“ اس نے ایک توڑی وہ دونوں ٹوٹ گئیں۔ اسی طرح ان کو، بہت سے انڈے نظر آتے تھے کہ وہ دو غائب ہوئے تو سب ہی غائب ہو گئے، یہ جزیرہ کہلاتا ہے، یہ عقل کا ہیضہ ہے، ایک اکل کا ہیضہ ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں ایک بلاہت ہے کہ کچھ خبر ہی نہ ہو، بہت سے بزرگ ایسے ہوتے ہیں، مگر یہ کمال نہیں، چنانچہ کوئی نبی بھولا نہیں ہوا، نہایت دانش مند اور بیدار مغز ہوئے ہیں۔

میرے ایک دوست نہایت بھولے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری بیوی عورت ہے یا مرد؟ کہنے لگے: بظاہر عورت معلوم ہوتی ہے! میں نے کہا کیسے معلوم ہوا کہ عورت ہے؟ کہا: ”وہ ننھ پنے ہوئی تھی، اگر وہ ننھ نہ پنے ہوئے ہوتی تو شاید اسے مرد سمجھتے، یا ان کو کوئی ننھ پہنا دیتا تو یہ بھی اپنے کو عورت سمجھنے لگتے تو بعض ایسے بھولے ہوتے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ نہ جزیرہ ہو، نہ بلاہت ہو، دونوں میں وسط ہو جس کا نام حکمت ہے: ”حیر الامور او سطہا“ اسی طرح باقی امور کو لے لو، غرض شریعت نام ہے، اعتدال حقیقی کا اور اس کا مقتضا جیسا کہ مذکور ہوا یہ تھا کہ اس پر چلنا نہایت دشوار ہو، مگر خدا نے آسان کرنے کے لیے اس وسط پر ایک ڈوری ڈال دی ہے جس کو وہ ڈوری نظر آرہی ہے، اس کو چلنا آسان ہے اور وہ ڈوری کیا ہے؟ علم صحیح! صحبت صالحہ! یہ وہ چیز ہے کہ اس سے وسط حقیقی نظر آ جاتا ہے: ”مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ“

بحر تلخ شیریں همعنان

در میان شاخ برزخ لا یبغیان

تو شریعت بھی افراط و تفریط کے برزخ کا نام ہے، میں علم صحیح کی ایک مثال دیتا ہوں، ایک صفت ہے، غضب للنفس اور ایک ہے غضب اللہ، ان دونوں میں خلط ہے، یہاں امتیاز کی

ضرورت ہے، مثلاً ہم نے ایک مسئلہ لکھا، اسے کسی نے رد کر دیا، ہمیں غصہ آیا اور فی نفسہ ہم نے وہ مسئلہ صحیح لکھا ہے، اس غصہ میں خلط ہے کہ آیا اللہ ہے کہ اس نے حق کو رد کیا یا اللہ نفس ہے کہ اس نے ہم پر رد کیا؟ سوائے طریقت بڑے حاذق طبیب تھے، وہ اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اے عزیز! غور کر کے دیکھو، اگر اسی امر میں تیرے کسی معاصر مولوی پر بھی رد کیا جاتا اور خاص کردہ معاصر جس کی ذات سے تمہارا نفس خوش ہو، اگر ایسے شخص پر بھی رد ہوتا ہے تو آیا اس وقت بھی تم کو ایسا ہی غصہ آتا یا نہ آتا؟ اگر سوچنے پر معلوم ہوا کہ آتا تب تو یہ غضب اللہ ہے اور اگر غصہ کم آتا تو آمیزش ہے اور اگر بالکل نہ آتا تو اس وقت کا غصہ محض للنفس، نفس کی شرارت اور بد معاشی ہے، اسی طرح دوسرے اخلاق رذیلہ اور اخلاق حمیدہ میں امتیاز کے واسطے علم صحیح کی ضرورت ہے اور چونکہ شریعت نام ہے وسط حقیقی کا اسی لیے صراط مستقیم بھی ہے، کیونکہ خط مستقیم کے لیے ”اقصر خطوط واصلہ بین النقطتین“ اور ”اوسط خطوط واصلہ“ ہونا ضروری ہے، یعنی دونوں نقطوں کے درمیان میں بھی ہوگا اور یہی صراط مستقیم شریعت ہے جو قیامت میں بشکل صراط قائم ہوگا، پس وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے اور یہی معنی ہیں اس کے بال سے باریک ہونے کے، کیونکہ بال تو پھر بھی متجزی ہے اور شریعت وسط حقیقی ہونے کی وجہ سے غیر متجزی ہے، کیونکہ شریعت اتنا وسط ہے کہ اس میں پھر وسط نہیں، اسی واسطے قیامت میں بال سے باریک نظر آئے گی، باقی تلوار سے تیز ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ شریعت نام ہے وسط حقیقی کا اور وسط حقیقی پر چلنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے، جیسا کہ تلوار کی دھار پر چلنا، اس لیے وہ صراط دھار سے زیادہ تیز نظر آئے گا۔

البتہ جن کو یہاں وہ ڈوری امتیاز کی عطا ہونے سے چلنا آسان ہو گیا تھا، چونکہ صراط وہ چیز ہوگی جس پر چلنے کے خوگر تھے، اس لیے وہاں بھی اسی درجہ میں اس صراط پر چلنا آسان ہوگا، یعنی اگر یہاں برق کی طرح ہے تو وہاں بھی ہے، اگر یہاں چلنے میں اٹکا تھا تو وہاں بھی اٹکے گا اور جنہم میں گرے گا۔

(روح الجوار صفحہ: ۲۲)

## چھبیسواں اعتراض..... شریعت سے ناگواری کی وجہ!

شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کے لیے آنکھ نہیں ہے، اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں کہیں حق تعالیٰ نے اپنی عرض پوری نہیں کی ہے۔

من نہ کرم خلق تا سودے کنم  
بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم

آپ کے مصالِح کی ایسی رعایت کی ہے کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے، مثلاً شریعت کے پھل پانا کہ پھل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیچنا حرام ہے، گو یہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہے کہ پھل آنے سے پہلے تو باغ پانچ سو کا بکتا تھا اور اب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کا بیچنا پڑا، لیکن خریدنے والے سے پوچھو کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے کہ پانچ سو جس باغ کے دیتا تھا، ڈھائی سو میں مل گیا، اسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دور کا عصبہ چھوڑا، آدھی میراث بیٹی کو ملے گی اور آدھی عصبہ کو۔ اس میں بیٹی کو ناگوار ہوا کہ میں خاص بیٹی اور میرے باپ کا مال! یہ دور کا رشتہ دار، اسے خواہ مخواہ دے دیا، مگر اس عصبہ سے پوچھو تو وہ کہے گا، سبحان اللہ! شریعت میں حقوق کی کیا رعایت ہے! دور دور کی قرابت کو بھی اس قدر مانا ہے، تو اب ایک ہی حکم ہے، مگر دو آدمیوں میں سے اپنے اپنے اغراض کی وجہ سے ایک کو ناگوار ہے اور ایک دوسرے کو گوارا، اب ہم کس کے فیصلہ کون دونوں میں سے مانیں گے.....؟؟

ترك اللات والعزى جميعا

كذلك يفعل الرجل البصير

یعنی لات اور عزری کو چھوڑ دیا، ہم دونوں میں سے کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے، کیونکہ یہ دونوں خود غرض ہیں ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے، کیونکہ وہاں شائبہ بھی غرض کا نہیں ہے، اسی لیے وہی قابل اعتبار ہے، وحی کا فیصلہ یہ ہے کہ شریعت کا قانون ہے جو مصالِح عامہ کی رعایت کرتا ہے، جیسے سرکاری قانون، مثلاً سڑک پر پیشاب کرنا حرام ہے۔

اب ایک شخص کو زور کا پیشاب لگا، وہاں تو یہ حکم ہے کہ پیشاب مت کرو اور یہاں موت نکلا جا رہا ہے، تو وہ شخص کیا کہے گا کہ بڑی تیزی کا قانون ہے! کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیشاب کی تو اجازت ہوتی، مگر اس کی بدلو سے بچنے کے لیے کوئی ایسی دوا ڈال دی جاتی کہ دماغ بے حس ہو جاتے، اس لیے کسی کو بد بونہ معلوم ہوتی، بھلا کون اسے پسند کرے گا؟ اس گدھے کے مونٹنے کے واسطے سب کو بے حس بنا دے، اسی طرح شریعت نے بھی مصالِح عامہ کی رعایت سے قانون بنایا ہے، تم اس میں مصالِح خاصہ اور وہ بھی نفسانیہ ڈھونڈتے ہو اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالِح عامہ کی رعایت سے ہے۔

### قانون میں حکمت

یہ تو حکماء و عقلاء کی نظر میں ہے اور ایک نظر ہے عشق و محبت والے کی اس کو اس وجہ سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ دوست کا قانون ہے، یہ حکماء کی نظر سے بڑھ کر ہے، جیسے کوئی طوائف اپنے کسی

خاص عاشق سے یہ کہہ دے کہ تم لنگوٹی باندھ کر رام نرائن کے بازار میں پھرو، یہ اس سے نہیں پوچھے گا کہ اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے بلکہ فوراً ادھر ادھر دوڑنے لگے گا، اگر کوئی کہے بھی گدھے یہ کیا ہے؟ تو وہ کہے گا:

قال الحداد للو تدلم تشقنى

قال الوتد انظر الى ما يدقنى

ایک شخص دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا تو دیوار نے کیل سے شکایت کی کہ میں نے کیا کیا جو میرے جگر کو شکافتہ کر رہی ہے؟ کیل نے جواب دیا کہ اس سے پوچھو جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔  
تو حکماء و عقلاء احکام کے لم کے درپے ہوں گے اور جو عاشق ہوگا وہ یہ کہے گا کہ حکمت اس سے پوچھو جس نے یہ قانون مقرر کیا ہے، مجھ کو کچھ بحث نہیں، بس مولوی صاحب کو یہی جواب اختیار کر لینا چاہیے۔

در پس آئینہ طوطی صدم داشت اند

آنچه استاد ازل گفت بگو می گویم

غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے، میں اس کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر حکم واسرار معلوم بھی ہوں تو بھی پوچھنے پر ہرگز مت بتاؤ، چاہے یہی گمان کریں کہ انہیں نہیں آیا اور پوچھنے والے بھی خوب سمجھ لیں کہ جاننے والے بھی بہت ہیں، مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتا دیا کریں جیسے طیب کہ جانتا ہے کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا ہے؟ اور چھ ماشہ گل گاؤ زبان کیوں لکھا ہے؟ مگر کوئی مریض پوچھنے لگے تو وہ نہیں بتائے گا، اگر وہ کہے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں طب نہیں آتی؟ ہاں صاحب! نہیں آتی تمہیں پسند ہو پیو، ورنہ مت پیو، عارف شیرازی کہتے ہیں:

مصلحت نیست کی از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

یعنی کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو، مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں بتاتے اور حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ محبوب سمجھ کر اس کے حکم کی علت دریافت کرنا عشق کے بالکل ہی خلاف ہے، اگر کوئی کہے کہ جاؤ! ہم عاشق ہی نہیں، پھر و طائف عشق بھی واجب نہیں، تو صاحب! تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ عشق تو لوازم ایمان سے ہے جب تم نے آمنہ کہا، تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا، جیسے کوئی شخص کہے کہ مجھ پر نان و نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گیا؟ میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا، صرف قبلت الکاح کہا جب ہی شوہری کے حقوق ملتزم

ہو گئے، پس اسی طرح جب ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کہا پس عاشق ہوئے، کیونکہ اس کلمہ سے مؤمن ہو گئے، مؤمن کے بارے میں ارشاد ہے: ”وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ“ لوگ خدا پر ایمان لائے وہ خدا کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، تو تصدیق ایمان کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہو گئے، اب آپ عشق سے انکار کریں تو کیا ہوتا؟ جب عاشق ہونا ثابت ہو گیا تو عشق کے حقوق ادا کرو، پس کان مت پلا اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو، اگر کوئی اس انقیاد کا قصد کرے تو اول اول تو تکلف ہوتا ہے، پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے، تو اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے، تو جس طرح وہ عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے، اگر کوئی کہے کہ وہاں کیونکر غذا ہو جاتی ہے، تو میرے پاس اس کی لا جواب مثال موجود ہے، دیکھئے! حضرت تمباکو سلمہ اللہ تعالیٰ کہ کوئی اس سے مشکل سے بچا ہوگا، کہیں اگلا، کہیں شراب اس کا استعمال ہوا کرتا ہے، شروع کرتے وقت کیسی مٹی ہوتی ہے! کیسی اڑکیاں آتی ہیں، چکر آتا ہے، مگر جب عادت پڑ جاتی ہے، تو پھر یہ غذا سے زیادہ مرغوب ہو جاتا ہے، روزے میں سب کو تو پانی اور شربت کی فکر ہوتی ہے، مگر انہیں نہ پھلکوں کی پرواہ نہ شربت کی پرواہ نہ افطاری سے مطلب، ارے بھی حقد دے دو، ایک پان دے دو ایسی مکروہ چیز کیسی محبوب ہوئی! اے اللہ! تمباکو کی تو اتنی محبت اور شریعت کی اتنی بھی نہیں، ارے بھائی تمباکو ہی سمجھ لیا ہوتا، تمباکو تو کیا ہوتا؟ آخر کسی طرح بھدے لوگوں کو سمجھاؤں بھی، اگر خمیرہ گاہ زبان نہیں سمجھتے تو خمیرہ تمباکو ہی سمجھ۔

بہر حال اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ عادت ڈال لو تو وہ بھی غذا ہو جاتی ہے۔

## ایک مثال

بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کے وقت ناک منہ پڑھاتے دیکھ کر اگر یہ شبہ ہو کہ عادت پڑ جانے کے بعد ان پر اثر کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہے، صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے اور دل میں نہایت خوش ہیں، اس کی مثال بھی میرے پاس موجود ہے اور وہ نظیر حضرت تمباکو کے دردست ”مرچ“ ہیں کہ ناک بہہ رہی ہے، آنسو جاری ہیں، سی سی کر رہے ہیں، مگر کھائے چلے جاتے ہیں، کیوں صاحب! اگر تکلیف ہے تو کیوں کھاتے ہو؟ بات یہ ہے کہ تکلیف منہ کو ہے مگر زبان اور حلق کو مزہ آتا ہے، اس لیے منہ کی تکلیف گوارا ہے تو اب سمجھ میں آ گیا کہ لذت و الم دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو، مگر دل اور روح شاداں ہیں اور اس عادت کا یہ اثر ہے کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے، گو بدن کو آرام ملا کہ پڑے سوتے رہے مگر قلب کو جو

تکلیف ہے اس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں، حضرت مولانا فرماتے ہیں:

بردل سالک ہزاراں غم بود

گر زباغ دل خلالے کم بود

یعنی اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے تو اس وقت دیکھو ان کے غم کو، پھر اس میں بھی دو درجے ہیں، زاہد کو تو غم ہوتا ہے، مطلقاً عمل فوت ہو جانے کا اور عارف کو غم ہوتا ہے، باختیار خود فوت ہو جانے کا اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا، دوست نے اس میں یونہی تصرف کیا، مگر یہ بات عام لوگوں کو سنانے کی نہیں، کیونکہ اگر یہ قصداً بھی سو گئے اور نماز قضا کر دی، تو جیلہ نکال لیں گے کہ محبوب کی یوں ہی مرضی تھی، تو یہ مرضی مرض والوں کے لیے نہیں، کیونکہ وہ خود مرضی بفتح امراء ہیں یعنی مرض والے، بہر حال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہے، مگر روح کو نہیں ہوتی، بلکہ ان اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ وہ غذائے روح بن جاتے ہیں کہ اگر وہ نہ ملیں تو پریشانی ہوتی ہے، صرف شروع میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے، جیسے مشاہدہ سے پہلے مجاہدہ کی ضرورت ہے، یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے، پھر تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔

تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ حالانکہ اس میں ہمارے کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی بے حد رعایت کی ہے اور ساری مصلحتوں سے بڑھ کر تو چین ہے جو بدون اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ چین تو بقول تمہارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے، پس اگر ہم ہر وقت خدا کو یاد کریں اور اتباع شریعت نہ کریں تو تعلق باللہ تو حاصل ہو گیا، پس چین سے رہ گئے، تو خوب سمجھ لو کہ مطلق تعلق سے یہ قاعدہ حاصل نہیں ہو سکتا، ایسے تعلق میں چین کا گمان بے حسی ہے، فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے جو مرنے کے بعد کھل جائے گی۔

## غیر ملکی کی ایک حکایت

جیسے ایک سرحدی گنوار ہندوستان میں آیا، ایک حلوائی کی دوکان پر جا کر حلوا لیا، اس نے دام مانگے، یہ وہاں سے بھاگا، وہ حلوائی بھی پیچھے بھاگا جب وہ اتنا بھاگا کہ قریب تھا کہ پکڑ لے، آپ نے وہ حلوا چھٹ منہ میں رکھ لیا کہ جاؤ اب نہ ہمارا نہ تمہارا وہ پکڑ کر پولیس کے پاس لے گیا، تھا نیند اتر تو رحم دل تھے، انہوں نے بجائے چالان کے یہ سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے ادراعلان کے لیے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دینے کی سزا دی، لوٹنڈوں نے اسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ ہو لیے یہ ہندوستان کی سیر سے فارغ ہو کر اپنے ملک میں پہنچے وہاں لوگوں نے پوچھا کہ ”آغا ہندوستان رفتہ بودی“ چطور ملک است؟“ جناب ہندوستان کیسا ملک



ہے؟) آپ نے کہا: ”خوب ملک است!“ (بڑا اچھا ملک ہے!) پوچھا گیا: ”بچے طور؟“ تو جواب فرماتے ہیں: ”در ہندوستانی حلوا خوردن مفت است!“ (حلوا مفت کھانے میں آتا ہے!) ”سواری خرمفت است!“ (گدھے کی سواری مفت ملتی ہے!) ”ہوم ہوم صفت است!“ (باجا مفت ملتا ہے!) ”فوج طفلان مفت است!“ (لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے) ”ہندوستان خوب ملک است!“ تو جیسے ان حضرات کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ چشم و خدم عزت کا سامان تھا، یا یہ نہایت ذلت کی سزا تھی؟ اسی طرح ان کو نہیں معلوم کہ یہ چین ہے یا بے چینی؟ لیکن کہاں تک:

فسوف تری اذا انكشف الغبار

افرس تحت رجلك ام حمار

”عنقریب غبار چھٹنے کے بعد معلوم ہوگا کہ تیرے پاؤں کے نیچے گھوڑا تھا یا گدھا جب حقیقت منکشف ہوگی اس وقت معلوم ہوگا کہ چین تھا یا بے چینی؟ جیسے اس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہوگا! اسی طرح انہیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائے گا کہ وہ لذت تھی یا بے لذتی.....!!

### شریعت کا اتباع

غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایہ راحت ہے تو وہ جانین سے ہے ”رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ“ وہ نسبت ہی نہیں جو ایک طرف سے ہو، جیسے کسی شہر میں ایک پڑوسی طالب علم تھے، ان کے دیس کے کوئی آدمی ان سے ملنے گئے انہوں نے پوچھا میاں طالب علم! کس رنگ میں ہو؟ کہنے لگے: ”شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں!“ پوچھا: ”کیا سامان ہوا؟“ کہنے لگے: ”وہاں آدھا کام تو ہو گیا، آدھا باقی ہے۔“ پوچھا: ”کس طرح۔“ کہنے لگا: ”میں تو راضی ہوں، مگر وہ راضی نہیں۔“ خوب آدھا ہو گیا!! تو یہ تو الوپن ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ بزرگ خود صاحب نسبت ہیں جو یادداشت بہم پہنچا کر اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں، مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب ان کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں، مگر اللہ میاں راضی نہیں، خوب سمجھ لو کہ ان کے راضی ہونے کا معیار صرف اتباع احکام ہے، اگر اس حال میں موت آگئی تو سب ٹھل جائے گا یہ تعلق ان کو پسند نہ ہونے کے سبب تمہاری نظر میں کس قدر ہوگا، بقول شیخ سعدی رحمہ اللہ:

چوں در چشم شاہد نیاید زرت

زر و خاک یکساں نماید برت

آپ نے ہزار روپیہ محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو، مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش نہیں ہوا اور اس نے نہیں لیے اور انہیں واپس کر دیے کسی نے کہا کہ گھر میں بھیج دو، تو یہی کہو گے کہ چھینکو بھی، کیا کروں گا ایسے نمونوں روپے کو؟ اسی طرح جب معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ اس تعلق سے راضی نہیں ہوئے تو اس کا تعلق کو کیا سمجھو گے؟ تعلق وہی ہے جو کہ دونوں جانب سے ہو اور یہ تعلق بدون اتباع شریعت کے نہیں ہو سکتا، تو دیکھئے! شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی! حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں:

”ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا“، تم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں: ”وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّورَ..... فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ“، یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دیں تھیں اور ہم نے ان کو دنیا والوں پر فوقیت دی تھی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں، سو انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا، بوجہ آپس میں ضد ضدی کے، آپ کا رب ان کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے، اس کے بعد فرماتے ہیں: ”ثُمَّ جَعَلْنَاكَ..... الْح“، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی تھی، اس کے بعد ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا ”مِنَ الْأَمْرِ“ میں من بیان یہ ہے کہ وہ شریعت یا طریقہ خاص کیا ہے، وہ امر دین ہے، پس اس کا اتباع کیجئے، لقب کتنا لطیف ہے، شریعت! یعنی جس عنوان سے علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں، وہی عنوان آیت میں وارد ہو گیا، جس سے صریحاً علماء کا ثابت ہو گیا۔

## اتباع شریعت

اب یہ سمجھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ ہے جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے؟ ”وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ“ اور ان جاہلوں کی خواہش کا اتباع نہ کیجئے، سبحان اللہ! کیا یا کیزہ طرز بیان ہے! یہ نہیں فرمایا: ”وَلَا تَتَّبِعْ غَيْرَهَا“ کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے بلکہ یوں فرمایا کہ جہلاء کی خواہش کا اتباع نہ کیجئے، اس میں بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں، وہ خواہشیں ہیں اور ہوائے نفسانی ہیں، اس لیے وہ عمل کے قابل نہیں ”الَّذِينَ يَعْلَمُونَ“ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترامی ہے، یعنی ”الَّذِينَ يَعْلَمُونَ“ کی اہواء کا اتباع جائز ہے، بلکہ یہ قید واقعی ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہش پیش کرتے ہیں، بلکہ وہ تو جہلاء ہیں، جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں آ جانا نہیں، بلکہ مطلب یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں، ان سے

بچتے رہنا، اسی طرح یہاں بھی کچھ اور ”الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ“ کا مفعول جو یہاں ذکر نہیں فرمایا، سبحان اللہ! اس میں عجیب رعایت ہے، اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ ”امر الذین“ ہوتا تو ایک گونہ مصداقہ ہوتا، کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے، تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لیے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے، اس لیے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ ابواء اس لیے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں، یہ دعویٰ کہ جو شخص شریعت کا نتیجہ نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے، اتنا بڑا دعویٰ ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ یہ ساری دنیا کو جاہل بنانا اتنی پکی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال خلافا کا نہیں، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھجک ضروری ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے اور اس وقت گو ظاہر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تشریف رکھتے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و فیض تو ہے، جیسے آفتاب پر ابر آ جائے تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہے، مگر اس کی روشنی تو ہے، بلکہ چونکہ انہوں نے اس لیے تو یہ ابر بھی رحمت ہے کہ براہ راست اس کا عمل نہ کر سکتے، اسی طرح بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو یقیناً یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے عار کرتے اور اس سے حد کفر میں پڑ جاتے، تو اچھا ہوا کہ ابر آ گیا ورنہ ان چندوں کو بڑی مشکل ہوتی ہے۔

## آفتاب کی مثال

بہر حال اب آفتاب کی روشنی ابر سے چھن رہی ہے، اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گیا، وہ شعر یہ ہے:

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ

چارہ نہ نبود در متالاش از چراغ

یعنی آفتاب رخصت ہو گیا اور میں اسے اس لیے پسند نہیں کہ آفتاب رخصت نہیں ہوا، وہ تو اب بھی درخشاں ہے، صرف ابر کے نیچے چھپ گیا ہے، بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہے:

بنوز آل ابر رحمت درخشاں است

نم فغانہ بامبر و نشان است

اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں، جو اب بھی اس دعویٰ کو ثابت کرنے کو تیار ہے کہ جو نتیجہ شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے اور میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا، مگر دین کے حمان پر نظر

کر کے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عاقل ہو، مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی عامل محقق کی صحبت میں رہا ہوں، اس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ مہینے کے لیے بھیج دو، خدا کی قسم! اس چھ مہینے میں وہ محقق یہ ثابت کر دے گا کہ اس عاقل کی زبان سے اقرار کرالے گا کہ میں احمق ہوں! اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا، اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے تو تجربہ کر لو کہ چھ مہینہ کی رخصت لو، پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو، اس وقت دیکھ لو گے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا، مگر جائے گا یہ کہتا ہوں کہ میں احمق ہوں، نہیں! بلکہ احمق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آ جائے گی، تب معلوم ہوگا کہ "أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے وہ جہل ہے، میں حالانکہ کچھ بھی نہیں، مگر جو نیور کے ایک شاعر صاحب میرے یہاں آئے، جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے، میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے ادنیٰ آدمی ہوں، اس طرح دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اضافت ادنیٰ کی طرف کی جائے، بہر حال میں کچھ بھی نہیں ہوں، مگر چند روز رہنے کے بعد وہ واپس گئے تو وہاں جا کر انہوں نے ایک رسالہ لکھا، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عمر بھر جسے تہذیب سمجھائیے وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہیں تھی، خیر وہ تو مر گئے، ایک اور وہی کے طیب آئے، چند روز یہاں رہنے سے وہ بھی یہ کہنے لگے کہ جن کو ہم لوگ اب تک کمالات سمجھتے تھے، سارے نقائص نکلے اور جنہیں ہنر سمجھتے تھے، وہ سب عیوب تھے، تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں؟ اگر شبہ ہو تو تجربہ کر لیجئے! اس لیے فرمایا: "أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" جاہلوں کا اتباع نہ کیجئے۔

### اتباع شریعت کا فائدہ

یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے، جسے امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے، کیونکہ اطمینان اور چین بدون تقلید کے نہیں ہوتا، مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے، ہم فلاںے طیب کا علاج کریں گے، تو اطمینان ہے کہ طیب موجود ہے، بیماری کا خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں؟ اور اگر وہ تقلید نہیں ہے، مثلاً ہم کسی خاص طیب کے پابند نہیں، اگر آج ذرا سنا تغیر پیش آیا تو ایک طیب سے رجوع کر لیا، دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے رجوع کر لیا، تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تغیر میں کس طیب سے رجوع کریں گے؟ غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے، چاہے وہ طیب دانش مند بھی نہ ہو، مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا اور اگر تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ! کیا

کہنا ہے! اگر شریعت کے علم و حکمت کے مواقع ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے ”وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ“ کا تب بھی اتباع شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جب کہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری و مصلحت و موجب اطمینان ہونا اور بھی ثابت ہو گیا، آگے وعید ہے ”أَنْتُمْ لَنْ تُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا“ یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذرا کام نہیں آسکتے، یعنی گویا آج مددگار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آسکتے، اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کر کے ہم تو اکیلے رہ گئے، اس لیے فرماتے ہیں: ”وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ“ اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ دوست سے اہل تقویٰ کا اس سے تردد رفع ہو گیا کہ اہل ابواء اگر ہم سے الگ ہو گئے تو کچھ پرواہ نہیں، کیونکہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے، آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شریعت میں جو صفتیں ہیں، انہیں بتاتے ہیں ”هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ“ قرآن یا شریعت لوگوں کے لیے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لیے بڑی رحمت ہے ”هَذَا بَصَائِرُ“ بصائر جمع بصیرت کی ہے، بصیرت کہتے ہیں، باطنی روشنی کو، جیسے بصر کہتے ہیں نگاہ یعنی ظاہر روشنی کو تو شریعت بصائر ہے، یعنی باطن کو روشن کرنے والی ہے ”وَهُدًى“ اور سرِ اہدایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے ”وَرَحْمَةٌ“ اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے، گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔

## راستہ طے کرنے والوں کی ضرورت

یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے ذہن میں آیا تھا، مگر اسے بھول گیا تھا، اس وقت پھر یاد آ گیا، وہ نکتہ یہ ہے کہ ہر کو کو انہیں تین چیزوں کی ضرورت ہے جب آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے، جس کے ذریعہ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں اور ایک بصر یعنی نگاہ ہوتی ہے جس کے ذریعے سے راستہ نظر آئے، حق تعالیٰ کے قربان جائیے کہ شریعت بتلاتے ہیں کہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کیے ہوئے ہے ”هَذَا بَصَائِرُ“ یہ آنکھیں بھی ہے ”وَهُدًى“ اور راستہ بھی اس کے ذریعے سے طے ہوتا ہے ”وَرَحْمَةٌ“ اور رحمت بھی ہے، یعنی مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے، سبحان اللہ! بصیرت، طریق، مقصد، تینوں اسی ایک شریعت میں ہیں۔ اب رہا یہ ہے کہ بصائر کو جمع کیوں لائے؟ اور ہدیٰ و رحمہ کو مفرد کیوں لائے؟ اس میں نکتہ یہ ہے کہ راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں اور سب کی آنکھیں الگ الگ ہوتی ہیں، اس

لیے اس کو جمع لانے اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے اور مقصود بھی سب کا ایک ہی ہوتا ہے، اس لیے وہ بالکل مفرد لائے پھر آگے فرماتے ہیں یہ رحمت تو ہے، مگر ہر شخص کے لیے نہیں بلکہ "لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ" یعنی یقین کرنے والوں کے لیے یقین کے دو درجے ہیں، ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی، تقلیدی تو یہ ہے کہ احکام کو بلا دلیل مان لو، پھر ان احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جائے گا، جیسے شروع میں الف بے کے محض استاد کی تقلید سے مان لیتے ہو، اس کے بعد اس تقلید کی بدولت بڑے بڑے علوم کے محقق بن جاتے ہو، اگر شروع ہی میں یہ پوچھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے؟ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل رہو گے، اس لیے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو، پہلے ہی محقق بننے کی کوشش مت کرو۔

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی

تاراه میں نہ باشی کے راہبر شوی

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو۔

در کاتب حقائق پیش ادیب عشق

ہاں اسے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(الشریعت صفحہ: ۴۲۷۳۰)

## ستا کیسواں اعتراض..... عذاب قبر پر اعتراض کا جواب!

احادیث میں جو عذاب و ثواب قبر کا ذکر ہے، یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ ہم نے انسان کے مرجانے کے بعد اس کے جسم غضری کا مہینوں پہرہ دیا ہے، ہم کو تو کچھ بھی عذاب و ثواب نظر نہیں آیا، جواب یہ ہے کہ بزرخ میں انسان کو دوسرا جسم عطا ہوتا ہے جو کہ جسم مثالی ہے، عذاب و ثواب اسی کو ہوتا ہے، لہذا جسد غضری پر عذاب و ثواب محسوس نہ ہونے سے اس کی مطابقت نافی نہیں ہو سکتی، پھر بعض دفعہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لیے اس جسم غضری پر بھی عذاب و ثواب کو ظاہر کیا ہے، چنانچہ اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ بعض لوگوں نے کسی مردے کی قبر میں آگ جلتی ہوئی دیکھی بعض لوگوں کو کسی قبر سے نہایت پاکیزہ خوشبو محسوس ہوئی، لہذا اس حدیث پر کوئی اشکال نہیں خوب سمجھ لو۔ (ترجیح الآخرة صفحہ: ۳۶)

## اٹھا کیسواں اعتراض..... اسلام در حقیقت اللہ کا راستہ ہے!

بعض جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس صراط کو اس لیے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو

اس پر عمل کرنے کی ہمت و دہ اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں، اگر پہلے یہ فرما دیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے، اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبراجاتے، کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات کی رسائی اولاً دشوار ہے، ان کی تو شان یہ ہے:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم

و زہر چہ گفتمہ اندشنیدہ ایم و خواندہ ایم

خدا تعالیٰ کی ذات تک وہ ہم بھی نہیں پہنچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے، خدا

تعالیٰ اس سے بھی وراء الوراہم وراء الوراہ ہیں، اسی کو مولا نافرما تے ہیں:

در تصور ذات او را گنج کو

تا در آید در تصور مثل او

یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہے، مثنوی کو جس گنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا، کسی کے پاس اس کی کنجی نہ تھی، صرف حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ ہی کے پاس اس کی کنجی تھی، حضرت رحمہ اللہ نے اس کا نقل کھولا، حضرت رحمہ اللہ نے مکہ میں ایک دفعہ ایک شخص کو گنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے معنی بتانے میں وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے، مگر کوئی بات غنی نہ تھی، حضرت رحمہ اللہ نے صلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے، بمعنی گنجائش، بس اس کو سن کر وہ شیخ پھر تک ہی تو گئے، اب شعر کے معنی بے تکلف ظاہر ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجائش نہیں، یعنی تصور بالکندہ کی گنجائش نہیں، حق تعالیٰ کا بالکندہ ذہن میں آنا محال ہے، جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے، حق تعالیٰ کی ذات تک رسائی نہیں تو اگر ابتداء ہی اسلام کو صراط اللہ کہہ دیا جاتا، یعنی حق کی طرف اس کی نسبت کی جاتی تو لوگ گھبراجاتے اور سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں، پس اسی طرح ان کا راستہ بھی نہ معلوم کتنا دور دراز ہوگا؟ اس لیے پہلے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے، اس پر چلو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی رسائی ممکن ہے، آپ عیا ناً سب کے سامنے ہیں، پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں، اس لیے سن کر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذہن سے دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا بلکہ نزدیک ہے، یہ فائدہ ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا سہل و نزدیک ہونا معلوم ہو گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی ہوگی اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا اور حقیقت متکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف داعی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود

بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں، یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستہ کو طے کر لیا ہے، معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اس کو طے کر سکتے ہیں، خصوصاً جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو واقف طریق ہیں، ہمارے معین و رفیق ہیں۔

## حق تعالیٰ کی امداد

واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے، کیونکہ خدائی راستہ ہے جس کو وہی طے کر سکتا ہے، جس کو حق تعالیٰ طے کرانا چاہیں، اس لیے سالک کی جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے، اس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے، وہ اس کے طول و لاتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے:

بحریت بحر عشق کہ ہمچش کنارہ نیست

آنجا جز اینکه جاں بسپارند چارہ نیست

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چل رہے ہیں تو اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے:

تو دست گیر شوائے خضر چے خستہ کہ من

بیادہ می روم و ہرہاں سوارند!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت و رفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کر لیتا ہے، یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کی رسائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہو چکی ہے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں انہیں اس کی ضرورت ہے کہ ان مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی کر چکے ہیں، جیسے بادشاہ تک پہنچنے کے لیے وزیر کا واسطہ ضروری ہے، مگر جو وزیر تک نہ پہنچا ہو اس کو چاہیے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں۔

(الاسعاد والابواب صفحہ: ۴۹)

انہی سوال اعتراض..... بعض عامی کی مغفرت بدون عذاب کے بھی ہوگی!

بعض گنہگار بدون عذاب کے ہی بخش دیے جائیں گے معتزلہ کے سوا کسی کا اس میں اختلاف نہیں، ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب ہونا لازم ہے، تماشا ہے! نہ معلوم ان لوگوں کی عقلیں کہاں



گئیں؟ وہ خدا کے ذمہ عقاب و ثواب کو واجب کہتے ہیں، گو یا خدا کو عفو و یا اللہ! قانون کا تابع نہ رہتا ہے، حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ قانون بنانے والا قانون کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ قانون خود اس کے تابع ہوا کرتا ہے، اگر ان کے نزدیک عذاب و ثواب کا وجوب عقلی ہے، اس سے واجب کا منظر ہونا لازم آتا ہے اور اضطرار امارات حدود سے ہے اور واجب اضطرار سے منزه ہوتا ہے اور اگر یہ وجوب شرعی ہے تو اس کے لیے دلیل شرعی کی ضرورت ہے، اگر وہ دلیل میں آیات و وعید پیش کریں تو ہم آیات عفو و مغفرت و شفاعت پیش کریں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے گناہوں کو بدون عذاب کے بھی معاف کر دیتے ہیں:

”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ وہاں! جن آیات میں افعال کبیرہ کا عقاب مذکور ہے، وہاں استحقاق مراد ہے لزوم عذاب لازم نہیں وقوع مراد نہیں، یعنی کبار سے وہ شخص عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے، وقوع عذاب لازم نہیں ممکن ہے حق تعالیٰ ویسے ہی بخش دین، باقی وقوع کے متعلق آیت: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ... الخ“ سے صاف معلوم ہو گیا کہ سب گناہوں پر عذاب لازم نہیں، بجز شرک و کفر کے، ان پر عذاب لازم ہے، یعنی شرعاً غرض گناہ کبیرہ تو بدون عقاب کے معاف ہو سکتا ہے، مگر کفر و شرک کا مرتکب بدون عذاب کے نہیں رہ سکتا، اس پر عذاب لازم ہے اور وہ بھی ابد الابد کے لیے جس کا انقطاع کبھی نہ ہوگا، یہ جرم کسی طرح معاف نہ ہوگا، نہ عذاب سے نہ بغیر عذاب کے۔ (محاسن الاسلام صفحہ: ۹)

تیسواں اعتراض..... مرتد بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا ہوا ہے!

قوانین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں، بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں، ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں، یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں، یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں، مگر باغی کے لیے بجز قتل یا عبور دریاے شور کے کچھ سزا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے، اسی طرح اسلام لاکر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہے۔

دیکھئے ایک وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی، بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے، اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر کبھی وہ آپ کی خدمت و ججو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، سب کہہ دیتے ہیں کہ میاں! اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ

عداوت ہے، دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کا دوست رہا، پھر کسی وقت مخالف بن گیا، اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہنچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں کرتا ہے لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ وہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کا منشاء محض عداوت نہیں ہے، اگر دشمن ہو تو سالہا سال تک دوست کیوں بننا؟ معلوم ہوتا ہے کہ دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں، اس لیے مخالف ہو گیا، حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو، وہ اترے پترے معلوم کرنے کے بعد ہی دشمن بنا ہو، ممکن اس شخص نے دوستی ہی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہے، اس کو ضرور کچھ رازدار نہ باتیں معلوم ہوئی ہیں، اس لیے مخالف ہو گیا، چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا، پس ہر چند دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے، مگر عادتاً لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے، اس لیے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے، اس لیے شریعت میں مرتد کے لیے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

(محاسن اسلام صفحہ: ۱۹)

## اقتیواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب کا حال!

سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غنائے ظاہری کی ضرورت نہ تھی اور جو اصل غنا ہے یعنی غنائے قلب تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فطرت سے موجود تھا اور نبوت کے بعد اس میں قدر ترقی ہوئی کہ کسی کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر غنائے قلب حاصل نہ ہوگا، کیونکہ اس کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے اور ان صفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی کامل نہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا، بلکہ ظاہری غنا سے تو اہل قلب کو پریشانی ہوتی ہے اور اس کے حقوق کا خیال کر کے یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اسی کے ازالہ کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فرمایا ہے: ”هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ اس کی دوسری تفسیریں کی گئی ہیں، ایک یہ کہ ”هَذَا“ متبداً ”عَطَاؤُنَا“ خبر اول ”بِغَيْرِ حِسَابٍ“ خبر ثانی، یہ ہمارے عطا ہے اور بے حساب ہے، یعنی بے شمار ”بِغَيْرِ حِسَابٍ“ سے کثرت کا بتلانا مقصود ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ ”بِغَيْرِ حِسَابٍ“ معمول ہے ”فَإْمْنُنْ أَوْ“

اُمّیّک“ کا یعنی یہ ہماری عطا ہے خواہ دو یا نہ دو، آپ سے اس کے حقوق کے متعلق کوئی سوالی اور باز پرس نہ ہوگی، جس طرح چاہو تصرف کرو، کئی اختیار ہے، دوسری تفسیر مجھے زیادہ پسند ہے اور واقعی سلیمان علیہ السلام کے لیے اتنی بڑی سلطنت اور اس کا ساز و سامان خراجان ہو جانا اگر ان کی تسلی اس طرح نہ کی جاتی، جب ”بَعْبِیْرٍ حَسَاب“ فرما کر بائٹم ہکا کر دیا، اس کے بعد انہوں نے بے فکری سے سلطنت کی، اس سے ظاہر سامان کی کثرت کا موجب پریشانی ہونا ثابت ہو گیا تب ہی تو ان کا ازالہ کیا گیا، اسی واسطے جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہے ملک ہونا اختیار کر لیں یا نبی ہونا اختیار کر لیں، حضرت جبرائیل علیہ السلام کے مشہورہ سے نبی عبد ہونا اختیار کیا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ملک ہونا چاہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی ارشاد ہوتا: ”هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَاب“ اور اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تسلی کر دی جاتی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطنت پر عبدیت کو ترجیح دی اور غنائے ظاہری اختیار نہیں فرمایا، دوسرے اگر غنائے ظاہری ہی مراد لی جائے جیسا مفسرین میں یہی مشور ہے تو گو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال جمع نہ رہتا تھا اور اسی سے شبہ عدم غنائے ظاہری کا ہو سکتا ہے، مگر جو مقصود ہے مقصود ظاہری سے کہ کوئی مصلحت انکی نہ رہے، وہ مقصود اس طرح حاصل ہے کہ وقتاً فوقتاً اس قدر مال آتا تھا کہ سلاطین و امراء کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ فرماتے تھے جس میں یہ بھی حکمت تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقتداء تھے اور مقتداء کے لیے وقعت ہوتی ہے اور وہ عرفاً متول سے ہوتی ہے، بشرطیکہ متول پر تحول بھی مسلط ہو (یعنی سخاوت بھی ہو کہ لوگوں کو دینا دلاتا رہے جس سے مال چلتا پھرتا رہے) چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری غنا کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ نے حج و داع میں سواونٹ قرمان کیے جس میں تریہ ٹھاپنے دست مبارک سے نحر کیے جس کی تفصیل حدیث میں آتی ہے: ”سکلھن بزدلفن الیہ“ کہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تھا، گویا ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کیجئے سبحان اللہ! کیا شان محبوبیت تھی۔

ہمہ آہوان صحرا سرخود نہادہ برگف

پامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں زیادہ چسپاں ہے، واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے ہی تھے کہ جانور اپنی گردنیں خود آگے بڑھاتے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش پہلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ذبح کیا جاؤں تو اتنے اونٹوں کا ذبح ہونا بددن ظاہری غنا کے کب ممکن ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا اور سخاوت کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے سو، سو دو سو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا فرمائے، ایک اعرابی کو بکریوں کا بھرا جنگل عنایت فرمادیا، بحرین سے جب مال آیا تو وہ اتنا تھا کہ مسجد میں سو نے چاندی کا ڈھیر لگ گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کا سب ایک دم سے بانٹ دیا اور بعض صحابہ کو اتنا دیا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے، ایسے نظیریں تو سلاطین کے یہاں بھی نہیں سنی جاتیں اور اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غنائے ظاہری بھی ظاہر ہے کیونکہ عطاءے ظاہری کی حقیقت مال کا رکھنا نہیں، بلکہ مال کا خرچ کرنا ہے، وہ بوجہ اکمل ثابت ہو گیا۔

(الواء الیتامی صفحہ: ۲۸)

### بتیسواں اعتراض..... جنت میں شہداء کی ارواح کا سبز پرندوں میں ہونا!

جنت میں وہ جسم طیر (پرندہ) شہداء کے لیے مرکب ہوگا، ان کا حقیقی جسم وہ نہ ہوگا بلکہ ان کے لیے جسم انسانی دوسرا ہوگا، پس ارواح شہداء کا اصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں ہم پہلی اور کبھی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں اور اگر کبھی بند ہو تو دو کیٹھنے والے کو بھی معلوم ہوگا کہ پالکی اور کبھی آ رہی ہے، ہمارا جسم ان کو نظروں نہ آئے گا، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے گا کبھی اور پالکی ہمارا جسم ہے اور ہماری روح اس کے اندر بیٹھا آ دی ہے، اس کا جسم کبھی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ شخص اس کی سواری ہے، اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جنت میں ارواح شہداء کے لیے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہوگا اور اس کے اندر روح انسانی اپنے جسم کے ساتھ سوار ہوگی، پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا، یہ صورت جب لازم آتی کہ روح انسانی اپنے جسم میں علیحدہ ہو کر جسم طیر میں حلول کرتی اور وہاں یہ بات نہ ہوگی، اب رہی یہ بات کہ وہ جسم انسانی کون سا ہے جس میں شہداء کی روہیں حلول کر کے جو اصل طیور خضر (سبز پرندوں کے پونوں) میں سوار ہوں گی، آیا وہ یہی جسم غضری ہے، یا کوئی دوسرا جسم ہے؟ اس کی تحقیق کے لیے کشف کی ضرورت ہے، کیونکہ نص اس سے ساکت ہے، اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ عالم برزخ میں انسان کو جسم مثالی عطا ہوتا ہے جو اسی جسم غضری کے مشابہ ہے، مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے، لیکن یہ جسم مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہوگا اور جنت و دوزخ میں یہی جسم غضری پھرل جائے گا، گو برزخ میں جسم غضری کا ہونا کچھ محال نہیں، مگر خلاف مشاہدہ ہے، اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ برزخ میں عذاب و ثواب ارواح کو جسم مثالی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

(ترجیح الآخرۃ صفحہ: ۲۳)

## تین تیسواں اعتراض..... اہل دنیا کے آخرت کا نفع دنیا کے نفع سے

بڑھا ہوا ہے!

اس کا جواب بھی سن لو "وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى" اس میں جواب ہے اس عذر کا جس سے اس کا نفع ہونا معلوم ہو گیا، حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اس کی ترجیح کے لیے کافی نہیں، بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں، سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے، مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں، ایک خیریت دوسرے بقاء یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے، دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے، نہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں ہر صفت ایسی ہے اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دیتا، کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو تو پھر تجارت کبھی نہ ہو سکے کیونکہ اس سرمایہ عاجلہ کو اس وقت لگانا پڑتا ہے اور نفع زائد آجل ہے، لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے، بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجود سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں، محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا۔

معلوم ہوا کہ زیادہ کثرت کے مقابلے میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور نفع آخرت آجل ہے؟ تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور کتنی عمدہ ہے؟

اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہو سکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے، اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو، پس زراعت کو بھی جواب دے دو، مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو، کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے، پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے (یعنی جلدی ملنے والی ہے) اور یہ آجل ہے (یعنی دیر سے ملنے والی ہے) اور آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی قابل بھی نہیں اور دوسری صفت آخرت میں یہ بھی ہے کہ وہ "ابقی" ہے، بہت پائیدار ہے اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلے میں وصف غفلت کوئی چیز نہیں، چنانچہ دنیا میں اس کی صد ہا نظیریں ہیں، ایک شخص آپ کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں، ایک تو کچا بنا ہوا ہے اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے اور وسیع بھی ہے، وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا

چاہتے ہوتو میں یہ بھی دے سکتا ہوں مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا ہوتو ہمیشہ کے لیے تمہاری ملک کر دوں گا، آپ بتلائے! کیا کریں گے؟ یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی اس عالی شان محل سے جو عاریہ ملتا ہے، وہ کچا مکان اچھا ہے جو دائمی ملک ہے۔

## دنیا کی وجہ سے آخرت چھوڑنا

مگر انہوں نے تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو کہ آخرت کو جو دوامی ہے، دنیا کے لیے چھوڑتے ہو، جو چند روزہ ہے، انسان کی حیات ہی کیا ہے؟ بعض لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے، اس ناپائیدار مردار کے لیے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لیے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتا ہے، پھر مزہ یہ ہے کہ یہاں معاملہ برعکس ہے کہ دنیائے عاجل کوئی عالی شان و خوبصورت بھی زیادہ نہیں ہے، آخرت اس سے کہیں اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوبصورت و عالی شان ہے، تو یہاں تم ایک کچے اور ناپائیدار مکان کے لیے جو عاریہ مل رہا ہے اور عاریت بھی سال دو سال کے لیے نہیں بلکہ ایک دو لمحہ کے لیے مل رہی ہے، جس میں کچھ راحت نہیں کلفت ہی کلفت ہے اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہے، جہاں رنج و غم کا نام نہیں، جس کو دیکھ کر بے ساختہ کہو گے:

”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ۝ نِ الْيَوْمِ أَحَلَّنَا دَارًا لِمَقَامَةٍ مِنْ فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَمَسٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوتٌ“

## آخرت کا نفع یقینی ہے

رہا یہ شبہ کہ آخرت کا ادھار ایسا ہے کہ نہ معلوم کب ملے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ مؤجل کے ملنے کا پورا یقین نہ ہو اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ مؤجل ضرور ملے گا تو وہاں تاخیر زائد کی بنا پر عاجل کو ترجیح نہیں ہو سکتی، اب یہ دیکھو کہ آخرت کا وقوع متحمل ہے یا یقینی؟ فرماتے ہیں: ”إِنَّ هَذَا الْفَيْسِ الصَّحِيفِ الْأُولَى ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَى“

یعنی آخرت کا آنا ایسا یقینی ہے کہ خبر متواتر سے ثابت ہے، ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے وقت سے اس کی خبر ہر زمانے میں دی جا رہی ہے، لہذا یہ عذر بھی باطل ہو اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے، مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ ہو جائے گا اور مرنے میں دیر ہی کیا ہے؟ زندگی کا دو منٹ بھی بھر دے

نہیں، لہذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے۔

اور تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب ادھار ہی نہیں، بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں کہ انہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی، تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح و عزت و راحت عطا فرمائی کہ ان کے دشمن مغلوب و مقہور ہوئے اور وہ غالب و قاہر ہوئے، دشمنوں کے نام لینے والے ناپید ہو گئے ہیں اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع و تعظیم کرنے والے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں، تو خیریت و بقاء کا نمونہ دنیا میں اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے۔

(ترجیح الآخرت صفحہ ۴۳۳ تا ۴۳۴)

چوتھوں سوال اعتراض ..... حسن یوسف علیہ السلام و جمال محمد صلی اللہ علیہ

### وسلم کی تحقیق

شاید کسی کو شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنان مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی مختلف انواع ہیں، حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ وہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے، حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا، چنانچہ زلیخا کو آپ علیہ السلام کے حسن کی سہار ہو گئی تھی، انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے شکل سے باہر ہوتا جائے، جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دل میں گھستا جائے، اسی کو شاعر بیان کرتا ہے:

يزيدك وجهه حسنا

اذا ما ازدت له نظرا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا کہ اس میں دفعۃً متحیر کر دینے کی شان ظاہر نہ تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں خدا داد عظمت و جلال کی ایک شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑتا تھا، جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہو جاتا تھا، اس کو حسن صورت پر آنکھ پھر کر نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی، تاکہ تیسری نوبت آئے ”کما فی حدیث من راہ

بداہتہ ہایہ، اخرجہ الترمذی فی الشمانیل“ (جامع) اس پر منکشف ہوتا تھا اور دن بدن دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا؛ ”کما فی حدیث علی المذکور من حبابلہ بشاشۃ احبہ“ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہو جانا منقول ہے، مگر فی نفسہ زیادہ بعید نہیں، بلکہ ایک فطری امر ہے جو عادت کے مطابق ہے، گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے اور حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم پر مرد عاشق تھے جن میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی تھے، مردوں کا عاشق ہونا اور وہ بھی بچوں اور بوڑھوں کا فی نفسہ بہت عجیب ہے، ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں:

”رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ فی حلۃ حمراء والقمر طالع کنت اری القمر مرۃ والی وجہہ صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ فواللہ کان وجہہ احسن منه او کمال قال“

یعنی ایک رات میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ (دھاری دار) جوڑے میں دیکھا، اس وقت چاند نکلا ہوا تھا، تو میں کہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر نظر کرتا کبھی چاند کو دیکھتا بخدا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا۔“  
اسی کو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے:

گہے بسوئے تو گاہے بسوئے مد می مگر م

کند مقابلہ چوں کس کتاب را تنہا

یعنی کتاب کے مقابلے کے لیے تو دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، میں تنہا کیونکر مقابلہ کروں؟

ایک مرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سپر بنایا تھا، کفار کے جتنے تیر آتے تھے، وہ سب کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے، تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی تیر نہ لگنے پائے، یہ عشق نہ تھا تو اور کیا تھا؟ اس کے علاوہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت کے واقعات کتابوں میں بکثرت موجود ہیں، بہت سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں گھربار چھوڑا، بیوی بچے چھوڑے، اپنے عزیزوں کو جب کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہوئے بے دریغ قتل کیا، حتی کہ خود اپنی جانیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شہر کر دیں اور سر کٹوائے اسی حسن کے متعلق ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

”نواحی زلیخا لورئین حبیبہ لا ثرن بالقطع القلوب علی البید“

”یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن دل میں گھستا تھا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان مصر دیکھ

لیتیں تو بجائے ہاتھ کے دلوں کو چیر پھاڑ دیتیں۔“



یہیں اجمالاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن کے متعلق میں اپنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کے خلاف ہے، باقی اس بات میں تفصیلی گفتگو کرنا تو میرے مذاق کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس میں ایہام تشقیص کا ہوا جاتا ہے۔ (الرفع والوضع صفحہ ۱۱)

پینتیسواں اعتراض..... علماء کرام میں غیر خدا سے طبعی خوف کی وجہ!

بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کو ایسا ہونا چاہیے: ”يَحْشَوْنَهُ وَلَا يَحْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ“ کہ بس خدا ہی سے ڈریں اور کسی سے نہ ڈریں، ان کے نزدیک علماء کو نہ شیر سے ڈرنا چاہیے، نہ سانپ بچھو سے، نہ توپ سے، نہ بندوق سے، نہ حکام سے، نہ ڈاکوؤں سے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ موزی چیز سے انبیاء علیہم السلام کو بھی خوف طبعی ہوتا ہے، اگر یہ خوف طبعی توکل کے خلاف ہے تو کیا معاذ اللہ! انبیاء علیہم السلام کو غیر متوکل کہو گے؟ ہرگز نہیں! کس کا منہ ہے جو اپنے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ متوکل بتائے؟ مگر وہاں یہ حالت تھی کہ نبوت کے بعد ان کے دل میں فرعون سے بھی خوف تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:

”قَالَ رَبَّنَا إِنَّا نَتَخَفُ أَنْ يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَىٰ قَالَ لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا أَسْمَعُ

ذَٰرِئِ“

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو فرعون کی طرف سے یہ خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے یا حد سے بڑھ جائے باوجودیکہ حق تعالیٰ کی طرف ان کو صریح اور صاف حکم ہو چکا تھا ”أَذْهَبْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ“ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکشی پر کمر باندھ رہا ہے، مگر یائیں ہمہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے آج کل کے بہادروں کی طرح اپنی بہادری ظاہر نہیں کی کہ ہم کو قتل کا خوف ہے، نہ قید خانے کا اندیشہ ہے، ہم بلا خوف و خطر اس خدمت کو انجام دیں گے، بلکہ انہوں نے اپنے طبعی خوف کو حق تعالیٰ سے عرض کر دیا کہ ہم کو اس کی زیادتی سے ڈر لگتا ہے اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم کو قتل نہ کر دے، اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف کا ہونا نبوت و ولایت کے بالکل منافی نہیں، ورنہ حق تعالیٰ اس خوف پر انکار فرماتے، مگر حق تعالیٰ نے اس پر ان کو ذرا ملامت نہیں کی، بلکہ تسلی دے کر فرمایا: ”لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا“ تم ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ”نَجْعَلُ لَكُمْ سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمْ بِأَيِّنَّا أَنْتُمْ وَمَنْ أَتَعْتَمِدُ الْغٰلِبِينَ“

”یعنی ہم تم کو رعب عطا کریں گے جس کی وجہ سے وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے اور تم کو اور تابعین ہی

کو غالب حاصل ہوگا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے طبعی خوف کے ازالے کا سامان کر لیا اس وقت فرعون کے پاس تشریف لے گئے، اس سے معلوم ہوا کہ ”بِخُشُونِهِ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ“ میں خوف طبعی کی نفی نہیں، بلکہ خوف عقلی کی نفی ہے۔

دوسرے یہ کہ آیت تبلیغ احکام کے متعلق ہے اور مقصود یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام میں سوائے خدا کے کسی سے ایسا نہیں ڈرتے کہ وہ تبلیغ سے مانع ہو جائے چنانچہ پوری آیت اس طرح ہے:

”الَّذِينَ يَسْتَلْعُونَ رَسُولَ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ وَ كَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا“

”وہ انبیاء علیہم السلام ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔“

اس میں تبلیغ احکام کے وقت غیر اللہ کے خوف عقلی کی نفی کی گئی ہے، رہا یہ کہ ان کو کسی سے خوف طبعی بھی نہیں ہوتا، یہ اس آیت کا مفہوم نہیں، لوگ قرآن کو ادھورا پڑھتے ہیں، اس لیے اشکال ہوتا ہے، پورے مضمون پر نظر کرنے کے بعد کچھ اشکال نہیں رہتا، غرض تبلیغ احکام کے وقت بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت خوف طبعی کسی درجہ کا لاحق نہیں ہوتا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کو فرعون سے طبعی خوف تھا، اسی لیے انہوں نے حق تعالیٰ سے اپنا خوف ظاہر کر کے اس کا علاج چاہا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام ضرور کرتے ہیں اور تبلیغ کے متعلق خوف عقلی تو ان کو صرف خدا سے ہوتا ہے، مخلوق کا خوف عقلی نہیں ڈرا نہیں ہوتا، جس کے اثر سے خوف طبعی مخلوق کا ان پر ایسا غالب نہیں ہوتا، جو تبلیغ سے روک دے، بلکہ اگر کسی وقت مخلوق سے ان کو خوف طبعی ہوتا بھی ہے تو وہ خشیت خداوندی سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

پس مخلوق کے خوف عقلی کی تو مطلقاً نفی ہے اور خوف طبعی کی مطلقاً نفی نہیں، بلکہ اس کے غلبے کی نفی ہے، اب یہ مضمون ان شاء اللہ کسی نص سے متعارض نہ ہوگا اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر علماء کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ مخلوق سے خوف ان کو ذرا نہ ہو اور خوف طبعی اگر ہو تو خوف خداوندی سے مغلوب ہو اس پر غالب نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ علماء کے ذمہ تبلیغ فرض ہوتی ہے، وہاں بے شک ان پر خوف خداوندی ہی غالب ہوتا ہے، مخلوق کا خوف طبعی غالب نہیں ہوتا، مگر جہاں ان پر تبلیغ فرض ہی نہ ہو محض مستحب ہو، وہاں اگر ان کو مخلوق سے خوف طبعی ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟ بخلاف حضرات انبیاء علیہم السلام کے کہ ان پر تبلیغ ہر حالت میں فرض ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ جن علماء کو تم خائف کہتے ہو، وہ اس خوف کی وجہ سے کسی فرض و واجب کو ترک کر دیتے ہیں، یا

مباح و مستحب کو؟ اگر تم انصاف سے دلائل میں غور کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ مخلوق کے خوف سے کسی فرض و واجب کو ہرگز ترک نہیں کرتے، بلکہ محض بعض مباحات یا بہت سے بہت بعض مستحبات کو ترک کر رہے ہیں، سوائے ایسی حالت میں وہ یُخَشَوْنَہُ وَلَا یَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللہ کے خلاف کیونکر ہو سکتے ہیں؟ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن مسائل کی تبلیغ آج کل کے بہادر لوگ کر رہے ہیں، علما بھی ان سب کی تبلیغ کرتے ہیں جن کو تم خانف کہتے ہو، وہ تہذیب اور نرمی کے ساتھ ان مسائل کو بیان کر رہے ہیں۔ صرف عنوان کا فرق ہے، بہادران قوم مقابلہ و سب و شتم کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں، اب صرف اس بات کا فیصلہ باقی رہا کہ مخالفین اسلام کے سامنے آیا ہم کو مقابلہ اور سب و شتم کے ساتھ احکام کو ظاہر کرنا چاہیے، یا نرمی اور تہذیب کے ساتھ؟ سوا اس کا فیصلہ خود قرآن نے کر دیا ہے۔

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر جب فرعون کے پاس تبلیغ احکام کے لیے جانے کا حکم فرمایا تو اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا: "فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ" اور فرعون سے نرمی کے ساتھ بات چیت کرنا، شاید کہ اس کو نصیحت ہو جائے، یا خدا کا خوف اس کے دل میں آجائے دیکھ لیجئے! حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کون متوکل ہوگا؟ اور فرعون سے زیادہ ظالم و سرکش کون؟ مگر باری ہمہ یہ حکم ہو رہا ہے کہ اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کیجئے گا۔

صاحبو! تاہم یہی ہے کہ جب کسی مخالف پر اپنا زور اور باؤ نہ ہو وہاں مقابلہ اور سختی نافع نہیں ہوتی، بلکہ اکثر مضر ہو جاتی ہے، ایسے موقع پر اکثر نرمی ہی سے کچھ نفع ہوتا ہے۔ (جامع)

(حرمت الحدود صفحہ: ۳۰)

## چھتیسواں اعتراض..... جنٹل مینوں کا انگریزی کو علم میں شمار کرنا غلطی ہے!

جتنے فضائل احادیث میں علم کے لیے وارد ہیں، انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں: "اطلبوا العلم ولو بالصبین" یعنی علم کو طلب کرو اگرچہ بچپن میں بھی ہو، وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن سے طلب علم کی ترغیب دی ہے، حالانکہ اس وقت بچپن میں دین کا علم بالکل نہ تھا، بلکہ محض دنیاوی علم تھا، معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں، خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا، پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے، ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیے، ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

”قلت ذكر له فى المقاصد طريقتين و قال هو ضعيف من الوجهين و قال ابن حبان انه باطل لا اصل له، و اخرجه ابن الجوزى فى الموضوعات قال و اخرجه البيهقى فى الشعب، قلت قد التزم ان يخرج موضوعاً فالأشبه بالحكم عليه بالضعيف، و الضعيف لا يحتاج به فى الاحكام۔ جامع“

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے لفظ ”ولو“ پر نظر نہیں کی، یہ لفظ فرض کے لیے آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنے چاہیے اور فرض اس چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم و مستبعد ہو، موجود کو فرض نہیں کیا جاسکتا، معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث سے وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا، اس لیے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور یہ وہ علم دین ہی ہے، ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو گیا تو ایک بھنگی اور چماری کو بھی عالم کہنا چاہیے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے جو کام وہ کرتا ہے، اس کو خوب جانتا ہے اور اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے اور خیر جانے دیجئے! ہم لفظ ”ولو“ سے بھی استدلال نہیں کرتے، مگر ہم کہتے ہیں: ”اطلبوا العلم و لو بالصين“ میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کون سا علم مراد ہے؟ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے، بس علم وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی رحمہ اللہ بھی ہیں۔

علمی کہ راہ بحق نماید جہالت است

اور حدیث میں ہے:

”الدنيا ملعونة و ما فيها ملعون الا ذكر الله و ما والاہ“ (الحدیث)

معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے، وہ دنیائے ملعونہ ہے، اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں، اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قریب ہوتا ہے؟ واصل ہوتا ہے یا فصل؟ قریب ہوتا ہے یا بعد؟ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے، گوچاہے تو یہ تھا کہ سائنس سے خدا کی طرف قرب بڑھتا کیونکہ اس سے قدرت مانع کا انکشاف ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہد ہوتا ہے، کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں، اس لیے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں، جو عرصہ تک پورے نہیں ہوئے، زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے، بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدوم سے چند ہیں، جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں، مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں

ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناما کام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے، مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ و عجز و انکسار کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے، بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہوگئی، اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی؟ ڈالے پتھر، اگر ایجاد تمہارے ہاتھ میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کر لی؟ تمہارے کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو، باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آجانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے، یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے، مگر عادت الہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لیے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لیے ہزاروں غور و فکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے، چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے؟ اور ایسی نظائر کبکثرت موجود ہیں، اگر غور و فکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کر لیا؟ غرض تجربے سے یہ بات مشاہدہ ہے کہ کچھ عوارض کہ بمنزلہ لوازم کے ہیں، آپ سے آپ جمع ہوتے ہیں، چونکہ سائنسی اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا، بلکہ بعد ہی ہوتا ہے، تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہو سکتا ہے ہاں! ایسے لوگوں کو ایسا علم دین البتہ حاصل ہو جاتا ہے۔

جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آج کل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کہ کسی جگہ نماز کا وقت آ گیا اور پانی نہ تھا، تیمم کی ضرورت ہوئی تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمم کیا کہ اول تو مٹی کو ہاتھوں پر بہایا، جیسا پانی کو بہایا کرتے ہیں، پھر کلی کرنے واسطے منہ میں ڈالتے اور مسح کے لیے سر پر بھی ڈالتے اور بیروں پر بھی مٹی بہاتے، مگر منہ میں دیتے ہوئے بعض لوگ ہنس پڑے اس لیے وہ آگے نہ بڑھ سکے، بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم ہوتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے، بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے، تو اس میں کیا حرج تھا؟ مگر پوچھتے کس طرح؟ لیڈر ہو کر اپنے جہل کو کیوں ظاہر کریں؟ گو مٹی سے کلی کر کے اس سے زیادہ جہل ظاہر کر دیا اور مزہ یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر ہی رہے، یہ حالت قوم کی ہے کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا، انہیں حضرت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ موٹر میں سوار تھے، نماز کا وقت آ گیا، موٹر ٹھہرا یا گیا اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی، حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے، مگر انہوں نے موٹر کے اندر بیٹھ کر ہی پڑھی، بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہو گیا؟ جب کہ موٹر کھڑا ہوا تھا، چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی گنجائش بھی ہے، مگر موٹر میں چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس کا ٹھہرا لینا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل گاڑی کا ٹھہرانا ہمارے اختیار میں نہیں اور اگر موٹر ٹھہرا ہوا ہو تب تو کسی طرح

ترک قیام کی گنجائش نہیں مگر ان لوگوں نے محض لیڈر، بننے کے لیے نماز شروع کی ہے، اس لیے نماز بھی لیڈری میں ہوتی ہے، شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے؟ گواہی غلطیاں دیہاتوں سے بھی ہوتی ہیں اور ان کو مسائل کا علم نہیں، مگر وہ اپنے کو تعلیم یافتہ تو نہیں کہتے، نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں، بلکہ بیچارے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں تو گواہان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو، مگر شاید ان کے عجز و نیاز کی وجہ سے ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے، چاہے تھوڑی سی سزا کے بعد ہی سہی، حق تعالیٰ کو عاجز پر رحم آتا ہے، اس لیے بعض دفعہ گنہگاروں کو ان کی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تصوف اور تقویٰ دھرا رہ جاتا ہے۔

(الہدیٰ والمنظرہ صفحہ ۱۳)

سینتیسواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے طلب کرنا

محبت الہی کا نتیجہ ہے!

”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْحَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ“

”اے اللہ! میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت کے نزدیک کرنے والی ہو، قول ہو یا عمل۔“

اس سے معلوم ہوا کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی، تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کے لیے عمل کیا جائے، رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا، سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوا کرتی ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے، ہم تو جنت اس لیے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے، حوریں ملیں گی، خوب مزے اڑائیں گے، غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بناء پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے اور خدا تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانگنے کا امر فرمایا ہے جب محبوب خود چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے، اس وقت استغناء مناسب نہیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں  
خاک پرفرق قناعت بعد ازیں

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت مانگی اور اس سے استغناء نہیں برتا، عارف کامل خدا کا اپنی نعمت سے بھی استغناء ظاہر نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اصل انعم ہے، وہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغناء ظاہر کر دے اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے، ورنہ معرفت کا منتفعانہ یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے، اسی طرح جس چیز کا اسے مانگنا پسند ہو وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضائی ہے، کسی دوسری چیز کی طلب نہیں، دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بناء پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا، بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا اسی کو کہتے ہیں۔

”عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا، بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں، ہم تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے!!

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں، ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبۂ خضراء ہی نظر آئے۔

مرا ز زلف تو مومے پسند است

ہوک راه مدہ بوئے پست است

تو بعض دفعہ علیہ تو اضع طلب جنت کا منشاء ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا، اس لیے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے لائق نہیں کاش! اس کے شہر میں ہی جا رہوں اور کبھی اپنی احتیاج و اقتضاء ظاہر کرنے کے لیے جنت کی طلب کی جاتی ہے کہ اے اللہ! میں آپ کی رضا کا محتاج کیوں نہ ہوں گا، میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں، اسی لیے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ! جنت دے دے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔

”الحمد لله الذي اطعمنا و سقانا و جعلنا من المسلمين غير مودع و لا مكفئ و لا مستغنى عنه ربنا“

”یعنی اے اللہ! اس وقت پیٹ بھر گیا ہے، اس لیے کھانے کو اٹھا دیا ہے، ہم اس کو ہمیشہ کے لیے وداغ نہیں کرتے، نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں اور نہ اے اللہ! ہمیں اس سے استغناء ہے، حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می گمزم  
 کرشمہ دامن دل می کشند کہ جا اینجا است  
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس ادا کو دیکھو اس میں غضب کی دلربائی ہے، پھر کمال یہ ہے کہ اس  
 میں نہ تصنع ہے، نہ تکلف، بلکہ ایک بے ساختہ حال ہے۔

دل فریباں نیائی ہمہ زیور یستند  
 دلبر ماست کہ باحسن خدا داد آمد

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا پڑا  
 کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے، تصنع، بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا،  
 غرض ایک مبنی طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے، یعنی اظہار احتیاج، بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت  
 مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے  
 واسطے کرنا چاہیے بلکہ اس کا جو منشاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مناسب تھا، وہ اپنے علم کے  
 موافق عرض کر دیا، لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راد صواب پر  
 ہے، غلط راہ پر نہیں، خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیے خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے  
 سے ہو، سب ٹھیک ہے۔

بخت اگر مد کند دامنش آرم بکف

گر بکشد زبے شرف و رکشم زبے طرب

یعنی مقصود قرب ہے، بس قرب ہونا چاہیے خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ کھینچ لیں اسی طرح یہاں  
 کھجھو کہ مقصود تو کام چلانا ہے کہ بندے کو خدا کی اطاعت و ذکر کی توفیق ہو جائے، اب وہ خدا کی  
 براہ راست محبت سے ہوا تو کیا اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں اور دونوں  
 بڑھیا ہیں، گوا ایک رفیع ہے اور ایک رافع۔ (رذم البیان صفحہ: ۴۸)

اڑتیسواں اعتراض..... انبیاء علیہم السلام پر نزع کی کیفیت کیوں ہوتی ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی حتیٰ کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ  
 رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع  
 کی تمنا نہیں کرتی، اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو بات یہ ہے



کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں، جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا، اسی قدر نزع میں شدت ہوگی، مگر تعلقات دو قسم پر ہیں، ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں، جیسے جائیداد اور مال وغیرہ کی محبت، ان سے جو نزع میں شدت ہوتی ہے، اس سے تکلیف سخت ہوتی ہے، دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں، بلکہ معین آخرت ہیں اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اس کے مصداق میں داخل ہیں۔

اسیرش نحوہد خلاصی زبند

اس کی تعین عنقریب آتی ہے، اس سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے، مگر اس سے روحانی تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے، کیونکہ اس کا منشاء قید لذیذ ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذات حق کے کسی سے نہیں اور اس کا محتضاً سہولت نزع ہے، مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد مطلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدون الی الخلق کے نہیں ہو سکتی، اس لیے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے اور اصلاح و ارشاد کے لیے ان سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے، اس لیے آخرت سے مانع نہیں ہوتا، بلکہ موجب امر اور سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہوگا، اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا، چنانچہ یہ خدمت سب سے زیادہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے، اس لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کے ساتھ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد سب سے زیادہ یہ خدمت تھی، کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ ارشاد و اصلاح کا فکر و اہتمام تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نزع میں شدت زیادہ ہوگی، کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا اہتمام تھا، مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوشگوار تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی، اس لیے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی، حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے، ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے، مگر ان کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے برابر شدت نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی ذمہ داری حضرات انبیاء علیہم السلام کے برابر نہیں ہے، اس لیے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح و ارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی، وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں، ان کو نہ کسی کا فکر ہے، نہ کسی سے تعلق ہے، ان کا

نزع بہت سہل ہوتا ہے، ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑا شاداں و فرحاں ہوتے ہیں، بعض غزلی پڑھتے ہوئے جاتے ہیں، بعض ہنتے ہوئے جاتے ہیں، عارف شیرازی فرماتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم ،  
راحت جاں طلیم و زپے جاناں بردم  
نذر کردم کہ گر آید بسر این غم روزے  
تا در میکده شاداں و غزل خواں بردم

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم  
جسم بگذارم سراسر جاں شوم

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے، کیونکہ وہ موت کے وقت ان کے برابر بے فکر نہیں ہوتے، ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے، اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے، اسی وجہ سے ان کے نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے، مگر یہ اعتقاد فضیلت صحیح نہیں، بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہے اور جو جتنا انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا، لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں کہ اپنے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو، بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ تمہارا امتحان لے کر جو عہدہ جس کو چاہے دے۔

(العمرۃ بذبح البقرۃ صفحہ: ۲۱)

## انتالیسواں اعتراض..... تفاضل تفصیلی بیان الانبیاء ممنوع ہے!

آج کل ایک سیرت نبویہ شائع ہوئی ہے (یہ سیرت مولوی شبلی نعمانی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے تصنیف کی ہے) جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے، لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں، کیونکہ کاغذ چمکانا اور لکھانی عمدہ ہے، ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن ایسا ہی ہوگا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، کیونکہ کمالات نبوت سے اس میں بحث ہی نہیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے، زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر سے انتظام کا ہی

پہلو دکھلایا گیا ہے اور کسی جگہ اتفاق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات نبوت کا ذکر نہیں ہے تو غضب یہ ہے کہ دوسرے انبیاء میں نقص نکالا گیا ہے، چنانچہ شروع ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات کے جامع تھے اور دیگر انبیاء، علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے، کسی میں کوئی صفت تھی، کوئی نہ تھی، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ وہ رحم سے خالی تھے اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے ”رَبِّ لَا تَذَرْنَا عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ ذِيَارًا“ اے رب! زمین پر کسی بسنے والے کو نہ چھوڑے سب کو تباہ کر دیتے (جامع) یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَيْہِ رَاٰجِعُوْنَ! رہی دلیل تو اس کا جواب خود نہیں میں موجود ہے۔

### حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کی وجہ

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال برس تک اپنی قوم کو سمجھایا، غور کیجئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد ہے! اتنی مدت تک ان اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے؟ ذرا کوئی کر کے تو دکھلائے، نو سو برس تو کیا نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائے گی، تو حضرت نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک قوم کی بدحالی اور اذیت رسانی پر صبر کرتے رہے اور بددعا نہ فرمائی، اس مدت کے بعد اگر وہ از خود بھی بددعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے، چہ جائیکہ انہوں نے خود بددعا نہیں فرمائی، بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا کہ اب ان میں کوئی ایمان نہیں لائے گا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے، اس وقت بددعا فرمائی! بتلائے! جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے تو اس وقت ان کا باقی رہنا بہتر ہے، یا ہلاک ہو جانا؟ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں، بلکہ اندیشہ فساد ہے کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے، اس وقت ان پر بددعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہے، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی بددعا میں اس بات کو ظاہر فرمایا: ”اِنَّكَ اِنْ تَذَرَهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَا لَا يَلِدُوْا اِلَّا فٰسِقًا كٰفِرًا“ ”خداوند! اگر آپ ان کو زندہ چھوڑیں گے تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور کافر و فاجر کے سوا کسی کو بھی نہ جنمیں گے۔“

اور یہ بات حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی، بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا۔

”وَاَوْحٰی اِلَیْہِ نُوْحًا اِنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِکَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ“ تو بتلائیے! اس حالت میں اگر حضرت نوح علیہ السلام ان کے لیے یہ نہ فرماتے تو اس کا

انجام کیا ہوتا؟ ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی، مسلمان بہت ہی محدودے چند تھے اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ نہ یہ خود ایمان لائیں گے، نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ یہ سب ایماندار ہی ہوں گے، بلکہ ان میں ایماندار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے، بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونے والا تھا، اب اگر اس زمانہ کے کافر غرق نہ کیے جاتے اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی، تو مسلمانوں کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں، وہ حضرت نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اتنا غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے، تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا؟ سب کافر ہی ہوتے، اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حضرت نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا کی، ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آ جاتی اور ان کا جینا محال ہو جاتا، غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے، مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بددعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہیں، سراسر رحم تھی، ورنہ مسلمانوں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دو بھرا ہو جاتا۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض

یہ اعتراض تو حضرت نوح علیہ السلام پر تھا، اس کے بعد لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست کا مادہ نہ تھا، نہ معلوم اس کے پاس کون سی وحی آ گئی تھی؟ یا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ سے اور وہ مادہ نہیں، کچھ نہیں اس اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا، اس سے ان حضرات نے یہ استنباط کر لیا کہ ان میں یہ مادہ ہی نہ تھا، حالانکہ عدم ظہور سے شے ظہور عدم کو مستلزم نہیں، بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کرنے کا موقع نہ ملے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں؟ ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ دے کر دیکھو! اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے اس وقت تم کو اس بات کا حق ہے، ورنہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقع ہی نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن و سیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آ گیا؟ اور تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں تھی، یہ بات

جب چل سکتی کہ ان کو سلطنت کا موقع ملتا اور پھر انتظام نہ کر سکتے، پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہو گیا، اب میں ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے، گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”کیف انتم اذ انزل فیکم عیسیٰ بن مریم عدلا لا مقینا۔ او کما قال“ یعنی تمہارا کیا حال ہوگا، اس وقت جب کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آئیں گے، عادل منصف ہو کر حکومت کریں گے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سے مسرت فرمائی جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق عدل و قسط کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہو سکتا، عدل وہی کر سکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو، نیز احادیث میں بھی یہی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن و امان اور خیر و برکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے، اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کر لیں گے؟ پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کرنے کا یہ کون سے طریقہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے، کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! یاد رکھو! حضرات انبیاء علیہم السلام کامل ہیں، ان میں ناقص کوئی نہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں، تفاضل بین الانبیاء سے اسی واسطے منع کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔

الغرض حضرات انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں، مگر کامل سب ہیں اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔

(العمرۃ بذخ البقرۃ صفحہ: ۲۳)

چالیسواں اعتراض..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال بیان

کرنے میں اعتدال!

رسید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہے، حتیٰ کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے، چنانچہ شتر کا کینہ مشہور ہے، مولوی محمد

علی صاحب نے سرسید کی تفسیر کے رد میں ایک کتاب ”البرہان“ بہت ہی عمدہ لکھی ہے، بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے، انہوں نے اس اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ! اول تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا یہ عجیب طریقہ استدلال ہے، پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شترکینہ جو شہور ہے، یہ عرب کا محاورہ ہے یا فارس کا؟ ظاہر ہے یہ عرب کا محاورہ نہیں فارس کا ہے، تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا، عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا؟ اور اگر مان لیا جائے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے، تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا، اس کی دوسری خوبیوں کو بھی بیان کیا ہوتا۔

عیب آں جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو  
اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے تو ہزار باتیں مدح کی ہیں، اس میں تحمل و جفاکشی بہت ہے، قناعت کا مادہ بہت ہے، عرب کے اونٹ مطیع و منقاد بہت ہوتے ہیں، چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کے لیے اس کی گردن کو جھکا یا وہ فوراً زمین پر رکھ دیتا ہے، پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس طرح اٹھتا ہے کہ سوار نہایت سہولت سے پشت تک پہنچ جاتا ہے، لوگ کثرت سے اس طرح چڑھتے اترتے ہیں، اونٹ کی لمبی گردن سیڑھی کا کام دیتی ہے، تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے، تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہل عرب کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا.....!!

## عربی گھوڑے

پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں، جن کی اصالت و نجابت و شرافت ضرب المثل ہے، وہاں کے گھوڑے مالک کے ساتھ ایسے وفادار ہوتے ہیں جن کو سب جانتے ہیں (لڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک زخمی ہو کر گر اچھا ہتا ہے تو اس وقت دشمن پر حملہ کر کے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان سے اس کو لے بھاگتا ہے) اگر یہی طریقہ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفات حمیدہ سے بھی تو اہل عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہیے تھا، مگر کچھ نہیں، آج کل لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ اہل عرب کی جہالت و وحشت کو بہت ہی غلط اور بدنما بھدے عنوانوں سے بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جاہلوں کی اصلاح کی، ایسے وحشیوں کو متمدن بنایا، ان لوگوں کی نیت تو بہت اچھی ہے، مگر نہایت برا ہے۔

## اہل عرب کا حال

اول تو بات اتنی کہنی چاہیے جتنی اصلیت ہو، اہل عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جہالت و وحشت ضرور تھی، مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان کرتے ہیں، پھر جتنی جہالت تھی، اس کے ساتھ ان کمالات و صفات حمیدہ کو بھی بیان کرنا چاہیے جو ان میں زمانہ جہالت میں تھیں، اہل عرب میں ہمیشہ شجاعت کا جو ہر موجود تھا، زبان کے بڑے پکے تھے، جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے، مہمان نوازی اور سخی نمبر اول تھے اور ایک بات ان میں ایسی تھی کہ جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب دشمنوں کے ساتھ اپنے مقابلہ اور لڑائی کا ذکر کرتے تو دشمن کی شجاعت و بہادری کا دل کھول کر تذکرہ کرتے کہ وہ ایسے بہادر، ایسے کریم اور دلیر تھے، حتیٰ کہ کبھی مقابلہ میں پسپا ہونا بھی ذکر کر دیتے۔

غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہل عرب کی خاص صفت ہے، اس پہلو کو بھی بیان کرنا چاہیے۔ تاکہ ناظرین و سامعین کو اہل عرب سے نفرت نہ پیدا ہو، ان کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو، مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے نبی کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر کرے اور اس طرح ان کا ذکر کرے جس سے قلوب میں ان سے نفرت پیدا ہو، جیسا سرسید نے کیا، اس لیے مولانا محمد علی کو غصہ آیا اور اس کا خوب جواب دیا، خدا ان کو جزائے خیر دے۔

(العمرۃ بذج البقرۃ صفحہ: ۶۹)

## اکتالیسواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح فرمانے کی حکمت!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں مصالح کیوں نہ ہوتیں، عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا ہے، یعنی پہنچا دینا اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے، جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت و عطا فرمائی تھی کہ جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لیے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت

ہے، جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا، پس یہ حال ہو جاتا ہے:

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے

تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ رہتا ہے کہ یوں کہوں گا، یہ

پوچھوں گا، صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔

ہمارے ایک عزیزنا خواندہ کہتے ہیں:

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا

سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے گاہے گاہے مزارع فرمایا کرتے تھے

تا کہ ان کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت تو

بھلا کیسی کچھ ہوگی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ

عنه ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ دفعۃً پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب مارے

ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے، حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ

تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پیر بھائی تھے جن میں گونہ مساوات ہوا کرتی ہے، مگر ان پر بھی آپ کا

اس قدر رعب تھا۔

مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات تو معتقد تھے، تو سینے کے غیر معتقدین پر آپ کے

رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ میں آپ کی خدمت

میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہا ہے؟

گفت کہ قصر خلیفہ اے چشم

تا من اسب و رخت را آنجا کشم

قوم گفتندش کہ او را قصر نیست

مر عمر را قصر جاں روشنیست

### حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ

(اس واقعہ پر حضرت رحمہ اللہ پر گریہ طاری ہو گیا، مگر بہت ضبط سے کام لیا) لوگوں نے کہا کہ عمر

رضی اللہ عنہ کے لیے نہ قصر ہے، نہ ایوان ہے، بس اس کا دل ہی قصر و ایوان ہے، قاصد کو بڑی حیرت



ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کا نیتے ہیں، اس کے نکل نہ قصر، یہ کیا معاملہ ہے؟ اور پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں، گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں، تلاش کر لو! کہیں مل جائیں گے، اب وہ آپ کی تلاش میں نکلا، معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے۔ سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں، جنگلوں میں پھرتا ہے، نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں، نہ پولیس، آخر وہ جنگل کی طرف چلا، جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑے سو رہے تھے۔ قدم رکھتے ہی اس کے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا، کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ کہ جہاں شیر پڑا ہوتا ہے، اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے، نہ جاہ و حشم ہے، نہ وہ ساز و سامان ہے، پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے؟ یہاں تک کہ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تنہا پڑا سو رہا ہے، نہ اسے کسی دشمن کا خوف ہے، نہ جا سوس کا ڈر، سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کی بجائے رکھی ہے، نہ کوئی فرش ہے، نہ بستر، بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں، اس حالت کا مقتضاء یہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی، مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا، جو نبی نظر پڑی، پیراٹھانے کی ہمت نہ رہی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب و داب کے ہزار سامان ہوتے تھے، مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا، آج کیا بات ہے کہ اس بے سرو سامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے، آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہو گیا؟ بے شک:

بیت حق است این از خلق نیست

بیت آل مرد صاحب دلق نیست

یہ خدائی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا، بالآخر سفیر روم کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خود جگائے وہ تو اپنی جگہ پر دیر تک کھڑا کا پتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ میں تو اس غریب عورت کا بچہ

ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باتیں سننے کے بعد ہیبت مبدیٰ سے محبت ہو گئی اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ مذہب اسلام حق پر ہے، پھر وہ اسلام سے شرف ہو گیا۔

یہ تو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حالت تھی، ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کو ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

### حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا دبدبہ

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے رعب و ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا رحمہ اللہ سے بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے، حضرت رحمہ اللہ کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور جھجکتے اور ڈرتے تھے اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لیے ڈرتے تھے کہ وہ غصیارے ہوتے ہیں، بات بات میں ان کو غصہ آ جاتا ہے، اسی لیے ان کے پاس جاتے ہوئے کانپتے ہیں۔ جیسے مولانا فضل الرحمن تھے، یا آج کل بھی ایک بدنام ہے۔

ہائے ہزار نام فدائے تو بدنامی تو

(جامع)

مگر مولانا گنگوہی رحمہ اللہ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا، میں نے کبھی مولانا رحمہ اللہ کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا، مگر اس پر بھی مولانا رحمہ اللہ کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لیے مانع فیض ہو جاتی ہے، اس لیے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام اپنے اصحاب سے گاہے مزاح کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت و محبت کے گل جانے سے اعتدال پیدا ہو جائے۔

(الاسعاد والایعاد صفحہ: ۳۰)

### بیالیسواں اعتراض..... اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح بدل سکتی ہے؟

حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ آپ رحمہ اللہ کے زمانے میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے، جن سے بہت فیض جاری تھا، مگر حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ کو ان کی بابت مکشوف ہوا کہ ان کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا، بس حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے، آپ رحمہ اللہ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے، آپ رحمہ اللہ نے اس کے لیے دعا کرنا

چاہی، مگر ڈرے کی کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر کشف ہونے کے بعد اس کے خلاف کی دعا کرتا ہے، مگر پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر شتی کو سعید کر سکتا ہوں، اس پر مجدد صاحب رحمہ اللہ کو بھی ہمت ہوئی، معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں، چنانچہ پھر تو آپ رحمہ اللہ نے اس کے لیے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو سبیل بہ سعادت کر دیا جائے، حتیٰ کہ آپ رحمہ اللہ کو کشف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا، تب آپ کو چین آیا۔

تو دیکھئے! مجدد صاحب رحمہ اللہ نے اس شخص کے حق میں در بردہ کتنا بڑا احسان فرمایا، مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی، اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گزر رہی ہے، راتوں کی نیند اس کی اڑ گئی ہے۔

خبر واقعہ تو ہو گیا، مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی؟ جس کے متعلق ارشاد ہے:

”مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَيْ“ حضرت مجدد رحمہ اللہ نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقعہ میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں، مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الہی میں ہوتی ہے، تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا، مگر علم الہی میں اس کے ساتھ ایک قیدی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لیے دعا نہ کرے، سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا، کیونکہ اصل میں تقدیر علم الہی کا نام ہے، اسی لیے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الہی سے کرتے ہیں، کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا، پس دراصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحمود الاثبات کے اعتبار سے ”ام الکتاب“ ہے کیونکہ لوح محفوظ میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا، جتنا کتاب المحمود الاثبات میں ہوتا ہے، مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے اور جو تقدیر علم الہی کے درجے میں ہے، اس میں اس کا اسلا احتمال نہیں پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے اور اس کی تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجے میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے، کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ”وَرَأَاهُ فِيْ اَمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِّيْ حَكِيْمٌ“ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجے میں ’عَلِيٌّ حَكِيْمٌ‘ ہے یہ غایت قرب ’لَدَيْ“ کا مدلول ہے اور غایت ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں ’عَلِيٌّ‘ ہے ’حَكِيْمٌ‘ ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفس ہے اور اس لیے اس کو ’عَلِيٌّ حَكِيْمٌ‘ کہا گیا اور ’عَلِيٌّ حَكِيْمٌ‘ کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو ’لَدَيْنَا‘ اور ’عَلِيٌّ‘ دونوں کی دلالت اس کے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی اور اس سے

قبل جو ارشاد ہوا ہے: "إِنَّا جَعَلْنَا قُرْآنًا عَرَبِيًّا" اس میں اس کے فعل کا مفعول ہونا اور عربیہ کلمے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اس سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے، تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہو گیا۔  
(الاسعاد والالبعاد صفحہ: ۱۵)

## ترا لیسواں اعتراض..... فلسفہ اور تعلیم حضرت انبیاء علیہم السلام میں فرق!

تمہارا فلسفہ ایسا ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور اخیر میں نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ اشراقیین کی یرائے ہے اور مشائیین کی یرائے ہے معلوم نہیں کون غلط ہے اور کون صحیح ہے؟ اور ہمارے علم میں یہ ہے کہ اول ہی دن ہم نے پڑھا ہے وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کر دیا اسی وقت سے حاصل نکلے گا اور اس عمل پر ثواب کی امید ہوئی اور تمہیں کیا ملا؟ کون سا ثواب مشائیین اور اشراقیین کی رائے پر ملنے کی امید ہے؟ بس یہی فرق ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور حکماء کی تعلیم میں فلسفہ تو آگے ہے، منطقی ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں؟ ایک ذرا سی بات ہے، وہ طے ہی نہیں ہوتی، خواہ نواہ فضول جھگڑے بھردیے اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں، دقیق بے شک ہیں، مگر اس دقت کا حاصل کیا ہے؟ اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نتیجہ معتد بہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں، لیکن یہاں حاصل کا نام صفر ہے، تمام عمر اس لوٹ پوٹ میں رہے کہ یہ ٹھیک ہے اور طے جب بھی نہ ہو کہ کیا ٹھیک ہے؟ اور اگر طے بھی ہو جائے کہ امر حق یہ ہے کہ تب بھی اس کا کچھ حاصل نہیں، صرف ایک بات کا علم ہو گیا، اس سے کام کون سا نکلا.....؟؟

## علم معقول

دیکھئے! معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اس میں اس قدر مناقشات ہیں کہ ان کی وجہ سے اس بحث کو معرکہ الآراء ٹھہرا لیا ہے، اس میں سب سے پہلے اس پر بحث ہے کہ علم کون سے مقولہ سے ہے؟ یہ ذرا سی بات ہے، مگر لوگوں نے اس میں کتابیں کی کتابیں سیاہ کر دی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مقولہ افعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے، اضافت سے ہے، کوئی مقولہ کیف سے بتلاتا ہے، پھر سب طرف وہ جھتتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الہی تو یہ! دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں، اگر تحقیق ہو گیا اور امر واقعی معلوم ہو گیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے تو شرعاً علم کا نہ تو بدلا، یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے، وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہے، چاہے علم کسی

مقولہ سے ہوا اور اگر تحقیق نہ ہو اور اس حقیق معلوم نہ ہو، تب بھی شمرہ نہ بدلا یعنی جو نتیجہ اس سے حاصل ہونے والا ہے، وہ اب بھی مرتب ہوگا، بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھاویں یا کوئی کھانسی کھاویں تو اس کی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں، اس ترکیب کا ہم کو علم ہو یا نہ ہو، منفعت پھر بھی حاصل ہوگی، لوگ ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں، باورچی پکاتا ہے اور کھا لیتے ہیں، اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مرتب ہے، برابر حاصل ہوتی ہے، حالانکہ ترکیب کسی کو نہیں آتی، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے، یعنی باورچی اس پلاؤ کے نتیجہ سے اکثر محروم رہتا ہے، کیونکہ اسے پلاؤ کھانے کو نہیں ملتا، نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے اور پکا تا وہ ہے، جس کو دوسروں لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ علم باورچی ہے اور شمرہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے، عالم صاحب شمرہ سے محروم ہیں، اب فرمائیے کہ علم اچھا یا شمرہ؟ یہی حال علوم حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے کہ ان کے پاس صرف علوم ہی ہیں اور انہوں نے ان کو منتہی نظر قرار دے رکھا ہے اور شمرہ حاصل ہے، شریعت جانتے والوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام نے تو خدا کی پکائی دی ہے اور حکماء نے پکانا سکھایا ہے، مگر انہوں نے جس چیز کا پکانا سکھایا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں، محض سوکھنے کی ہے، دن بھر تو سر مارا جب چیز تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانے کی نہیں ہے۔

چوں دم برداشتم مادہ آمد

اور یہ میں بالکل غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی تھلائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے، جن باتوں کو انہوں نے تمام عمر سر مار کے طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں۔

تعلیم انبیاء کرام

اب دیکھ لیجئے کہ وہ کار آمد ہیں یا نہیں؟ جب غلط ہیں تو کار آمد کیسی؟ تو یہ بات صحیح ہوئی کہ جو چیز انہوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ تھی، خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم انبیاء علیہم السلام کی سہل ہوتی ہے کیوں کہ وہ فضول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے، کام میں لگانا چاہتے ہیں، ان کو خلق خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اور اپنی بڑائی جتنا منظور نہیں ہوتی تو سہولت تعلیم انبیاء کی یہ ہے یعنی شفقت، لیکن نتیجہ اس سہولت کا یہ ہوا کہ عام فہم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا ہے، یہ بڑی نادانی ہے۔

(الباطن صفحہ: ۵)



چوالیسواں اعتراض..... نو تعلیم یافتہ کو ظاہر اصلاح کے ساتھ باطن کی

## صفائی بھی ضروری ہے!

آج کل دین کی طرف سے ایسی لاپرواہی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے؟ اللہ ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو دین کا نام لیتے ہیں، یہ کس قدر دین سے بعد کی دلیل ہے! اور اگر کسی کا خیال دین کی طرف ہے بھی تو ظاہری اصلاح کا نام دین رکھ لیتا ہے، نقلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں، وضع قطع مسلمانوں کی سی بنائی، بس اس کا نام دین ہے، ان کی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی، جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہنچتی تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں، تو اس خفا، کجی سے ان میں دشواری پیدا ہوگی تو اب سمجھئے کہ یہ امر کس قدر قابل توجہ ہے، پس اس حدیث: "قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاه"

میں ان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ان تمام امراض کی ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے، اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کس قدر قیمتی بات، بیان فرمائی گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ دین کے دو جز ہیں، ظاہری باطنی، اب تو یہ حالت ہے کہ باطن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہے، باطن کی جگہ بطن نے لے لی، بس پیٹ بھر لیا جائے۔ جس طرح بھی ہو، حلال سے ہو یا حرام سے دھوکہ سے ہو یا اشرف نفس کے ساتھ ہو، بلا طیب خاطر ہو یا جبر سے ہو، جس طرح سے بھی لیا جائے لقمہ حاصل کر لیا جائے ہاں! بے شک ظاہر کو بعض نے ذرا درست کر لیا ہے اور بس.....!!

اور اس میں بھی دو فریق ہیں، ایک تعلیم یافتہ اور ایک عوام، عوام تو اس بارے میں اقراری مجرم ہیں، خود اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین؟ الٹی سیدھی نگریں مار لیتے ہیں، دل دنیا میں لگا ہوا ہے، کسی وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں، خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں، اپنے تصور کا.....!

دوسرا گروہ جو تعلیم یافتہ ہے، ان پر زیادہ افسوس ہے کہ اپنے تصور کے بھی مقرر نہیں ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جز بھی ہے، عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں، وہ محض ظاہری ہے اور باطن سے ہم محروم ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ محروم ہونے کا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے کیونکہ شان میں فرق آجائے گا انہوں نے باطنی جز دین سے اڑا ہی دیا، بس ظاہر پر کفایت کر لی اور اس پر ناز کر بیٹھے اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں اور پھر ظاہر میں سے

بھی چھانٹ لیا ہے، بعض اجزاء کو گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزاء نکال دیے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے اجزاء نعوذ باللہ! فضول اور زائد ہیں اور وہ انتخاب کن اجزاء کا کیا ہے؟ جن میں سہولت ہے، یا جن کی عادت ہوگئی ہے، جیسے نام مسلمانوں کا سارکھ لینا، صورت مسلمانوں کی سی بنالینا، بس انہیں اجزاء کا نام دین سمجھ لیا ہے۔

## دین کے اجزاء

صاحبو! دین کے اجزاء تو ہیں عقائد، اعمال، معاشرت، معاملات، اخلاق ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے، اب یہ حالت ہے کہ اجزاء میں سے بعضوں کا نام سن کر بھی چوکتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں، بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ ان کو دین سے کیا تعلق؟ معاشرت بھی دین سکھانے کی چیزیں ہیں؟ یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے آدمی خود دیکھ جاتا ہے، اس میں بھی مولویوں نے پابندیاں لگا دی ہیں، ملی ہذا معاملات میں بھی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں۔

غرض بعض اجزاء کو دین کا جزوی نہیں سمجھا جاتا، برے اعمال دیانت تک رہ گئے ہیں اور وہ اعمال بھی سب نہیں ان میں سے بھی وہی لیے ہیں، جن کی ایک رسم چلی آتی ہے اور جن کی بچپن سے عادت پڑ گئی ہے، چنانچہ بڑی دیانتداری یہ ہے کہ نماز پڑھ لی دائرگی رکھ لی، شرعی پاجامہ پہن لیا، گوشت کھا لیا، صورت، شکل وضع مسلمانوں کی سی بنالی، یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں اور جو اپنے آپ کو دیندار بھی نہیں کہتے ہیں ان کا تو یہاں ذکر ہی نہیں۔

غرض دین کے اجزاء میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی گویا جو ہر نکل آیا اور دین نام رہ گیا گنتی کے صرف چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کے چند شعبوں کو درست کر لیا۔

غرض اس انتخاب میں بھی جو راہ وہ ظاہری رہ گیا، اس کے سوا دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا، بس اس نام تمام ظاہر کو بنا کر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں، اس بیان ظاہر کو بگاڑنے والا خوش نہ ہوں کہ ہم تو دیکھنے باطن پرست ہیں، مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں کہ باطن کا درست ہونا کافی ہے، ظاہر کے درست کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے کا مغل ہے، لہذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچانا جاسکتا کہ یہ بھی مسلمان ہیں! وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے، بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے، یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہو جائے گا، اس سے

ہمارے نفس کو خوشی ہوگی تو یہ نفس پروری ہوئی، اس قسم کی بہت سی خرافات من سمجھوتہ کرنے کے لیے گھڑی ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے، پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے؟ میری ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا کہ یہ لوگ خوش ہوتے ہیں، اس لیے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ اس پر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں تاکہ وہ اصلاح باطن کی فکر کریں، شخص اصلاح ظاہر پر قناعت نہ کریں، باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے، اس لیے کسی کو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاح ظاہر کو ترک کر دے، گو بالفرض باطن بھی درست ہو اور ان بدوبینوں کا تو وطن بھی درست نہیں، بلکہ انہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے، ظاہر کو تو بگاڑا ہی ہے، باطن کو بھی بگاڑا ہے اور یہ اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے، اس سے بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا تاکہ ایک فرض تو ادا ہوتا۔

## باطن کی اصلاح

اگر ان لوگوں کی طرف کہا جائے کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے، باطن ہمارا بالکل اچھا ہے! ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لیے بگاڑا ہے، اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہے! پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہوا کہ انہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے؟ میں بطور ازماہی جواب کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر حکم کی مخالفت کرتا ہے اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا، لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو کیوں بغاوت کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیر خواہ ہوں، یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف عجب سے بچنے کے لیے کر رکھی ہے تاکہ میرے خلوص میں فرق نہ آئے بتائیے! آپ اس کو کیا کہیں گے؟ یہی کہیں گے کہ جھوٹا بد معاش غلط کہتا ہے فرمائیے! اس کی کیا وجہ ہے؟ جب ایک شخص اپنے ذمہ سے کہہ رہا ہے کہ میں دل میں مطیع ہوں اور خیر خواہ ہوں، تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں؟ اور اس کو باغی کیوں سمجھتے ہیں؟

اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سوائے اس کے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے باطن کا جب افعال اس کے مخالف نہیں ہیں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ باطل اس کا موافق اور مطیع ہے اور یہی کہا جائے گا کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باغی ہے، اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہو؟ اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو؟ سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدن اضطراری کے ظاہر اس کا مخالف ہو۔ یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آگئی، اصل بیان یہ تھا کہ آج کل بہت



سے دیندار ایسے ہیں جنہوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ رکھا ہے، پھر اعمال سے مرضی اعمال ظاہری لیے گئے ہیں، وہ بھی بہت نہیں بلکہ محدود ہے چند جیسے دائرہ ہی بڑھائی، وضع قطع درست کر لی اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہو گئے۔

اس تقریر سے چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ظاہر کو بنانا کچھ اچھی چیز نہیں اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے ہیں جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں، اس لیے ان کی غلطی کو بیچ میں رفع کر دیا گیا، باقی اصل خطاب انہیں لوگوں کو ہے جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھتے ہیں اور جن کو اپنے مرض کی خبر نہیں اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار بھی ہے اور جب خبر ہونا دشوار ہے تو اس کی اصلاح بھی دشوار ہے، خبر کے دشوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے، لہذا خبر بھی آسانی سے ہوگی اور اصلاح بھی اس کی آسان ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے، بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی پھر اصلاح کیسے ہو اور جب اس کے مریض کو بھی خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو تو کیسے خبر ہوتی؟ کیونکہ وہ دوسروں کو نظر تو نہیں آتا اور بدگمانی کی کسی کو اجازت نہیں، تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسا سمجھے؟ لہذا یہ مرض دشوار ہو، پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے؟ اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے؟ کیونکہ اطلاع مفقود اور دہی شرط علاج اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے تو جیہ اور تاویل کا کہ اس کو کھینچ کھانچ کر مرض کی حد سے نکال لیں گے اور ناجائز کو جائز بنالیں گے حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے تو اس تاویل سے ہرگز بنناشت نہیں ہوگی، بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہے گا کہ یہ گناہ ہے، پھر جب خود ہی گو گناہ ہونے کا علم ہے تو اللہ تعالیٰ کو کیسے علم نہ ہوگا؟ تو پھر اس توجیہ اور تاویل سے کیا کام چلا؟ خدا کے سامنے تو گنہگار ہی رہے، ظاہر بیٹوں کی نظر میں سرخ رو ہو گئے تو کیا؟

کہ گبے اللہ درونے می زنی  
از برائے مسکہ دونے می زنی  
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام  
در غلط اندازی تا ہر خاص و عام  
کاربا با خلق آری جملہ راست  
با خدا تزویر و حیلہ کے رواست  
کاربا او راست باید داشتن  
رایت اخلاص و صدق افراشتن

ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آگئی کہ ان کی نظر صرف ظاہر تک ہے، مگر باطن کو بگاڑ کر دھوکہ کیسے دے سکتے ہیں؟ جب کہ ان کی نظر باطن تک بھی پہنچتی ہے، دنیا کی نظروں کے سامنے تاویل میں کر کے مرخو ہو گئے تو کیا ہوا؟ تاویل سے اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے، حق تعالیٰ کو تو اصل واقعہ کا علم ہے۔

## تاویل کی خرابی

اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی برائی پر پردہ پڑھ جاتا ہے، اصل گناہ تو مرض تھا ہی یہ تاویل کا مرض اس سے بھی سخت ہے، کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہو سکتی ہے کہ کبھی اس سے تنبیہ ضرور ہو جائے گا اور جب تاویل درمیان میں آگئی تو گناہ کی برائی پر پردہ پڑھ گیا اب تنبیہ ہو تو کیونکر ہو؟ اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ نہیں کر سکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے، کوئی برائی اس کی نظر میں نہیں آتی اور خود تنبیہ اس واسطے نہیں رہا کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑ گیا، تنبیہ اور تنبیہ سب اڑ گئے اب اصلاح کی کیا امید ہو؟ دیکھئے! کس قدر دشواری ہے باطن کی اصلاح میں.....!!

بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں تاویل کی ضرورت نہیں اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے اس لیے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں، لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں، علم ہے، عمل ہے، نماز ہے، روزہ ہے، جب اتنے کمال موجود ہیں تو وہ عیوب بھی صحیح فیصلہ غلبہ سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے اور برائی کم تو بھلائی ہی حکم ہوگا، اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اچھے بن گئے اور سب بات قاعدہ کے اندر ہی رہی، یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا، اس سے بات بھی وہی کی وہی رہی اور دل کو اچھی طرح سمجھالیا کہ ہم اچھے ہیں، یہ ایسی مدلل تقریر ہے کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔

اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پائے، مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسروں کے ساتھ میں ہوگا اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کرے گا اور اس روز دل کو سمجھالینے سے کچھ کام نہ چلے گا اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپ کا غالب تو مغلوب ہو اور مغلوب غالب ہو۔

دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کی ضرورت تو اصلاح کی ہے اور عیبوں کے دور کرنے کی ہے جو اس کے اندر ہے۔

تو کیا اس دل کو سمجھ لینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگئی؟ ہرگز نہیں! بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑ گیا تھا اسی طرح اس فیصلے سے بھی پردہ پڑ گیا، تاویل بھی ایک مرض تھا، یہ بھی ایک مرض ہے وہ ایک قسم کا پردہ وہ دوسری قسم کا پردہ ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہی ہے، اس میں اور اس میں اتنا فرق ہے کہ اس میں تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ تسلیم نہ کیا تھا، اس وجہ سے نفس پردہ نہ آیا، اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پردہ اب بھی نہ آیا خیال کیجئے کہ یہ کس قدر گہری تاویل ہے.....!!!

### باطنی بیماری کا علاج

بہر حال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آگئی ہوگی کہ امراض باطن کا ادراک نہایت دشوار ہے، کیونکہ اتنے مواقع موجود ہیں اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں جب اس کی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے، کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے جب مرض کی خبر ہو اور جب خبر ہی نہیں تو علاج کیسا؟ اس دشوار کو دیکھ کر بعض لوگوں نے ہمت ہاری دی کہ کون علاج کرے؟ اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے، اللہ میاں بڑے کریم ہیں، ہم گنہگار سہی، اللہ میاں معاف کرنے والے ہیں، پھر کیوں مصیبت میں پڑی کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو اس کے نخرے اٹھاؤ، ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہو، اچھی خاصی مصیبت ہے جب اللہ میاں رحیم و کریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت کو اٹھانے کی؟ وہ اپنی رحمت سے خود ہی سب کام بنادیں گے۔

یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں اور کوئی کام خلاف شرع نہیں کرنا چاہتے، ان کے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے، روزے کی بھی ضرورت ہے، واظہی کی بھی ضرورت ہے، مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی، کہ اس کے بھی کسی مرض کی اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں.....؟؟

پس سن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں اور ان کے دور کرنے کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے ظاہر کو سنوارنے کی ضرورت ہے، جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا۔

## پینتالیسواں اعتراض..... ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ضروری ہے!

ان نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے خیالات بھی نئے ہیں، انہوں نے دین کا خلاصہ ایک نئے طریقے سے کیا ہے، یہ دعویٰ تو ان میں اور فقراء میں دونوں میں مشترک ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور مقصودا عظیم باطن ہے، ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں اور آگے اس بات میں دونوں متمایز ہیں کہ وہ باطن کیا ہے کہ فقراء نے تو ہر عمل کا باطن الگ نکالا ہے، نماز کا الگ روزے کا الگ اور حج و زکوٰۃ کا الگ جیسا کہ بیان کیا گیا اور ان امراء نے اس سے بھی زیادہ اختصار کیا ہے، گویا اس کی صنعت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے، انہوں نے ست کا بھی ست نکالا یہ مولوی اور فقراء کو سب کو فٹنول سمجھتے ہیں، انہوں نے کل دین کا خلاصہ ایک ہی چیز کو نکال لیا ہے وہ کیا ہے؟ تہذیب، اخلاق بس تمام اعمال تو دین کے لیے ظاہر ہیں اور باطن دین کا اور حقیقت اس کی تہذیب اخلاق ہے اور کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ اٹھک بیٹھک اور مال کا خرچ کرنا اور پیٹ کا ٹنا، جس جس عمل کو عبادت کہا جاتا ہے وہ سب بانی اسلام علیہ السلام نے صرف اس واسطے تجویز فرمائی تھیں کہ تہذیب اخلاق حاصل ہو، بلکہ عرب وحشی ملک تھا اور وہاں بہیمیت بہت زیادہ تھی، ان کی اصلاح بلا اس سخت گیری کے ہو نہیں سکتی تھی، اس واسطے یہ احکام تجویز کیے گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑے ریفارمر تھے، ان کی اصلاح کے لیے ایسی صحیح تدبیریں تجویز فرمائیں کہ ان سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی تھیں اور ہم کو وہ بات بدون نماز روزہ کے حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلی تھا یعنی تہذیب اخلاق، کیونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور ”بہیمیت“ عرب کی سی ہم میں نہیں ہے تو واسطے اس سخت گیری کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہ بڑی نادانی ہے کہ متکلم کی اصل غرض کو نہ سمجھا جائے اور صرف الفاظ پر رہا جائے، جیسا کہ خشک مولوی کر رہے ہیں، کیوں صاحب! کیا دلیل ہے اس بات کی کہ تمام احکام سے مقصود اصلی خطرہ شارع علیہ السلام کا صرف تہذیب اخلاق ہے؟ کوئی دلیل اس پر ہوئی چاہیے اور میں دور کی بات کہے دیتا ہوں کہ اول تو دلائل عقلیہ سے اس کا احتمال بھی منفی ہے، لیکن بغرض محال اگر اس کا احتمال بھی ہو کہ شاید یہی مقصود ہو تو صرف احتمال پر اس دعوے کی بناء ہوئی دلیل پر تو بناء نہ ہوئی تو کیوں صاحب! ایک دین ہی آپ کے نزدیک ایسی چیز ہے کہ جس میں اپنے مطلب کے لیے احتمال ہی پر بناء کر کے اس سے تسلی کر لی جاتی ہے؟ کبھی دنیا کے بھی کسی کام کی بناء پر آپ یا کوئی عقل مند صرف احتمال پر کیا کرتا ہے؟ مثلاً ایک بہت بڑا مہاجن ہو، جس کے یہاں بہت دولت ہو، وہ مر جائے تو آپ اس کے یہاں جا کر

کہیں کہ اس میں سے مجھے بھی حصہ ملنا چاہیے کیونکہ میں اس کا بیٹا ہوں اور کوئی کہے کہ تم بچے کیسے ہو؟ تو جواب دیجئے کہ احتمال تو ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور جب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں بیٹا ہوں، لہذا میراث ملنی چاہیے کیونکہ صاحبو! کیا یہ بات چل جائے گی؟ اور کیا اس کو سن کر کوئی پاگل نہ کہے گا؟ یا مثلاً جو آپ کا بیٹا ہے، اس کو آپ میراث سے محروم کرنا چاہتے ہیں، اس طرح کہ گواس کو بیٹا کہا جاتا ہے، مگر احتمال تو ہے کہ بیٹا نہ ہو؟ لہذا اسی شق کو ترجیح دی جاتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے اور میراث سے محروم ہونا چاہیے، تو کیا یہ بات مان لی جائے گی؟

### دین سے بے رغبتی

صاحبو! تعجب ہے کہ دنیا کے تو کسی معمولی کام کی بناء بھی احتمال پر نہیں ڈالتے اور دین کے بڑے بڑے کاموں میں جرأت کرتے ہیں اور تغیر کر ڈالتے ہیں، دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ احتمال کے موقع پر ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے، مثلاً کسی دو میں شک ہو جائے کہ یہ دوا افلائی ہے، یا کوئی تیزاب ہے تو اس کو کوئی بھی نہیں لے گا، بلکہ اسی کو پسند کریں گے کہ اس کو تلف کر دیا جائے، گوگنتی ہی لاگت اس میں ضائع ہوتی ہو اور اس کو مکان میں رکھنا گوارا نہ کریں گے، اس احتمال کی وجہ سے کہ کوئی پی نہ جائے اور نقصان نہ ہو جائے، یا اللہ! دین ہی کیا ایسی سستی اور بیکار چیز ہے کہ اسے بالکل سر پر سے اڑا دینے کے لیے صرف احتمال کافی ہے، تمام ارکان دین کو بدل ڈالا صرف اس احتمال پر کہ شاید مقصود ان سب سے تہذیب اخلاق ہو اور لطف یہ ہے کہ احتمال بھی مروج بلکہ غلط اور اپنا تراشا ہوا اور بردستی کا احتمال ہے، کیونکہ احتمال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں متکلم کی طرف سے کوئی بیان نہ ہو، یہاں تو صاحب شرع کی طرف سے صاف صاف بیان موجود ہے، ہر ہر عبادت کی کیفیت اور اس کے کرنے کی ضرورت اور اس پر ثواب اور ترک پر وعیدیں بیان فرمائی ہیں، پھر یہ احتمال بھی کہاں رہا کہ شاید مقصود تہذیب اخلاق ہی ہو؟ یہ تو کھلی ہوئی توجیہ: "القسول بما لا یرضی بہ قائلہ" ہے اور یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ایک نوکر سے کہیں کہ انگور لے آؤ، وہ آنا لے آئے اور کہے مقصود تو کھانے سے تغذیہ بدن ہونا ہے اور وہ انگور میں اتنا نہیں ہے جتنا آٹے میں ہے، کیا یہ حرکت اس کی نافرمانی نہیں؟ حالانکہ وہ ایک معقول وجہ بیان کرتا ہے، مگر جواب میں اس کے یہی کہا جائے گا کہ تو اپنی طرف سے غرض اور مقصود کو تراشنے والا کون ہے؟ کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اس وقت ہم کو مقصود تغذیہ بدن ہے؟ ممکن ہے کہ تغذیہ مقصود ہو جس کے لیے انگور موزوں ہے نہ آٹا، خصوصاً جب یہ صورت ہو کہ تغذیہ مقصود نہیں، مثلاً کھانے کا وقت نہ ہو، یا ابھی کھانا کھا چکے ہیں، یا گھر میں کوئی بیمار موجود ہو جس کو طبیب نے انگور کھانے کے لیے کہا ہو، تو اس کا

آٹالے آنا اور زیادہ سخت بیوقوفی اور بد تمیزی بلکہ گستاخی سمجھا جائے گا، حالانکہ اس قرینے کے ہوتے ہوئے وہ احتمال باقی ضرور رہتا ہے، لیکن ایسے نوکر کو کان پکڑ کر نکال دیا جائے گا۔

بس یہی قصہ دین کا سمجھو کہ جب دین میں قرآن اس بات کے موجود ہیں کہ خود اعمال بھی مقصود ہیں تو اپنی طرف سے ایک احتمال نکال کر ان کو بدلنا کیسے جائز ہوگا؟ اور یہ قرآن اگر معمولی بھی ہوتے تب بھی اس اختراع کی گنجائش نہ تھی، چہ جائیکہ تصریحات قرآنی موجود ہیں، اس وقت تو اس اختراع کی مثال بالکل یہ ہوگی کہ نوکر سے کہیں: اگور لے آ! اور وہ جواب میں کہے: جی ہاں میں سمجھ گیا، آپ کا یہ مطلب ہے کہ اگور نہ لانا بلکہ آٹالانا!

## دین کی اہمیت

اے اللہ! عقلیں کہاں چلی گئیں؟ یا عقل اس واسطے ہے کہ دنیا کے کام بنائے جائیں اور دین کا نام آتے ہی اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور دین کے کاموں کو جان جان کر بگاڑا جائے دنیا کے کاموں میں تو ذرا سا احتمال جو غیر ناشی عن دلیل بھی ہو پیدا ہو جائے تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا جائے اور دین کے کاموں میں ایک غلط احتمال اپنی طرف سے تراش کر اس پر عمل کر لیا جائے، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دین کو صرف ایک غیر ضروری چیز سمجھا ہے جس کا مقتضایہ ہے کہ یوں کر لیا تو کیا؟ اور یوں کر لیا تو کیا؟ ورنہ اگر ذرا بھی وقعت دین کی قلب میں ہوتی اور اس کی کچھ بھی ضرورت سمجھی جاتی اور درجہ وہم میں بھی یہ بات ہوتی کہ قیامت آنے والی ہے اور باز پرس ہوگی اور وہاں ایسی ایسی ہولناکیاں اور عذاب ہیں، تو اول تو یہ احتمال پیدا ہی نہ ہوتا اور پیدا بھی ہوتا تو پہلو احتیاط ہی کا اختیار کیا جاتا اور یوں کرتے کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اعمال کا یہ خاص باطن (یعنی تہذیب الاخلاق) مقصود ہو (گو یہ ان کا خود تراشیدہ ہے) مگر بہتر احتیاط یہی کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جائے اور ظاہر کو بھی ترک نہ کیا جائے، کیونکہ اگر وہ احتمال غلط نکلا تو قیامت میں کیا جواب ہوگا؟ دیکھئے مال گزاری داخل کرنے کو تحصیل میں جاتے ہیں اور فرض کیجئے کہ بیس روپے مال گزاری کے داخل کرنے ہیں، لیکن اگر شک پڑ گیا کہ کچھ آنے پائی اس رقم کے اوپر اور بھی ہیں تو اس صورت میں جیب میں پچیس روپے ہی ڈال کر چلیں گے، اس خیال سے کہ کچھ تو کسر مال گزاری میں ہے جس کی مقدار معلوم نہیں اور شاید کوئی روپیہ کھوٹا بتا دیا جائے، یا عملہ والوں کو کوئی روپیہ تاق کا دینا پڑے تو احتیاط یہی ہے کہ پانچ روپے زائد لے چلیں، اگر خرچ نہ ہوئے تو واپس آ جائیں گے اور اگر نہ لے چلیں اور ہاں کمی پڑ گئی تو ذرا اسی بات کے لیے آبرو پرین جائے گی ایسے موقعوں پر دنیا میں بیوقوف سے بیوقوف بھی احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے، پھر تعجب ہے کہ

دین میں وہ لوگ جواہل عقل ہونے کے اور تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں، انھیں بلا کا پہلو اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک من گھڑت احتمال پر قطعی حکم کر دیتے ہیں اور ایسے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب کا (جو درحقیقت راجح اور یقینی ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ احتمال جان بوجہ بلکہ غلط ہے) ان کو احتمال ہی نہیں ہوتا، اس کی وجہ صرف دین کا غیر ضروری سمجھنا ہے، اس کا آخری جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ آنکھ مجھے پر معلوم ہو جائے گا کہ کس دھوکہ میں رہے؟ اور اس وقت اس کا کچھ بھی مدارک نہ ہو سکے گا۔

## امراء کا حال

غرض اس امراء کے فرقے نے بھی دین کا ایک ست نکالا اور یہ ست اس ست سے بڑھا ہوا ہے جو فقراء نے نکالا تھا، کیونکہ فقراء نے جو ست نکالا تھا وہ ایک دین کی چیز تو ہے اور انہوں ست بھی دنیا ہی کی ایک منفعت نکالی ہے پس وہ ست تھا اور یہ روح ہے، آج کل ہر چیز کی روح نکالی گئی ہے، گلاب کی روح الگ ہے، چینیلی کی روح الگ ہے، انہوں نے یہ روح نکالی، (روح کیا نکالی کہ دین کی روح ہی نکال دی) تمام دین کی روح ایک ذرا سی نکالی جس کا نام تہذیب اخلاق رکھا ہے، اس کو اور وہ بھی اپنے ہی نزدیک حاصل کر لیا ہے، بس کسی عمل کی ضرورت نہیں، اگر کوئی کیا بھی تو دنیا کے فائدے کے لیے مثلاً نماز پڑھی تو اس فائدے کی بناء پر کہ ان حرکات سے جسم کی ریاضت ہو جاتی ہے، اس واسطے کبھی اٹھک بیٹھک کر لیتے ہیں اور کبھی اور طرح کی ریاضت ہوگی مثلاً گھوڑے کی سواری کر لی، یا کرکٹ اور فرٹ بال کھیل لیا تو اب ریاضت کی ضرورت نہیں رہی، بس نماز حذف۔

یا ایک نماز کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے واسطے وضو کیا جاتا ہے، جس سے صفائی ستھرائی ہو جاتی ہے اور صفائی اچھی چیز ہے اور تہذیب میں داخل ہے اور اگر صبح اٹھ کر غسل کیا یا صابن سے ہاتھ منہ دھولیا اور ہنگامہ اور کوشیوں میں رہتے ہیں، گرد و غبار کا وہاں دخل نہیں تو اس صورت میں نماز کے واسطے وضو کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ ایک صاحب ایسا ہی کرتے تھے کہ بے وضو نماز پڑھ لیتے تھے اور اگر کسی نے کہا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو کہتے کہ یہ دقیقاً نوسی مولویوں کے خیالات ہیں، لوگ غور نہیں کرتے اور دین کی تہمت تک نہیں پہنچتے، عرب میں جب اسلام شروع ہوا تو افلاس بہت تھا، لوگ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے اور میلے کپیلے رہتے تھے، اسی واسطے وقت کے لیے بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید لگا دی تھی کہ جب نماز پڑھو تو منہ ہاتھ دھولیا کرو، اب وہ زمانہ رہ نہیں گیا ہے، اب مال کی افراط ہے، محنت و مزدوری کی ضرورت نہیں، ہم کوشیوں اور ہنگاموں میں

رہتے ہیں، روز صبح کو صابن مل کر غسل کرتے ہیں، گرد و غبار کا یہاں تک گزر نہیں، بتاؤ! ہمارے بدن پر کیا لگ رہا ہے جس کے واسطے بار بار دھوئیں؟ (کوئی پوچھے کہ ہر روز صبح کو کیا لگ جاتا ہے جس کے واسطے روز روز نہاتے ہو؟ مگر یہ کام تو اس استاد نے بتایا ہے جس کے حکم پر چون و چرا کی گنجائش نہیں، یعنی فیشن نے) خود یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ عرب عموماً میلے کپیلے رہتے تھے، یہ تاریخی بات ہے کہ ان کے یہاں تاریخ کو بڑا دخل ہے اور اس پر بڑی جلدی ایمان لاتے ہیں، تاریخ میں یہ لگ گیا کہ عرب میں افلاس تھا، آگے عموماً اپنی رائے سے تجویز کر لیا، کیا تاریخ میں کہیں یہ بھی ہے کہ اہل عرب سب ایسے ہی غریب اور مفلس تھے؟ کیا ان میں متمتع اور صاحب ثروت نہ تھے؟ عرب میں وہ لوگ بھی تھے جن کے یہاں سو سو غلام تھے، تو اگر وضو کی بناغہ غربت اور مفلسی پر تھی تو ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جاتا اور صرف غریبوں کے لیے وضو کا حکم ہوتا نیز حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات ابتداء میں بے شک ایسے تھے، مگر پھر حق تعالیٰ نے فتوحات دیں اور وہ والی ملک ہوئے اور یہ حالت تھی کہ بدن پر بجائے عطر کے مشک ملا کرتے تھے، مگر کیا تاریخ میں کہیں ہے کہ انہوں نے وضو کرنا چھوڑ دیا تھا؟ بس زمانہ آزادی کا ہے جو چاہو کر، جو چاہو کہو، کوئی پوچھنے والا نہیں، چنانچہ وہ صاحب پانچواں وقت نماز بے وضو اڑاتے تھے، ایک صاحب نے اور زیادہ ترقی کی کہ نماز بھی ندراد کر دی، کیونکہ مقصود بدون اس کے حاصل تھا یعنی ریاضت جیسے گھوڑے کی سواری وغیرہ۔

ایک اور صاحب کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ مدعو تھے اور بڑے معزز شخص تھے، ان کے ساتھ اور بہت سے اشخاص بھی مدعو تھے، گویا تمام جلسہ انہیں کی وجہ سے سے مدعو تھا اور سالار قافلہ بھی یہی تھے، نماز کا وقت ہوا تو سب لوگ اٹھے مگر یہ نہ اٹھے، کسی نے کہا آپ بھی نماز کو چلیں تو کہا کہ میں نماز کو لغو سمجھتا ہوں (نعوذ باللہ) لوگوں نے کہا: نماز تو اسلام کا رکن ہے آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟ تو آپ جواب میں (توبہ توبہ!) کیا کہتے ہیں کہ میں اسلام ہی کو لغو سمجھتا ہوں!!

صاحبو! یہ نوبت ہے ان لوگوں کی جو سر بر آوردہ کہلاتے ہیں اور جن کی عزت کو لوگ اسلام کی عزت سمجھتے ہیں، اس پر اگر کوئی مولوی کچھ کہے تو کہا جاتا ہے مولویوں کو تو بس فتویٰ لگانا آتا ہے! مسلمانوں کے کسی ایک فرد کو مشکل سے ترقی ہوتی ہے، اس کے یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں، بس ترقی قومی دیکھ ہی نہیں سکتے!

صاحبو! یہ کیا اسلامی ترقی ہے؟ اب سنئے! کہ اس شخص کے لیے اہل جلسہ میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز کیا کہ اس شخص نے ایسا بہودہ کلمہ بکا ہے، اس واسطے اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیے اور اس سے قطع تعلق کر دینا چاہیے تو دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ہم کیوں اختلاف ڈالیں؟ اس نے



اللہ میاں کی شان میں گستاخی کی ہے، اللہ میاں آپ نمت لیں گے، سبحان اللہ! یہ صاحبِ صلح صلح کل ہوں گے، مگر کیا یہ صلح کل ہے؟ دارالاسطنت کے بانی سے دوستی کر کے تو دیکھو، دیکھیں صلح کل کی مذاق کو کیسا بنا جتے ہیں؟ مگر یہاں اہل جملہ کو بھی تامل ہے کہ ایسے بیہواہ سے باپکاٹ بھی کرنا چاہیے یا نہیں؟ افسوس! رزکی میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اس پر بحث کی جاتی تھی کہ نکاح کی پیچ کیوں لگائی گئی ہے؟ نکاح کی روح اور حقیقت تو تراضی ہے، جہاں تراضی پائی جاوے، نکاح ہی کا حکم ہونا چاہیے، عورت اور مرد کا ایک کے ساتھ متید ہو جانا کچھ میں نہیں آتا؟ ہاں! جبر نہیں چاہیے، رضامندی سے کسی مرد اور عورت کے مل جانے میں کیا حرج ہے؟ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ ایک بیوی ایک میاں ہو، یہ مسلمانوں میں کمیٹی ہوئی تھی۔

### ایک لطیفہ

اس سے بڑھ کر ایک اور لطیفہ ہے (لطیفہ کیا ہے، کثیف ہے) لکھنؤ میں ایک محلہ ہے، خیالی گنج، وہاں کے ایک صاحب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے، ایک روز ذرا دیر سے آئے تو پوچھنے پر بیان کیا کہ آج وہاں ایک کمیٹی ہوئی، جس میں اس پر بحث ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ کیا ہے؟ بہت گفتگو کے بعد جو خیر بات طے ہوئی وہ یہ کہ ان کے تنزل کا اصلی سبب "اسلام" ہے جب تک اس کو نہیں چھوڑا جائے گا ترقی نہیں ہوگی اور یہ بات پاس ہوگی، لعنت ہے اس پاس ہونے پر!

### بے غیرتی کی انتہا

اے صاحبو! خیال تو فرمائیے، کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے؟ پھر اپنے کو کہتے ہیں "ٹھٹھ مسلمان ہیں"، ٹھٹھ نہیں، بلکہ تمہارے اسلام کی آنکھ میں ٹینٹ نکل آیا ہے جس نے بالکل بے کار کر دیا اور جس کا علاج سوائے نشتر کے کچھ بھی نہیں اور نشتر بھی کون سا؟ نائی کا! پھر وہ نشتر نہیں جس سے آنکھ بن جائے، بلکہ وہ جس سے اور پھوٹ جائے اور کاٹ کر نکال دی جائے کیونکہ اس میں قابلیت ہی بننے کی نہیں یہ تو نوبت ہے، اگر اس پر کوئی حکم شرعی سنایا جائے تو کہتے ہیں کہ بس مولویوں کو توئی لگانا آتا ہے اور عقل ان کی ناک پر رکھی رہتی ہے اور ذرا سی دیر میں برامان جاتے ہیں، اگر ان کی ماں کو کوئی گالی دے تب دیکھیں یہ برائیں مانتے؟ اس شخص سے دوستی قائم رہتی ہے یا نہیں؟ اس وقت تو یہ بھی ایسا خشک برتاؤ کریں کہ مولوی بھی مخالف کے ساتھ نہ کریں۔

بات یہ ہے کہ جس سے جس کا تعلق ہوتا ہے، اس کو برا کہنے سے غصہ آتا ہے، سو آپ کو اپنی ماں سے تعلق ہے، اس واسطے ماں کو گالی دینے سے غصہ آ گیا اور ایسا ہونا ہی چاہیے! اگر ایسا نہ ہو تو فطرتِ سلیمہ کے خلاف ہے اور ہم کو اللہ و رسول سے تعلق ہے، اس لیے جب ہمارے اللہ اور ہمارے

پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی جائیں گی تو ہم کو کیسے غصہ نہ آئے گا؟ اور کیوں ہم بڑے  
نمائیں گے؟ اور کس طرح سے ایسے یہودہ سے دوستی رکھیں گے.....؟؟

## ایک صاحب کا حال

ایک اور ایل ایل بی صاحب کا قصہ ہے (اتنا بڑا تو پاس کیا مگر بی ہی رہے) کہ انہوں نے مجمع  
میں کہا کہ رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے جو بضرورت مذہب مان لیا جاتا ہے، ورنہ واقعہ میں اس  
کی کوئی اصل نہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتا ہوں، ایسا نہیں بلکہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں، محمد  
صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بڑے ریفا ر مرتھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی اصلاح کی، لیکن  
رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے، کیوں کہ صاحبو! کیا ان پر بھی کوئی فتویٰ نہیں لگانا چاہیے؟ کیا یہ  
صریح کفر نہیں؟ افسوس یہ ہے کہ ان کے تحت ایک مسلمان دیندار لڑکی ہے اور دھڑا دھڑپتے ہو رہے  
ہیں، اگر لڑکی کے گھر والوں سے کہیں کہ یہ نکاح باقی نہیں رہا اور لڑکی کو اس سے الگ کر لینا چاہیے، تو  
ابھی صاحب پر تلوار کھینچ لی جائے کہ ہم کو گالی دیتے ہیں.....!!

صاحبو! آج کل تو اس کی بھی ضرورت ہے اور میں بطور نصیحت اور خیر خواہی کہتا ہوں کہ جہاں  
دولہا کی صحت اور نسب اور حیثیت وغیرہ دیکھتے ہو، اللہ کے واسطے اور رسولوں کے واسطے اس کا اسلام  
بھی دیکھ لیا کرو، وہ زمانہ ٹھیک کہ دولہا کے صرف افعال دیکھے جاتے تھے کہ نمازی اور پرہیز گار بھی ہے  
یا نہیں؟ اب تو وہ زمانہ ہے کہ اگر یہی دیکھ لیا کرو تو بہت ہے کہ وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں؟ اور لڑکی  
مسلمان کے گھر جا رہی ہے یا کافر کے گھر؟ آج کل کے تعلیم یافتہ ایسے آزاد ہوئے ہیں کہ بہت  
سوں کا ایمان اور اسلام ہی باقی نہیں، یقیناً کافر ہیں! ان سے نکاح صحیح ہو ہی نہیں سکتا! ان کو بیٹی  
دینے سے چکلا میں بٹھا دینا بہتر ہے، کیوں نام نکاح کا کیا۔

## بعض لیڈروں کی حالت

بعضوں کو تو اس قدر اجنبیت ہوئی ہے اسلام سے کہ نام بھی مسلمانوں کا سا پسند نہیں کرتے اور  
اس کو زلت سمجھتے ہیں اور ایل یورپ کے سے نام رکھتے ہیں اور ایسوں کو لوگ قومی لیڈر کہتے ہیں اور  
ان کی تعریفیں کرتے ہیں کہ بڑے ہمدرد اور باجمیت ہیں، مسلمانوں کے اوپر انہوں نے جان و مال فدا  
کر رکھا ہے، آج کل کے لیڈروں میں جمیت تو ہے، مگر صرف قومی جمیت ہے، مذہبی نہیں، یہ کوشش بے  
شک کرتے ہیں کہ ایک جماعت قائم رہے جس کو اہل اسلام کہا جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان

ہوں بھی یا نہیں، بلکہ یہ لوگ مذہبی حیثیت کو جنون کہتے ہیں۔

لیڈر ان قوم کے قصے آپ نے سن لیے اگر ایسے لوگ بھی مسلمان ہیں تو دنیا میں کوئی بھی کافر نہیں، ان سے وہ کافر بدر جہا ایتھے جو کھلم کھلا اپنے آپ کو دوسری قوم میں شمار کرتے ہیں، ان سے اتنا ضرر مسلمانوں کو نہیں پہنچتا، کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے مخالف ہیں اور ان لوگوں کو اپنا موافق سمجھتے ہیں اور حقیقت میں ان کو اسلام سے کوئی علاقہ نہیں، یہ تو دشمن بصورت دوست ہیں، ان سے مسلمان ہر وقت دھوکہ کھا سکتے ہیں، ان سے وہ نقصان پہنچتا ہے جیسے ایک رئیس کو ریچھ سے پہنچا۔ ایک رئیس نے ریچھ پالا تھا اور تعلیم اس کو یہ دی تھی کہ یہ سویا کرتے تھے اور وہ مکھیاں اڑایا کرتا تھا، ایک دفعہ آقا صاحب لیٹے تھے اور بے خبر سو رہے تھے اور آقا صاحب کے محافظ تھے ہی اور اپنے معمول کے مطابق کھیاں اڑا رہے تھے بعض مکھی ضدن ہوتی ہے کہ جہاں سے اڑا جائے وہیں لوٹ لوٹ کر آتی ہے، مکھی نے محافظ صاحب کو دق کیا، یہ اڑا اڑتے اور وہ لوٹ لوٹ کر پھر منہ پر آ بیٹھتی تھی، بس ان کو غصہ آ گیا، جیسے ایک انبونی کا قصہ اس کی ناک پر ایک مکھی بارہا آ کر بیٹھتی تھی، اسے غصہ آ گیا اور لے کر استرا اپنی ناک اُزادی کے لے حرامزادی اب وہ اڑا ہی نہیں رہا، اب بیٹھ، کہاں بیٹھے گی؟ حالانکہ جب تو ایک مکھی تھی اب تو اس کی ساری برادری خون پر آئے گی!

غرض اس ریچھ کو غصہ آ گیا اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر لایا اور منتظر رہا کہ اب مکھی آئے تو اس کو پتھر سے ماروں گا، چنانچہ وہ مکھی آقا صاحب کے منہ پر حسب دستور آ کر بیٹھی، انہوں نے پوری قوت سے نشانہ صحیح کر کے پتھر مارا، مکھی تو اڑ کر الگ ہو گئی اور آقا صاحب کا سر پاش پاش ہو گیا۔ صاحبو! یہ ریچھ بھی خیر خواہ ہی تھا، قرآن تو یہ اس بات کی شہادت میں موجود ہیں کہ اس نے اس فعل میں کوئی بد نیتی نہیں کی، اپنے نزدیک تو آقا کی خیر خواہی اور خدمت ہی کی مگر ایسی خدمت سے خدا بچائے، اس کا تو کام ہی تمام ہو گیا۔

ایسی خیر خواہی آج کل اسلام کی ہو رہی ہے، کہ ہمدردان اسلام اور خیر خواہیاں قوم وہ تجویزیں کرتے ہیں کہ مسلمان کو ترقی ہو خواہ اسلام کا گلابی گھٹ جائے۔

## نماز پر اعتراض

ایک اخبار میں چھپا تھا کہ اسلام ایسا مذہب ہے جس کی طرف بہت لوگوں کا رجحان ہے مگر اس

میں نماز کی بیچ لگا رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے بہت لوگ اس میں آنے سے رکتے ہیں، اگر علماء نماز کو اس میں سے نکال دیں تو ہزاروں آدمی مشرف باسلام ہو جائیں اور مسلمانوں کی جماعت میں معقول اضافہ ہو جائے اور بہت زیادہ ترقی اسلام کی ہو، کیونکہ صاحب! وہ اسلام ہوگا؟ میں اس سے بھی بہل کر تکیب بتاؤں؟ وہ یہ ہے کہ سب قوموں کا نام مسلمان رکھ دیا جائے، خواہ وہ اس کو پسند کریں یا نہ کریں پس آج ہی کروڑوں کی تعداد کا اضافہ ہو جائے گا، دنیا میں کوئی قوم اور رہے گی ہی نہیں سب مسلمان ہی ہوں گے۔

صاحبو! یہ لیڈران قوم اور عقلاء کی رائے ہے، نہ معلوم عقل ان لوگوں کی کون لے گیا؟ ایک چیز کی ذاتیات اور ارکان موجود نہیں اور چیز موجود سمجھتے ہیں، کسی چیز پر حیوان ناطق تو صادق آتے ہیں اور انسان کو اس پر صادق سمجھتے ہیں، یا کسی کے سر کا ٹکڑا الگ پھینک دیا گیا، پاؤں الگ پھینک دیے گئے اور تمام جسم کی بوٹی بوٹی الگ پھینک دی گئی، مگر اس کل کو یہاں جی قائم سمجھ رہے ہیں، نہ معلوم یہ کون سی معقول کا مسئلہ ہے کہ وجود عدم کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے، دین کی ہر ہر چیز کو تو حذف کر ڈالا اور دین موجود اور مسلمان ہونے کے مدعی ہیں، مامورات میں سے کوئی چیز مامور نہیں مانتے، نماز کی ضرورت نہیں، اس کی حقیقت جسمانی ریاضت ہے، وہ اور طریقہ سے کر لی جاتی ہے، روزہ بے حیویت توڑنے کے لیے تھا، وہ اس زمانے میں رہی نہیں، کیونکہ تعلیم کا زمانہ ہے، اسی طرح حج زکوٰۃ وغیرہ سب کتر بیونت کر کے نثار کر دیا اور محرمات میں سے کسی چیز کو ممنوع نہیں سمجھتے، سود کی حرمت اڑادی، اس کا تو آج کل اتنا زور و شور ہے اور اس مسئلہ میں ایسی قابلیتیں دکھائی ہیں کہ حلال ہی کر کے چھوڑا ہے۔

غرض اجزائے دین کو سب کو الگ کر دیا ہے اور منافیات دین کو دین میں داخل کر لیا ہے اور خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں اور بچے مسلمان ہیں یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی اپنے کنبہ والوں اور دوستوں کو اپنے گھر سے نکال کر باہر کرے اور غیروں کو اور جانی دشمنوں کو گھر میں داخل کرے اور دیکھ کر خوش ہو رہا ہو اور خوشی خوشی لوگوں کو دکھا رہا ہو کہ دیکھو ہمارا گھر کیسا آباد ہے! ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ کیسا آباد ہے؟ جب کہ وہ تیری تکابوٹی کریں گے۔

### ایک بڑھیا اور شاہی باز

آج کل لیڈران قوم نے دین میں وہ تصرفات کیے ہیں اور ایسی خیر خواہی اس کے ساتھ کی ہے کہ جیسے کسی بڑھیا نے ایک شاہی باز کے ساتھ کی تھی، حکایت اس کی اس طرح ہے کہ شاہی باز اڑ

کریک بڑھیا کے یہاں جا بیٹھا، بڑھیا نے اس کو پکڑ لیا اور اس کی چونچ اور پنوں کو دیکھ کر بڑھیا آئی، دیکھا کہ چونچ ٹیڑھی ہے، ناخن کس قدر بڑھے ہوئے ہیں اور ٹیڑھے بھی ہیں اور اس کو گود میں لے کر رونا شروع کیا کہ ہائے پئے! تو کیسے زمین پر بیٹھتا ہوگا؟ تیری انگلیاں ٹیڑھی ہیں، ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں اور کھاتا کیسے ہوگا: کیونکہ چونچ بھی ٹیڑھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ توبے ماں باپ کا ہے، کوئی تیرا غور کرنے والا نہیں ہے، جو ناخن کاٹتا اور چونچ کو درست کرتا اور رحم و شفقت نے ایسا زور کیا کہ قینچی لے کر سب ناخن کاٹ دیے اور چونچ بھی تراش دی۔

اپنے نزدیک تو بڑھیا نے بڑی خیر خواہی اور ہمدردی کی، مگر خدا پچائے ایسی ہمدردی سے کہ اس کو بر باد ہی کر دیا، نہ وہ شکار پکڑنے کے کام کار ہا اور نہ کھانے کا۔

یہی خیر خواہی اسلام کے ساتھ آج کل کے ہمدردان اسلام کرتے ہیں کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول، نماز بھی زائد اور روزہ بھی زائد، زکوٰۃ کی حاجت نہیں، حج بھی فضول ہے اور پھر مسلمان ہونے کے مدعی! معلوم نہیں اسلام کس چیز کا نام ہے؟ گوٹ کا نام ہے یا پتوں کا نام ہے؟ جب اسلام کا ہر جز فضول ہے، تو کل بھی فضول ہے، اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے؟ ہم تو جائیں تم بھی فضول ہو، جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو، حج یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں، ایک پیسہ کا شکلیا کھا کر مر جاتے تو دنیا ایسے ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی۔

غرض اس گروہ نے (یعنی امراء نے) عجیب گت بنائی ہے دین کی درحقیقت یہ تو دین سے بالکل الگ ہیں، مگر نامہاد کے لیے دین کا ایک خلاصہ نکال لیا ہے اور اس کو دین کا لب لباب سمجھ کر خوش ہیں کہ وہ ہمارے پاس موجود ہے، لہذا ہم دین دار ہیں، وہ خلاصہ تہذیب اخلاق ہے، اس کو دین کا باطن کہتے ہیں اور خیال ہے کہ باطن ہی مقصود اعظم ہے، ظاہر کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے اس طرح دین کا باطن نکالا اور درویشوں نے اور طرح نکالا تھا، جس کو میں بیان کر چکا ہوں۔

غرض ان دونوں جماعتوں نے ظاہر کی ضرورت نہیں رکھی پس یہ حدیث اس پر رد کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ظاہر بھی مقصود اعظم ہے، کیونکہ حضور قلب کو شرط کیا دعا کے لیے چنانچہ فرماتے ہیں: ”ان اللہ لا يستجيب الدعاء عن قلب لاه“ یعنی اللہ بلا حضور قلب کے دعا قبول نہیں کرتا، یہاں دعا عمل ہے اور اس کے لیے شرط ٹھہرایا ہے حضور قلب کو اور ظاہر ہے (جیسا کہ میں اوپر بھی کہہ چکا ہوں کہ شرط میں حیث الشرط تابع ہوتی ہے) پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دعا ہے اور حضور قلب اس کے تابع ہے، اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصل مقصود عمل ظاہر ہے اور باطن اس کے لیے شرط اور اس کا تابع ہے، اس سے ان دونوں جماعتوں کے اس خیال پر رد ہو گیا کہ اصل مقصود باطن ہے، یہ تحقیق تو نسبت بین الظاہر والباطن کی حیثیت سے ہوئی، اب عقلی طور پر

کبھی کہ اس میں فلسفیانہ راز ہے وہ یہ کہ ہر چیز کی ترقی عمل سے ہوتی ہے، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو آج کل کے لوگ تہہ دل سے مانتے ہیں، کیونکہ ترقی کا مدار اسی پر ہے اور ترقی ہی ترقی کا آج کل ہر چہ طرف نقل ہے، سوسب کو معلوم ہوا کہ خیال باطن ہے اور عمل ظاہر اور ترقی صرف خیال سے نہیں ہوتی، چنانچہ لیکچروں میں برابر کہا جاتا ہے کہ ترقی کے لیے ہاتھ پیر ہلاؤ، صرف خیال سے کچھ نہ ہوگا، عمل کر کے دکھاؤ، عملی حالت بدلو، تب تو پستی سے نکل کر عمل کے میدان میں آؤ گے، اس کی بناء اسی بات پر تو ہوئی کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے، صرف خیال اس کے لیے کافی نہیں، گو یہ ضرور ہے کہ عمل اس خیال ہی سے پیدا ہوتا ہے اور خیال کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے کیونکہ اعضاء تابع ہوتے ہیں قلب کے اور قلب میں ایک بات مرتبہ خیال میں پیدا ہوتی ہے، تو اس کے بعد اس کا ظہور مرتبہ فعل میں اعضاء سے ہوتا ہے، کہاں ہیں مدعیان سائنس اور مدعیان تعلیم؟ ذرا اپنے سائنس ہی کے مسئلہ میں غور کریں کہ ہر فعل کے وجود کے لیے دونوں باتوں کی ضرورت ثابت ہوئی، خیال کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں باطن کہہ سکتے ہیں اور عمل کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں ظاہر کہا جاسکتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان دونوں میں سے کارآمد اصل چیز جس سے ثمرہ مرتب ہوتا ہے، وہ عمل ہے، یعنی ظاہر نہ کہ خیال باطن، گو بلا باطن کے وجود ظاہر نہیں ہو سکتا ہو، اس کی مثال پھل اور گٹھلی کی ہے، مثلاً آم ہے۔ آم کا پھل ہے نہ کہ گٹھلی، گو وجود پھل کا موقوف ہے، گٹھلی پر تو جس کو آم کھانا ہو اس کی گٹھلی سے بھی گریز نہیں ہو سکتا، بلکہ اول کام گٹھلی ہی سے پڑے گا مگر مقصود بالذات اور کام کی چیز پھل ہی ہے، جیسا کہ سب جانتے ہیں۔

## ظاہر و باطن

تو ان لوگوں کی مثال جو محض باطن کو مقصود و اعظم قرار دیتے ہیں اور ظاہر کو نہیں سمجھتے ایسی ہوگی کہ ایک شخص نے گٹھلیاں نوکرہ بھر کر جمع کر لی ہیں اور خوش ہو کہ ہمارے پاس آم ہیں اور ہم آم کھاتے ہیں اور جب کوئی اس پر اعتراض کرتا ہو تو جواب دیتا ہو کہ میاں اصلی چیز تو یہی ہے اس کے بغیر تو پھل کا وجود ہی نہیں ہو سکتا!

صاحبو! یہ دلیل تو ٹھیک ہے، مگر کیا کوئی اس کو اس دلیل کی رو سے آم کھانے والا کہہ سکتا ہے؟ حاشا وکلا! آم کی ان کو خوشبو بھی نہیں آئی اور بوجھوں سرے مفت تو اصل یہی ٹھہری کہ بڑا مقصود ظاہر ہی ہوا کہ وہ وجود میں موقوف ہو یا باطن ہو اور یہ یعنی سائنس کا وہی مسئلہ ہے کہ ترقی کا مدار عمل پر ہے، اگر خیال کافی نہیں، گو عمل کا وجود خیال ہی سے ہوتا ہے، ورنہ نرا خیال تو شخ چلی نے

بھی پکایا تھا اگر خیال سے ترقی ہو سکتی ہے تو شیخ چلی کو بڑی ترقی ہوتی اور اگر یہی ترقی ہے تو ایسے ترقی تو بہت سہل ہے، ہر شخص بے محنت و مشقت گھر میں بیٹھے حسب دلخواہ کر سکتا ہے۔

(الظاہر ص: ۳۵-۳۴)

## عمل کی ضرورت

صاحبو! خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی مقصود بلا مشقت اور بلا ہاتھ پیر ہلائے حاصل نہیں ہو سکتا، نہ دنیا کا نہ آخرت، اس مشقت ہی کا نام عمل ہے اور اسی کا ظاہر اور باطن نام صرف خیال کا ہے، اگر ظاہر کو اڑا دیا تو رہا کیا؟ صرف خیال! جو کچھ بھی کار آمد نہیں، جیسا کہ آپ کا سائنس بھی اور اس کو ثابت کرتا ہے اور آپ خود بھی مانتے ہیں کہ ترقی علم سے ہوتی ہے، نہ کہ صرف ارادوں اور ڈھکوسلوں سے پھر یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ نرا باطن کافی ہے اور ظاہر کی ضرورت نہیں.....؟؟

یہ عقلی ثبوت بھی ہو گیا کہ ظاہر کی ضرورت کا اور اس کے مقصود ہونے کا حدیث سے پہلے ثبوت ہو چکا اور اس حدیث کے علاوہ دوسرے نصوص بکثرت موجود ہیں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں اور وہ نصوص اس قدر ہیں کہ دنیا بھر ان کو جانتی ہے اور ہمارے مخاطبین کو بھی معلوم ہیں مگر انہوں نے ان میں ایک ترکیب چلائی ہے وہ یہ کہ ان کے معنی بدلے اور کہتے ہیں کہ ان کے معنی وہ نہیں جو مولوی لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں اور اپنے مذاق کے موافق کھینچ کھانچ کر معنی بیان کرتے ہیں، اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں، اہمالات یہ کہنا کافی ہے کہ آیا وہ معنی صحیح ہوں گے جو لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور اہل علم نے سمجھے ہیں یا وہ جو کسی ایک دو نے اختراع کر لیے؟ اب یہ دیکھ لیجئے کہ جب سے شریعت مقدسہ آئی اس وقت سے ان نصوص کے معنی کیا سمجھے گئے؟ اور تمام امت نے ظاہر کو ضرورت سمجھا یا نہیں؟ تمام کتابیں بھری پڑی ہیں، اعمال کی ضرورت سے اور ایک ایک عمل کی کیفیت اور اس کے اجزاء، ضروری اور غیر ضروری اور مہتمات و محسنات اور اس کے مفاسدات و مکروہات سب تفصیل کے ساتھ مدون ہیں، پھر اس بکھیرے کی کیا ضرورت تھی، اگر عمل کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا اس سب امت کی امت نے غلط معنی سمجھے؟ ظاہر ہے کہ ایک کے سمجھے ہوئے معنی غلط ہو سکتے ہیں، نہ کروڑوں کے کے سمجھے ہوئے خوب سمجھ لیجئے کہ یہ الحاد ہے اور ہریت ہے اور زندگی ہے اور شریعت کا انکار ہے جو اس کا مرتکب ہے وہ بے شک باطل پر ہے، خواہ اپنے زعم میں تعلیم یافتہ ہو اور بندار ہو اور مقتدا ہو اور عقل مند ہو اور کچھ بھی ہو اور یہ عمل ترک تعطل ہے اور یہ نفس کا دھوکہ ہے اور انجام اس کا حسرت ہوگا، جس کے اعمال صحیح نہیں وہ کسی شمار میں بھی نہیں اور یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ نہ کفر کے ساتھ خدا تک رسائی ہو سکتی ہے نہ فسق کے ساتھ، خدا تک

رسائی طاعت کے ساتھ ہوتی ہے اور طاعت نام ہے عمل کا جس میں باطن کے ظاہر بھی آ گیا ہے  
میں عمل نہیں وہ خدا رسیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔  
(ایضاً صفحہ: ۳۵، ۳۶)

## چھالیسواں اعتراض..... طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا سراسر حماقت ہے!

عقلاء میں اب تک اختلاف ہے کہ عقل جو ہر مجرود ہے یا جو ہر مادی ہے؟ اور یہ نفس ناطقہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے؟ یہ عقل کا علم ہے، پھر اس کو احکام خداوندی میں مزاحمت کا کیا حق ہے؟ جو لوگ عقل کے بہت قبیح ہیں وہ ہر وقت بڑے پریشان ہیں ہر چیز کی لم دریافت کرنا چاہتے ہیں، مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے اور کوئی بات نہیں بنتی اور جہاں کچھ اسباب و علل معلوم بھی ہو جاتے ہیں وہ بھی تخمیناً اور انکل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، پرسوں آندھی آئی تھی، میں کہہ رہا تھا کہ عقلاء کے نزدیک اس کے بھی کچھ اسباب ہیں تو لوگ ان اسباب میں تصرف کر کے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں، آندھی کے اسباب میں ذرا تصرف کر کے دکھائیں! دو حال سے خالی نہیں یا تو اسباب اختیاری یا غیر اختیاری، اگر اختیاری ہیں اور یہ قابل تصرف نہیں تو معلوم ہوا کہ آندھی کا آنا اور اس کا روکنا کسی کے اختیار میں نہیں، تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں؟ موصد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے حکم سے آندھی آتی ہے اسی طرح زلزلہ آتا ہے، اس کے لیے بھی ان کے نزدیک کچھ اسباب ہیں تو ذرا ان اسباب میں تصرف کر کے زلزلہ کو روک تو دیں، جن چیزوں کا ان کو تجربہ سے علم بھی ہو چکا ہے، ان کے بعد لم معلوم نہیں، مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے متناطیسیت کی خاص جذب زائل ہو جاتی ہے، ذرا اس کی لم مجھے کوئی بتلاوے کہ آخر زلزلہ میں اور متناطیسیت کی قوت میں تعلق کیا ہے؟ زلزلہ سے اس کی قوت جذب کیوں زائل ہو جاتی ہے؟ کوئی شخص اس کی لم بیان نہیں کر سکتا! باقی انکل چچو بات گھڑ دینا تو ہر ایک کو آسان ہے، لم تو وہ ہے جس کو دل میں قبول کر لے، ورنہ گھر گھر کر بیان کر دینا کیا مشکل ہے؟ مگر وہ ایسی ہی لم ہوگی جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ وہ دھوپ میں سیاہی دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا، اس لیے جہاں دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہو گیا اور جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہو گیا، بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پر کا تھی کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ دھوپ سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹتا تھا کہ بدن پر گول گول ہی نشانات پڑیں! کوئی نشان مربع، یا مستطیل، مثلث، یا مکعب نہ ہو! کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ



سکتی ہے؟ چیتا کیا ہوا بڑا ماہر انجینئر ہوا، مگر احمقانہ وجوہ پر یہ لوگ خوش ہیں کہ ہم نے تو بوجہ ایمان کر دی، چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو جیسے ایک شخص نے جاٹ سے کہا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولہوش نے کہا واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں! کہنے لگا: قافیہ نہ سہی بوجہ میں تو مرے گا ہی! ان کی وجہ ہوتی ہے کہ چاہے جوڑ نہ ہو مگر وجہ ہوتی چاہیے یہ ساری خرابی ہے طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی وجہ سے کیونکہ یہ لوگ تو یہ کہہ نہیں سکتے کہ یہ نشانات طبیعت نے بلا واسطہ بنا دیے ہیں، کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ کس طرح افعال مختلفہ بناتی، اس لیے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں، پھر انکل بچوں اسباب گھڑ نکالتے ہیں اور موصد کو کسی جگہ انکا وہ نہیں وہ بڑا بے فکر ہے جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے کہ خدا نے یونہی بنانا چاہا تھا بنا دیا اور گو وہ واحد حقیقی ہے، مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہو گیا، اس لیے: ”الواحد لا یصدر عنہ الواحد“ کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ یہ حکم علت موجبہ میں ہے، حق تعالیٰ ایجاب سے منزہ ہیں اور طبیعت میں ارادہ ہی نہیں، وہ علت موجبہ ہی ہوگی، اس لیے اس کی طرف افعال کی نسبت نہیں کر سکتے، ہائے! کیسے ذی شعور کو فاعل مانا اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی نہ الٹی نہ سیدھی نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ میں آتا ہے تو وہاں بھی ظالم خدا کو واحد فاعل نہیں مانتے، بلکہ ان مواقع کے لیے بخت و اتفاق کو گھڑ لیا ہے، مگر یہ محض نام ہی نام ہے: ”اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوَهَا اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ“

### صرف عقل پر اعتقاد کا انجام

کوئی ان سے پوچھے بخت و اتفاق ہے کیا بلا؟ اس میں فاعلیت کی قوت کہاں سے آگئی؟ اور یہ کیوں کر سبب بن گیا؟ بس اس کا کچھ جواب نہیں

یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں، موجد کیسے چین میں ہے کہ اس کو ایسی دور از کار باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں، وہ کہتا ہے کہ سب کا فاعل خدا ہے، اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا کر دیا اور اس کو طبیعت کی ضرورت ہے، نہ بخت و اتفاق کی اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے، وہاں وہ کہتا ہے کہ اسباب مؤثر بالذات نہیں ہیں، بلکہ یا مؤثر بربا بنانے والے ہیں، جیسا کہ ایک قول ہے اور یا مؤثر ہی نہیں بلکہ محض علامات ہیں، جیسا کہ ایک قول ہے، جیسے جھنڈی کا پلناریل کے چلنے کی محض علامت ہے، مؤثر بالذات حق تعالیٰ ہیں، اگر وہ ارادہ کریں تو سارے اسباب بیکار پڑے رہیں، جیسے ڈرائیور گاڑی کو روکنا نہ چاہے تو

ہزاروں سرخ جھنڈیا بیکار ہوتی ہیں، بتلائیے ایہ شخص چین میں ہے، یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو قاتل مانتا ہے کبھی طبیعت کو، کبھی بخت و اتفاق کو؟ موحدان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے:

اربنا واحداً الف رب  
ادیبنا اذا قسمت الامور  
ترکت اللات والعزی جمیعاً  
کذا لک یفعل الرجل جمیعاً

وہ ان سب لات اور عزنی پر لات مارتا ہے اور ایک خدا کو قاتل مانتا ہے اور اسباب پرستوں سے کہتا ہے کہ تم ایک خدا کو چھوڑ کر کہا مارے مارے پھرتے ہو؟ چھوڑو ان خرافات کو اور یہ مذہب اختیار کرو۔

مصلحت دیدمن آنت کہ یاران ہمہ کار  
بگزارند و خم طرہ یاری گیرند  
اور مولانا جامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

خلیل آسا در ملک یقین زن  
نوائے لا حب الاقلین زن

کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اسباب اس کے قبضہ میں ہیں۔

خاک و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

واقعی موحد سے بڑھ کر کوئی چین میں نہیں، پھر مشرکین کے بعد معبود ایسے ہیں کہ ان میں باہم رقابت ہے، وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں، کہیں وہ یہ معلوم کر کے دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے کہ ناخوش نہ ہو جائے۔ (تفصیل الاختلاط مع الانام صفحہ: ۲۲ تا ۱۹)

خدا کے منکر

آج کل کے حکماء تو ایسے بد تہذیب ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں، اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک چیرا سی اپنے افسر سے تنخواہ لیتا ہو، مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی افسر نہیں نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے، بلکہ زمین سے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر میرے ہاتھ میں آ جاتے ہیں۔

”رسالہ حمید یہ“ میں موصد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پیرائے میں خوب لکھی ہے کہ ایک موصد اور ایک دہری کسی جزیرے میں گئے وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت منظم بنا ہوا دیکھا، جس میں ایک طرف کھانے کا کمرہ ہے جو فرش فروش اور آئینوں سے سجا ہوا ایک طرف سونے کا کمرہ جس میں عمدہ عمدہ مسہریاں بچھی ہوئی اور سقئی پتکھے لگے ہوئے ہیں، ہر کمرہ میں ہوا کے لیے روشندان بنے ہوئے ہیں، ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینہ سے لگائے گئے ہیں، ایک طرف حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے، موصد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی صنّاع اور بہت ہی ماہر تھا جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا، دہری نے کہا اس کا بنانے والا کوئی نہیں بلکہ عرصہ دراز سے بارش ہونے کی وجہ سے زمیں کی مٹی جم گئی، پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں، پھر ہوا سے اڑا کر وہ اینٹیں اس جگہ جمع ہو گئیں، پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا اس طرح دیواریں بن گئیں، پھر پہاڑوں سے پتھر گرے اور ہوانے ان کو اڑا کر یہاں کھڑا کر دیا اس سے ستون بن گئے، پھر درختوں کی لکڑیاں ہوا سے ٹوٹ گئیں، وہ اڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہو گئیں اس طرح اس نے سارے مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کر دیا میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتلائیے ان میں سے گلہا کون ہے اور آدمی کون ہے؟ یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے کہ خود بخود تیار ہو گیا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جو لوگ آسمان و زمین کی اتنی بڑی عجیب و غریب عمارتوں کو کسی صنّاع کی بنائی ہوئی نہیں مانتے بلکہ از خود تیار مانتے ہیں وہ یہ تو ف ہیں یا نہیں؟ تو یونان کی حکمت اس حکمت سے بھر بھی اچھی تھی وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے اور اہل سائنس تو غضب کرتے ہیں خدا کے بھی منکر ہیں اور سائنس والوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں یہ ان کی محض وضع داری ہے، ورنہ ان کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے؟ وہ کہے کہ ہاں! دیکھا ہے، اس کے ایک سونڈھی اور ذرا سا سر تھا اور آنکھیں نہیں تھیں، تو پہلا شخص یہ اوصاف سن کر کہے گا کہ کجنت تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا، نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے، بادشاہ تو ایسا بد صورت نہیں ہے۔

### سائنسدانوں کا حال

یہی حال ان سائنسدان مسلمانوں کا ہے جو خدا کے قائل ہیں، مگر اس کے کمالات کے منکر ہیں جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے: ”یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید“ مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ

بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت کے سپرد سارا کام کر دیا ہے اب جو ہوتا ہے اسباب طبعیہ سے ہوتا ہے، خدا تعالیٰ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں، گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھردی ہے، اب اس کے چلنے میں فزاخاں اور بال کمائی کی طاقت کو دخل ہے، خدا کو کچھ دخل نہیں، اسی لیے یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نار کے گلزار ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ آگ بھلا کیونکر ٹھنڈی ہوگئی؟ یہ تو قانون طبیعت کے خلاف ہے، بھلا بنی اسرائیل پر پہاڑ کیونکر معلق ہو گیا؟ اور ایک ذرا سے پتھروں میں سے بارہ چشمے کیونکر بہنے لگے؟ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے، ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا۔

موجود کہتا ہے کہ نہ معلوم تم کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو؟ خدا تو ایسا عاجز نہیں! اس کی تو شان یہ ہے کہ پتہ بھی اس کے حکم و ارادہ کے خلاف نہیں مل سکتا اور اگر وہ چاہے تو تمام عناصر کی خاصیت کو دم بھر میں بدل دے۔

پھر ان اوصاف کے ساتھ ان کا یہ کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں، ویسا ہی ہے جیسا کہ اس شخص نے کہا تھا کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے، اس کے ایک سو نڈتھی اور آنکھیں ندر اندر تھی، مگر بائیں ہمہ ان کو کافر نہ کہیں گے، کیونکہ ان کے اقوال سے صرف خدا کا انکار لازم آیا ہے، التزامی نہیں پایا گیا اور لو لازم کفر، کفر نہیں، التزام کفر، کفر ہے، اس لیے ہم ایسے مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔

ایک اور مزے کی بات سنئے! جب اہل سائنس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ اسباب طبعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہونا تو ان کو مسلم نہیں یہ تو انسان کی عقل سے بعید ہے تو ڈارون کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندر ہے، بندر ترقی کر کے انسان بن گیا، اس کا نام ”مسئلہ ارتقاء“ ہے اس پتیارے کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندر ہی نظر آیا جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے، میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں، اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے، اس لیے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے، وہ بندر ہی کی نسل سے ہوگا اور ہم کو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں، تو تم اس بات کا انکار کیوں کرتے ہو؟ وہ پتیارہ تو اپنا نسب بتلا رہا ہے! تمہارے نسب تو ٹھوڑا ہی بتلا رہا ہے! اور جس دن وہ ہمارا بتلا دے گا ہم کہہ دیں گے ”صاحب البیت ادری بما فیہ“ گھر والوں کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ہمارے نسب کی خبر تجھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہو سکتی، ہمارے پاس اپنا شجرہ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے تجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہاں تیرے پاس شجرہ نسب محفوظ نہ ہو تو تجھے اختیار ہے، جس سے چاہے اپنا نسب

ملا لے۔ (مجمول النسب یہ نہ کرے تو اور کیا کرتے؟ جامع)  
یہ ساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی، خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھٹتے  
یہ ان سائنس والوں کا حال تھا، جو خدا کے منکر ہیں، اب ان سائنس والوں کا حال سینے جو برائے  
نام خدا کے قائم ہیں۔

### ایک صاحب علم کا قصہ

ان میں سے ایک صاحب علم کا قصہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں حضرت آدم  
علیہ السلام کا قصہ ڈارون کی تحقیق سے متصادم ہے تو وہ بولے شاید وہ پہلا بندر جس نے انسان کی  
طرف سے پہلے ترقی کی ہے (نعوذ باللہ) حضرت آدم علیہ السلام ہی ہوں، استغفر اللہ! استغفر اللہ!  
میرے تو روٹنے کھڑے ہوتے ہیں، اس بات کی نقل سے اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ اپنے  
آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل بتلاتے ہیں، یہ محض وضع واری ہے، ورنہ حقیقت میں یہ خدا  
کے قائل نہیں، بھلا ڈارون کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فاعل نہیں مانتا،  
طبیعت کو فاعل مانتا اور طبیعت دفعہ ترقی نہیں کر سکتی، تدریجاً ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسطہ  
یعنی عناصر کی صورت اختیار کی، پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی، پھر  
اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان  
کی صورت اختیار کر لی، مگر وہ جو شخص خدا کو فاعل مانتا ہو، اس کو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر  
کیا؟ اس کے نزدیک اس میں کیا استحالہ ہے کہ خدا تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے کو مٹی اور  
پانی سے بنا کر دفعہ اس کو انسان بنا دیں، اس ظالم کو ڈارون کی تقلید پر کس بات نے مجبور کیا کہ وہ  
خواہ نواہ ایک نبی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے؟؟

پھر اس میں علاوہ توہین نبی کے یہ خرابی ہے کہ یہ تاویل ڈارون کے قول پر بھی غلط ہے، کیونکہ  
ڈارون اس کا قائل نہیں ہے کہ دنیا میں بس ایک بندر ترقی کر کے انسان ہوا جو جس کی نسل میں یہ  
سب انسان ہیں وہ کہتا ہے کہ جس وقت بندر کی طبیعت نے ترقی کی ہے تو ایک خاص وقت ہر جگہ  
ہزاروں لاکھوں بندر آدمی بن گئے اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں تو اس شخص نے ڈارون کی تقلید  
میں قرآن کے اندر تحریف کی اور وہ تحریف بھی ڈارون کے یہاں قبول نہیں تو ادھر سے بھی گئے،  
ادھر سے بھی گئے۔

نہ خدا ہی ملا نہ دصال صنم!

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں؟ موحد کو ایک خدا سے تعلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا واسطہ علاقہ ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غلطی نہیں ہو سکتی، آپ کی شان یہ ہے:

گفتہ او گفتہ اللہ بود  
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

## موحد کا حال

اس موحد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو؟ وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں۔ موحد کہتا ہے کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے، خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر کے انسان بنا دیا، اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندر یا سور سے ملائے۔  
تو خدا کے فاعل بنانے میں کسی راحت ہے کہ جھگڑوں سے نجات ہوگی۔

یہ تو علمی راحت ہے اور دنیوی حسی راحت یہ ہے کہ حوادث و مصائب میں موحد مستقل و مطمئن ہوتا ہے، وہ کہتا ہے: "قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ" کہ تم وہی پیش آوے گا جو خدا نے مقدر کر دیا ہے، اس کے خلاف ہرگز پیش نہیں آ سکتا اور حق تعالیٰ ہمارے آقا اور مولیٰ ہیں، ان کی طرف سے جو کچھ پیش آئے گا اس میں رحمت و حکمت ہی ہوگی، اس لیے خدا تعالیٰ ہی پر بھروسہ مسلمان کو کرنا چاہیے۔

بتلائیے! جس کا یہ اعتقاد ہو وہ مصائب میں کب پریشان ہو سکتا ہے؟ اور بلخ پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد ہی نہیں رہتی، کیونکہ اس کو اسباب پر اعتماد تھا اور اسباب اس کے مخالف، تو اب اس کے پاس کوئی سہارا نہیں اور موحد کو خدا پر اعتماد ہے اور خدا کو وہ اپنا مخالف نہیں سمجھتا بلکہ مولیٰ اور آقا سمجھتا ہے، اس کو اسباب کے مخالف ہو جانے پر بھی یہ امید ہے کہ شاید حق تعالیٰ اسباب مخالف کو موافق بنا دیں اور اگر اسباب مخالف ہی رہے اور اس کو ناکامی بھی ہو جائے تب بھی وہ راضی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی طرف جو بات بھی آتی ہے، اس میں خیر ہی ہوتی ہے۔ پس اس صورت میں اگر دنیا کا ضرر ہو تو میری آخرت کی ترقی ہوگی: "قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسَيْنَيْنِ" موحد کے لیے مصائب میں بھی فائدہ ہی ہے اور تکلیف سے بھی خوش ہوتا ہے، جیسے بچہ دودھ چھوٹنے کے وقت گوپریشان ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے، مگر بعد میں ماں کو دعا دیتا ہے:

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی

مرا باجان جاں ہمزاد کردی

وہ کہتا ہے کہ اس ماں کا خدا بھلا کرے جس نے دودھ چھڑا کر مجھے اس قابل کر دیا کہ آج میں پلاؤ  
زردہ، تورم اور کباب کھا رہا ہوں، اگر دودھ ہی پیتا رہتا تو یہ نفیس و لذیذ غذا نہیں کیونکر کھاتا!  
اسی طرح موحّد کو مصیبت کے وقت گونا گویا ہر میں تکلیف ہوتی ہے، مگر تکلیف کے بعد جب اپنی  
ترقی کا احساس ہوتا ہے تو وہ خوش ہو کر یوں کہتا ہے:

ناخوش تو خوش بود بر جان من!

دل فدائے یار دل کہ نجان من!

اور موحّد عارف کو تو عین مصیبت کے وقت اس کی حکمتیں اور اپنی ترقی محسوس ہوتی ہے اس لیے  
وہ تکلیف بھی لذیذ ہو جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر مصیبت لوگوں کی نظر میں ”موت“ ہے یہ منتہی  
المصاب ہے کہ وہ تمام مصائب کا انتہائی درجہ ہے اور اسی کے اندیشہ سے آدمی تمام مصائب سے  
گھبراتا ہے، مگر عارف موحّد کے نزدیک ریزہ ریزہ کا پیا لہ بھی شیریں ہے وہ کہتا ہے:

خرم آں روز گزیر منزل ویراں برم

راحت جاں طلیم و زپے جانان برم

نذر کردم کہ گر آید بسر این غم روزے

تادر میکده شاداں وغزل خواں برم

(ایضاً صفحہ: ۲۳۳ تا ۳۰۱ ملخصاً)

## سینتالیسواں اعتراض..... مولوی لوگوں کو کافر بتاتے ہیں!

یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی لوگوں کو کافر بناتے ہیں۔ میں اس کے جواب میں کہتا  
ہوں کہ مولوی بنانا نہیں بلکہ کافر بنانا ہے، یعنی جو شخص حرکتوں سے کافر بن جاتا ہے، مولوی  
اس کے کفر کو ظاہر کر دیتے ہیں، جیسے کسی کے کپڑے میں پاخانہ لگا ہوا ہو اور دوسرا شخص اس سے کہہ  
دے کہ آپ کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے، اس کو دھو لیجئے۔ تو کہئے! اس نے پاخانہ لگایا یا  
پاخانہ لگا ہوا بتایا۔ پس آپ کا مولویوں پر جھلانا ایسا ہی ہے جیسا وہ شخص جس کے کپڑے میں پاخانہ  
لگ رہا ہے، بتلانے والے کو دھمکانے لگے، واہ! صاحب تم ہمارے لباس میں پاخانہ لگاتے ہو،  
وہ کہے گا بیوقوف! میں نے لگایا نہیں، نہ میرے پاس پاخانہ موجود ہے جو میں لگاتا، تو نے خود اپنی

بے احتیاطی سے کہیں سے لگا لیا ہے، میں نے تو تجھے اطلاع کر دی ہے۔ کہتے! ان دونوں میں کون حق پر ہے؟ دیکھو کافر بنانا تو یہ ہے کہ کسی کو کفر کی تلقین کی جائے، جیسے مسلمان بنانا یہ ہے کہ کسی کو اسلام کی تلقین کی جائے، تو جس طرح ہم کافروں کو اسلام کی تلقین کر کے مسلمان بناتے ہیں، کیا اسی طرح کسی مسلمان کو تلقین کفر کرتے ہوئے آپ نے کسی مولوی کو دیکھا؟ کبھی نہ دیکھا ہوگا؟ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مولوی کافر بناتے ہیں، بلکہ یوں کہو وہ کافر بناتے ہیں۔

(تقلیل الاختلاط مع الامام صفی: ۲۶)

اڑتا لیسواں اعتراض..... عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے، جتنی

شریعت خیر خواہ ہے!

آج کل ہر بات میں عقل پرستی کا دور ہے، ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لیے حکم بنایا جاتا ہے، حتیٰ کہ شریعات میں بھی اور شریعات میں سے معاد میں بھی اور پھر عقل کون سی؟ وہ جو دنیا کے معاملات میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے، تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ہے، ایسے عظیم فیصلہ کے لیے اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا، لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں، جتنا شریعت خیر خواہ ہے، دیکھئے! اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دو! ما ضروری ہو، ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو، جیسا کہ ایک بزرگ غلبہ میں فرماتے ہیں:

ہر آنکہ غافل از حق یک زمان است

در آل دم کافر است اما منہاں است

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے، یعنی مؤمن کامل کے مقابل اور کامل بھی کیسا ہو؟ جو اکملیت کے درجے میں پہنچا ہوا ہو، کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں اور ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک اکمل کا اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مؤمن اکمل ہے، اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد حق میں غفلت کرے اسے اضافتا کافر کہہ دیا ہے، اس سے حقیقی اور فقہی کافر مراد نہیں۔ غرض غلبہ حال کا جو اقتضا ہے کہ استحضار دو! ما ہو عقل کا بھی وہی اقتضا ہے تو اگر شریعت مقدسہ ہوتی اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ سب کو عاصی قرار دیتی، شریعت مقدسہ نے رحمت فرمائی کہ آپ کے



ذہول کو اجازت دے دی اور عدم تصدق کو بھی جب کہ تکذیب نہ ہو تصدق کا قائم مقام قرار دیا جا  
بتائیے! عقل زیادہ خیر خواہ ہوئی یا شریعت مقدسہ؟ یہ ان عقل پرستوں کو خطاب تھا جس پر سائنس کا  
غلبہ ہے اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں۔

(آثار العبادۃ صفحہ: ۶)

## انتچا سوال اعتراض..... کفار کا مال دبا لینا حلال نہیں ہے!

آج کل اجتہاد کا زور ہے حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں، خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا،  
تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدون  
طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا، لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے اور پھر شاید اس استدلال سے متفق  
ہو کر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں گے کہ وہ مسلمان کی نہیں ہے، غیر مسلم اس کے مالک ہیں،  
خواہ اس کے پاس شھیکہ ہے اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ  
سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔

یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے، یا نہیں؟ مگر  
بہت بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً  
کچھ جرم نہیں، خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم کا مال جبراً  
لینے کو منع فرمایا ہے۔

اس کا جواب ظاہر تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتہ مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے  
پڑتا ہے، ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی حلال نہیں، چنانچہ بعض احادیث  
وعدید میں ”الرحل یقطع مال الرحل“ آیا ہے۔

(رواہ الترغیب عن الحاکم وقال صحیح علی شرطہا)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر ذمی اور کافر مسلم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان  
کے ہے ”لہم ما لنا وعلینا“ البتہ کافر محارب کا مال مباح ہے، مگر وہاں بھی فریب اور  
عذر جائز نہیں اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس  
سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔ چنانچہ مولانا رحمہ  
اللہ نے فرمایا کہ بھئی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے، کافر کا نہ رکھے، کیونکہ قیامت  
میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی، تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز، روزہ ظالم کا اس کے

بھائی ہی کو ملے گا، خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پر اے گھر، پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا، کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا، اگر کوئی کہے کہ پھر اسے کیا نفع ہوا؟ جب نیکیاں اس کے کارآمد نہ ہوئیں، جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا، جیسے کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چر لیا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی، لیکن اس سے کوئی عاقل اور عادل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سچا لیا کرو، مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہ ہو اور اگر کوئی یہ کہہ کر ملادے کہ ایک من میں ایک لونا کیا معلوم ہوگا؟ تو کیا یہ جرم نہیں؟ یقیناً جرم ہے! اگر اطلاع ہو جائے تو ضرور سزا ہوگی، مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے، مگر عدم احساس سے بظلمانے تو لازم نہیں آتا، اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو، مگر سزا میں کچھ تخفیف ہوگئی ہو تو اس سے نفع کا بظلمانے لازم نہیں آتا، اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی، گو اسے خفت کا احساس نہ ہو۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے ”لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ“ کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہ کی جاوے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی، یہ تعارض ہوا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو، باقی یہ مطلب آیت کا نہیں کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا، کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں اور بعضے ایسے نہیں، اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں، یہ نہیں کہ فرعون اور شداد اور نمرود کے برابر اس کافر کو بھی عذاب ہوگا جو غریب مسکین مظلوم تھا، تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں، اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا کسی کو اس کا ضعف ہوگا اور کسی کو ضعفین اور یہ سب فرق قرآن میں آیا ہے، البتہ جس کے لیے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائے گا، پھر اس میں کمی نہ ہوگی اور یہ دوسرا جواب ہے، پس مطلق خفت کی کمی نہیں ہے، بلکہ عذاب مجوز میں خفت کی کمی ہے۔

بہر حال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔

اب تیسرا جواب سنئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی

مسلمان کسی کا فر کو نقصان پہنچائے گا اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کرے گا، یہ تو عام طور پر اس وقت لوگوں کا خیال یہ تھا:

خانہ دوستاں بردب و در دشمنان مکوب“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس سے بھی روک دیا جس سے اب خانہ دوستاں بردب کی بھی گنجائش نہ رہی، اس کی اس لیے تشریح کر دی کہ شاید اس قول سے ظاہر پر عمل کرنے لگے، اب ایسے شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اس کے گھر سے لائے ہیں، وہ بھی اور جو آپ کا ہے، وہ بھی سب لے جائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑے گا؟ اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے۔ (اسرار العبادہ صفحہ ۱۶۰)

پچاسواں اعتراض..... تقدیر پر اعتقاد رکھنے سے دنیا میں راحت رہتی

ہے اور انکار سے پریشانی بڑھتی ہے!

اعتقاد اور تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں راحت رہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہو کرے بلکہ یہ سمجھیں کہ تقدیر میں یوں ہی تھا، صبر و شکر سے کام لیا کریں، اب دیکھ لیں کہ اعتقاد تقدیر کا یہ اثر ہمارے اندر کتنا ہے؟ سو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہم مصائب و حوادث میں ضعف قلب اور قلت اعتقاد کی وجہ سے ایسے ہی پریشان ہو جاتے ہیں جیسا ایک دہری یا منکر تقدیر پریشان ہوتا ہے۔

صاحبو! اگر تقدیر پر کامل اعتقاد ہے تو اس کا اثر ظاہر میں بھی تو کچھ ہونا چاہیے، یاد رکھو! محض زبان سے اتنا کہہ دینا تو آسان ہے کہ ہم کو تقدیر پر اعتقاد ہے، مگر امتحان کے وقت ہر شخص کی قلعی کھل جاتی ہے اور امتحان کا وقت یہی ہے جب کہ مصائب و حوادث کا نزول ہو رہا ہو اور کسی کی قلعی بھی نہ کھلے تب بھی حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے، وہاں تو کوئی حیلہ نہیں چل سکتا۔

خلق را گیرم کہ بفرجی تمام  
در غلط ازی تا ہر خاص و عام  
کار با باخلق آری جملہ راست  
با خدا تزویر و حیلہ کہ رواست  
کار با او راست باید داشتن  
راست اخلاص و صدق افزاشتن

صاحبو! یہ شخص سچ مچ تقدیر کا معتقد ہے اس کو رنج و غم کبھی نہیں ہوتا اور جو کبھی کبھی آپ ان کو مصائب میں دیکھتے ہیں یہ نظر بد سے بچانے کے لیے صورت رنج و غم ہے، جس کو مولانا فرماتے ہیں:

دل بھی گوید ازد رنجیدہ ام  
و ز نفاق ست او خندہ ام

ان کو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرچوں کو کھانے والوں کو کلفت ہوتی ہے کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں، مگر دل میں ہنس رہا ہے اور مزے لے لے کر کھا رہا ہے، ان کو اس میں ایسی لذت آتی ہے کہ سلطنت کے بدلے میں بھی اپنی تنگ نظری اور فقر و فاقہ وغیرہ کو دینا نہیں چاہتے۔

### ایک بزرگ کی حکایت

چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک شہر کے دروازے پر پہنچے، دیکھا کہ شہر پناہ کا دروازہ بند ہے، لوگوں سے پوچھا کہ دن میں دروازہ کیوں بند کیا گیا؟ کیا کسی دشمن کا خطرہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں! بلکہ بادشاہ کا بازار لگا گیا ہے، اس لیے دروازہ بند کروایا، کہیں دروازہ سے نکل نہ جائے، یہ سن کر آپ بہت ہنسے اور سمجھ گئے کہ بادشاہ محض احمق ہے، بھلا بازار کو دروازہ سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو اوپر سے بھی جاسکتا ہے، اس کے بعد آپ نے بطور ناز کے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ سبحان اللہ! یہ تو اتنا احمق ہے اور اس کو بادشاہ بنا دیا اور ہم ایسے عاقل اور عارف اور ہماری یہ حالت ہے کہ بیہوش میں جوتی بھی سالم نہیں، بدن پر کپڑے بھی درست نہیں، ان بزرگ کا مقام اولال کا تھا، مگر ناز ہر وقت نہیں چلتا، کیونکہ کبھی وہ بھی ناز کرنے لگتے ہیں، یہ کیا کہ تم ناز کرو اور وہ کبھی نہ کریں! چنانچہ ارشاد ہوا بہت اچھا! کیا تم اس پر راضی ہو کہ اس بادشاہ کی حماقت و جہالت مع سلطنت کے تم کو دے دی جائے اور تمہاری معرفت و محبت مع فقر و تنگدستی و خستہ حالی اس کو دے دی جائے؟ یہ جواب سن کر وہ بزرگ کا نب اٹھے اور فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ میں اس گستاخی سے توبہ کرتا ہوں اور اس تبادلہ پر ہرگز راضی نہیں۔

تو حضرت وہ ایسا دے کہ اگر کوئی ان کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر ان پر ترس کھائے اور اس سے نجات اور سکون کی دعا کرے کہ خدا تم کو اس غم سے نجات دے تو وہ یوں کہتے ہیں:

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آب حیات  
ضاعت اللہ بہ کل زبان عطشی

## مجنون کا حال

اور کیوں نہ ہو یہ تو محبوب حقیقی کے عاشق ہیں، مجنون نے تو ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت کے غم سے بھی نجات نہیں جاتی، جب اس کا عشق مشتہر ہوا اور سوز و گداز سے کھانا پینا متروک ہو گیا اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا، تو اس کا باپ اس کو مکہ معظمہ میں لایا اور کہا:

”بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر خدا سے دعا کر کہ لیکن کی محبت میرے دل سے نکال دے، تو اس نے رو کر کہا:

يَا رَبِّ لَا تَسْلُبْنِي حَبِيهَا اَيُّهَا

وَبِرَحْمِ اللّٰهِ عَيْدًا قَالِ امِيْنَا

اور کہا:

الَّتِي تَبْتَ مِنْ كُلِّ الْمَعَاصِي

وَلَكِنْ حَسْبُ لِيْ اِلَّا تَوْبُ

تو جب ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت میں غم لہذا ہو جاتا ہے، تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت نہ تو لیا عجیب ہے؟ اب اس کو غم کہنا ہی غلط ہے وہ واقع میں غم نہیں محض صورت غم ہے، اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا، یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا، یا اس کا دنیاوی نقصان نہیں ہوتا، یہ سب کچھ اسے پیش آتا ہے اور اس سے کلفت بھی اس کو ہوتی ہے، مگر پریشانی اور حقیقی غم نہیں ہوتا، کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو اور کلفت کہتے ہیں، الم دکھن کو، اہل اللہ کو مصائب میں الم ہوتا ہے، مگر گھٹن نہیں ہوتی، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم میں نشتر لگائے اس وقت تم کو الم تو ہوگا، مگر رنج و غم نہ ہوگا، گو ظاہر میں ہائے بھی کرو گے، مگر دل اندر سے خوش ہوگا اور اس الم پر راضی ہوگا، کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت سے موافق سمجھتے اور اپنے لیے نافع اور مفید خیال کرتے ہو۔

یہی حال اہل اللہ کا ہے زمانے کے مصائب و حوادث کے ساتھ کہ وہ ان کو مبین حکمت اور سرتاپا مصلحت سمجھتے ہیں، اس لیے ہر حال میں خوش ہیں اور یوں کہتے ہیں:

نُكَلِّ دَمِ تَبْرَةِ قَدَمِيْنَ كَيْفَ يَنْجُو

یہی دل کی حسرت! یہی آرزو ہے!

غرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں، ان کو غم حقیقی ہوتا ہی نہیں، پس:

”الا ان اولياء اللہ لا حوف عليهم ولا هم يحزنون“ اپنی حقیقت پر ہے، اس میں تاویل کی ضرورت نہیں، مطلب یہ ہے کہ ان کو حقیقی خوف و حزن نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں، جس کا اثر یہی ہے کہ رنج و غم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے، جیسا کہ میں نے ابھی اس سے ثابت کیا تھا: ”لیکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتکم“، بس قائل تقدیر کو آخرت میں تو خوف و حزن ہوگا ہی نہیں دنیا میں بھی اس کو غم نہیں ہوتا، اس لیے لا حوف علیہم و لا ہم يحزنون ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے، اس کو دنیا میں غم ہے اور آخرت میں بھی اور جس کا اعتقاد ضعیف ہے، وہ آخرت میں تو پٹ چھٹ کر جنت میں پہنچ جائے گا، مگر دنیا میں عمر بھر ضرور بے چین رہے گا، تو کیا اچھا ہو کہ یہاں بھی راحت ہی ہو، اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل و اعتقاد کو کامل کرو، پھر تمہارے لیے دنیا میں بھی چین ہوگا۔

”لھم البشری فی الحیوة الدنیا و فی الاخرة“

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو اس چین کی ضرورت نہیں، دنیا میں تم کو بے چینی ہم نظر رہے تو یہ شخص قابل خطاب نہیں، پھر ہم تو جب جانتے کہ یہ لوگ دنیا کی چیزوں سے بھی صبر کر لیتے مگر یہاں تو یہ حالت ہے چار پٹیوں سے بھی صبر نہیں اور آخرت کے بارے میں ایسی ہمت ہے وہاں کی راحت اور دنیا کی حیات طیبہ سے صبر ہے، اس کا نام صوفیہ کے محاورات میں صبر فرعون ہے، مولانا اس کی شکایت فرماتے ہیں:

ایکے صبرت نیست از فرزند وزن

صبر چونکہ داری رب ذوالمنن

اے کہ صبر نیست از دنیائے دون

صبر چون کہ داری ز نعم الماہدون

(خیر الخیوة و خیر المہمت صفحہ: ۱۱۰، ۱۱۱)

اکا دنواں اعتراض..... روح کو موت نہیں آتی جسم عنصری کو آتی ہے!

یاد رکھو! موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے، روح کو موت نہیں آتی، بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری سے منقطع ہو جاتا ہے، اب اس کے بعد یہ سمجھو کہ لذات سے منقطع ہونے والا کون ہے؟ کیا آپ کے نزدیک یہ بدن ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح منقطع و متلذذ ہوتی ہے اور جسم اس کے لیے بمنزلہ آلہ و مرکب کے ہے اور یہ روح موت کے بعد بھی علی حالہ باقی رہتی

ہے، بلکہ اب اس کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے، تو موت کے بعد اس عالم کے لذات سے متلذذ ہوتی ہے اور اگر تم یہ سمجھو کہ میری حقیقت تو محض جسم کی ہے، تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی گدھے پر سوار ہو کر یوں سمجھے کہ میں گدھا ہوں، سو اس کا تو کوئی علاج نہیں، صاحب! آپ کی حقیقت وہ ہے جس کو آپ "میں" سے تعبیر کرتے ہیں کہ میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا، اب آپ غور کیجئے کہ اس "میں" کا مصداق کیا چیز ہے؟ کیا آنکھ، ناک، یا منہ اور ہاتھ پیر کو "میں" کا مصداق کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اور نہ چاہیے کہ ان اعضاء کے جاتے رہنے سے انسان ہی جاتا رہے اور یہ غلط ہے رہے اور اعضاء شریفہ اور قوائے شریفہ جیسے قلب اور عقل وغیر ممکن ہے کہ آپ ان کو "میں" کا مصداق کہیں گے، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اس کا مصداق نہیں ہے، کیونکہ آپ ان کو اپنی طرف مضاف کرتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہو گیا، یا میری عقل میں یوں آتا ہے، وغیرہ وغیرہ اور اضافت علامت مفارقت ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ بھی آپ کی حقیقت نہیں، بلکہ حقیقت آپ کی روح ہے اور گو وہاں بھی اضافت ہوتی ہے کہ میری روح اور دوسرے اعضاء وقویٰ میں کوئی ایسی دلیل نہیں، بلکہ خلاف پر دلیل قائم ہے، چنانچہ ایک زمانہ میں بچپن میں عقل نہیں ہوتی اور آپ ہوتے ہیں، ایک وقت میں یعنی بعد مدت قلب نہ رہے گا اور آپ ہوں گے صاف دلیل ہے کہ آپ کی حقیقت یہ سب چیزیں نہیں اس لیے یہ اضافت حقیقیہ ہے۔

بہر حال آپ کی حقیقت روح ہے اور اس پر موت نہیں آتی بلکہ وہ بجز نہ موت کے بعد اپنے حال میں رہتی ہے اور اب بجائے اس جسم کے جو موت کے بعد فنا اور شکست ہو جاتا ہے، روح کا مرکب دوسرا جسم بنتا ہے جس کو جسم مثالی کہتے ہیں، اب روح اس جسم کے ذریعے سے سارے اشغالات اور تلذذات حاصل کرتی ہے اور یہ جسم مثالی وہ نسمہ ہے جس کو تشکیمین اہل ظاہر روح کہتے ہیں، یعنی موت کے وقت جو چیز جسم عنصری سے الگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، وہ نسمہ ہے اور یہ بھی مادی چیز ہے، مگر اس کا مادہ لطیف ہے اور اس کو اس جسم عنصری کے ساتھ ایسا حلولی تعلق ہے جیسا کہ جسم تعلیمی کا تعلق جس طبعی کے ساتھ حکماء نے بیان کیا ہے، یعنی وہ نسمہ مقدر اور ہیئت و شکل میں بالکل جسم عنصری کے برابر ہے اور وجہ تشبیہ یہی ہے ورنہ جسم تعلیمی تو عرض ہے اور نہ جوہر اور یہ نسمہ اس وقت یعنی زندگی میں اس کے اندر سرایت کیے ہوئے ہے اور موت کے وقت وہ الگ ہو جاتا ہے، یہی جسم مثالی ہے جو موت کے بعد روح حقیقی کا مرکب بنتا ہے اور یہ جسم مثالی گو مادی ہے، مگر اس جسم سے زیادہ لطیف وقویٰ ہے اور روح حقیقی جو حقیقت میں انسان ہے وہ مادہ سے بالکل مجرد ہے، وہ نہ اس وقت جسم کے اندر ہے، نہ موت کے وقت اس سے الگ ہوگی، بلکہ وہ تو محض جسم کی مدبر ہے جو اب بھی بدن سے الگ ہی ہے اور اس کے لیے تدبیر کر رہی ہے اور گو

متکلمین نے روح کے تجزیہ کا انکار کیا ہے، مگر اس بارے میں فلاسفہ کا قول راجح ہے، دلائل سے قوت انہیں کے قول کو ہے اور صوفیہ کا کشف بھی اسی کے موافق ہے کہ روح حقیقی مادہ سے مجرد ہے، البتہ فلاسفہ کا اس کو قدیم کہنا جیسا کہ قداماء کا قول ہے یا حادث بعد حدوث البدن کہنا جیسا کہ مشائیین کا قول ہے، یہ بالکل غلط اور خلاف نصوص ہے اور متکلمین نے جس چیز کو روح سمجھ کر مادی کہا ہے، وہ دراصل روح حقیقی نہیں، بلکہ نسہ ہے جو مرکب روح ہے غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان میں جو اصل چیز ہے وہ حقیقت میں وہی انسان ہے، موت کے بعد وہ اپنے حال پر رہتا ہے اس کی قوت و صفات میں کچھ کمی نہیں آتی، بلکہ پہلے سے کچھ ترقی ہو جاتی ہے۔

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ گو روح کو موت نہیں آتی، مگر جسم سے تو تعلق منقطع ہو جاتا ہے، تو انفعالات روح سے تہا نہیں ہو سکتے تو اب وہ نہ ہو سکیں گے اس کا جواب بھی معلوم ہو گیا کہ موت کے بعد جسم مثالی مرکب بنتا ہے جو اس جسم عنصری سے لطیف اور قوی تر ہے، وہ سب لذات سے منقطع ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں یہاں کی لذات بیچ ہیں اور روح ان سے متلذذ ہے، کھانا بھی پینا بھی، سیر و تماشا بھی، ملاقات احباب بھی، مکانات اور باغات بھی وغیرہ وغیرہ، اس حقیقت کا مراقبہ کر کے موت کا دھیان کرو تو ان شاء اللہ موت سے وحشت نہ ہوگی، بلکہ اس کا شوق پیدا ہوگا اور یوں کہو گے:

خرم آل روز کزیر منزل ویراں بردم  
راحت جاں ظہم و زئیے جاں بردم  
نزر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے  
تادر میکده شاداں و غزل خواں بردم

(خیر الحیات و خیر الممات ص: ۲۶۲۳)

با نواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت آخرت میں

کفار کے لیے!

ایک رحمت عامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے سخت عذاب ٹل گئے ہیں، جو پہلی امتوں پر آئے تھے کہ بعض قومیں سورا اور بندر بنا دی گئیں، کسی کا تختہ الٹ گیا، کسی پر آسمان سے پتھر برسے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی تو برکت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آتے۔



اور اس رحمت کو عام اس لیے کہا گیا ہے کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ امت دعوت میں داخل ہیں۔

اب یہاں یہ ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمت عامہ ہونا ثابت ہو گیا مگر آخرت میں کفار کے لیے آپ کی رحمت کیا ہوگی؟ کیونکہ وہ کفار تو ابد الابد کے لیے جہنم میں رہیں گے، ان کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا؟ اسی طرح جن مؤمنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی ان کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی؟

اس کے جواب کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے، اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا، وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جرم کرے، جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو اور اس میں سے کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہو اور اس میں کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت میں داخل ہیں۔

اب سمجھنے کے قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی مسلمانوں کے لیے جو کہ جہنم میں جائیں گے سفارش فرمائیں گے، اگر یہ شفاعت نہ ہوئی تو ان کی معیاد اور زیادہ ہوئی تو معیاد کی کمی یہ رحمت سے ہوئی، کوئی ہزار برس کے عذاب کا مستحق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے اس میں کمی کر دی جائے، مثلاً پانچ سو برس کے بعد دو جہنم سے نکال دیا جائے تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ معیاد میں کمی کر دی جائے، عذاب تو ان کو ابد الابد تک ہوا، مگر بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ جو عنقریب آتا ہے، عذاب میں تخفیف کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے، چنانچہ بعض کفار کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ابوطالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع بھی ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا تو ابوطالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے، مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ ان کو صرف دو جو تیاں آگ کی پہنائیں جائیں گی، جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکے گا اور اس پر بھی یہ سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں، ابولہب کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزا کر دیا تھا، اس لیے ہر بیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پیئے کول جاتا ہے۔

## کفار کے حق میں سفارش کی نوعیت

باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی حدیث سے تو معلوم نہیں ہوئی، مگر شیخ عبد القادر محدث رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اشیۃ اللععات" میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی، ان میں ایک شفاعت ایسی ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام کفار کے لیے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس عذاب کے مستحق ہیں، اس میں کچھ کمی کر دی جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ان کے عذاب میں کمی کر دی جائے گی، گو کم ہونے کے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی سمجھیں گے، خدا محفوظ رکھے، وہاں تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں، چنانچہ ابو طالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا، مگر وہ بھی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں تو گو کفار کو اس کمی کا احساس نہ ہو، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی اور چونکہ شیخ عبد الحق رحمہ اللہ بڑے محدث ہیں، اس لیے انہوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں، کسی حدیث سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی، گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی، مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہے، اس لیے ان کا یہ قول قابل تسلیم ہے اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ یہ نص کے خلاف ہے، قرآن میں تو کفار کے بارے میں ارشاد ہے: "لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابَ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ" کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جائے گا اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائیں گے، دونوں میں تعارض ہو گیا بات یہ ہے کہ آیت کا یہ مطلب کہ جس قدر عذاب آخرت میں ان کے لیے طے ہوگا، پھر اس سے کمی نہ کی جائے گی اور یہ اس لیے ارشاد فرمایا گیا تاکہ کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلے بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے، پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہو جاتی ہے، ایسے ہی جہنم کی آگ ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہزاروں ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہو جائے گی، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں جیسی اول دن میں تیزی ہوگی، ہمیشہ ایسی ہی رہے گی اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہوں گے اسی میں کسی کی شفاعت سے کمی نہ ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر ان کے لیے عذاب طے

ہو کر قرار پائے گا، وہ ہمیشہ ایک حال پر رہے گا، زمانہ دراز گزرنے سے اس میں کمی و اضعاف نہ ہوگی،  
واللہ اعلم۔ (شرک العمیۃ بذکر حجۃ الہدیۃ صفحہ ۵۰ تا ۵۱ ملخصاً)

### ترپنواں اعتراض..... مطیع اور غیر مطیع پر مصائب آنے میں فرق ہے!

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ باتیں بیماری مقدمہ وغیرہ نمازیوں کو پیش نہیں آتیں، ہم دیکھتے ہیں کہ نہ بیماری میں تخصیص نمازی اور غیر نمازی کی ہے، نہ مقدمہ میں، نہ اور کسی مصیبت میں، میں کہتا ہوں کہ مصائب بے شک پیش آتے ہیں، ان کو کبھی اور ان کو کبھی مگر فرق ہے، دونوں میں ان کے واسطے مصائب سزا ہیں اور ان کے لیے باعثِ رفعت مراتب اور موجبِ قرب ہیں۔

اس پر شاید کہا جائے کہ یہ تو دل کے سمجھانے کی بات ہے اور سن گھڑت ہے، اس کا عکس بھی تو عکس ہے جب صورتہ دونوں جگہ یکساں ہیں تو وہ بھی اپنا دل اس طرح خوش کر سکتے ہیں کہ مصیبت جو آئی ہے تو کچھ برائیاں ہمارے درجے بلند ہوں گے جیسے نمازیوں نے اسی طرح دل کو سمجھالیا تھا، میں کہتا ہوں واقعیت کسی چیز کی من سمجھوتہ کرنے سے نہیں بدلتی دعویٰ دونوں فریق اس کا کر سکتے ہیں کہ مصیبت ہمارے لیے رحمت ہے، لیکن کسی علامت سے امرِ واقعی کا پتہ چل جائے تو بات طے ہو سکتی ہے کہ حق کس طرف ہے؟ وہ علامت یہ ہے کہ خاصہ ہے کہ مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی اور رحمت کی حقیقت یہی ہے اور مصیبت کی حقیقت پریشانی ہے، اس کو کان میں رکھو اور دونوں منظر دیکھ لو! ایک یہی واقعہ جس کو مصیبت کہا جائے نمازی پر یعنی مطیع پر آئے تو اس کا اس کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے؟ اور وہی واقعہ عاصی پر آئے تو کیا ہوتا؟ زمین آسمان کا فرق ملے گا دونوں میں! اور ذرا غور سے نزاعِ رفع ہو جائے گا عاصی کا دل ٹوٹ جاتا ہے مصیبت میں اور مطیع کو ڈھارس رہتی ہے، کیونکہ اس کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے اور عاصی کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق حاصل نہیں، تعلق خدا تعالیٰ مقوی قلب ہے اور خدا سے تعلق میں یہ اثر کیوں نہ ہو؟ ایک کلکٹر سے جس کو تعلق ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا، پھر جس کو تعلق خدا سے ہو وہ کیسے ڈرے گا؟ اور اس کا دل کیوں ٹوٹے گا؟ اور عاصی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، ڈرتا ڈرتا رہتا ہے، یہی تو فرق ہے پولیس اور ڈاکوں میں، مقابلہ کے میدان میں دونوں موجود ہیں اور مارنے میں دونوں شریک ہیں، ظاہری دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ دونوں فریق ایک مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بھی مر رہے ہیں اور وہ بھی مر رہے ہیں تو کسی کو حق پر اور کسی کو ناحق پر کیسے کہیں گے؟ لیکن ذرا غور کیجئے! تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پولیس مضر و رہی ہے، مگر دل ان کے مضبوط ہیں اور ان کی ڈھارس بندھی ہوئی ہے اور ڈاکو ہمت پولیس سے بھی زیادہ کر رہے ہیں، مگر دل اندر سے

ٹوٹے ہوئے ہیں اور پاؤں نہیں جمتے اور موقع دیکھتے ہیں کہ اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں، یہ اثر اسی کا ہے کہ پولیس مطبوع ہے اور حاکم سے تعلق ہے اور ڈاکو عاصی ہے اس کے دل کو کسی کا سہارا نہیں، اس مثال سے عاصی اور مطبوع کی حالتوں کا فرق بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے، نمازی اور مطبوع پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ صبر و سکون کے ساتھ رہتا ہے اور کوئی بے ہودہ کلمہ تک اس کے منہ سے نہیں نکلتا اور عاصی پر جب مصیبت آتی ہے تو پوری قیامت ہوتی ہے، چیخ و پکار اور رونا پینا مچ جاتا ہے، زبان سے بے ہودہ کلمات بکلتا ہے اور دل میں شکایت ہوتی ہے، یہ مصیبت جس کو مصیبت کہنا چاہیے کھلی ہوئی علامت ہے اس بات کی کہ تعلق مع اللہ باقی نہیں اور مطبوع کا تعلق باقی ہے گو جسمانی تکلیف ہے اور باقتضائے طبع اس کا احساس کرتا ہے اور رنج پاتا ہے مگر دل اندر سے تازہ ہے۔

ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہیں، اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں۔ عاصی اور مطبوع کی حالت میں فرق ضرور ہوتا ہے، بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے، کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے، جس کو بالکل تعلق نہیں یعنی کافر آپ کو نسبت حق سے ضرور حاصل ہے، گو آپ کو خیر نہیں:

یک سبد پر نان ترا برفرق سر  
تو بھی جوئی لب ناں در بدر  
تا بزانو غرق ہستی اندر آب  
و ز عطش و ز جوع گشتی خراب

ہماری وہ حالت ہے کہ ساری دولتیں حاصل ہیں، مگر عادت ہو گئی ہے بھیک مانگنے کی ان کی طرف توجہ نہیں اور ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں فیروں کی تقلید کرتے ہیں، عقائد میں خیالات میں معاشرت میں، صاحبو! تمہارے پاس تو اتنی دولتیں ہیں کہ دوسرے یہیں سے لے گئے ہیں افسوس ہے کہ ہم ان سے متمتع نہیں ہوتے اور ان سب دولتوں کی اصل ”تعلق مع اللہ“ ہے، اگر ہم اس سے کام لیں تو کبھی پریشانی نہ ہو، اللہ والا کبھی پریشان نہیں ہوتا، دیکھئے! سب سے بڑھ کر حادثہ موت کا ہے اور دیگر مصائب جو خوف عند ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ مقدمہ موت ہیں، مگر اہل اللہ کی حالت خود موت کے متعلق یہ ہے کہ بجائے پریشانی کے الٹی راحت ہوتی ہے، انہوں نے اس کو بھی

ایک کھیل سمجھ رکھا ہے، جس کے نام سے دنیا بھاگتی پھرتی ہے، ایک صاحب موت کی آرزو میں کہتے ہیں:

خرم آں روز گزریں ویران بردم  
راحت جان ظلم و زبے جانان بردم  
نذر کردم کہ اگر آید بسر این نم روزے  
تا در میکده شاداں و غزل خواں بردم

(الظاہر صفحہ: ۳۴)

### چونواں اعتراض..... قرآن کریم میں ہر پہلو کی رعایت ہے!

قرآن کریم میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے، قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا، اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو ضابطہ کے پابند ہیں، ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیے، ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں، ان کے سہل و آسان کرنے کی تدبیر بتائیں دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہنچانا چاہتے ہیں اور حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرینگی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس تجویز میں ان پر تعجب ضرور ہوتا ہے، مگر یہ شفقت پر مبنی ہے، اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے، جس کو رعایا پر شفقت ہو، اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے۔ باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے، استاد تو ضابطہ پوری کر دیتا ہے، مگر باپ ضابطہ پوری نہیں کر سکتا، وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کر لے، کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اصلاح ہو جائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جائے اور ان سب رعایتوں کا منشاء وہی شفقت ہے شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جاسکتی ہے اور اسی لیے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے، مثلاً باپ بیٹے کو کھانا دیتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو

کر رہا ہو، اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے! اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا، اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے؟ بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر؟ مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے، شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے، دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پہلی بات کو پورا کرے، یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے، اس ظاہری بے ربطی کا منشاء شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ کا مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے، بلکہ وہ ایک مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر کبھی تنبیہ فرمادیتے ہیں، اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آتی ہے جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔

### قیامت کا حال

سورہ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا، اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی، اس روز اس کو سب اگلے پیچھلے کیے ہوئے کام جتلا دیے جائیں گے، پھر فرماتے ہیں: **بَلِ الْإِنْسَانِ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَّلَوْ أَن لَّقِيَ مَعَاذِرَةً**“

یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتنا ہے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہوگا (کیونکہ اس وقت متعلق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (باقضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے، جیسے کفار کہیں گے واللہ! ہم تو مشرک نہ تھے، مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔

غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو جانتا ہوگا اس لیے یہ جتنا نا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لیے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لیے یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں۔

”لَا تَسْحَرَنَّ بِهٖ لِسَانُكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهٗا وَ قُرْآنُهٗا فَاِذَا قُرْآنُهٗا فَاتَّبِعْ قُرْآنُهٗا ثُمَّ اِنَّا

عَلَيْنَا نَبَاہٖہ“

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوئے ہوئے اس کو یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ بلایا کیجئے ہمارے ذمہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں قرآن کا جما دینا اور زبان سے پڑھو لینا، تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قراءت کا اتباع کیجئے، پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے، اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے: ”كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَ تَذَرُونَ الْآخِرَةَ“ کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو، پھر فرماتے ہیں: ”وَأُوْحُوهُ يَوْمَ يُبْعَثُ نَاصِرَةٌ إِلَيَّ رَبُّهَا نَاطِرَةٌ“، بعضوں کے چہرے اس دن ترونازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے..... الخ تو: ”لَا تَحْرِكْ بِهِ لِسَانَكَ“ سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لیے زبانی بیان نہ دیا کیجئے، لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں، مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے:

کلامیکہ محتاج لعنی باشد لا یعنی است

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے، جو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے، اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں موقع ہے، صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مناسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا اسالقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگایا کیا حرکت ہے؟ لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے! تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے، لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا، باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔

اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں، جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرنے کی فکر نہ کریں، یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں، قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا، تو اس مضمون کا درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی، مگر پھر بھی باوجود اس کے ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو، وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔ (کنز العمال ج ۶ صفحہ ۱۰۴۶)

پچھنوال اعتراض..... قرآن پاک کی آیتوں میں باہم ربط ہے اور

مفسرین کا بیان درست ہے!

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے، اس لیے مفسرین کے بیان کردہ روابط متضاد نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت اور مصحف اور ہے، یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوئی، پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوئی و علیٰ ہذا تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے، اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عزاسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تو جبرائیل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کو مثلاً سورہ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورہ کے ساتھ۔ و علیٰ ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں، بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے، دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے، کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہو تو ترتیب نزول کا بدنام مفید نہ ہوگا۔

(سبیل النجاح صفحہ: ۹)

چھپنوال اعتراض..... تفسیر بالرائے تحریر معنوی ہے!

آج کل ایک شخص نے سورہ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے، وہ مفسر اس قابل ہے کہ بقرہ ہی کی طرح ذبح کر دیا جائے، ظالم نے تمام عبادات کو سیاسیات پر محمول کیا ہے، نماز، روزہ سب سیاسیات کے واسطے ہے، نماز میں پریڈ کی تعلیم ہے تاکہ افسر کی اطاعت کرنا آجائے اگر وہ اٹھنے کو کہے تو اٹھو، بیٹھنے کو کہے تو بیٹھو، جھکنے کو کہے تو جھک جاؤ، اسی واسطے نماز میں امام مقرر کیا جاتا ہے تاکہ سب اس کے افعال کی اطاعت و اتباع کریں، جس سے پریڈ کے وقت افسر کی اطاعت سہل ہوگی، روزہ اس واسطے مشروع ہے تاکہ جنگ میں فاقہ کا تحمل ہو سکے، کیونکہ جنگ میں بعض دفعہ کھانے کو نہیں ملتا،



حج بھی اسی واسطے ہے تاکہ مسلمان سفر کے عادی ہوں اور گھر چھوڑنا ان پر گہرا اثر ہے اور احرام بھی اسی واسطے ہے تاکہ ترک زینت کی عادت ہو، ایک لنگی ایک چادر میں سردی گرمی کا تحمل کے عادی ہو، وغیرہ وغیرہ، گویا کوئی عبادت خدا کی یاد اور عبادت و بندگی کے لیے شروع نہیں ہوگی، بس ساری شریعت میں ملک گیری و سیاست کی تعلیم ہے، یہ اس مقولہ کا مصداق ہے:

کامیکہ محتاج یعنی باشد لا یعنی است

کیونکہ نماز، روزہ اور حج سے آج تک یہ مقصود کسی نے نہ سمجھا تھا، یہ باتیں فرصت میں بیٹھ کر اس نے گھڑی ہیں اور کھینچ تان کر نصوص کو ان پر منطبق کیا ہے، جیسے بعض شعراء نے قرآن کی بعض آیتوں کو کھینچ تان کر اوزان شعر پر منطبق کیا ہے اور اس شخص نے یہ تفسیر لکھ کر گویا مخالفین اسلام کو یہ سبق پڑھایا ہے کہ مسلمان کی نماز روزہ اور حج و زکوٰۃ کو بھی خطرہ کی نظر سے دیکھیں، کیونکہ ان سب میں مقابلہ اعداء کا طریقہ سکھلایا جاتا ہے اور یہ نماز نہیں، بلکہ چاند ماری ہے، مگر مسلمان ہیں کہ اس تفسیر پر لٹو ہیں، کیونکہ وہ کھنے کا غنڈ پر چھپی ہوئی ہے اور جلد بھی خوبصورت ہے اور آج کل کتاب کی خوبی اس میں رہ گئی ہے کہ عمدہ چھپی ہوئی ہو، ٹائٹل خوبصورت ہو، اس لیے بہت لوگ اس کو خریدتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر کیا جھرا ہے؟ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صندوق نقش و نگار سے مزین ہو اور اس کے اندر سانپ بند ہو۔ خریدنے والا اوپر کے نقش و نگار سے فریفت ہو کر اسے خریدتا ہے، مگر جب کھولے گا اس وقت حقیقت منکشف ہوگی اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس مصنف کا دل خود بھی جانتا ہے کہ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کے جو مقاصد اس تفسیر میں لکھے ہیں، وہ قرآن کا مفہوم ہرگز نہیں! یہ محض ایجا و بندہ ہے، جس سے محض یہ مقصود ہے کہ اس تحریک کی تائید قرآن سے کی جائے جس میں یہ شخص اور اس کی ایک جماعت ایک زمانہ میں پیش پیش تھے، قرآن کی تفسیر ہرگز مقصود نہیں تھی، بلکہ مخلوق کو دھوکہ دینے کے لیے اس کو قرآن میں ٹھونسایا گیا سو یاد رہے:

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام

در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

کارہا باخلق آری جملہ راست

باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

یہ ممکن ہے کہ تم ان تاویلوں سے مخلوق کو دھوکہ میں ڈال دو، مگر خدا کے سامنے یہ تاویلیں نہ چلیں گی، اس لیے:

کارہا او راست باید داشتن

رایت اخلاص و صدق افزاشتن

تاویل وہ کرو جو خدا تعالیٰ کے سامنے بھی بیان کر سکو۔ (ارضاء الحق حصہ دوم صفحہ: ۳۰)

ستائونواں اعتراض..... قرآن کریم سے متعلق شبہات دور کرنے کا

### طریق!

شبہات کا یہ علاج نہیں کہ تم اپنی رائے سے ہر شبہ کو رفع کرو، بلکہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ شبہات کے منشاء کا علاج کرو، ہر شبہ کو الگ الگ رفع کرنے میں دروسری بھی ہے اور اس سے سلسلہ شبہات کا ختم نہیں ہو سکتا، تم منشاء کا علاج کرو انشاء اللہ سب ایک دم سے زائل ہو جائیں گے، اس کی ایسی مثال ہے جیسے رات کو اندھیرے میں گھر کے اندر چوہے، چھچھوند کو دتے پھرتے تھے۔ گھر والا ایک ایک کو پکڑ کر نکالتا تھا، مگر پھر وہ سب کے سب اندر آ جاتے تھے۔ ایک عاقل نے کہا کہ میاں! یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کودتے پھرتے ہیں۔ تم لیپ روشن کر دو۔ یہ سب خود ہی بھاگ جائیں گے، پھر کوئی پاس نہ پھٹکے گا، چنانچہ لیپ روشن کیا گیا اور سب کے سب ادھر ادھر اپنے اپنے بل میں گھس گئے۔

اسی طرح یہاں بھی سمجھو کہ یہ وساوس و شبہات جو جی اور قرآن میں آپ کو پیش آتے ہیں، ان کا منشاء ظلمت قلب ہے جس کا علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کر لو، پھر ایک شبہ بھی نہ آئے گا اور وہ نور کیا ہے؟ نور محبت ہے، حضرت! محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول و فعل میں کوئی شبہ اور کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوتا، اگر ایک پروفیسر فلسفی کسی طوائف پر عاشق ہو جائے اور وہ اس سے یوں کہے کہ سر بازار کپڑے اتار کر ننگے آؤ تو میں تم سے بات کروں گی، ورنہ نہیں! تو فلسفی صاحب فوراً اس کے لیے تیار ہو جائیں گے اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ بی بی! اس میں تیری کیا مصلحت ہے؟ اب کوئی اس سے پوچھے کہ آپ کی وہ عقل اور فلسفیت اس طوائف کے سامنے کہاں چلی گئی؟ افسوس! قرآن وحدیث کے مقابلہ میں تو ساری فلسفیت و عقل ختم ہو جاتی ہے اور ایک ادنیٰ مردار کے احکام میں چون و چرا اور لم و کیف سب

رخصت ہو گیا، آخر اس کی کیا مہر؟ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ اس کی مہر محبت و عشق ہے۔  
پس معلوم ہو گیا کہ خدا اور رسول کے احکام میں شہادت پیدا ہونے کی وجہ عدم محبت یا قلت محبت  
ہے، اگر آپ کے دل میں نور محبت روشن ہوتا تو یہ سارے چوہے اور چھوٹے خود بھاگ جاتے۔ شیخ  
سعدی رحمہ اللہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

ترا عشق بچو خودی ز آب و گل

رباید ہمہ صبر و آرام دل

اور جب ایک مخلوق کے عشق کا یہ اثر ہے تو خالق کے عشق کا اثر کیا کچھ ہونا چاہیے!

عجب داری از ساکنان طریق

کہ باشند در بحر معنی غریق

دام شراب الم در کشد

دگر تلخ بینند دم در کشد

مولانا فرماتے ہیں:

عشق مولیٰ کے گم از لیلیٰ بود

گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

اور میں علماء کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علماء کے عرفی اخلاق ہی نے عوام کو خراب کیا ہے کہ جہاں ان  
کے سامنے کسی نے شہادت بیان کیے یہ ہر شبہ کے مفصل جواب کو تیار ہو گئے، ارے! اصل جواب  
یہ ہے کہ مرض کو تشخیص کرو اور جڑ کو اکھاڑو، تم شاخوں کو چمانٹتے ہو، اس سے کیا ہوگا جب جڑ موجود  
ہے تو چند روز میں ہزاروں نئے نئے پتے اور نکل آئیں گے، محقق تشخیص کر کے اصل مرض کا علاج  
کرتا ہے اور غیر محقق آثار کا علاج کرتا ہے، میں نہایت پیچیدگی سے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ جن  
مسلمانوں کو آج کل مذہب میں شکوک و اوہام پیدا ہوتے ہیں، ان کے اس مرض کا منشا، قلت محبت  
مع اللہ ہے، ان کو اللہ و رسول کے ساتھ محبت نہیں ہے اور نفس برائے نام تعلق کو تعلق کہا جاتا ہے اور  
تعلق مع اللہ کے حاصل ہونے کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل کی جائے اہل  
محبت کی صحبت میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ اہل غفلت  
کی صحبت سے غفلت پیدا ہوتی ہے، پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو جائے گا، یہ لم و کیف  
باطل اور وساوس و شہادت سب جاتے رہیں گے۔

میں علماء سے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم ان شہادت کے جواب میں کیوں اپنا دماغ تھکاتے ہو؟ بس تم صرف ایک کام کرو کہ ان لوگوں کو اہل اللہ کی صحبت و محبت کا پتہ دو۔

(غایۃ النجاح، صفحہ: ۵)

## اٹھاؤ نواں اعتراض..... وجودِ صانع کی عقلی دلیل!

فلسفی طریقہ پر وجودِ صانع کی دلیل یہ ہے کہ تمام عالم حادث ہے، کیونکہ بہت سی چیزوں کا حدوث تو ہم کو مشاہد ہے اور جن کا حدوث مشاہد نہیں ہو ان کے احوال کا تغیر و انقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ حادث ہیں کیونکہ کل حادث کا حادث ہوتا ہے۔

ابھی میں نے اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر ماہر سائنس کا قول پڑھا ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت سی آگنی ہے اور عنقریب اس کی روشنی زائل ہو کر یہ چراغ گل ہو جائے گا اور اس وقت دنیا میں اس قدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال ہو جائے گا، تمام عالم فنا ہو جائے گا (ہم اس خبر سے خوش ہوئے کہ اہل سائنس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہ ہوا تھا، تو اب آلاتِ رصد سے یقین آنے لگا)

غرض اشیاء عالم کا تغیر و انقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب حادث ہیں قدیم نہیں یعنی ان کا وجود دائمی اور ضروری نہیں اور حادث کے لیے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کے لیے کسی مرجح کی ضرورت ہے، کیونکہ ممکن وہ ہے کہ جس کا وجود عدم مساوی ہو، یعنی نہ اس کے لیے موجود ہونا ضروری ہے نہ معدوم ہونا ضروری ہے اور جس کا وجود عدم وجود برابر ہو تو اس کے وجود کے لیے کوئی مرجح ہونا چاہیے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور ترجیح بلا مرجح باطل ہے۔

پھر اس مرجح میں گفتگو کی جائے گی کہ یہ ممکن ہے یا کچھ اور ہے؟ اگر مرجح ممکن ہو تو اس کے لیے دوسرے مرجح کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسل محال ہے اس لیے کہیں نہ کہیں سلسلہ ختم کرنا پڑے گا اور یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح ایسی ذات ہے جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے، اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خلاق عالم کہتے ہیں، ایک سوال یہ ہوگا کہ صانع کے ماننے کے بعد بھی ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے، کیونکہ صانع نے تمام مخلوقات کو ایک دم سے پیدا نہیں کیا، کسی کو آج سے ہزار برس پہلے کسی کو سو برس پہلے پیدا کیا اور کسی کو بعد میں پیدا کرے گا اور کسی کو حسین بنایا، کسی کو بد شکل، کسی کو مرد، کسی کو عورت، کسی کو امیر، کسی کو غریب، کسی کو عاقل، کسی کو احمق تو یہاں مرجح کون ہے؟ زید کو آج کیوں پیدا کیا؟ کل کیوں نہیں کیا تھا؟ اور اس کو امیر کیوں بنایا؟ عمر کی طرح غریب کیوں نہ

بنایا؟ زید کو عمرو پر کیا ترجیح تھی؟ مثل اس سوال کا جواب حکمائے اسلام کے سوا کوئی نہ دے سکا۔ فلاسفہ کی عقلیں یہاں آ کر چکر کھانے لگیں، حکمائے اسلام نے اس کا جواب دیا ہے کہ ان امور میں ارادہ واجب مرتجح ہے اور ارادہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے مرتجح ہے، اس کے لیے کسی دوسرے مرتجح کی ضرورت نہیں، اس پر حکمائے یونان کی طرف سے ان کے معتقدوں نے یہ اشکال وارد کیا ہے کہ بے شک یہ تو ہم نے مان لیا ہے کہ ارادہ کے لیے کسی مرتجح کی ضرورت نہیں، وہ خود اپنی ذات سے مرتجح ہے، مگر یقیناً خدا تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم ہو اور مراد حادث ہو، اس صورت میں تحلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے اور یہ مجال ہے۔

### ایک اعتراض کا جواب

اس کا جواب حکمائے اسلام نے ایسا دیا ہے کہ حکمائے یونان کے دانت کٹھے ہو گئے۔ فرمایا کہ صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں، مگر ان کا تعلق ممکنات کے حادث سے ہے اور تحلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد مجال ہے، اس سے پہلے مجال نہیں۔ پس ہم یہی کہیں گے کہ ارادہ کا تعلق مختلف طور سے ہوتا ہے، اس لیے مراد کا وجود بھی مختلف ازمینہ اور مختلف حالات کے ساتھ ہوتا ہے، یہ عقلی دلیل ہے وجود صالح کی۔ (غایت النجاح صفحہ: ۲۱۰، ۲۰)

### انسٹھواں اعتراض..... عہد میثاق پر شبہ کا جواب!

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اس عہد کی کیفیت بے شک یاد نہیں رہی لیکن اس کا مقصود سب کو یاد ہے اور مطلوب مقصود ہی کا یاد ہونا ہے، کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا ضروری نہیں، دیکھو! جن لوگوں نے کبھی فارسی پڑھی ہے ان کو یہ محفوظ ہے کہ آمدن کے معنی ”آنا“ ہیں، کیونکہ آمدن کا سبق آج کل ہر شخص کو یاد ہے۔ لیکن آپ ان سے پوچھیں کہ آمدن کے معنی آپ کو کس دن اور کس جگہ پڑھائے گئے؟ اور آمدنامہ آپ نے کون سے استاد سے پڑھا ہے؟ تو ان سوالات کا جواب شاید ہزار میں ایک ہی آدمی دے سکے گا۔ کیونکہ باتیں کسی کو محفوظ نہیں رہتیں تو کیا ان کے نہ یاد رہنے سے یہ کہا جائے گا کہ آمدنامہ پڑھنا فضول اور بیکار گیا؟ ہرگز نہیں! بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ آمدنامہ پڑھنے سے صرف مقصود یہ تھا کہ اس کا مضمون یاد رہے، کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا مقصود نہ تھا، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ میثاق الست سے مقصود یہ تھا کہ وجود صالح اور توحید صالح کا مضمون طبائع میں مرکوز ہو جائے، کیفیت تعلیم کا محفوظ ہونا مقصود نہ تھا۔ سو بھرا اللہ وجود اور توحید صالح فطرۃ ہر شخص

کے دل میں مرکوز ہے، اسی کا یہ اثر ہے کہ مصنوعات کو دیکھ کر ایک جاہل بدوی بھی صنایع کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ آمدنامہ کی جو تم نے مثال دی ہے تو وہاں ہزار میں ایک آدمی تو ایسا نکلتا ہے جس کو کیفیت تعلیم بھی یاد ہوتی ہے، چنانچہ بعض قوی الحافظ اب بھی بتلاکتے ہیں کہ ہم نے آمدنامہ کس سے پڑھا تھا؟ اور کس مکان میں پڑھا تھا؟ مگر میثاق الست کی کیفیت یاد رکھنے والا تو کئی ہزار میں بھی ایک نہیں ملتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے، یہاں بھی بعض قوی الحافظ ایسے موجود ہیں جن کو اس عہد کی کیفیت اب تک یاد ہے، چنانچہ شیخ سعدی رحمہ اللہ اس طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں:

الست از ازل ہیچناں شاں بگوش  
بفریاد قالوا بلئی در خروش

اس میں تو اجمالاً بتلایا گیا کہ اس عہد کے یاد رکھنے والے اب موجود ہیں اور بعض بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے، چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم کو یاد ہے کہ اس وقت ہماری دائیں طرف اور بائیں طرف فلاں تھا اور انہیں بزرگوں کے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس وقت صف بستہ تھیں، بلکہ یوں گلدن جمع تھیں جیسے میلہ میں اجتماع ہوا کرتا ہے، پھر اس وقت جو لوگ باہم رو در رو ہو گئے، ان میں تو طرفین سے محبت ہوتی ہے اور جو لوگ رو در پشت ہوئے کہ ایک کا منہ دوسرے کی پشت کی طرف تھا، ان میں ایک طرف سے محبت اور ایک طرف سے اعراض ہوتا ہے اور جو پشت در پشت ہوئے ان میں طرفین سے التقابض و اعراض ہوتا ہے اور ان بزرگ کے مذاق پر اس حدیث کا یہی حمل ہے:

“الارواح جنود مجنودة فما تعرف منها اتلف و ما تناكر عنهم المختلف“

ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ جس وقت ازل میں میثاق لیا گیا تو سب ارواح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تکتے لگیں کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے وہی سب کہیں گے، چنانچہ سب سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ آباننا و امہاننا) کی زبان مبارک سے ”بلئی“ نکلا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”بلئی“ کہا (صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ کما یحب و یرضی) تو حضرت! آپ سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے، اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوئے جو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کر آئے ہیں کہ جنت کتنی بڑی ہے؟ اس کے کتنے درجے ہیں؟ اسی طرح دوزخ کی تفصیلی سیر کی اور پیمائش بھی کر لی اور یہ سیر روحانی طریقہ پر تھی۔ (غایۃ النجاح صفحہ: ۲۰۳ تا ۲۰۴)

ساتھواں اعتراض..... مال تدبیر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تقدیر سے

### حاصل ہوتا ہے!

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ قارون نے کہا: ”قال انما اوتيته على علم عندى“ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کس نے کیا؟ کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں، مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا، وہ طالب علم بی اے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوتا ہے، مگر نتیجہ امتحان اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیل ہو جاتا ہے اور عمر جو اس سے کم درجہ میں ہے، پاس ہو جاتا ہے۔ بتلائیے! عمرو کی تدبیر کو کس نے راست کیا؟ اور زید کو کس نے ناکام کیا؟ اگر تدبیر ہی مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیے تھا، مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے، اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے، دوسرا بے وقوف جاہل ہے تدبیر کا مقتضایہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بے وقوف سے زیادہ چلتی، مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان بھی ہوتا ہے، اسی طرح آپ غور کریں گے تو زراعت اور ملازمت وغیرہ تمام امور میں ایسی صد ہا نظائر دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر کافی نہیں، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوائے خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں ورنہ اپنی تدابیر کا راست ہونا کون نہیں چاہتا؟ پھر سب کے سب منقصود میں کامیاب ہی ہوا کرتے، ناکام کوئی نہ رہتا، حالانکہ مشاہدہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں بیس تئیں کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ ناکام ہوتے ہیں، اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں تو یہ محض ان کی حماقت ہے، ان کو سوچنا چاہیے کہ تدبیر تو وہ لوگ بھی کر رہے تھے جو ناکام ہوئے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہو گئے؟ یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقد ہیں، ورنہ مسلمان تو سب کے سب یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر مؤثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست ہونے کے لیے تقدیر کی موافقت بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الہیہ کا نام ہے۔

### اہل سائنس کی ایجاد

اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ

تھی، میں کہتا ہوں کہ اگر حقیقت میں تم ہی موجود ہو تو بتلاؤ کہ جس ایجا کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے، اس میں ایک سال کیوں لگا؟ اگر تمہارے قبضے میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں ایجا دکری ہوئی اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجا کرنا چاہو، ایک دن، بلکہ ایک ساعت، بلکہ ایک منٹ میں ایجا دکریا کرو! کیونکہ سب کام تمہارے ہاتھ میں ہیں، پھر دیر کی کیا وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضے میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے، ایجا کر لے، مگر زمانہ دراز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجا سمجھ میں آئی ہے اب بتلاؤ! جس وقت بات سمجھ میں آئی ہے، وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آئی یا بلا اختیار خود بخود دل میں آگئی؟ اگر کو اختیار سے سمجھ میں آئی تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا، اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا؟ یقیناً کہو گے کہ دفعہ بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے، بس یہی تقدیر ہے! اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجا آئی ہے، کیونکہ ان کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لیے کوشش کرتا ہے اور اپنی ہی کوشش صرف کر دیتا ہے، تو وہ امداد فرماتے ہیں۔

بہر حال یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمرہ سمجھے، ہر شخص کو عاجز و لاچار ہو کر مانتا پڑے گا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا اب فرمائیے! اگر آپ اللہ کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں ٹھوڑا سا صرف کر دیں اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں؟ یقیناً نعمت ملی!

(مظاہر الاموال صفحہ: ۱۳)

## اکسٹھواں اعتراض..... اسلام نے سادگی سکھائی ہے!

غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو سکھلایا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے، تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھ لیں گے، اگر ان کا حلیہ ہوگا جو اس کتاب میں ہے، تو ہم بدون لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے، ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین یہاں تشریف لے آئیں، شاید یہ قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہو جائے، امیر المؤمنین نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا، اب غور فرمائیے کہ یہ اس شخص کا دور تھا جس کے نام سے کسریٰ



اور ہر قل بھی تحرراتے تھے، مگر حالت یہ تھی کہ جس قمیص میں آپ نے سفر کیا تھا اس میں چند دوڑاؤں پیوند تھے اور سواری کے لیے صرف ایک اونٹ تھا، اس سے زیادہ کچھ نہ تھا، جس پر کبھی آپ سوار ہوتے، کبھی آپ کے غلام، آج کل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورے پر بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ اعظم رضی اللہ عنہ کے دورے میں کچھ بھی سامان نہ تھا، پھر آج کل ادنیٰ حاکم کے دورے میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے، کیونکہ رعایا کو ان کے دورے کے لیے رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے، یہاں خلیفہ کے دورے سے ایک ٹنٹس کو بھی تکلیف نہ ہوئی، کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں ستوا اور ایک تھیلے میں چھوہارے بندھے ہوئے تھے، منزل پر اتارت کر ستو گھول کر پی لیا اور چھوہارے کھالے، نہ رعایا سے مرغ لیے، نہ انڈے، نہ دودھ لیا نہ گھی، جب اس شان سے کبھی سوار، کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا، آپ نے ممانعت کر دی، خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا، اس وقت بعض حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے اس لیے مناسب ہے کہ اپنا یہ قمیص اتار کر دوسرا قمیص عمدہ سا پہن لیجئے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے، تاکہ ان کی نظر میں عزت ہو، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "لحسن قوم اعزنا الله بالا سلام" ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے! ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے، بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے، مگر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لیے درخواست منظور کر لی، چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے، دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتڑ پڑے اور فرمایا: "میرے دوستو! تم نے اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا واللہ! میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس میں اور اس سواری میں میرا دل بگڑنے لگا ہے، تم میرا وہی پیوند لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ، میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا۔"

اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑ رہا ہے تو ہمارا دل اور ہمارا منہ کیوں نہ بگڑے گا، پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں؟ اور ہم کو کس چیز نے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لیے کوئی لباس مضرت نہیں؟ اور جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا: "لحسن قوم..... الخ" واقعی بات یہی ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں، ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی ہے۔

ز عشق نا تمام بہمال یار مستغنی است!

باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت رونے زیبار

خوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی ضرورت نہیں، وہ تو ہر لباس میں حسین ہے، بناوٹ کی احتیاج اس کو ہے کہ جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا وہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی لباس اور سواری پر آپ کو دیکھ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا، کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ خلیفہ اسلام تشریف لے آئے تو ان کا بڑا پادری فصیل پر آیا اور کتاب کھول کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حلیہ کو ان اوصاف سے ملانے لگا، جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے، اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے لباس اور ایسی سواری پر تشریف لائیں گے، اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی۔

کہ آپ چشمہ حیوان درون تاریکی است

اگر آپ قیمتی لباس میں آتے تو پیشین گوئی پوری نہ ہوتی، چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لیے تو وہ چیخ مار کر بڑا اور کہا کہ جلدی سے قلعہ کا دروازہ کھول دو بخدا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب توراۃ میں حدید ہے! یہی فاتح بیت المقدس ہے، تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدون جنگ و جدال کے بیت المقدس کو فتح کر دیا۔

مولانا گنج مراد آبادی رحمہ اللہ

تو صاحبو! ہمیں تکلیف، تکلف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں، ہماری عزت تو سادگی ہی میں ہے۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی رحمہ اللہ اسی زمانہ میں ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ سے لیفٹیننٹ گورنر نے ملنے کی اجازت چاہی، یہاں سے اجازت ہوگئی، اس وقت آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لیفٹیننٹ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے؟ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں، وہ جو بی کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں، چونکہ لیفٹیننٹ گورنر اس وقت مہمان ہو کر آرہے تھے اور مہمان کی مدارات اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے، اس لیے یہ خیال ہوا، مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے، وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا، بلکہ آپ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ لیفٹیننٹ گورنر کس دن آئیں گے؟ چنانچہ جب دن آیا اور لیفٹیننٹ گورنر خانقاہ میں پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا، سب معمولی سامان تھا، بعد ملاقات لیفٹیننٹ گورنر نے کہا حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں ارشاد فرمایا: ”ظلم کبھی نہ کرنا! پھر اس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرمایا جائے فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے پھر خادم سے فرمایا کہ ارے دیکھنا! مٹھائی

کی ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دوے دو، یہ مانگ رہے ہیں! چنانچہ ہنڈیا میں سے مٹھائی کا چھوٹا تھوڑا تھوڑا سب کو دے دیا گیا جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔ تو دیکھئے! مولانا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہوا بھی تھا، مگر آخر میں یہ سارے منصوبے مٹ گئے اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی اور اسی میں ان کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی!!  
بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی

بے تکلفی

غرض ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیے، اگر کسی مسلمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے، مبالغہ نہ کیا جائے، اس میں ہماری عزت ہے، مگر آج کل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں، ان کا لباس اور ان کا طرز معاشرت ان کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں، میں کچھ کہتا ہوں کہ اس میں مسلمان کی عزت نہیں۔

ایک واقعہ

ایک بار میں بریلی میں تھا، بھائی سے ایجنٹ نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا چاہتے ہیں، بھائی نے مجھ سے پوچھا میں نے کہا ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے، لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا برا ہے، آخر وہ حاکم ہیں، ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے، میں چلوں گا، بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا، میں نے کہا ”ہرگز نہیں! جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں، اسی میں جاؤں گا، چنانچہ میں اچکن اور کرتہ میں ان سے ملنے گیا، وہ شاید غسل کر رہے تھے، ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے، عصر کی نماز کا وقت آ گیا اور میں نے اور بھائی نے ان کے بنگلہ ہی میں نماز پڑھی، پھر وہ آ کر ملے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بیٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے، پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں اور تھوڑی دیر میں رخصت ہو کر آ گئے، میں تم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انگریزی لباس میں ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوئی۔

کلکتہ میں مولوی عبدالجبار صاحب وائسرائے سے عبا اور چوغہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر ملے

دوسرے روماء انگریزی لباس میں گئے تھے، تو وائسرائے نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب! آپ اس لباس میں شہزادے معلوم ہوتے ہیں، یہ لباس بڑی راحت کا ہے اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے، مگر ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں، ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔  
غرض ہم کو شریعت نے جو تعلیم دی ہے، اس پر چلنا چاہیے۔ (مظاہر الاموال صفحہ: ۲۳)

## باسٹھواں اعتراض..... علماء پر ایک اعتراض کا جواب!

مجھے اس وقت اس سے تو بحث نہیں کہ مسلمان کی ترقی انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے۔ یا نہیں؟ فرض کر لیجئے کہ اس پر موقوف ہے اور بدون اس کے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی، مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے۔ یا غلط؟ سو پوچھتا ہوں کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں؟ یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں؟ اور بتلائیے! کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں؟ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں، مثلاً جھوٹ بولنے سے، غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے سے۔ اگر مسلمان ”انگریزی“ علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھتے، تو ان کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھتے؟ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا، صرف اسی ایک بات میں اثر کیوں ہوا؟ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں، ان سے محنت نہیں ہوتی، یا افلاس کی وجہ سے ان کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کے لیے رقم نہیں، علماء کے منع کرنے سے کوئی نہیں رکتا ”الا ماشاء اللہ و هو نادر، و النادر کالمعدوم“، مگر آج کل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہے، گو حکایت تو فحش ہے، مگر مولانا نے اس بھی زیادہ فحش حکایتیں مثنوی میں لکھی ہیں اور ان سے علوم نکالے ہیں، اس لیے بیان کرتا ہوں۔

## ایک بھٹیاری کا قصہ

یہ قصہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں ٹھہرا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے کے لیے جنس دی، بھٹیاریاں اکثر جنس چرا کر لیتی ہیں، اس لیے سپاہی اس کے پاس مسلط ہو کر بیٹھ گیا، اس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بچا کر چرائوں مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا، اب اس نے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو ساتھ میں اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا کہ تو بھی کھالے، شریف آدمی کا دسترخوان پر سے کسی کو اٹھانا گوارا نہیں ہوتا، اس لیے سپاہی خاموش ہو گیا، اتفاق سے بھٹیاری کی رت زور سے

صادر ہوگی، اس کی خفت اتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھپ لگا یا کہ دو دمورے کھانا کھاتے ہوئے کیا کرتا ہے؟ سپاہی کو انتقام کا موقع ملا! اس نے قصداً تیرا صدارت صدارت کی اور زور سے ایک چیت لڑنے کو رسید کیا اور کہا، یاد رکھ! کرے گا کوئی، مگر پڑے گا تو ہی اس سے بھٹیاری کو بھی بتلا دیا کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں۔

بس یہی حال آج کل کے مسلمانوں نے علماء کا کر رکھا ہے کہ کرے کوئی، مگر الزام انہیں پر ہوگا! انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر! اور مسلمانوں کے تنزل و افلاس کا الزام بھی علماء پر! اور جاہل اور مرتد ہونے کا الزام بھی ان ہی پر! مسلمانوں کی ناقصی کا الزام بھی انہیں پر!  
(اصلاح ذات البین صفحہ: ۱۶)

ترسیٹھواں اعتراض..... اس اعتراض کا جواب کہ شریعت قید محض ہے!

ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں، ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں۔

ایک صاحب کانپور میں کوٹ، پتلون، بوٹ سوٹ سے کسے میرے پاس آئے، وہ بیٹھنا چاہتے تھے، کرسی پر وہ ہولت سے بیٹھ جاتے، لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں؟ ہمارے لیے تو چٹائی پر بیٹھنا نخر ہے، اب وہ کھڑے ہیں، لیکن کھڑے کھڑے بات کیسے کریں؟ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، چھڑی پر سہارا دے کر اور تاک لگا کر بھد سے گر پڑے، مجھے بڑی ہنسی آئی، بتلائیے کہ یہ تہذیب ہے یا تعذیب؟ یہ آزادی ہے، یا قید ہے؟ بیٹھنا تو مصیبت تھائی، اٹھنا اور بھی زیادہ مصیبت اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے اور لیجئے! اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجائے تو ہم دانے بھی چبا سکتے ہیں اور روٹی ہو تو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں اور ان کے لیے میز کرسی ہو، کاشا ہو، چھری ہو، جب یہ کھانا تناول فرمائیں، کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہے کہ پا جامہ نہ ہو، لنگی باندھ لیں گے، اچکن نہ ہو، کرت کافی ہے، ٹامبا نہ ہو، ٹوپی ہی سہی پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو، پھر حد و شرعیہ کی بھی قید نہیں کہ پا جامہ کشمیر کا ہو، لٹھے کا ہو، گاڑھے کا ہو، گزئی کا ہو، کسی شے کا ہونہ ہو، لنگی بھی کفایت کرتی ہے، ان کو یہ مصیبت ہے کہ پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو، تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو، قمیص بھی اس کے مناسب ہو، ورنہ فیشن کے خلاف ہے، کیونکہ صاحبو! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے! میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول سے آزاد ہیں، باقی نہ کھانے میں آزاد ہیں، نہ پہننے

میں آزاد، ہر بات میں مقید ہیں، اگر آزاد ہیں تو خدا اور رسول سے آزاد ہیں، تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی اور مبارک رہے ہم کو یہ قید اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو یہ حالت ہے:

اسیرش نخواستہ رہائی زبند  
شکارش نخواستہ خلاص از کمند

اور یہ وہ قید ہے:

گرد و صد زنجیر آری  
غیر زلف آن نگار مقہلم

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد محبوب کسی کو ملا ہو اور اپنے لطف و کرم سے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھلا لے اور اس کو نہ چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی؟ اس کو تو غیبت میں یہ حالت تھی کہ کہا کرتا تھا:

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم  
کہ شاد دوست من باردگر جانان من گیرد  
بھلا اب کیا حال ہوگا؟ بلکہ اگر محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں؟ تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا! جان بھی نہ چھوڑا رکھے گا:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ  
سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

پس جن کو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہے، کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھیں گئے؟ ہرگز نہیں! جس کسی کو محبت ہوئی ہوگی، وہی اس کا لطف جانتا ہے؟ ہاں جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو، وہ کیا جانے اس میں کیا لطف ہے۔ نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے؟ ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں، وہ چولھے میں ڈالے گا ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا ایسی عقل کو اور سر پر رکھے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں:

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم  
مست آن ساقی و آن پیانہ ایم

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہونا داری ہو، بیماری ہو، افلاس ہو، اس کو سب گوارا ہیں اور اول تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی اور بالفرض اگر ہو بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے، اطمینان ہے، اس کی زندگی لطف کی زندگی ہے، خواہ کسی حالت میں ہو، حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں:

”من عمل صالحاً من ذکر او انثی و هو مؤمن فلنجینہ حیاة طیبہ“

یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، اس کو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں، ان کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے، ان کے قلب میں سکون اور چین کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے:

سوئے نو میدی مرد کاسید ہاست

سوئے تاریکی مرد خورشید ہاست

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں اور ایسی قید کے مقابلے میں جو آزادی ہے، وہ نزی مہمل ہے اور سر اسخران ہے، خرمان ہے اور یہ آزادی بس خدا اور رسول سے آزادی ہے، ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔ (الاتفاق صفحہ: ۲۰)

چونسٹھواں اعتراض..... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی پر

### شبہات کا جواب!

ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق و التیام لازم آتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق و التیام کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے۔ اس وقت ان شاء اللہ ہم ان سب کا لغو ہونا ثابت کریں گے، چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلد میرساوات سے فارغ ہو کر واپس آ گئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی کہ یہ بحالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہو جائے، ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے؟ ہاں! استبعاد ہو سکتا ہے، سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک

زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے، چنانچہ رات دن کا آنا ”طلوع وغروب کا ہونا“ یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے، اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہوگا وہی رہے گا اگر رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی، دن موجود ہوگا تو دن ہی رہے گا، تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لیے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں، معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔

### معراج کا واقعہ

ہم جب حیدرآباد گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی سڑک پر لوگوں کو چلنے سے روک رہے ہیں، اس وقت سڑک پر سنانا چھایا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے، اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لیے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے، پس آفتاب جس جگہ تھا اسی جگہ رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے، کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا، اس میں کیا استبعاد ہے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے تو پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو، مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا، کیونکہ حرکت اس وقت موقوف ہو چکی تھی اب اگر کوئی دوام حرکت کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لزوم کو ثابت کرے ان شاء اللہ ایک بھی دلیل قائم نہ کر سکے گا۔

دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی رحمہ اللہ نے دیا ہے:

تن او کہ صافی تر از جان ماست

اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے، چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے، تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا، خیال کی حرکت بہت سربلج ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے، وہ مادیت کی طرح کثیف نہیں ہے، اس لیے اس کی سیر میں کوئی حاجب و مانع نہیں ہوتے تو مولانا نظامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک



اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہو آئے، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے، اس میں ہوانہ ہونے کے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا، تو آپ اگر اس میں سے گزرتے تو زندہ کیسے رہتے؟ مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس التزام کے یہ اس وقت ہے، جب متنفس کو اس میں کچھ مگسٹ بھی ہو، چنانچہ آگ کے اندر اگر جلدی جلدی ہاتھ نکالا جائے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سرعت سے اس خلا میں سے گزر جائیں تو وہ عدم متنفس میں مؤثر نہ ہوگا اور ذیل ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔

”و اللہ ما فقد حسد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ الاسری“

کہ بخدا! شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفتوق یعنی غائب نہیں ہوا، اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھی؟ (تیز اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی، شاید چار پانچ سال کی ہوں اور اگر معراج ۵ نبوی میں ہوئی جیسا کہ زہری کا قول ہے، تو وہ اس سال پیدا ہوئی ہوں گی) اس لیے اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے، مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بے تحقیق ایک بات فرمادی ہم ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر یہ گمان نہیں کریں گے کہ نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہو سکتی ہے یہ مانا کہ وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کس نہ بھی تھیں، مگر جو بات وہ فرما رہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں یقیناً تحقیق کے بعد فرما رہی ہیں، ہاں! یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرما رہی ہوں کیونکہ تعدد ہے، تو پھر کچھ بھی مضاقت نہیں۔

میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے، وہ بہت لطیف ہے، وہ یہ کہ فقدان (۱) کے دو معنی ہیں، ایک تو چیز

(۱) اور اگر فقدان کے وہی معنی لیے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب معراج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے، کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے، نہ کہ لازم، اس کے معنی غیبت و انفصال کے نہیں، بلکہ گم کرنے کے ہیں، جس کے لیے اس کا فائدہ اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور پھر روایت درست ہے، کیوں کہ آپ سب گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی جو کہ عادتاً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت

کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا ہٹ جانا، دوسرے تلاش کرنا (۲) چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے: ”فالمرء اقبلو علیہم ماذا تفقدون“ یعنی برادران حضرت یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر نندا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو؟ یہاں فقدان کے معنی طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں، پس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش کی جاتی، یہ مطلب نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات میں اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے، تاکہ اس سے محراب منامی یا کشتی پر استدلال کیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ گھر سے جدا تو ہوئے، مگر زیادہ دیر نہیں لگی، جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ (الرفع والوضع صفحہ ۳۴)

(گزشتہ سے پیوستہ حاشیہ)

تھا، پھر جاننے کے وقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود اگر گھر والوں کو صبح کی نماز کے لیے بگایا تو ایسا نہیں ہو کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات مفقود ہونے کے لیے ضروری ہے، ”قلت و لعل هذا هو مراد الشيخ فعبہ بالفتیش و الافال فقدان غیر التفقد، نعم و هو يستدعی فاقدا کما لا یخفی“

(۲) احقر اشرف علی کے ذہن میں پہلا حاشیہ دیکھ کر ہی یہ تاویل آگئی تھی، مگر اب اس تاویل کی اس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں، وہ یہ کہ فقدان کے معنی تو گم ہی کرنے کے ہیں، مگر اس کے دودر رہے ہیں، ایک مطلق گم کرنا ایک اور ایسا گم کرنا جس کے بعد اس کی تلاش میں لگ جائے، پس پہلا درجہ مفقود مطلق سے اور دوسرا درجہ مفقود مقید، پس اس حدیث میں ”وسر ادجہ مراد ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آئی ہو، کیونکہ ”ما زفقدا کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقہ کی اطلاع بھی نہیں ہوئی، پس متن میں میری عبادت میں ہٹ جانے کو پہلے درجہ پر اور تلاش کرنے کو دوسرے درجہ پر محمول کیا جائے تو اب معنی لغوی کے خلاف نہیں ہوا اور بنا، یہ قواعد تصوف یہ بھی ممکن ہے کہ جسم عنصری ملکوت میں پہنچا ہوا اور جسم مشائی ناسوت میں رہا ہو، اس کے دیکھتے ہوئے کسی نے اس کو جسم عنصری سمجھ کر ما فقدا کا حکم کر دیا ہو اور موتی بات ہے کہ اگر محراب جسم عنصری سے نہ ہوئی تو اتنا انکار اس پر نہ ہوتا اور اگر غلط فہمی سے ہوتا تو آپ بھی جواب دے دیتے کہ میں جسد عنصری سے دعویٰ نہیں کرتا کہ اس پر اس قدر استیجا کیا جائے۔

احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ بعد میں تفسیر تہویر المقیاس میں جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف منسوب ہے ”ما ذا تفقدون“ اور ”تفقدون“ کی تفسیر ”ماذا تصلوبون“ اور ”تطلب“ کے ساتھ میری نظر سے گزری اور یہ تفسیر بالکل اسی معنی کے مطابق ہے جو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں، کیونکہ طلب کے معنی تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کے ہی ہیں اور بظاہر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ تفسیر بالذم ہے کیونکہ فقدان اکثر

سینسٹھواں اعتراض..... تبلیغ کے لیے چندہ جمع کرنے کا کام علماء کے

### سپر ڈنہیں کرنا چاہیے!

میں کہتا ہوں کہ علماء یہ کام ہرگز نہ کریں، بلکہ روسا، و عوام خود چندہ کریں اور مولویوں سے دین کا کام لیں، مگر آج کل علماء کی مثال ڈوم کے ہاتھی جیسی ہو رہی ہے، کہ اکبر نے ایک ڈوم کو ہاتھی انعام میں دے دیا تھا، وہ بڑا گھبرایا کہ میں اس کا خرچ کہاں سے لاؤں گا؟ آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی کہ گلے میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا، اکبر نے دیکھا شاہی ہاتھی گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے، پوچھا یہ کیا قصہ ہے؟ ڈوم کو بلایا گیا کہ تم نے اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول کیوں لٹکا یا ہے؟ کہا، حضور! آپ نے مجھے ہاتھی تو دے دیا، اب میں اسے کھلاتا کہاں سے؟ میں نے اس سے کہا کہ بھائی! میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں، تو ڈھول گلے میں ڈال کر گا بجا کر اپنا پیٹ بھر لے، اکبر نہیں پڑا اور ڈوم کو اس کی امداد کے لیے بھی عطا فرمایا۔

یہ حال آج کل مولویوں کا ہے کہ لوگوں نے ان کو گلے میں ڈال دیا ہے کہ جاؤ گاؤ بجاؤ اور

(گزشتہ سے پیوستہ حاشیہ)

طلب کو مستزم ہوتا ہے لہذا ملزم کی تفسیر لازم سے فرمادی، لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ گاہے فقہان سے طلب و فتنش بھی مراد ہوا کرتی ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول میں بھی اس معنی کا احتمال ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا: ”و اذا جاء الاحتمال بطل الا سندلال“ اور ہر چند کہ تفسیر تنویر المقیاس اکثر محدثین کے نزدیک معتبر نہیں، کیونکہ اس کے راوی کجی اور ان کے شاگرد محمد بن مروان سدی صغیر مجروح ہیں، مگر سیوطی نے القان“ میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے:

”لکن قال ابن عدی فی الکامل للکلبی احادیث صالحہ و خاصة عن ابی صالح وهو معروف بالتفسیر و لیس لاحد تفسیر الحول منه و الا شح“ (جلد ۲، صفحہ ۱۶۲)

جس سے فی الجملہ اس کی تقویت ہوتی ہے، دوسرے یہ مسئلہ کوئی احکام کی قبیل سے نہیں جس میں راوی کا مجروح ہونا معتبر ہو، بلکہ از قبیل نقل لغت ہے، جس میں بہت وسعت ہے۔

”فانہم و اللہ اعلم، و انما اطلبنا الکلام فی هذا المقام لیظہر لک نعمة اللہ علی حسانتنا و له الحمد انہا لا تقبل اقوال اکابرہا فی تفسیر معانی القرآن الا بعد ظہور مطابقتہا الاقوال السلف و ان اکابرہا لا تکذبون لا براد الا صاعر علیہم اذا کان بالادب لاجل الطلب و لیظہر لک حسن ذوق حضرت حکیم الامہ فی التفسیر بحیث لا ینخطی عن الصواب و لوقال شیخا بغير مطالعة الكتاب“ (تمت الحاشیہ)

روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو، یاد رکھو! ایک جماعت سے دو کام نہیں ہو سکتے، کام کا طریقہ یہی ہے کہ روپیہ تم خود جمع کرو اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو، بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو، علماء کو روپیہ دو بھی نہیں، کیونکہ آج کل بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو واقع میں مولوی نہیں تھے، مگر مولویوں میں جا گھسے، انہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانیتیں کی ہیں جس سے مولوی بدنام ہو گئے، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ روساء چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں، مولویوں کو نہ دیں، کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے، تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں؟ ہرگز نہیں! آپ کو تو چاہیے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں تو آپ ان کو خود روکیں کہ یہ کام آپ کے مناسب نہیں، یہ کام ہم خود کریں گے، بلکہ ایک صورت سب سے اچھی یہ ہے کہ ایک ایک رئیس ایک ایک مبلغ کی تنخواہ نہ دے سکے تو دو چار مل کر ایک مبلغ رکھ لیں اور اس کا حساب خود اپنے پاس رکھیں، یہ صورت تو روپے کے انتظام کی ہے۔ رہا تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ یہ علماء کی رائے سے ہونا چاہیے کہ تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو اور مبلغ بھی ان کی رائے سے مقرر کرو، پھر جس طرح وہ بتلائیں اس کے موافق کام کرو، اس مشورہ کے لیے ایک کمیٹی بناؤ، علماء کو اس میں مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس سے انکار نہ کریں، پھر اس طرح اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں، ان شاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی، گوادل اول دقتیں بھی پیش آئیں گی مگر دقت سے نہ گھبرا سکیں، پیادہ سفر کرنے کی ضرورت نہیں، سواری میں سفر کریں، جہاں ریل ہو وہاں ریل سے پہنچیں، ورنہ گاڑی پہلی سے جائیں، باقی فنن اور موٹر کی ضرورت نہیں نہ لین اور برف کی ضرورت ہے، ان فضولیات میں پیسہ قوم کا برباد نہ کرنا چاہئے، آپ کا تو ایرنگ ہونا چاہیے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگون باشی  
بے زر و کسب بھد حشمت قاروں باشی  
در رہ منزل لیلی کہ خطر ہاست بجائ  
شرط اول قدم آنت کہ مجنوں باشی

(اعلم، الخ، صفحہ ۲۱)

چھیا سٹوال اعتراض..... نسب نامے نہ تو محض بیکار ہیں اور نہ ہی مدار نخر ہیں!

حق تعالیٰ نے مختلف خاندانوں اور قوموں کے بنانے میں یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس سے تعارف اور شناخت ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قریشی ہے، یہ انصاری

ہے، یہ صدیقی ہے، فاروقی ہے، اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو امتیاز سخت دشوار ہوتا، کیونکہ تا سکونت میں اکثر توار دہوتا ہے، ایک ہی نام کے بہت سے آدمی ہوتے ہیں، تو کسی قدر تو جائے سکونت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک دہلوی ہے، ایک کھنوی ہے، پھر ایک شہر میں بھی اک نام کے بہت سے ہوتے ہیں، تو محلوں کے نام سے امتیاز ہو جاتا ہے کہ ایک محلہ خیل کا رہنے والا ہے، پھر وہاں بھی ایک نام کے دو تین ہوتے ہیں تو قبائل کی طرف نسبت سے امتیاز ہو جاتا ہے، یہ حکمت ہے اختلاف قبائل کی۔

مگر آج کل ہمارے بھائیوں نے اس کو مدارفخر بنا لیا ہے اب یہاں دو قسم کے لوگ ہو گئے، بعض نے تو نسب و شرف کی جڑ ہی اکھاڑ دی، ان کو اس سے شہہ ہوا کہ اس آیت میں اختلاف قبائل کی حکمت صرف تعارف بتلائی گئی ہے اور حکمتوں سے سکوت کیا گیا ہے تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس اس میں اور کچھ حکمت نہیں، لان السکوت فی موضع الیسان، اس پر نظر کر کے بعض نے تو شرافت نسب کا ہی انکار ہی کر دیا کہ اس سے شرف کچھ نہیں ہوتا، بلکہ جس طرح دہلوی، کھنوی، ہندوستانی، بنگالی، برہمی یہ سب نسبتیں تعارف کے لیے ہیں اور ان سے کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح قریشی، انصاری سید، فاروقی، عثمانی وغیرہ یہ نسبتیں بھی شناخت کے لیے ہیں، ان سے بھی کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس شرف عربی سے محروم ہیں، ان میں سے بعض نے تو اپنے کو شریف ثابت کرنا چاہا ہے، چنانچہ ایک قوم نے اپنا عرب ہونا ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ ہماری اصل راعی ہے، چونکہ یہ لوگ جانور پالتے ہیں، اس لیے ان کو راعی کہا گیا، پھر غلط عوام سے لفظی تغیر ہو گیا، اسی طرح بعضوں نے اپنے آپ کو خالد بن ولید کی اولاد میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح وہ عرب بنا چاہتے ہیں، مگر اس ترکیب میں تکلف تھا، کیونکہ تاریخ سے تو اس کا کچھ ثبوت نہیں ملتا محض قیاسات بعیدہ سے کام لینا پڑتا ہے، جس سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے، اس لیے بعض نے اپنے نقض کو بوں دور کرنا چاہا کہ اہل شرف ہی سے اس شرف کی نئی کردی کہ شرافت نسبت کوئی چیز نہیں، بعض نے اس نئی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے:

الناس من جهة التماثل اكفاء

ابوہم ادم و الام حواء

و ما الفخر الا لاهل العلم انہم

علی الہدی لمن استہدی اولاء

”آدمی صورت کے اعتبار سے سب برابر ہیں، کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں

حواء علیہ السلام ہیں، پس اہل علم کے سوا کسی کے لیے فخر نہیں ہے، کیونکہ وہی ہدایت پر بھی ہیں اور طالب ہدایت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔“

اس سے بعض وہ حضرات جو نبی شرف نہیں رکھتے اور علم حاصل کر چکے ہیں اس پر استدلال کرتے ہیں کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں، بس شرف اگر ہے تو علم سے ہے، سو اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے یا نہیں؟ پھر جس کا بھی قول ہے، مطلب نفی فخر ہے، نسب پر فخر نہ کرنا چاہیے، کیونکہ وہ امر غیر اختیاری ہے اور اس پر فخر نہ کرنا چاہیے، مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حسن صورت اور سوا نکاح ہونا نعمت بھی نہیں؟ یقیناً اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے، اسی طرح یہاں سمجھو کہ گو شرف نسب بوجہ امر غیر اختیاری ہونے کے سبب فخر نہیں، مگر اس کے ثبوت ہونے میں شبہ نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی ہے، انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ایک حدیث میں ہیں:

”الناس معادن كمعادن الذهب و الفضة، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا“

کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں، اسی طرح آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں جن میں بعض سونے کے مشابہ ہیں، بعض چاندی کے، بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں، پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے ہیں، وہی اسلام کے بعد بھی اچھے ہیں، جب کہ علم حاصل کر لیں، بعض نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں قید ”اذا فقهوا“ اہل انساب کو مضر ہے کہ اس میں مدار فضل فقہ کو فرمایا، مگر کچھ بھی مضر نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد حجازی فی الجاہلیہ کو حجازی فی الاسلام فرما رہے ہیں، تو فقہ کے بعد مساوات نہ رہی بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیہ غیر صاحب نسب، فقیہ صاحب نسب کے برابر نہیں، بلکہ فقیہ صاحب نسب افضل ہوگا تو کوئی تو بات ہے جس سے وہ خیار ہوئے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ صاحب نسب جاہل سے غیر صاحب نسب عالم افضل ہے، اس کا ہم کو انکار نہیں، مگر حدیث سے اتنی بات معلوم ہوگئی کہ شرف نسب بھی کوئی چیز ضرور ہے جس کے ساتھ علم و فضل جائے تو صاحب نسب غیر صاحب نسب سے بہتر ہوگا، نیز حدیث میں ہے: ”الائمة من قریش“ کوئی تو وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امارت کو قریش کے ساتھ مخصوص فرمایا، معلوم ہوا کہ اہل انساب میں شان متبوعیت دوسروں سے زیادہ ہے ”انسا النسبی لا کذب انا بن عبدالمطلب“ جب جنگ حنین میں حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پیر اکھڑے گئے اور وہ پیچھے ہٹنے لگے تو آپ نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میں نبی ہوں، یہ جھوٹ بات نہیں ہے (اس لیے میرا غلبہ یقینی ہے) اور میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں،

یعنی میں خاندانی اور صاحب نسب ہوں، میں ہرگز پسا نہ ہوں گا تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحب نسب ہونے پر فخر کیا ہے اور دشمن کو ڈرایا ہے کہ تو اپنے مقابل کو کم نہ سمجھنا وہ مجھنا وہ خاندانی ہے، جس کی بہادری سب کو معلوم ہے، اگر اشرف نسب کوئی چیز نہیں ہے تو آپ نے ”ابا بن عبدالمطلب“

کیوں فرمایا؟ نیز ایک حدیث میں ہے: ”ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراہیم اسمعیل و اصطفیٰ من ولد اسماعیل بنی کنانہ، واصطفیٰ قریشا من کنانہ، واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم، واصطفانی من بنی ہاشم“ (رواہ مسلم والترمدی)

یعنی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو انتخاب فرمایا (اس سے عرب کی فضیلت عجم پر ثابت ہوئی، کیونکہ اسماعیل علیہ السلام ابو العرب ہیں اور ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے: ”احتمار اللہ العرب من بین الانام“ اور اسماعیل علیہ السلام کو اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو منتخب کیا اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو منتخب کیا اور ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

”ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیرہم (ای الانس) ثم جعلہم فرقتین، فجعلتہ فی خیرہا فرقة (ای العرب) ثم جعلہم قبائل، فجعلتہ فی خیرہم قبيلة (ای قریش) ثم جعلہم بیوتا، فجعلتہ فی خیرہم بیتا (ای بنو ہاشم) فانا خیرہم نفسا و خیرہم بیتا“ (رواہ الترمدی)

اس نص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسب مطلق کرم سے خالی نہیں، گو اکرم ہونے کو سب کرم نہ ہو، کیونکہ ”اکرمیت“ کا مد ارتقوی ہے: ”ان اکرم کم عند اللہ اتقکم“ مگر اس کرم بالنسب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے کام کو نسب ہی میں منحصر کر دیا جائے جیسا کہ اہل قصبات کی عادت ہے، یہ دوسری جماعت ہے جس نے نسب کے بارے میں افراط و تفریط کیا ہے، جیسا کہ پہلی جماعت نے تفریط کی تھی اہل قصبات نے فخر بالانساب ہی پر قناعت کر لی ہے: ”الاکرمیہ بالاعلمیة والاعملیة“ (صفحہ: ۵ تا ۹ ملخصاً)

سر سٹھواں اعتراض..... نماز کی برکتیں اور اس کے نہ پڑھنے پر ترہیب!

اس وقت واقعی طور پر ان کو حی علی الفلاح کا ادراک ہوتا ہے کہ نماز عجیب راحت کی چیز ہے، یہ تو نماز میں فلاح عاجل باطنی ہے اور اس کے علاوہ نماز میں ظاہری فلاح عاجل بھی بہت کچھ ہے،

چنانچہ نماز میں ایک یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کو فضول مجالط فضول مقامات لگا لگا کر ایذا دینا چاہے تو نماز شروع کر دو، جب تک نماز پڑھتے رہو گے کوئی تمہیں کچھ نہ کہے گا، دوسرے اگر تم کسی آنے والے کی تعظیم نہ کرنا چاہو اور تعظیم نہ کرنے میں خطرہ کا اندیشہ ہو تو اس کو آتا ہوا دیکھ کر نماز قطع کر دو، اس طرح تعظیم سے بھی بچے رہو گے اور دوسرے کو اپنی بے تعظیمی کا خیال نہ ہوگا، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ نماز میں انسان دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، تیسرے اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس طرح خلوت اختیار کروں کہ گوشہ نشین بھی مشہور نہ ہوں کیونکہ اس شہرت کے بعد پھر خلوت نہیں رہ سکتی، لوگ جگ کرتے اور جھوم کرنے لگتے ہیں تو اس کی سہل صورت یہ ہے کہ ہر وقت نفل نماز پڑھا کرے، ہمارے ایک عزیز بزرگ نے جو مشرب سماع رکھتے تھے، اسی طرح خلوت اختیار کی تھی کہ بیٹھک ہی میں عام منظر پر رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے تھے، جب کوئی ملنے آیا تو سلام کے بعد دو چار باتیں خیریت کی پوچھ لیتے اور پھر نماز شروع کر دیتے تھے، مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا کہ نہ وہ بد اخلاق مشہور ہوئے، کیونکہ جو کوئی بھی آتا تھا، اس سے ضرورت کے قدر مل بھی لیا کرتے تھے اور نہ عزت گزرتی میں فرقی آیا اور نہ خلوت نشین مشہور ہوئے جو عوام کا جھوم ہوتا، ایک برکت نماز کی یہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے سلاطین اور رؤساء کی برابری ہو جاتی ہے۔

### نماز میں مساوات

ایک انگریز علی گڑھ کالج میں گیا تو وہاں دیکھا کہ رئیسوں کے لڑکے پڑھتے ہیں، مگر خدمت کے وہ نوکر دور کھڑے رہتے ہیں، آقا کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتے اور نماز کے وقت آقا کے برابر کھڑے ہوتے ہیں، اس نے ان رئیس زادوں سے دریافت کیا کہ نماز میں برابر کھڑے ہونے سے یہ ملازم گستاخ نہیں ہو جاتے؟ انہوں نے کہا مجال ہے جو نماز کے بعد ہماری ذرا بھی برابری کر سکیں، اس وقت کا حق یہی ہے کہ سب برابر ہوں اور دوسرے وقت کا دوسرا حکم ہے، اس کو اس سے بڑی حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو نوکر نماز پڑھتا ہے، حالانکہ وہ نماز میں آقا کے برابر بھی ہو جاتا ہے، مگر پھر بھی اس میں امتیاد کی صفت بڑھ جاتی ہے، یعنی وہ آقا کی خدمت اور اس کے حقوق کی بجائے اور بے نماز نوکر سے زیادہ کرتا ہے۔ واقعی یہ بات مشاہد ہے کہ دیندار آدمی جیسے خدا تعالیٰ کے حقوق ادا کرتا ہے، بندوں کے حقوق بھی خوب ادا کرتا ہے، نماز کی ایک برکت یہ ہے کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے، اطباء بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اخلاق حمیدہ و افعال حسنہ کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑتا ہے اور افعال بد سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تجربہ



کر کے دیکھ لیا جائے کہ ایک آدمی نمازی ہو اور ایک بے نمازی، تو نمازی کی بے نمازی سے ضرور اچھی ہوگی۔ (مگر دونوں یکساں قوی اور قریب قریب بدن کے لینے چاہئیں کہ ایک حدیث سے تو جو ان ماجہ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے گو محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ذریعہ سے بعض امراض کا علاج کیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیٹ میں درد تھا، وہ آہ آہ کر رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے اور فارسی میں فرمایا: شکمت درد۔؟ "قال: نعم! قال: قم فصل فزال وجع بطنہ" کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے؟ کہا، ہاں۔ فرمایا: "کھڑے ہو کر نماز پڑھو" چنانچہ نماز پڑھتے ہی درد زائل ہو گیا، چونکہ یہ مسئلہ احکام میں سے نہیں اس لیے ضعیف حدیث اس میں مضر نہیں، میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتا کہ نماز پڑھنے سے ہمیشہ درد زائل ہو جائے گا ممکن ہے کہ کسی عارض سے اس نفع کا ظہور نہ ہو، مگر یہ تو ضرور ہے کہ نماز سے ایک خاص سرور و نشاط اور قلب کو راحت حاصل ہوتی ہے، جس کا اثر صحت پر بھی ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ہم کو اس کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ نماز سے راحت و سرور کیوں ہوتا ہے؟ کیونکہ ہر اثر کے لیے کسی علت کا ہونا ضروری نہیں ہے بعض چیزیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، دیکھئے! مقناطیس میں جو جذب حدید کی خاصیت ہے، اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے جس کی علت بتلانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔

## جماعت کی اہمیت

انسوس! اتنی بڑی عبادت جس میں فلاح اخروی بھی ہے اور فلاح دنیوی بھی ہے اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہم کو پکارتا ہے اور ہم جماعت میں نہیں آتے، حالانکہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"ولقد هممت ان امر بالصلوة..... الى ان قال..... احرق بيوتهم بالنار" کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایک شخص کو امام بناؤں، پھر چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دیکھو کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے، پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے گھر پھونک دو اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو پھونکا نہیں، مگر چاہا تو تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: "انسی اری ربك بسارع في هوك" کہ میں

حق تعالیٰ کو دیکھتی ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو بہت جلد پورا کر دیتے ہیں اور بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان کیوں نہ ہو؟ جب ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے:

تو چنینں خواہی خدا خواہد چنینں

می دہد یزداں مراد متقیں!

تو معلوم ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا چاہا ہے تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے۔ اب بتاؤ! جس کے گھر کو خدا اور رسول پھونکنا چاہیں وہ کیونکر بیچ سکتا؟ تو جو لوگ جماعت میں نہیں آتے، ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے۔

شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں چلا؟ وہ تو اچھا خاصا موجود ہے، تو اس کے متعلق مولا ناروم کا جواب سن لو! فرماتے ہیں:

آتشی گر نامدست این دود چپست

جاں سیه گشت دوراں مردود چپست

یہ تھوڑی آگ لگی ہے جس کے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا ہے اور چہرہ پر وحشت و ظلمت برس رہی ہے، اس حکمت طلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک اثر ہوتا ہے جس سے اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے، نمازی کے چہرہ پر بخونور ہوتا ہے، اس کے چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے اور بے نمازی کے دل میں جو ظلمت ہے، اس کے چہرہ کی بد روئی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگ ضرور لگی ہے، اسی کا یہ دھواں ہے جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے۔

(الاکرمیہ صفحہ: ۲۲۹ ملخصاً)

## اڑ سٹھواں اعتراض..... اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت!

اتحاد مطلوب کے دو درجے ہیں۔ ایک اس کا حدوث۔ دوسرے بقاء۔ میں دونوں درجوں کے اسباب بیان کروں گا کہ حدوث اتحاد کی بنیاد کیا ہونی چاہیے؟ اور اس کے بقاء کا کیا طریقہ ہے؟ اور وہ اسباب ایسے ہیں جو شرعی پہلو سے بھی ظاہر ہیں اور عقلی پہلو سے بھی اور اسباب بقاء کی تحقیق زیادہ اہم ہے، اس لیے کہ آج کل ہم لوگوں میں اتحاد و اتفاق تو پیدا ہوتا ہے، مگر باقی نہیں رہتا، میں اس کا سبب شرعی پہلو سے بتلاؤں گا، جو عقل کے بھی مطابق ہے، گو مجھے عقل کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کیونکہ عقل باندی ہے اور شریعت سلطان ہے، پس عقل کی تائید سے شریعت کی بات کا ماننا ایسا ہے جیسے غلام کی ”جی ہاں“ کوسن کر بادشاہ کی بات کو مانا جائے اور

اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے، بادشاہ کی بات خود حجت ہے، غلام کی تصدیق سے اس کو بجا سمجھنا سراسر حماقت ہے، مگر کیا کیا جائے آج کل عقل پرستی کا غلبہ ہے، لوگوں کی سمجھ میں وہی بات آتی ہے جو عقل کے مطابق ہو، اس لیے تبرعاً میں عقلی پہلو سے بھی ان اسباب کو بیان کروں گا کہ میرا اصلی مذاق اس کے خلاف ہے۔

پس سینے کہ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ ہم لوگوں میں اتحاد باقی نہیں رہتا، بلکہ ایک اتحاد ہی کیا ہے؟ مجھے تو ایسی بدگمانی ہے کہ جب میں سنتا ہوں کہ مسلمانوں نے کوئی کام شروع کیا ہے تو سب سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے کہ دیکھئے! استقلال کے ساتھ چلے گا بھی یا نہیں؟ کیونکہ میں رات دن دیکھتا ہوں کہ نہ ہمارے کارخانے چلتے ہیں، نہ انجمنیں، نہ مدرسے، نہ اتحاد و اتفاق، ہاں! ایک چیز ہمیشہ چلتی ہے، وہ کیا؟ جوتا اور لٹھ! یہ ایک بار جہاں چلا عمر بھر چلتا رہتا ہے، چاہے اس کی بنیاد کبھی ہی کمزور ہو، مگر شاخیں مضبوط ہو جاتی ہیں، جیسے عرب میں جاہلیت کے زمانہ میں ایک گھڑ دوڑ ہوئی تھی جس میں ایک فریق کا گھوڑا آگے نکل گیا تھا تو اسی بات پر صدیوں لڑائی رہی، ہماری حالت آج کل اہل جاہلیت کی حالت کے مشابہ ہے کہ جہاں ذرا سی بات پر جوتا چلا پھر وہ برسوں تک چلتا رہتا ہے، باقی اتحاد و اتفاق، اس کی عمر ہمارے یہاں بہت تھوڑی ہے، گو یکپہرہ حدود اتحاد کی بہت کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس پر تقریریں بہت ہوتی ہیں، مگر آج تک کسی نے بقاء اتحاد کے اسباب بیان نہیں کیے نہ عدم بقاء کے اسباب کو مرتفع کیا، حالانکہ سب سے پہلے یہ مسئلہ قابل غور تھا، اس لیے اس وقت میں اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی کے ضمن میں اسباب صحیحہ حدود کے بھی مذکور ہو جائیں گے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ“ (مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں)، (پس اگر کبھی ان میں نزاع ہو تو) اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادیا کرو، یہاں ”فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ“ میں اس پر تنبیہ ہے کہ بچپوں کو کسی ایک فریق کی اعانت نہیں کرنا چاہیے، بلکہ دونوں کو اپنا بھائی سمجھ کر اس طرح صلح کرانا چاہیے جیسے حقیقی دو بھائیوں میں صلح کرائی جاتی ہے کہ ان میں سے کسی کا نقصان گوارا نہیں ہوتا اور صلح کا یہ طریقہ نہیں جو آج کل رائج ہے کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ با دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ جس کا حق ہوتا ہے اس کو بھی دیا جاتا ہے، بلکہ صلح کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ جو حق پر ہو اس کو غلبہ دیا جائے اور جو حق پر نہ ہو، اس کو

دیا جائے، کیونکہ صاحب حق کو دباننا اضرار ہے اور غیر صاحب حق کو دباننا اضرار نہیں، اس میں تو اسے اضرار سے روکتا ہے۔

### اصلاح کا طریقہ

مگر آج کل عجیب دستور ہے کہ صاحب حق و غیر صاحب حق دونوں کو دباتے ہیں، سو یہاں اصلاح سے یہ مراد نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے ارشاد ہے: "وَأَنَّ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا تَيْنَهُمَا قَانَ بَعَثَ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبِعْتِ حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنَّ فَاتًا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْبَطُوا إِلَى اللَّهِ لِيُنْجِبَ الْمُفْسِدِينَ"

یعنی اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں یا ہم لڑنے لگیں تو دونوں میں (اول) صلح کرو، پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو جو زیادتی اور ظلم کرے تو اس سے مل کر قتل کرو، یہاں تک کہ وہ حکم الہی کی طرف واپس آجائے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حکم الہی کے موافق فیصلہ کیا جائے اور یقیناً صاحب حق کو دباننا حکم الہی کے خلاف ہے، پس اگر فریقین حکم الہی کے مطابق فیصلہ پر راضی ہو جائیں تو فیہما، جو ظلم پر کمر بستہ ہو اور دوسرے کا حق مارنا چاہتا ہو سب کو اس سے لڑنے کا حکم ہے، یہ حکم نہیں ہے کہ بس جس طرح ہو صاحب حق کا گلا گھونٹ گھانٹ کر لڑائی موقوف کرادو، آج کل لوگوں نے اصلاح اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ بس لڑائی موقوف ہو جائے، چاہے صاحب حق کو ہی دبا یا جائے، مگر شریعت نے اس کو اصلاح ہی نہیں سمجھا بلکہ شرعاً اصلاح یہ ہے کہ حق بخندار رسد اور جو دوسرا فریق حق میں پس و پیش کرے تو پھر یہ حکم ہے کہ سب مل کر اس کو دباؤ اور لڑائی کی ضرورت ہو تو اس سے لڑو، اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح میں بعض دفعہ سختی اور قتل کرنا بھی مستحسن ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نا اتفاقی کی غرض سے اتفاق کرنا تو برا ہے اور اتفاق کی غرض سے نا اتفاقی کرنا جائز بلکہ واجب ہے، مثلاً چار آدمی اس غرض سے اتفاق کریں کہ پانچویں سے نا اتفاقی کریں گے یہ مذموم ہے اور یہیں سے معلوم ہو گیا کہ اگر خدا تعالیٰ سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق ہو، یعنی معاصی پر اجتماع ہو تو وہ کیوں برائہ ہوگا؟ یقیناً یہ اتحاد سب سے بدتر ہے، مگر آج کل لوگوں نے اتفاق کا نام یاد کر لیا ہے اور اس کو مطلقاً محمود سمجھتے ہیں، حدود کی رعایت نہیں کرتے یہ بالکل غلط ہے، شریعت میں نماز تک کے لیے حدود ہیں کہ طلوع و غروب اور دوپہر کے وقت اور بغیر استقبال قبلہ کے نماز

حرام ہے، اسی طرح ذکر اللہ کے لیے حدود ہیں کہ ذکر میں نیند آ جائے تو سونے کا حکم ہے۔ اس وقت ذکر ممنوع ہے، شریعت کا مقصود ان حدود سے یہ ہے کہ بندہ کو غلام ہونا چاہیے، جس وقت جو حکم ہو اس کا انتقال کرے، چاہے عبادت کا حکم ہو یا ترک عبادت کا، پس وہ شان ہو:

من چوں کلکم در میان اصبعین  
عیستم در صف طاعت بین بین

### اتحاد کے لیے حدود

قلم کی خوبی یہ ہے کہ جب چلائیں تو چلے اور جب روکیں رک جائے، کیونکہ قلم اگر روکے سے بھی نہ رکے تو حرف بگڑ جاتے ہیں، اسی طرح عبادات حدود شرعیہ کے خلاف معاصی ہیں، اس لیے حکم ہے کہ نیند کے وقت ذکر موقوف کر کے سو رہو، تو اتنی بڑی چیز غیر مستحسن ہونے کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا وہ بھی ایک وقت میں ترک حدود کی وجہ سے مذموم ہو جاتی ہے، تو اتحاد کے لیے حدود کیوں نہ ہوں گی؟ اور ان حدود کے خلاف جو اتحاد ہو وہ مذموم کیوں نہ ہوگا؟ پس اتحاد کی بھی ہر فرد مستحسن نہیں اس کو علی الاطلاق محمود کہنا اتحاد کا ہیضہ ہے، افسوس! آج کل اتحاد کے فضائل بہت بیان کیے جاتے ہیں، مگر اس کے حدود و اصول بیان نہیں کیے جاتے۔

پس خوب سمجھ لو کہ خدا سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق کرنا مذموم اور نہایت مذموم ہے، پس اس سے اس اتحاد کا حکم سمجھ لیا جائے جس میں اتحاد کے لیے شریعت کے احکام کو چھوڑا جاتا ہے۔ صاحبو! جیسے اتفاق مستحسن ہے، ایسے ہی کبھی نا اتفاقی بھی مستحسن ہے پس جو لوگ خدائے تعالیٰ کے احکام چھوڑنے پر اتفاق کریں ان کے ساتھ نا اتفاقی کرنا اور مقابلہ کرنا محمود ہے۔

دیکھو! جیسے عمارت بنانا محمود ہے، ایسے ہی بعض عمارت گرانا بھی محمود ہے، اگر آپ اپنی رعایا سے کوئی مکان خریدیں اور اس میں بجائے کچے کوٹھروں کے عمدہ کوشی بنانا چاہیں تو ایسی عمارت کو گرائیں گے یا نہیں؟ یقیناً گرائیں گے! اب بتائیے یہ نساؤ محمود ہے یا مذموم؟ اس کے محمود ہونے میں کسی عاقل کو کام نہیں ہوتا، پھر کسی موقع پر نا اتفاقی کے محمود ہونے میں کیوں شبہ ہے؟ اس لیے حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح بھی صلح کرو، بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ صحیح بنیاد پر صلح کرو اور اگر لوگ اس پر راضی نہ ہوں تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھا دو، پھر قتال کے بعد طائفہ باغیہ حق کی طرف رجوع ہو جائے تو حکم یہ ہے: ”فَيَا فَيَاءٌ فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسَمُوا“ یعنی اب پھر ان معاملہ کی انصاف کے ساتھ اصلاح کرو، یہ نہیں کہ بس لڑائی موقوف ہوتے ہی ان کا

مصافحہ کرادو، اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں، بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں نزاع ہو، فوراً دونوں کا مصافحہ کرادیا جائے، چاہے فریقین کے دل میں کچھ ہی بھرا ہو، میں کبھی ایسا نہیں کرتا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلے معاملے کی اصلاح کرو، ورنہ بدون اصلاح معاملہ کے نما مصافحہ بیکار ہے، اس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا تو مصافحہ کے بعد پھر مکافحہ شروع ہو جاتا ہے، یعنی مقاتلہ تو حق تعالیٰ نے: ”فآءت“ کے بعد یہ نہیں فرمایا: ”فکفو الیدیکم“، کہ زیادتی کرنے والا حق کی طرف رجوع ہو، پس تم ہاتھ روک لینے پر اکتفاء کرلو، بلکہ فرماتے ہیں کہ جب دوسرا فریق زیادتی چھوڑ دے تو اب پھر اصلاح معاملہ کی عدل کے ساتھ کوشش کرو، یہ قید یہاں ایسی بڑھائی گئی ہے جس پر ساری عقول قربان ہیں، کیونکہ نزاع بدون اس کے ختم ہو ہی نہیں سکتا، مگر اس نکتہ پر کسی کی عقل نہیں پہنچتی۔

### اصلاح کا عمل

بہر حال اصلاح کے نہ یہ معنی ہیں کہ صاحب حق کو دبایا جائے، نہ یہ معنی ہیں کہ محض مصافحہ کرادیا جائے، بلکہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کیا جائے، یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو آج کل علماء دیوبند اور جماعت رضائیہ میں اتفاق کرانا چاہتے ہیں اور دونوں جماعتوں پر باہمی نا اتفاقی کا الزام دھرتے ہیں کہ اسلام کو ضرر پہنچ رہا ہے، سبحان اللہ! اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ایک شخص کے گھر میں چور ڈاکہ ڈالیں اور وہ ان پر دعویٰ کرے دونوں فریق کو نا اتفاقی کا مجرم قرار دے کر دونوں کو اتفاق پر مجبور کیا جائے، بلکہ اس صورت میں ہر مائل چوروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مال کا مال واپس کر کے اس سے اتحاد کریں، مالک کو اتحاد پر کوئی مجبور نہیں کرتا، نہ اس کو دعویٰ دائر کرنے سے مجرم قرار دیتا ہے۔

### دین پر ڈاکہ

اسی طرح علماء دیوبند کو جس جماعت سے اختلاف ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ دین پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور احکام میں تحریف کرتے ہیں، ان دونوں میں اتفاق کرانے کی صورت یہی ہے کہ اول حق و ناحق کو معلوم کیا جائے، پھر جو ناحق پر ہو اس کو دبایا جائے، یہ طریقہ نہایت غلط ہے کہ حق و باطل کی تعیین سے پہلے ہی دونوں فریق کو اتفاق پر مجبور کیا جاتا ہے اور ہر ایک کو دبایا جاتا ہے، یہ اتفاق ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ (جامع)

اس پر فریقین اتفاق کر لیں تو خیر ورنہ اس اتفاق کی طرف لانے کے لیے فریقِ مبطل سے نا اتفاق اور قتال کا حکم ہے، پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس میں حق تعالیٰ نے حکمِ اخوت کو صفتِ مؤمن پر مرتب فرمایا ہے اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی صفت پر حکم مرتب ہوتا ہے، وہاں وہ صفت حکم کی علت ہوتی ہے، تو معلوم ہوا کہ ہم میں جو اخوت کا تعلق ہے، اس کی علت ایمان ہے اور وہی اخوتِ مطلوب ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو۔

صاحبو! آج کل جو اتفاق و اتحاد کو بقاء نہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی، بلکہ ہوائے نفسانی یا معاصی پر ہوتی ہے، اس لیے وہ بہت جلد ہوا ہوجاتا ہے (یعنی فناء) اس لیے اگر اتفاق کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ایمان پر قائم کرو، مگر آج کل تو ایمان کو ایسی بے قدر چیز سمجھ کر رکھا ہے کہ اس کی کچھ وقعت ہی نہیں ہے جس کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے، اس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ملائوں کا کام ہے، چنانچہ آج کل زبانوں پر یہ بات بہت کثرت سے ہے کہ یہ وقت نماز و روزہ کا نہیں ہے، اتحاد کا ہے اور جب کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کرتا ہے کہ اتحاد کی وجہ سے احکامِ شرعیہ کا فوت کرنا جائز نہیں تو نہایت بے باکی سے جواب دیا جاتا ہے کہ یہ وقت جائز و ناجائز کا نہیں ہے، کام کا وقت ہے اور غضب یہ ہے کہ اس متن پر بعض اہل علم نے حاشیہ چڑھا دیا ہے کہ اتفاق و اتحاد وہ چیز ہے کہ اس کے قائم کرنے کے لیے نمازیں قضا کر دی گئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہٴ احزاب میں نمازیں قضا کر دی تھیں، سبحان اللہ! کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا! بھان متی نے کنبہ جوڑا! اول تو یہی بتلائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کس سے اتحاد کر رہے تھے؟ جو اتحاد کی وجہ سے نمازیں قضا ہوئیں، بلکہ وہاں تو عدم اتحاد اس کا سبب ہوا تھا، کفار سے مقابلہ اور لڑائی تھی نہ کہ اتحاد کی گفتگو اور اگر کوئی شخص اپنے اس اتحاد کو بھی مقابلہ میں داخل کرنا چاہے تو پھر وہ ثابت کرے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود فرصت کے نمازیں قضا کر دی تھیں؟ یا کفار نے آپ کو نماز پڑھنے کی مہلت نہ دی تھی، احادیث و واقعات میں صاف مذکور ہے کہ وہاں نماز کے قضا کرنے کا سبب یہ تھا کہ کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی مہلت نہ دی تھی کیونکہ مقابلے کے وقت مہلت اپنے قبضہ میں نہیں رہتی بلکہ دونوں پر متوقف ہوتی ہے، اگر ایک مہلت لینا چاہے اور دوسرا مقابلے سے باز نہ آئے تو اس مہلت کا لینا یا کار ہے، پھر ایسی حالت میں نماز کیسے پڑھی جائے؟ بہر حال اس وقت قتال درپیش تھا اور ایسی حالت تھی کہ "صلوٰۃ الخوف" بھی نہ پڑھ سکتے تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز قضا کی مگر آج کل جو اتحادی جلسوں اور ترقی قوموں کے مشوروں میں نمازیں قضا کی جاتی ہیں، ان پر کون سا حملہ ہوتا

ہے؟ جس سے ان کو نماز کی مہلت نہیں ملتی، افسوس! باتیں بنانے اور دو راز کار ریز و لیوشنوں کے پاس کرنے میں تو نمازیں قضا ہوتی ہیں اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پر تیاں کیا جاتا ہے، ان لوگوں کو کچھ تو شرم کرنی چاہیے.....!!

### اتحاد غلط طور پر

پس خوب سمجھ لو کہ یہ مسائل اور یہ دلائل حسب غلط تھے اور تماشایہ کیا گیا کہ ان لوگوں کو اتحاد کا ایسا ہیضہ ہوا کہ کفار کو بھی بھائی بنایا اور ان کی رعایت میں احکام شرعیہ کو چھوڑا گیا اور اس کی یہ مصلحت بیان کی جاتی ہے کہ اس سے اسلام کو کفار کی طرف انجذاب ہوگا اور اگر ان کو بھائی نہ بنایا گیا تو اسلام سے بعید اور اجنبی رہیں گے۔

صاحبو! یہ خیال محض لغو ہے، اسلام تو ایسی حسین چیز ہے کہ کسی کی آنکھ میں کچی نہ ہو تو اس کا حسن ضرور اپنی طرف کھینچے گا، چاہے تو اس کو بھائی بھی نہ کہو بلکہ دشمن ہی کہو، ابو جہل کی آنکھ میں کچی تھی، اس لیے اس کو ہدایت نہ ہوئی اور جس کی نگاہ میں کچی نہ تھی وہ کسی نہ کسی وقت اسلام کی طرف آئے اور پھر آئے، حالانکہ عمر بھر اسلام سے عداوت ہی ظاہر کرتے رہتے تھے اور مسلمان بھی ہر موقع پر ان سے مقابلہ کرتے رہتے تھے، پس اسلام کو اپنی طرف مذبذب کرنے کے لیے کسی کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں، وہ دشمن کو دشمن سمجھ کر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے، کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی پوری رعایت کی ہے، وہی حقوق اور وہی رعایت سب کے جذب کے لیے کافی ہے، میں یہ کبھی نہ کہوں گا کہ کفار ہمارے بھائی ہیں، ہاں! یہ کہوں گا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں اور وہ ہمارے پڑوسی ہیں اور اسلام میں ہمسایہ کے بھی حقوق ہیں گو وہ کافر ہی ہو اور اگر ان کو بھائی کہا جائے تو یہ بات چل نہیں سکتی، نہ اس کو اس بجا خوشامد کا یقین آ سکتا ہے اور یہ قرآن کے بھی بالکل خلاف ہے۔

### کفار سے اتحاد

پس کفار سے ایسا اتحاد شرعاً جائز نہیں ہے جس میں احکام الہیہ کی بھی مخالفت کی جائے، بھلا اگر ایسا اتحاد محمود ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل پر تمام عالم کا اتفاق ہے) لا الہ الا اللہ کی تعلیم کیوں دی ہوتی؟ جس سے تمام عالم میں تہلکہ مچ گیا اور کفار کہتے لگے: "أَحْعَلَّ الْإِلَهَاتُ الْبُهَاتِ وَأَجْدَا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ" ○ وَأَنْتَلَقَ الْمَنَاءُ مِنْهُمْ أَنْ أَسْمُوا وَأَصْبِرُوا عَلَيَّ الْبُهَاتِكُمْ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ بَرَّادٌ"



”اس تعلیم سے پہلے سب کفار آپ کے ساتھ متحد تھے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تفریق کی بنیاد کو اکھاڑ ڈالا، کیونکہ کفار کے اس موافقت کی بنیاد کفر پر تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے کفر سے ہم کو روکا گیا، اس لیے خوش تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد کمزور اور لچر بنیاد تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نیویں نکالیں پھر نئی بنیاد ڈال کر اس پر عالی شان عمارت بنانے لگے، مگر ہماری حالت اس وقت یہ ہو رہی ہے کہ ترقی و اتحاد بھی کرتے ہیں تو اس طریقہ پر جس پر کفار نے ترقی کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہ ہماری ترقی ہے، نہ اتحاد ہے، حالانکہ ہم کو کفار کی چیزوں کی طرف تو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ممانعت ہے، حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں:

”وَلَا تَسُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زُخْرًا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا لِنَفْسِنَهُمْ فِيهَا وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ“

”اور اپنی نگاہوں کو اس چیز کی طرف دراز نہ کیجئے جس کے ساتھ ہم نے کفار کی بعضوں جماعتوں کو متع دیا ہے جس میں زندگی دنیا کی رونق ہے تاکہ اس میں ہم ان کی آزمائش کریں اور آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور پائیدار ہے۔“

اس میں تو کفار کے طریقہ ترقی کی طرف نگاہ اٹھانے کی ممانعت کی گئی ہے، آگے اپنی طرف سے ترقی کا طریقہ بتلاتے ہیں۔

”وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا تَسْفِكَنَ رِزْقًا لَّنَحْنُ نَزَّلْنَاكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ“

اور اپنے اہل کو نماز کا حکم کیجئے (اور خود بھی) اس پر تہہ رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم رزق نہیں مانگتے، رزق تو ہم خود ہی آپ کو دیں گے اور (اچھا) انجام تقویٰ ہی کا ہے۔“

اس میں پابندی نماز اور تقویٰ کا حکم ہے، اس کو کفار کی ترقی کے مقابلے میں بیان کرنا اس کی دلیل ہے کہ اسلامی ترقی کا طریقہ یہ ہے۔

لیجئے! اللہ میاں نے بھی ملانوں ہی کے مذاق کی رعایت کی ہے، اب تلاؤ! کیا اس قرآن کو منادو گے؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ دو اور نماز روزہ ہی کے ہو رہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود نہ سمجھو، باقی بضرورت دین دنیا میں مشغول ہونے کا مضائقہ نہیں، اس کی ایسی مثال ہے جیسے کھانے کی ضرورت سے کڈے جمع کیے جاتے ہیں اور جب کوئی پوچھتا ہے کہ یہ کھانا کتنے میں تیار ہوا ہے؟ تو اس کی فہرست میں کڈے اور لکڑیاں بھی شمار ہوتی ہیں۔

(الاحقہ صفحہ: ۲۳۱۵)

## انتہر وال اعترض ..... ترقی متعارف کارو!

ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے، اس لیے یہ عنوان ظاہر میں بھی بہت عمدہ ہے، اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا، مگر قرآن میں اس کو خیرات کے ساتھ مقید کیا گیا ہے کہ باہم خیرات میں ترقی کرو، اب فیصلہ اس پر ہے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو، وہ خیر ہے یا نہیں؟ تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال و حکومت کی تعلیم دے رہے ہو اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت نہیں کر سکتے۔

شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے: ”اِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ“ اور یہ بھی ہے: ”كُتِبَ عَلَيْكُمُ اِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا لِّلَّذِيْنَ“

یہاں خیر سے مراد مال ہے، لہذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوئی، اس کا جواب یہ ہے: ”فَمَا سَبِقُوا الْخَيْرَاتِ“ میں خیر مطلق مراد ہے کہ خیر مطلق میں باہم سبقت کرو اور مال خیر مطلق نہیں، بلکہ خیر مقید ہے جس کی خیریت کے لیے بہت سی شرطیں ہیں جن کی تم رعایت نہیں کرتے، لہذا تم اپنی ترقی مال کو ترقی خیر نہیں کہہ سکتے اور جس درجہ میں مال خیر ہے، اس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں ہیں، بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں ہے: ”كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ“۔

## آج کل کی ترقی کا حال

مگر تم ہی بتلاؤ کہ جیسی ترقی آج کل (یعنی زمانہ تحریکات میں) ہو رہی تھی کیا وہ خیر تھی؟ اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا کہ مسلمانوں کو پنڈت کا لقب دیا گیا؟ ہندوؤں کو مولانا کہا گیا، تشقے لگائے گئے، گائے کے گوشت کو ممنوع کیا گیا، مسلمانوں سے قربانی کی گائیں چھینی گئیں اور ہندو کی نسبت کہا گیا کہ نبوت ختم نہ ہوئی، ہوتی تو وہ نبی ہوتا (پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں ان سے قطع تعلق نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو بدستور لیڈر مانا گیا وغیرہ وغیرہ) اگر اس صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر کا مصداق تھی تو فرعون سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہیے، اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی یہ کہتا کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے تو اس کو یہ جواب دیا جاتا کہ تم محض ملانے ہو، تم کو سیاست کی کچھ خبر نہیں، یہ وقت جائز اور ناجائز کے سوال کا نہیں، اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونی چاہیے، افسوس! ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود

مقصود نہیں، بلکہ ملائین کی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود بھی ملائین ہی کا پھیلا نا ہے، چنانچہ تعلق  
تعالیٰ فرماتے ہیں:

”الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَ  
نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ“

”مگر لوگ اس کو مٹا رہے تھے تو اس صورت میں اس کو ترقی خیر کون کہہ سکتا ہے؟ پس حرص کا  
عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی، مگر ان لوگوں نے تو اس عنوان سے اس کا عیب  
چھپانا چاہا ہے، جب اس کا نام ترقی رکھ لیا تو اب وہ ان کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا پھر وہ  
اس کا علاج کیا خاک کریں گے؟  
(علاج الحرص صفحہ: ۱۷۷)

### ستر واں اعتراض..... توجہ الی اللہ کے معنی!

اب سمجھئے کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے؟ بعض نے تو یہ سمجھا ہے کہ توجہ الی اللہ یہ ہے کہ نماز پڑھے،  
روزہ رکھے اور احکام شرعیہ بجالائے، ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفاء کیا، یہ لوگ دل سے خدا  
کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتے، مگر پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجود یہ کہ ہم سب کچھ  
کر رہے ہیں، لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ تقاضائے معصیت کیوں  
نہیں ہوتا؟ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے اور بعض نے کہا کہ توجہ الی اللہ  
کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو، یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے  
بیٹھے، انہوں نے نماز، روزہ اور تلاوت قرآن اور نظر بد کا بچانا وغیرہ سب چھوڑ دیا، مگر ان کو بھی  
برکت اور نورانیت حاصل نہ ہوئی کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دل میں  
گناہوں کا تقاضا شدید پاتے ہیں، تو سنو! کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف  
دل سے متوجہ ہو، مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے جو  
شریعت نے بتلائی ہے، پس دونوں کو جمع کرنا چاہیے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو اور  
ظاہر سے اعمال شرعیہ کے پابند رہو، طاعات کو بجالاؤ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو، نگاہ کو  
روکنا اور ناخرموں کی باتیں بھی نہ سنو، اس کے بعد بھی اگر نورانیت نہ ہو تو ہم پر بنسنا اس وقت میں  
وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق نے کہا ہے:

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند!

گر نہ بینی نور حق بر ما بخند!

اس وقت یہ غلطی ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہر کے تارک ہیں اور بعض اعمال باطن کے تارک ہیں، اس لیے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی، دونوں کو جمع کرنا چاہیے۔

(علاج الحرس صفحہ: ۳۰)

## اکتبر واں اعتراض..... پردہ کا عقلی ثبوت!

آج کل بعض نا عاقبت اندیش پردہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، میں قسم کہتا ہوں کہ پردہ کے توڑنے میں قطع نظر خلاف شرع اور گناہ ہونے کے اتنی خرابیاں ہیں کہ آج جو عقلاء پردہ کی مخالفت کرتے اور پردہ اٹھادینے کی کوشش کرتے ہیں، ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں خود ہی یہ تجویز کریں گے کہ پردہ ضرور ہونا چاہیے، مگر اس وقت بات قابو سے نکل چکی ہوگی، اب تو بنی بنائی بات ہے، اس کو نہیں بگاڑنا چاہیے، پھر یہ کچھ بتائیں گے اور کچھ بھی نہ ہو سکے گا، آج کل ایسا مذاق بگڑ گیا ہے کہ کوئی پردہ کو خلاف فطرت کہتا ہے، کوئی قید اور جس بیجا کہتا ہے۔

ایک مسلمان انجینئر تھے، ان سے ایک پادری انجینئر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے، اس میں سب خوبیاں ہیں، مگر عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے، مسلمان انجینئر نے کہا، کہاں! ہم نے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا؟ کہا، وہی قید ہے جس کا نام تم نے پردہ رکھا ہے، تو ان مسلمان انجینئر صاحب نے پادری سے کہا کہ پہلے آپ یہ بتائیے کہ قید کس کو کہتے ہیں.....؟ حقیقت یہ ہے کہ قید جس خلاف طبع کو کہتے ہیں اور جو جس خلاف طبع نہ ہو اس کو قید ہرگز نہ کہیں گے ورنہ پاخانہ میں جو آدمی پردہ کر کے بیٹھا ہے، اس کو بھی قید کہنا چاہیے، کیونکہ پاخانہ میں آدمی تمام آدمیوں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے، سب سے الگ ہو جاتا ہے، مگر اس کو کوئی نہیں کہتا کہ آج ہم بھی اتنی دیر قید میں رہے اور فرض کرو اگر اس پاخانہ میں کسی کو بلا ضرورت بند کر دیا جائے کہ باہر سے زنجیر لگا دیں اور ایک پہرہ دار کھڑا کر دیا جائے اور اس سے کہہ دیا جائے کہ خبردار! یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پائے تو اس صورت میں پیشک یہ جس خلاف طبع ہوگا اور اس کو ضرور قید کہیں گے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر جس خلاف طبع ہوگا اور اس کو ضرور قید کہیں گے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر جس بیجا کا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے، بتائیے ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں جس خلاف طبع نہیں اور دوسری میں خلاف طبع ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مطابق جس کو قید نہیں کہہ سکتے، بلکہ جس خلاف طبع کو قید کہتے ہیں، پس آپ کو پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عورتوں جو پردہ میں رہتی ہیں، وہ ان کی طبیعت کے

موافق ہے، یا خلاف؟ اس کے بعد یہ کہنے کا حق تھا کہ پردہ قید ہے یا نہیں؟ میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ پردہ مسلمان عورتیں کے خلاف طبع نہیں ہے، کیونکہ مسلمان عورتوں کے لیے حیا و امر طبعی ہے، لہذا پردہ جس موافق طبع ہوا اور اس کو قید کہنا غلط ہے، ان کی حیا کا مقتضاً یہی ہے کہ پردہ مستور ہیں، بلکہ اگر ان کو باہر پھرنے پر مجبور کیا جائے تو یہ خلاف طبع ہوگا اور اس کو قید کہنا چاہیے۔

(کساء النساء، صفحہ: ۵۹)

بہتر واں اعتراض..... کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں رغبت نہیں ہوتی؟

اعمال میں کوتاہی اور بے رغبتی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اعمال میں اور ان کی جزاء میں کچھ تعلق اور ارتباط نہیں دیکھتے، یوں سمجھتے ہیں کہ ان اعمال پر جو جزائیں ملتی ہیں، ان میں اور اعمال میں باہم کوئی علاقہ نہیں، ایسا سمجھتے! جیسے اس دنیا کے اسباب اور مسببات میں علاقہ ہے، مثلاً بریلی پینچ، پھر بریلی سے چل کر کانٹھ گودام کا اسٹیشن ملتا ہے، وہاں کچھ دیر کے بعد اور سواری ملتی ہے، بہر حال نیچی تال اور ان اسباب میں ایک قومی علاقہ ہے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ کی وجہ سے کشش ہوتی ہے اور یہاں علاقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں اس لیے نہیں آتا کہ نظر نہیں آتا، اس لیے دل کی کشش نہیں ہوتی یعنی ابھرتی نہیں؟ طبیعت جیسی کہ ابھرتی چاہیے، بعنوان دیگر میری مراد یہ ہے کہ اس مقصود کے لیے طبیعت اس واسطے نہیں ابھرتی کہ خود اس مقصود کو اپنے اختیار میں نہیں سمجھتے اور خود اس واسطے نہیں سمجھتے کہ اسباب اور مقصود میں یعنی اعمال اور جزاؤں میں کچھ علاقہ نہیں سمجھتے ورنہ اگر علاقہ سمجھتے تو چونکہ اسباب اختیاری ہیں، اس لیے اس حیثیت سے مقصود کو بھی اختیاری سمجھتے، جب اختیاری نہیں سمجھتے تو طبیعت ابھرتی بھی نہیں، کیونکہ طبیعت اسی کام میں ابھرتی ہے، جس کو انسان اپنے اختیار میں سمجھتا ہے، چنانچہ یہی بات ہے کہ عامی کو کبھی سلطنت کی ہوس بھی نہیں ہوتی اس کو کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں آتا کہ میں بادشاہ ہو جاؤں، وہ کبھی اس پر غور نہیں کرتا کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کروں بادشاہ بنوں محل میں رہوں مثلاً ایک رئیس سے پوچھا کہ بادشاہ یوں محل میں رہا کرتے ہیں، یوں ان کے ساز و سامان ہوتے ہیں، یوں حشم و خدم ہوتے ہیں، خیر ان عجائب امور کو سن کر چاہے اس کا جی خوش ہونے لگے لیکن یہ ہرگز نہ ہوگا اس کی طبیعت میں گدگدی اور دھڑ دھڑی پیدا ہو کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرنی چاہیے! سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم کریں، یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر کسی سے پوچھوں گا بھی تو وہ ڈانٹ دے گا کہ اے تو پاگل ہو گیا ہے! معلوم ہوتا ہے کہ جو تیاں کھائے گا سبحان اللہ! رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں مخلوق!.....!!

غرض بادشاہوں کے قصے سن کر وہ سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم نہ کرے گا اور اگر معلوم بھی کر لے تو کیا ہے؟ وہ اتنے بعید ہیں کہ اس بیچارے کا طائر و ہم بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا، اب سر پر ٹوکرار کھنے والی اور گواٹھانے والا بھی بادشاہوں کے قصے سنتا ہے، لیکن کیا کبھی اس کے ذہن میں بھی خیال آتا ہے کہ لاؤ میں بھی بادشاہ بننے کی کوشش کروں؟ کس سے پوچھوں کہ سلطنت کیونکر حاصل ہوتی ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس کے بھی ذہن میں کبھی یہ خیالات آتے ہیں؟ کبھی نہیں! اس واسطے کہ وہ اسباب ہی اختیار میں نہیں تو پھر کتنا ہی بڑا مقصود کیوں نہ ہو؟ طبیعت ابھرتی ہی نہیں، بخلاف اس کے نینی تال کا حال سنا تو طبیعت میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے، فکر ہوتی ہے کہ بس بیچارے روپے پاس ہوں تو وہاں پہنچیں اور اگر ہوں بھی پاس بس پھر کیا ہے؟ پھر تو سمجھتا ہے کہ وہاں پہنچا گیا ہر وقت اختیار میں ہے اور سوچتا ہے کہ جب اختیار میں ہے، تو پھر کیوں نہ حاصل کیا جائے اس مقصود کو؟ چنانچہ نہایت شوق کے ساتھ وہاں پہنچنے کا فوراً اہتمام کرنے لگتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو جس مقصود کے اسباب کو انسان اختیاری نہ سمجھتا ہو، لیکن اسباب اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہو، تب بھی حرکت نہیں ہوتی، اس حالت میں اسباب کی طرف حرکت نہ ہونے کی وجہ اسباب ہیں اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہونا ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقصود کی طرف حرکت نہ ہونے کی کہ ان اسباب اور مقصود میں چونکہ تعلق معلوم نہیں، اس لیے ان اسباب پر اس مقصود کے ترتیب کا معتقد نہیں اور اس معتقد نہ ہونے سے باوجود اسباب کے اختیاری سمجھنے کے بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتا، اس واسطے کہ مقصود اگر اختیار میں ہے تو بواسطہ اسباب ہی کے تو اختیار میں ہے تو گویا اسباب اختیار میں ہیں، لیکن چونکہ اسباب اور مقصود میں تعلق نہیں، اس لیے اسباب کے اختیار کرنے کا حال طاری نہیں ہوا، اس کو جس طرح اسباب کے اختیاری ہونے کے علم ہے، اسی طرح اگر یہ بھی علم ہوتا کہ اگر اسباب اور مقصود میں یہ تعلق ہے، تب طبیعت ابھرتی شوق پیدا ہوتا، اب وہ تعلق تو چونکہ ذہن میں حاضر نہیں اس لیے اسباب اختیار کرنے میں جی لگتا نہیں ہے، یہ اطمینان نہیں ہے کہ اسباب اختیار کرنے سے مقصود ضرور حاصل ہو ہی جائے گا، پھر جب مقصود ہی کو اختیار ہی نہیں سمجھتا تو اس کے اسباب اختیار کرنے کی طرف بھی حرکت نہیں ہوتی۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی بلور مثال کے تو اب یہ سمجھئے کہ نعمائے آخرت اور جنت کی طرف جو طبیعت نہیں ابھرتی ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اعمال میں اور مقصود میں جو واقعی علاقہ ہے، وہ نہیں سمجھتے، یعنی ایسا علاقہ جیسا آگ جلانے اور کھانا پکنے میں، ایسا علاقہ جیسے پانی پینے اور پیاس کے بچھنے میں، ایسا علاقہ جیسے ہمسر خاندان میں پیام دینے اور عورت کے گھر آجانے میں، غرض ایسا علاقہ نہیں سمجھتے اعمال صالحہ میں اور جنت کے حاصل ہونے میں، یہی وجہ ہے کہ ہر شخص قریب

قریب یہ سمجھتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اختیاری نہیں، ہرگز ہرگز ذہن اس کی طرف نہیں جاتا کہ اعمال صالحہ پر جنت ضروری ہی مل جائے گی، ایسا سمجھتے ہیں جنت کو کہ اعمال صالحہ پر بس محض اتفاقاً ہی مرتب ہو جاتی ہے جیسے کسی کو اتفاق سے سلطنت مل جائے مثلاً کہیں اتفاقاً ”ہما“ سر پر بیٹھ گیا اس لیے بادشاہت مل گئی، چنانچہ پرانے زمانے کے ایسے ہی افسانے ہیں کہ کسی جگہ کا بادشاہ مر گیا اس کے اولاد بھی نہیں تھی اس لیے اس میں اختلاف ہوا کہ کس کو بادشاہ بنایا جائے؟ اس کے متعلق پہلے یہ دستور تھا کہ ”ہما“ اڑاتے تھے، وہ جس کے سر پر بیٹھ جاتا اس کو بادشاہ بنا دیتے، چنانچہ ”ہما“ اڑایا گیا، جانور کو کیا عقل؟ اتفاق سے ایک فقیر ہی کے سر پر جا بیٹھا، بس اسی کو تخت پر بیٹھا دیا گیا، اب اگر کوئی فقیر بھی ہوصلہ کرنے لگے اور وہاں پہنچنے کا اہتمام کرے کہ شاید ”ہما“ میرے ہی سر پر بیٹھ جائے اور میں بادشاہ ہو جاؤں تو سب اس کو جنت بنا لیں گے کہ یہ کیا لغو حرکت ہے؟ یعنی محض ایک سوہوم امید پر کہ شاید ”ہما“ میرے ہی سر آ بیٹھے، اتنا لمبا سفر کرنا اور جو نہ بیٹھا؟ پھر اتنا لمبا سفر بھی کیا اور وہاں سفر کے بھی یوم ہوئے یعنی ”ہما“ تو کیا سر پر بیٹھتا، سب اُلٹے بتاتے کہ بڑا گدھا ہے فلانا فقیر اس پر قبہ لگا کس گے کہ بالکل اُلٹ ہی ہے، بھلا تیری ہی توقع ہے ”ہما“ کہ کب وہ آئے اور کب میں اس کے سر پر بیٹھوں، اُلٹو کہیں کا! ارے کسی کا اُلٹو سیدھا کرنے کے لیے ”ہما“ کیوں میڑھا ہونے لگا؟ کیونکہ یہی میڑھا ہوتا ہے، اس کا کہنا اہل کے سر پر بیٹھے پھر جب یہ حال ہے تو بھلا اس پر کوئی کیا سفر کرے؟ تو جیسے ”ہما“ کا سر پر بیٹھنا غیر اختیاری سمجھا جاتا ہے، اسی طرح جنت کا حاصل ہونا بھی لوگ غیر اختیاری سمجھتے ہیں، واقعی ٹٹول کر دیکھ لیجئے اپنے وجدان کو، اکثر کا یہی قاعدہ ہے کہ جنت کا حاصل ہونا کسی کے اختیار ہی میں نہیں، حضرت! میں کہتا ہوں اگر جنت اختیار میں نہیں تو حق تعالیٰ یہ کیوں ارشاد فرماتے ہیں: ”وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ“ دوز و مغفرت اور جنت کی طرف تو کیا اللہ میاں اندھی کوٹھری میں دوڑا کر سر بھڑواتے ہیں؟ پھر حکم بھی دوڑ کر چلنے کا فرمایا تو معلوم ہوا کہ سڑک بالکل صاف ہے، جو شخص اعمال صالحہ کرے گا، بشرطیکہ ایمان بھی ہو، واللہ العظیم! ثم و اللہ العظیم، ثم و اللہ العظیم! وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا تو عجیب یہ ہے کہ یہ شخص گویا تکذیب کرتا ہے، نصوص کی اور یہ خرابی کی ہے جاہل و اعظفوں نے بس یہ حدیث بیان کر دی ہے کہ ایک شخص تھا جس نے ساری عمر عبادت میں گزار دی اور جنت کے کام کیے، لیکن اخیر میں دوزخی ہو گیا، حالانکہ اس جاہل و اعظف نے حدیث کو سمجھا نہیں، حدیث میں جو آیا ہے، اس کا سبب بھی کسی عمل اختیاری ہی کا صدور ہے۔

## تہتر وال اعتراض ..... عالم مثال اور عذاب و ثواب کا قبر کا اثبات!

اور عالم مثال کا اثبات کرتا ہوں، سو سمجھ لیجئے کہ یہ ثابت ہے ارشاداتِ نصوص سے اور اشارات تو میں نے احتیاطاً کہہ دیا ہے ورنہ وہ اشارات بمنزلہ صراحت کے ہیں، تو گوگوبالیا تصریح یہ بات ثابت ہے کہ علاوہ شہادت یعنی دنیا کے اور عالم غیب یعنی آخرت کے ان دونوں کے درمیان میں ایک اور بھی عالم ہے، جس کو عالم مثال کہتے ہیں، جو من وجہ مشابہ ہے، عالم شہادت کے اور من وجہ مشابہ ہے عالم غیب کے، یعنی وہ برزخ ہے، درمیان دنیا اور آخرت کے اور اس عالم کے ماننے سے ہزاروں اشکالات قرآن و حدیث کے حل ہو جاتے ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے اور یہ کام کی بات ہے، حدیث میں وارد ہے کہ قبر میں اس طرح سے عذاب ہوگا یا ثواب ہوگا، مثلاً عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ زمین مل جائے گی اور صاحبِ قبر کو دبا لے گی، اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا فصل لاش اور قبر کی دیواروں میں مردہ کو رکھتے وقت ہوتا ہے، وہی باقی رہتا ہے، لاش دبتی دباتی کچھ بھی نہیں، ویسی کی ویسی رکھی رہتی ہے، تو یہ صورت عذاب قبر کی جو حدیث میں آئی ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کے متعلق تو نہیں، کیونکہ مشاہدہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔

یہ اشکال اس وجہ سے اور بھی قوی ہو گیا کہ لوگوں نے اس کو دنیا ہی کے متعلق سمجھ لیا ہے، حالانکہ اگر دنیا کے متعلق ہوتا تو اس کے آثار کا نظر آنا بھی ضروری تھا اور آخرت کے متعلق سمجھا جائے تو اول تو آخرت میں وہ زمین نہیں جو لفظ زمین سے متبادر ہے، دوسرے یہ کہ آخرت میں اگر وہ پہنچ جائے تو پھر وہاں وہی ٹھکانے ہیں جنت یا دوزخ اور داخل ہونے کے بعد جنت سے تو کسی کا ٹکنا ممکن نہیں اور دوزخ سے بھی سب کا ٹکنا ممکن نہیں اور حشر ہوگا جنت اور دوزخ سے باہر تو معلوم ہوا کہ ابھی جنت یا دوزخ میں گیا ہی نہیں، پھر حدیث کے کیا معنی؟ تو اول نظر میں تو کسی کو یہی شبہ ہو سکتا ہے کہ جو ملاحدہ اور اہل سائنس کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے، چنانچہ ملاحدہ اور بعض اہل سائنس جو ایمان لائے ان کا بھی مذہب یہی رہا ہے کہ یہ سب مثالیں ہیں اور شبہیں ہیں اور مطلب ان مثالوں کے دینے سے یہ ہے کہ ایسی حالت ہوتی ہے، یعنی بعض مشابہ ان حالتوں کے ہوتی ہے، واقعی میں یہ حالتیں پیش نہیں آتیں، تو اپنے نزدیک گویا یہ بہت بڑی دوز دوڑے۔

حاصل اس تقریر کا یہ ہوا کہ وہ لوگ محض روحانی عذاب و ثواب کے قائل ہو گئے اور جسمانی کے منکر ہو گئے۔



اسی طرح حدیث شریف میں جو ہے:

“القیبر روضة من رياض الجنة او حفرة من حفرات النار“

یعنی قبر یا جنت کا ٹکڑا ہوتی ہے، یادوزخ کا گڑھا تو وہ لوگ اس پر کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں قبر میں کہ یہاں تو قبر پھول ہیں جنت کے، نہ آگ ہے، دوزخ کی، پھر اپنے ظاہر معنوں پر قبر دوزخ کا گڑھا یا جنت کا ٹکڑا کیونکر ہو سکتی ہے؟ غرض یہاں قبر کی جنت و دوزخ میں تو یہ اشکال ہے، رہی آخرت سو وہاں کی دوزخ و جنت میں وہ اشکال ہے، جو میں نے پہلے عرض کیا۔

بہر حال یہ اشکال حل نہیں ہو سکتا جب تک تیسرے عالم کے قائل نہ ہوں، یعنی عالم برزخ کے جس کو عالم مثال بھی کہتے ہیں، کیونکہ وہ مشابہ اس عالم کے بھی ہے یعنی باعتبار آخرت ہے، تو گویا کہ وہ دنیا ہے اور باعتبار دنیا کے گویا وہ آخرت ہے، تو وہ ایسا عالم ہے جیسا کہ باغ کا پھانک کہ بہ نسبت اندرونی حصہ باغ کے تو گویا وہ باغ نہیں ہے، لیکن بہ نسبت خارج حصہ باغ کے گویا کہ وہ باغ ہے، یا جیسے حوالات کہ بہ نسبت گھر کے تو وہ جیل خانہ ہے، مگر بہ نسبت جیل خانہ کے پھر بھی گھر ہے اور اللہ تعالیٰ نے عالم مثال کو دنیا کا بھی نمونہ بنایا ہے۔

تو جس وقت انسان مرتا ہے، پہلے اس عالم مثال ہی میں جاتا ہے، وہاں ایک آسمان بھی ہے، مشابہ دنیا کے آسمان کے اور ایک زمین بھی ہے، مشابہ دنیا کی زمین کے اور ایک جسم بھی ہے، مشابہ اس جسم کے لیکن وہ بھی ہے جسم ہی تو مرنے کے بعد تو روح کے لیے ایک جسم مثالی ہوگا اور آخرت میں جو جسم ہوگا وہ یہی ہوگا جو دنیا میں ہے۔

غرض یہ ایمان ہے ہمارا کہ حشر روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی، یعنی یہی جسم جو ہم اب لیے بیٹھے ہیں جو گل سر کر خاک ہو جائے گا، اسی کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے پھر تازہ بنا کر محشر فرمائیں گے، لیکن وہاں اس جسم کی خاصیت بدل جائے گی، یعنی اب تو یہ خاصیت ہے کہ ہم جو کھاتے پیتے ہیں، اس کا پیشاب پاخانہ بنتا ہے، بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، یہاں تک کہ ایک دن مر کر فنا ہو جاتا ہے، وہاں گویا ابدی اور خالد ہو جائے گا۔

غرض ایک تو جسم یہاں ہے اور ایک جسم ہے عالم مثال میں اور وہ مشابہ ہے اس جسم کے یہ جسم بعینہ نہیں تو عالم مثال میں بدن بھی مثالی ہے، وہاں کی جنت بھی مثالی ہے، دوزخ بھی مثالی ہے، بس اس عالم مثال ہی کا نام قبر ہے، اب سب اشکال رفع ہو گئے، کیا معنی کہ قبر سے مراد یہ محسوس گڑھا نہیں ہے کیونکہ کسی کو بھیڑ یا کھا گیا، کوئی سمندر میں غرق ہو گیا، تو اس صورت میں چونکہ وہ زمین میں دفن نہیں ہوا اس لیے اس کو چاہیے کہ قبر کا عذاب ہی نہ ہو، لیکن اب اشکال ہی نہ رہا، کیوں کہ وہ عالم مثال ہے، وہیں اس کو عذاب قبر بھی ہو جائے گا، اشکال تو جب ہوتا جب قبر سے

مراد یہ گڑھا ہوتا جس میں لاش دفن کی جاتی ہے، حالانکہ اصطلاح شریعت میں قبر گڑھے کو کہتے ہی نہیں، بلکہ عالم مثال کو کہتے ہیں، قبر اور وہاں پہنچنا کسی حال میں منقہی نہیں ہے، خواہ مردہ دفن ہو یا نہ ہو اور اس عالم مثال کے نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ عوام کی قبر ذرا بڑی رکھنی چاہیے تاکہ مردہ کو بیٹھے میں تکلیف نہ ہو، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسی قبر کے اندر مردہ کو بٹھایا جاتا ہوگا، تو بس پھر کیا ہے؟ اگر اپنے دشمن کو ستانا ہو تو اس کی قبر ذرا تنگ بنا دی جائے تاکہ مر کر بھی اسے جین نصیب نہ ہو کیونکہ بعض لوگ اپنے دشمن کے لیے تنگ کرتے ہیں کہ مر کر بھی مصیبت سے نہ بچے تو اچھا ہے، حضرت! یہ جو وسیع قبر شریعت نے تجویز کی ہے، یہ اس بنا پر تھوڑا ہی ہے کہ اس کے اندر مردہ کو بٹھایا جائے گا، جیسے آپ اس وقت بیٹھے ہیں، بلکہ یہ تو محض اکرام اور عزت ہے مومن کی کہ اس کو مر کر بھی بے کار نہ سمجھا گیا، مرنے کے بعد بھی اس کے مرتبے کا لحاظ کیا اور ہر طرح اس کا اکرام کیا یہ نہیں کہ وہاں تھا مال دیا، بلکہ یہ حکم ہوا کہ اس کی اس وقت بھی خاطر تواضع کرو، قبر ایسی بناؤ کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو ویسی ہی جگہ اس کے لیے تجویز کرتے، کپڑا ایسا پہناؤ جیسا کہ وہ زندگی میں پہنتا تھا۔ یعنی ویسی ہی صفائی ہو، خوشبو بھی لگاؤ، نہلاؤ دھلاؤ، بھی، غرض بنا سنو اور کر عزت کے ساتھ اس کو رخصت کرو اور واقعی جیسا مسلمانوں میں مردہ کا اکرام ہوتا ہے کسی قوم میں نہیں ہوتا اور عیسائیوں میں بھی بہت اکرام ہوتا ہے، ان کے ہاں اکرام میں غلو بہت زیادہ ہے، یہاں تک کہ بیٹی بھی کہتے ہیں، بوٹ بھی، پٹی بھی، غرض پوری وردی پہناتے ہیں گو وہاں جا کر کبھی صاحب بہادر پہرہ دیں گے۔

غرض عیسائیوں کے یہاں تو اکرام میں غلو ہے اور ہندوؤں کے یہاں بالکل بھی اکرام نہیں بلکہ اور اٹنی بے حرمتی ہے، یہاں تک کہ پچارے کا سر بھی پھوڑتے ہیں، خیر وہ بے چارہ تو نہیں ہے، تو واقعی سر پھوڑے جانے کا سحق۔ بہر حال اسلام میں اعتدال ہے، تو وہ عالم مثال ہے جہاں مرنے کے بعد انسان اول پہنچتا ہے اور وہ مشابہ کچھ اس عالم کے ہے اور کچھ مشابہ عالم آخرت کے ہے، وہیں اس کو فرشتے بٹھلاتے ہیں، وہیں اس سے سوالات کرتے ہیں، وہیں کی زمین اس کو دہانی ہے، وہیں اس کو عذاب و ثواب ہوتا ہے، وہ عالم یہی ہے جس کو حدیثوں میں قبر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور لو میں اب تمہیں کچھ اس کا پتہ بھی بتائے دیتا ہوں جس سے یہی اس کی کچھ حقیقت سمجھ میں آ جائے اور وہ عالم کچھ کچھ خواب میں منکشف ہوتا ہے، لیکن ایک تو خواب ہوتا ہے سچا اور ایک ہوتا ہے محض خیال تو جو خواب سچا ہوتا ہے، اس میں کچھ کچھ انکشاف اس عالم کا ہوتا ہے، بس اتنا فرق ہے کہ خواب میں حقیقت اس عالم کو مغلوب ہوتی ہے، کیونکہ اس میں آمیزش اس خیال کی بھی ہوتی ہے اور وہاں بالکل حقیقت ہی حقیقت ہوگی وہ حقیقت اصلہ بھی عالم آخرت کی حقیقت

اصلیہ کے اعتبار سے تو بمنزلہ خواب ہی کے ہے، بلکہ خواب میں جو حقیقت عالم مثال منکشف ہوتی ہے، وہ بمقام بلکہ مثال کی حقیقت اصلیہ کے اتنی ضعیف نہیں ہوتی جتنی عالم مثال کی حقیقت اصلیہ بمقام عالم آخرت کی حقیقت اصلیہ کے ضعیف ہے، وہ اس سے بھی ضعیف تر ہے، تو خواب میں اگر کوئی یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹا تو اب وہ خواب ہی میں بھاگتا بھی ہے، پلتا بھی ہے، چیتا بھی ہے، چلاتا بھی ہے، اب کوئی اسے کہے کہ ارے تو برابر بستر پر پڑا رہا ہے، نہ تھے کسی سانپ نے کاٹا، نہ تو بھاگا، نہ چلایا، کیوں خواہ تو اوجھوٹ بول رہا ہے؟ تو کہہ سکتا ہے، مگر چونکہ یہ امر خواب میں ہر شخص کو واقع ہوتا ہے اور عالم مثال منکشف ہوتا ہے، اس لیے اس کی کوئی تکذیب نہیں کرتا اور شارع عالیہ السلام اس کی خبر دیتے تو وہاں تکذیب کرتا ہے، حیرت ہے تو عالم مثال میں ہر چیز کا نمونہ موجود ہے، یعنی حتمی چیزیں ہیں موجودات حقیقیہ وہ سب وہاں موجود ہیں۔

ایسی مثال ہے جیسے آئینہ کہ اس میں بھی اپنی شبیہ نظر آتی ہے، لیکن جس طرح آئینہ میں بھی ہمیشہ شکل بالکل مشابہ نظر نہیں آتی، یعنی آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی آئینہ میں تو بڑا لمبا چہرہ نظر آتا ہے، کسی میں بہت چوڑا اور ایسا بڑا کہ خود ہی تھپڑ مارنے کو جی چاہے، اسی طرح سیاہ آئینہ میں سیاہ صورت نظر آتی ہے، حالانکہ آپ نے چہرہ پر کالک نہیں لگا رکھی ہے اور سرخ آئینہ میں سرخ صورت نظر آتی ہے، حالانکہ آپ نے چہرہ پر کوئی سرخ چیز نہیں مل رکھی، تو جس طرح یہاں جو چیزیں آئینہ میں نظر آتی ہیں وہ من کل الوجوہ مشابہت نہیں رکھتیں اصل کے ساتھ بلکہ جو آئینہ سچا ہوتا ہے وہ بالکل سچا نہیں ہوتا، اس واسطے کہ کم از کم اتنا فرق تو ضرور ہوگا کہ آپ تو مثلاً بیٹھے ہیں مغرب میں لیکن آئینہ میں آپ نظر آئیں گے مشرق میں تو دیکھئے! کہاں رہی مشابہت من کل الوجوہ؟؟

غرض یہ جو آئینہ میں عکس نظر آتا ہے، یہ محض ایک مثال ہے اصل صورت کی یعنی اس کو ایک گو نہ مناسبت ہے اصل صورت کے ساتھ، تو جیسے آئینہ میں سب چیزیں نظر آتی ہیں، اس طرح عالم مثال میں اور اس عالم میں جو صورتیں مشابہ ہیں، ان میں سے بعض میں تو مماثلت نہیں ہوتی ہے اور بعض میں مناسبت، جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ مناسبت بعض اوقات جلی ہوتی ہے اور بعض اوقات خفی، مثلاً ہم نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص کے لڑکا پیدا ہوا ہوا اور بعد میں سن بھی لیا کہ واقعی اس کے لڑکا پیدا ہو گیا، تو یہاں تو باہم مناسبت تو یہی ہے اور جلی ہے، جس کو مماثلت کہنا چاہیے اور کبھی یہ مناسبت تو یہی نہیں ہوتی، بلکہ ضعیف اور خفی ہوتی ہے، جیسے میں نے دو بند میں دیکھا کہ منشی سراج الحق ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں، لیکن وہ دو ہیں یعنی سر ہانے بھی وہی بیٹھے ہیں اور پانکتی بھی وہی بیٹھے ہیں۔ غرض یہ دیکھا کہ دو سراج الحق ہیں، حضرت

مولانا یعقوب صاحب رحمہ اللہ سے میں نے یہ خواب بیان کیا تو مولانا نے فی الہدیہ فرمایا کہ ان شاء اللہ ان کے لڑکا پیدا ہوگا، کیونکہ اولاد جو ہے، وہ باپ کا وجود دہانتی ہے، چنانچہ ان کے گھر میں امید تھی، لڑکا ہی پیدا ہوا یہ مناسبت خفی تھی، یعنی بیٹے کو باپ کی شکل میں دیکھا یہ مماثلت تو نہیں کہی جا سکتی ہاں مناسبت ہے، اب جس کو اس عالم مثال کی وجوہ مناسبت کا زیادہ علم ہے، وہی مبر صورت مناسبت کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ کس حقیقت کی صورت ہے؟ اور یہ کوئی بزرگی کی بات نہیں، بلکہ محض فراست ہے، چنانچہ بعض کفار بھی نہایت صحیح تعبیر دیتے ہیں، یہاں تک کہ ابوہبل بھی بڑا مبر تھا، تو اب کیا اس کو بھی بزرگ کہیں گے؟؟

(آثار المربع صفحہ: ۳۳۲۳۸)

چوتھوں اعتراف..... اس اعتراف کا جواب کہ عالم آخرت محض خیالی ہی ہے!

یہ لوگ عالم مثال کے ایسے قائل ہوئے کہ سرے سے آخرت ہی کو اڑا دیا، یعنی آخرت کی حقیقت ہی یہ بیان کی کہ آخرت یہی تمثیلات ہیں، وہاں مادیات نہیں، یعنی جیسے دنیا عالم مادی ہے اور عالم آخرت ان کے نزدیک ایسا نہیں ہے، وہ غیر مادی ہے، حالانکہ اہل حق کے نزدیک آخرت بھی عالم مادی ہے اور وہ غلط کار لوگ کہتے ہیں کہ آخرت عالم مادی نہیں ہے، بلکہ محض خیال ہوگا، لیکن ایسا تو خیال ہوگا کہ یوں معلوم ہوگا جیسے مادیات ہوں، بس ایسا عالم ہوگا جیسے خواب میں ہوتا ہے کہ سانپ کے کاٹنے کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے، انسان ڈرتا بھی ہے بھاگتا بھی ہے، چیختا بھی ہے، چلاتا بھی ہے، لیکن واقع میں نہ کوئی سانپ ہوتا ہے نہ وہ کاٹتا ہے، نہ کچھ ہوتا ہے، وہ عذاب قبر کے بھی اسی طور پر قائل ہیں کہ مثلاً یہ جو آیا ہے کہ سانپ اور بچھو کاٹیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سچ سچ سانپ اور بچھو کاٹیں گے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسی سانپ اور بچھوؤں کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے، ایسی ہی تکلیف روح کی ہوگی، اس تکلیف کو تعبیر کر دیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان سے کہ سانپ بچھو کاٹیں گے۔

غرض کہ وہ لوگ اس کے قائل ہو گئے کہ آخرت میں عذاب اور ثواب اس طور پر ہوگا جیسے بعض اوقات انسان پر خیال کا غلبہ ہوتا ہے، وہاں بھی اعمال کی صورتیں ایسے طور سے نمایاں ہوں گی کہ وہ یوں سمجھے گا کہ میں باغوں میں پھرتا ہوں، حوروں میں مشغول ہوں اور واقع میں باغ نہ ہوں گے، نہ حوریں ہوں گی، مگر تصرف متخیلہ کا غلبہ ایسا ہوگا جیسے یہاں آدمی بیٹھ کر وہم کو اپنے اوپر غالب کر لیتا ہے۔

(آثار المربع صفحہ: ۳۷)

اگر کوئی آخرت کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے جیسے بعض فلاسفہ کا عقیدہ ہے تو سراسر گمراہی اور بالکل غلط عقیدہ ہے، سو بعض کا تو یہ عقیدہ ہے، جو مذکور ہوا کہ عالم آخرت میں اعمال ہی بشکل درخت وغیرہ تشکیل ہوں گے اور ان میں واقعیت کچھ نہ ہوگی۔

باقی جو خصوص کو مانتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ تو نہیں لیکن ان میں بعض مبتدعین جیسے معتزلہ جنت و نعمائے جنت کو فی الحال موجود نہیں مانتے، ان کو سرسری نظر سے کچھ تا سیدل گئی اس حدیث سے جنت ایک چٹل میدان اور اس کے درخت ”سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر“ ہیں، اس حدیث میں انہیں دھوکا ہوا، اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ کسی شیخ سے بڑھنا چاہیے وہ یوں سمجھے کہ جنت بھی خالی ہے اور دوزخ بھی خالی ہے، ہم جیسے جیسے عمل کریں گے یہ عمل ہی اس شکل سے ظہور کریں گے، سو خوب سمجھ لیجئے! یہ بھی غلطی ہے، واقع میں یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں، مگر باوجود ہونے کے ہیں، انہیں اعمال کے ثمرات، کیونکہ خدا تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ کون شخص کیا کیا عمل کرے گا؟ اسی کے مناسب سزا جزا کی صورت پہلے سے بنا کر اس کے وجود واقعی کی خبر دینے کے لیے یہ فرمایا: ”أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ“، ”أَعَدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ“ جیسے میزبان کو پہلے سے معلوم ہو کہ میرے مہمان کا مزاج علیل ہے اور وہ پہلے سے اس کے مزاج کے مناسب کھانا تیار کر کے رکھ دے، تو وہ کھانا رکھا گیا مزاج کی مناسبت سے یعنی سودا، یا صفر، یا تلخ، یا ملح، یا کھارے پلاؤ یا اور کوئی چیز اس کے لیے تیار کی گئی، ہاں! یہ اور بات ہے کہ کسی میزبان کو خبر ہی نہ ہو کہ میرے مہمان کا مزاج کیسا ہے؟ وہ کیا پرہیزی کھانا کھاتا ہے؟ لیکن حق تعالیٰ جو میزبان ہیں انہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے مہمانوں کے مزاج کی کیا حقیقت ہے؟ انہیں تو پہلے ہی سے مفصل علم ہے کہ میرا فلاں فلاں بندہ فلاں فلاں عمل کرے گا، بس ان اعمال کے مناسب ہی جزاؤں کو مہیا فرما رکھا ہے، پس ”قیعان“ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ واقع میں وہ موجود ہے، کیونکہ جنت کا مع نعمائے حییہ بالفعل موجود ہونا تو منصوص ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ درجہ حصول فی الحال میں قبل صدور اعمال بمنزلہ قیعان کے ہے اور درجہ ذات میں قیعان نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ فی نفسہ قیعان نہیں بلکہ جنتیوں کے حق میں قیعان ہے، جیسے ایک شخص نے دس ہزار روپے اپنے خادموں کے لیے خزانہ میں جمع کر دیے اور فی کام دس پیسے بچاؤ روپے علی قدر مراتب نامزد کر دیے، پھر وہ شخص سب کو خطاب کر کے یوں کہتا ہے کہ اتنا روپیہ خزانے میں رکھا گیا ہے، اگر تم خدمتیں کرو گے تو خزانہ میں سب کچھ ہے، ورنہ یوں سمجھو کہ بالکل خالی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قبل خدمتیں کرنے کے تمہارے حق میں گویا خزانہ خالی ہے، جب خدمتیں کرنا شروع کر دو گے تو اب سمجھو کہ وہ پرہوگا، واقع میں تو وہ اب بھی پرہے، لیکن تمہارے حق میں وہ جھبی پر سمجھا جائے

گا جب تم خدمتیں کرو گے، تو معنی یہ ہیں حدیث کے کہ اعمال کے ثمرات تو پہلے سے مہیا کر دیے گئے ہیں، لیکن وہ ابھی کسی کی ملک نہیں بنائے گئے، جیسے جیسے بندے عمل کرتے جاتے ہیں، وہ ثمرات ان کے نامزد ہوتے جاتے ہیں۔

اب اس تقریر پر سب اشکالات رفع ہو گئے تو عالم مثال میں بھی حق تعالیٰ نے انہیں اعمال کو پہلے سے مشتمل فرمایا ہے اور جنت و دوزخ میں بھی انہیں اعمال کی شکلیں پہلے سے پیدا فرمادی ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کو تو معلوم تھا کہ میرے بندے کیا کیا اعمال کریں گے، انہیں اعمال کی صورتوں کو جنت و دوزخ بنا دیا۔ (ایضاً صفحہ: ۵۵، ۵۶)

### چکھتر واں اعتراض..... حقیقتِ پل صراط!

حقیقتِ پل صراط حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے یہ لکھی ہے کہ شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور اعمال فروع ہیں اخلاق کی، تو اصل محل اعتدال کا اخلاق ہیں، ان کا بیان ہے کہ اخلاق کے اصول تین ہیں۔ یعنی اصل میں تین قوتیں ہیں۔ جو جزء ہیں تمام اخلاق کی یعنی جن قوتوں سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں وہ تین ہیں۔ قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ، حاصل یہ کہ منافع کے حصول اور مضار کے رفع کے لیے خواہ وہ دنیویہ ہوں یا اخرویہ، دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک وہ قوت کہ جس سے منفعت و مضرت کو سمجھے کہ یہ مضرت یا منفعت ہے، وہ قوت مدرکہ قوت عقلیہ ہے اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو حاصل کرے، یہ قوت شہویہ کا کام ہے اور یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو رفع کرے، یہ قوت دافعہ قوت غضبیہ ہے، پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں، پھر ان اعمال کے تین درجے ہیں۔ افراط و تفریط و اعتدال، چنانچہ قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ وحی کو بھی نہ مانے، جیسے یونانیوں نے کیا، تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل و سفہ تک اتر آئے، اسی طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حرام و حلال کی بھی خبر نہ رہے، بیوی اجنبی سب برابر ہو جائیں اور ایک درجہ تفریط، یعنی ایسے پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں، اسی طرح قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑ یا ہی بن جائیں اور تفریط یہ کہ ایسے نرم ہوئے کہ کوئی جوتے سے بھی مارے، دین کو برا بھلا کہہ لے، تب بھی غصہ نہ آئے۔ یہ تو افراط و تفریط تھا۔ ایک ہے ان تینوں قوتوں کا اعتدال، یعنی جہاں شریعت نے اجازت دی ہو وہاں تو ان قوتوں کو استعمال کرے اور جہاں اجازت نہ دی ہو، وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے، یہ اعتدال ہے، تو ہر وقت میں تین

درجے ہیں، افراط، تفریط، اعتدال ان سب درجوں کے الگ الگ نام ہیں، بقوت عقلیہ کا درجہ افراط ہے، اس کا نام ہے جزیرہ اور جو تفریط کا درجہ ہے، اس کو سفاهت کہتے ہیں، جو اعتدال کا درجہ ہے، اس کا لقب حکمت ہے، اسی طرح قوت شہویہ کا افراط درجہ فجور ہے، تفریط کا درجہ خودی ہے، اعتدال کا درجہ عفت ہے اور قوت غصبیہ کا بڑا ہوا درجہ تمہور ہے، گھٹا ہوا درجہ حین ہے، اعتدال کا درجہ شجاعت ہے۔

تو یہ نو چیزیں ہوئیں جو تمام اخلاق حسنہ و سیدہ کو حاوی ہیں اور مطلوب ان نو درجوں میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں، یعنی حکمت، عفت، شجاعت، باقی سب رذائل ہیں، تو اصول اخلاق حسنہ کے یہ تین ہوئے اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہے، اس لیے اس امت کا لقب وسط ہے، یعنی امت عادلہ، غرض انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہو، اب آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں، لیکن انسان بہت کم ہیں، چنانچہ شاعر کہتا ہے:

زاهد و شیخ شدی و دانشندی

ایں جملہ شدی و لیکن انسان نشدی

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ اعتدال حقیقی سب میں زیادہ مشکل ہے، کیونکہ اعتدال حقیقی کہتے ہیں، وسط حقیقی کو کہ اس میں ذرا برابر نہ افراط ہو، نہ تفریط ہو اور مشاہدہ سے اس کا دشوار ہونا ظاہر ہے اور پل صراط اسی اعتدال کی صورت مثالیہ ہے اور اس کی دشواری تلوار کی تیزی کی صورت میں ظاہر ہوا کیوں کہ جب اعتدال حقیقی بال سے زیادہ باریک ہونے کی صورت میں ظاہر ہوئی، اور اس کا اعتدال وسط حقیقی ہوگا اور وسط حقیقی غیر منقسم ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ منقسم ہو تو پھر خود اس میں طرفین اور وسط نکلیں گے تو وہ وسط حقیقی نہ رہا، بہر حال وسط حقیقی کا غیر منقسم ہونا لازم ہے اور بال منقسم ہے تو وہ بال سے زیادہ باریک ہوگا۔

بس اس طریق شریعت کا وسط حقیقی ہونا اس شکل سے ظاہر ہوگا کہ وہ پل صراط بال سے زیادہ باریک ہوگا، اس تشبیہ میں کوئی امر خلاف اصول عقلیہ لازم نہیں آتا اور اس درجہ کے وسط ہونے سے اس کا مشکل ہونا بھی لازم آیا کہ نہ ادھر جاؤ، نہ ادھر جاؤ، بیٹیوں بیچ میں رہو۔

بس یہ حقیقت پل صراط کی وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے جس کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا ثابت کر دیا گیا، تو شریعت پر چلنے والے اب بھی پل صراط پر چل رہے ہیں، جب یہ ہے تو جو یہاں پل صراط پر یعنی شریعت پر چل چکا ہے، وہ وہاں بھی آسانی سے چل سکے گا کیونکہ وہ بھی تو ہے، اب ہٹائیے! پل صراط پر چلنا کیا دشوار ہوا؟ جو یہاں شریعت پر چل رہا ہے،

اسے وہاں بھی چلنا آسان ہو جائے گا۔

سو پہلے صراط پر چلنے کا طریقہ بہت ہی آسان ہے اور وہ سنت کا طریقہ ہے، یہی سنت بیچ کا راستہ ہے، اسی کو فرماتے ہیں شیخ سعدی رحمہ اللہ۔

مہندار سعدی کہ راہ صفا  
تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ  
دریں راہ جز مرد راعی زرفت  
گم آں شد کہ دنیا راعی زرفت

(آثار المربع صفحہ: ۵۹)

## چھہتر واں اعتراض..... عقل کے معنی اور تشریح

عقل کے معنی لغت میں روکنے والا ہیں، اسی سے عقلمندی کو کہتے ہیں کہ وہ جانور کو بھاگنے سے روکتی ہے، تو عقل کا حاصل یہ ہوا کہ وہ ایسی قوت مدد کرے جو مضرت سے روکتی ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ مضرت کیا چیز ہے؟ اور منفعت کیا چیز ہے؟ سو اصل میں مضرت کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور منفعت کی بھی، کیونکہ ہر منفعت میں کچھ نہ کچھ مضرت بھی ہے اور ہر مضرت میں کچھ نہ کچھ منفعت بھی ہے۔ اب عقل کا یہ کام ہے کہ وہ بتا دیتی ہے کہ کہاں منفعت کا پہلو غالب ہے اور کہاں مضرت کا مثلاً ایک شخص کو شدت کی پیاس لگی ہوئی ہے، حلق خشک ہو جاتا ہے، دم نکلا جاتا ہے، ایسے وقت میں اس کے پاس صرف دودھ ہے، مگر دودھ ایسا ہے جس میں سے کچھ سانپ بھی پی گیا ہے جس کی وجہ سے زہریلا ہو گیا ہے، اب بعض دوست تو یہ کہتے ہیں، میاں! دودھ پی لو، تمہارا حلق تو تر ہو جائے گا پیاس تو بجھ جائے گی اور بعض کہتے ہیں اسے ہرگز نہ پینا! کیونکہ اس میں زہر ہے، اس وقت حلق تر تو ہو جائے گا، مگر پھر حیات ہی منقطع ہو جائے گی، اس وقت عقل یہ فیصلہ کرے گی کہ گو دودھ پی لینے میں قدرے منفعت بھی ہے، مگر یہ منفعت معتد بہا نہیں، اس لیے نہیں پینا چاہیے۔

القرض منفعت قابل اعتراض وہ ہے جو ضرر پر غالب ہو، اسی طرح ضرورہ قابل اعتبار ہے جو نفع پر غالب ہو، ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ اور ملایے کہ دنیا کی منفعت سے آخرت کی منفعت بڑھی ہوئی ہے اور دنیا کی مضرت سے آخرت کی مضرت بڑھی ہوئی ہے، دنیا کی



منفعت و مضرت آخرت کی منفعت و مضرت کے آگے کوئی چیز نہیں۔

ان دونوں مقدماتوں کے ملانے کے بعد عقل بھی یہی فتویٰ دے گی کہ جس کام میں دنیا کی منفعت ہو، مگر آخرت کی مضرت ہو، ایسی منفعت کو چھوڑ کر آخرت کی مضرت سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح کسی کام میں دنیا کی مضرت ہو اور آخرت کی منفعت ہو، تو عقل یہی کہے گی کہ چھوٹی سے مضرت کو بڑی منفعت کے لیے گوارا کرنا چاہیے۔

بس یہ ہے اصلی عقل! مگر آج کل لوگوں نے دنیا کمانے کا نام عقل رکھ لیا ہے، اگر اسی کا نام عقل ہے تو فرعون سب سے بڑا عقلی ہوگا، مگر اس کا جاہل اور احمق ہونا تمام مسلمانوں کو مسلم ہے۔

(الامتحان صفحہ ۴۰)

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج بتاریخ ۳ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ بمقام موضع گنچ متصل لاہور میں مواعظ کے انتخاب کا سلسلہ متعلقہ جوابات شہادت و اعتراضات اختتام کو پہنچا۔

وللہ الحمد!

